دل گداز تحریریں، • زندگی کی تصویریں

کراچی

ماہنامہ

سچی کہانیاں

April
2017

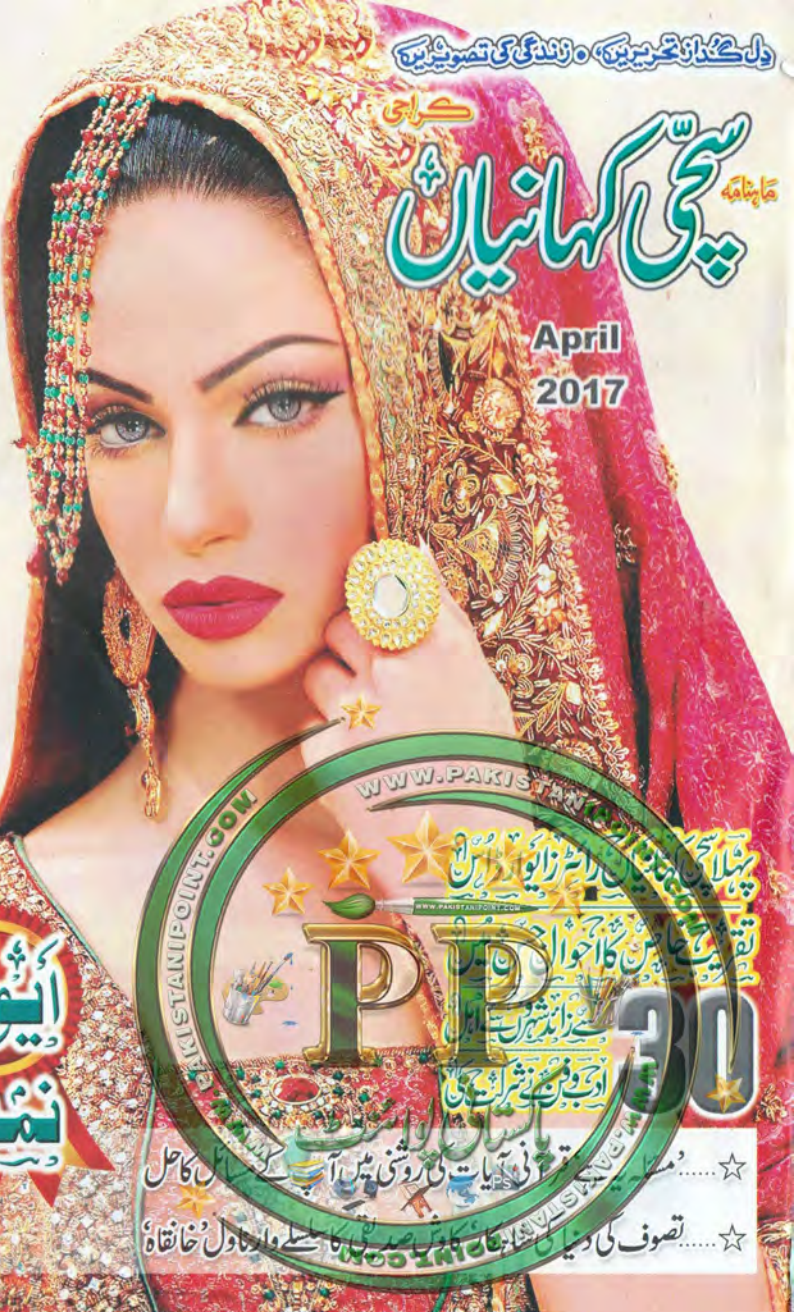

ایوارڈ نمبر

پہلا سچی کہانیاں ایوارڈ

تقریب جائزہ کا احوال

سے زائد شہروں سے اہل

ادب و فن کی شرکت کی

☆.....مسائل حاضرہ قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

☆.....تصوف کی دنیا کے شہکار فاؤنڈ صدیقی کا سلسلے وار ناول 'خانقاہ'

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
PP 30

07 **کاش...**
منزہ سہام

09 **احوال**
کاشف چوہان
قارئین کے خطوط اور حال احوال کا دل چسپ سلسلہ

31 **لائف بوائے**
اسماء اعوان
حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

25 **سپاس نامہ**
مدیر
ایوارڈ تقریب میں منزہ سہام کی جانب سے مدیر کی زبانی "سپاس نامہ"

26 **ایوارڈ تقریب کا احوال**
مصنفین
ایوارڈ تقریب کی یادوں بھری کہکشاں سے سجے محبت نامے

70 **داؤ**
افتخار چوہدری
بس ایک داؤ نے اُس شخص کی زندگی بدل دی اور دوسرے داؤ نے اُسے واپس وہیں لا کھڑا کیا

80 **اِک گناہ کی قیمت**
دستگیر شہزاد
اُس عورت کی داستانِ عبرت، جو تا عمر ایک گناہ کی قیمت چکاتی رہی

92 **بُو**
کرن شبیر
اُس معصوم شخص کی داستان، جسے مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا

99 **دنیائے جستجو**
تسنیم منیر علوی
غلط فہمی سے جنمی اک چھوٹی سی محبت کی بہت بڑی کہانی، جو بطور خاص دبئی سے بھیجی گئی

104 **محبت اور فرض**
بابر نایاب
اُس نوجوان کی یادگار کتھا، جس نے فرض اور محبت کو نبھا کر مثال قائم کر دی

113 **ذرا سی بات**
فردوس بانو
بیوی کے قاتل اُس نوجوان کا قصہ، جو آج پانچ بچوں کے ساتھ سسکتے ہوئے زندگی گزار رہا ہے

118 **سزا مجھے ملی**
آصفہ سکندر
فیوڈل سسٹم کا شکار ایک دوشیزہ کی آبلہ پائی، جو آج بھی اپنوں کے کیے کی سزا بھگت رہی ہے

126 **تری راہ تک رہی ہوں**
فیصل نعیم بھٹی
اُس دوشیزہ کی داستان جو شر سے خیر نیکی کی طرف پلٹ آئی تھی مگر.....

131 **دو دن کی زندگی**
شاہد محمود مغل
اُس طمع پرست نوجوان کا عبرت نامہ، جو بالآخر میں اپنے گنے چنے دن پورے کر رہا ہے

136 **ایس ایچ او**
افشاں
نغمۂ آدم کے اس ایس ایچ او کی کہانی، جس کی بہادری اور بے باکی کے گن آج بھی گائے جاتے ہیں

140 **داسی**
احمد سجاد بابر
برصغیر کی اُس عظیم ادیبہ کی داستانِ حیات جو تا حیات اپنے دیوتا کی داسی رہی

154 **الماس**
سید مازم حسین شیرازی
اُس امیدوں بھرے دل کی کہانی، جس میں آرزوؤں کے مہکتے گلابوں کو راکھ کر دیا گیا

فون: 021-35893121-35893122 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس، OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی

واپسی 160
سید وجاہت علی
اُس دوشیزہ کا قصۂ الم جس کی واپسی اپنے رب تک ہوگئی تھی

چمن پھونک دیا 168
فرزانہ نگہت
اُس نوجوان کی ماں نے تین بار اُس کا گھر اجاڑا اور پھر اُسے پاگل خانے کا باسی بنا دیا

برف کے شہر 174
قمر علی عباسی
پاکستان کی برف پوش وادیوں کی سیر کراتا ایک منفرد سفرنامہ

خوش بخت 182
ممتاز احمد
اُس ڈرائیور کا قصۂ خاص، جسے لاری اڈے سے ایک دن کا بچہ مل گیا تھا

قوسِ قزح 191
راناحبیب الرحمن
جیل کی سلاخوں کے پیچھے فیروز مسلم کے شکار ایک نوجوان کی سرگزشت

گیم 204
ارم ناز
ارم ناز کے قلم سے، آج کا کریز، آج کی سفاک حقیقت

بھنور 207
شازمہ خان
اُس رات کی حکایت، جس کی صبح کھو گئی تھی

بس محبت چاہیے 210
سید محمد ابو آزاد
اُس معصوم نیکی کی داستان، جسے زندگی میں کبھی پیار نہ ملا تھا مگر

رب کا انصاف 214
ماریہ یاسر
ظالم ظلم کرتے وقت ہمیشہ خدا کو بھول جاتا ہے، اک حکایت عبرت

حادثہ 218
کرن نورین
بس ذرا سی غفلت کبھی کبھی بہت بڑے نقصان کا باعث بھی بن جایا کرتی ہے

جہالت 220
نازیہ جہانگیر خان
آج بھی کچھ خاندان، خاندانی جہالت کا شکار ہیں

پچھتاوا 222
عارف شیخ
پچھتاوا صرف ہمارے ہی کیے کا عکس ہوتا ہے، سستی کبھی زندگی بھر کا روگ بھی بن جاتی ہے

خانقاہ 226
کاوش صدیقی
خانقاہوں، آستانوں، درباروں، مزاروں سے جڑی ایک مرد درویش کی داستانِ عجب

مسئلہ یہ ہے 242
ادارہ
آپ کا مسائل کا حل، سچی کہانیاں کا لازوال سلسلہ

ہائیڈ پارک 252
ڈی خان
زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ جسے قارئین خود ترتیب دیتے ہیں

تیرِ نیم کش 257
قارئین
قارئین کی سخن فہمی کو آزماتا ایک دلچسپ سلسلہ

متفرقات 000
☆☆☆
چنیدہ، چنیدہ معلومات اقتباسات قارئین کے ذوقِ مطالعہ کے لیے

ااا: بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر

سچّی کہانیاں ڈائجسٹ میں اشتہار کیوں دیا جائے؟

- ..... پاکستان کا یہ واحد رسالہ ہے، جس کا گزشتہ بتیس برس سے تین نسلیں مسلسل مطالعہ کر رہی ہیں۔
- ..... اِس لیے کہ جریدے میں شائع ہونے والے اشتہارات پر قارئین بھرپور اعتماد کرتے ہیں۔
- ..... اِس میں غیر معیاری اشتہار شائع نہیں کیے جاتے۔
- ..... پوری دنیا میں پھیلے، اِس کے لاکھوں قارئین متوسط اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، جو مستند اور معیاری مصنوعات کی خریداری کو ترجیح دیتے ہیں۔
- ..... اِس لیے کہ سچّی کہانیاں ڈائجسٹ کو گھر کا ہر فرد یکساں دلچسپی سے پڑھتا ہے۔
- ..... جریدے کے ہر شمارے کو قارئین سنبھال کر رکھتے ہیں۔
- ..... اِس جریدے کے بڑی تعداد میں مستقل خریدار ہیں، جو اندرون اور بیرون ملک پھیلے ہوئے ہیں۔
- ..... آپ کی مصنوعات کے اشتہار با کفایت اُن تک پہنچ سکتے ہیں۔
- ..... جریدے کی اعلیٰ معیار کی چھپائی آپ کے اشتہار کی خوب صورتی میں اضافہ کرتی ہے۔

شعبہ اشتہارات: سچّی کہانیاں

II 88-C۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبر: 021-35893121 - 35893122

کاش.....

میں ایک ایسی کشتی میں محو سفر تھی جس میں گنجائش سے بہت زیادہ مسافر سوار تھے۔ طوفان بپھرے ہوئے شیر کی مانند چاروں جانب سے کمزور کشتی پر حملہ آور تھا۔ آسمان سے برستا مینہ صورتحال کو مزید دگرگوں کر رہا تھا۔ اونچی اونچی لہریں کسی عفریت کی مانند زندہ نگلنے کے لیے تیار تھیں۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ کمزور لکڑی کی کشتی میں جگہ جگہ چھید ہو گئے۔ اب مجموعی طور پر تمام مسافران سوراخوں کو اپنے ہاتھوں، پیروں اور بعض تو جسم سے دبائے بیٹھے تھے۔ لوگوں، ملاحوں اور چپوؤں کی مدد سے کشتی میں بھرنے والے پانی کو باہر پھینکا جا رہا تھا، موت سامنے تھی۔ ایسے میں، میں نے سچے دل سے اپنے رب کو پکارا۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میں جینا چاہتی تھی اپنوں کے پاس پلٹنا چاہتی تھی۔ ایسی اذیت ناک موت کا تو کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ میں گڑگڑا رہی تھی۔ اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہی تھی زندگی کی قدر و قیمت کا مجھے موت کے پہلو میں کھڑے ہو کر اندازہ ہوا۔ تمام مسافر اللہ کے حضور سربسجود تھے، اپنی زندگی کی رب کائنات سے بھیک مانگ رہے تھے۔ تب یکدم میری آنکھ کھل گئی۔ میں پسینے سے شرابور تھی، چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ میں زندہ تھی۔ اپنے گھر میں تھی۔ اپنے پیاروں کے درمیان تھی۔ اور اس لمحے مجھے ادراک ہوا کہ زندگی سے بہت بڑا زندگی کا احساس ہے۔ یہ جاننا کہ ہم زندہ ہیں، زندگی کی اصل حقیقت ہے۔ کاش ہم سب پاکستانیوں کو یہ احساس ہو جائے کہ ہم زندہ قوم ہیں..... کاش ہم اپنی کشتی طلاطم بلاخیز سے نکال لائیں کاش.....

منزہ سہام

دنیا میں کس جگہ

سچّی کہانیاں کے چرچے نہیں

اِس لیے کہ "سچّی کہانیاں" کے مصنّفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچّائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ "سچّی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچّائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچّی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچّی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافاتِ جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ دستنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچّی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں، پرل پبلی کیشنز : 88-C-II فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔
ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی فون نمبر: 021-35893121-35893122
ای میل : pearlpublications@hotmail.com

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

رشتے اسیری ڈھونڈتے ہیں۔ محبتیں قید ہو جاتی ہیں۔ ذات گروی رکھ دی جاتی ہے۔ عاشق غلام ہو جاتا ہے۔ عشق نیلام ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی لفظوں کی ناؤ میں بیٹھ کر ایک نیا جہاں سر کرنے کا جی چاہتا ہے۔ اک نیا جہاں سر کرنا کبھی سہل نہیں ہوتا۔ وقت کو گوندھ گوندھ کر محبتوں کی میعادیں کب طے ہوتی ہیں۔ صرف سمجھوتے ہوتے ہیں۔ سمجھوتے ہی ہمیں جینا سکھاتے ہیں۔ زندگی کے خوابوں کی تعبیریں دیتے ہیں۔ قانونی مہریں بھلا کبھی کسی کو من سے ایک کر پائی ہیں؟؟ دیوان اِک رہ گزر ہے اور اس رہ گزر میں داخل ہونے والا پورا جیون آخری دروازہ ڈھونڈتا رہ جاتا ہے۔ مرے پیارو! جانتے ہو! محبت کی گلیاں بھیگی بھیگی کیوں رہتی ہیں۔ کیونکہ محبت پانے والے اک جہاں سر کر جاتے ہیں۔ منزل پا جاتے ہیں۔ منزل پر آ کر واپسی کے سفر میں ان کے سارے پیار منزل کی جستجو میں دیوان کی رہ گزر میں گمشدہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ بس اس لیے محبت کی گلیاں گیلی اور رسیلی رہتی ہیں۔ واقعی سچ ہے کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا۔ ساتھیو! ہم بھی ایک جہان سر کر آئے۔ نیل سمندر باندھ آئے اور اب یوں لگتا ہے جیسے ہم نے پھر سے سفر اکائی سے شروع کر دیا ہے مگر اک فرق ہے۔ وہ سفر ناپختہ تھا مگر اب جو سفر درپیش ہے وہ شعوری ہے چلیے اور ہم قدم ہو جائیں مرے۔

پہلے پرایوارڈ نمبر کے ساتھ آپ کی محبتوں کے طلسم کدے ''احوال'' کی ابتداء کرتے ہیں۔

☆ محمد طفیل طوفی کاموکی سے پہلی بار احوالی بن رہے ہیں لکھتے ہیں۔ جب میں اسکول اے ڈی ماڈل ہائی اسکول میں پڑھتا تھا جب سے مختلف رسائل میں لکھ رہا ہوں۔ آپ کا سچی کہانیاں میں نے پہلی بار پڑھا ہے۔ میرے ساتھ بہت بڑا فراڈ اپنوں نے کیا اور میرے دو گھر ہتھیا لیے گئے۔ شوگر کی وجہ سے پیر کا زخم خراب ہو گیا۔ کویت میں ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ آدھا پیر کاٹنا پڑے گا۔ ایک ساتھی نے مجھے اپنا پیر دکھایا اور کہا میرا بھی پیر کاٹنے کا ڈاکٹر بولتے تھے۔ میں نے پاکستان سے علاج کروایا پیر ٹھیک ہو گیا، بہت زیادہ پریشانیوں میں گھرا ہوا ہوں۔ میرے لیے سب احوالی دعا کریں۔

❀ بھائی طفیل! خوش آمدید! آپ کی کہانی پڑھ کر بہت دکھ ہوا مگر انسان کیا کر سکتا ہے۔ کہانی پڑھ کر آپ کو جلد مطلع کر دیا جائے گا، بس تھوڑا سا انتظار۔

☆ اکوال تلہ گنگ سے ہمارے پیارے ساتھی قاری سلیمان شبیر بڑے دنوں بعد احوال کا حصہ بن رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ سب سے پہلے تو آپ کو خوب صورت ایوارڈ تقریب منعقد کرنے کی اور اس کی کامیابی پر بہت بہت مبارک قبول ہو۔ یہ سب آپ کی شب و روز محنت کا ثمر ہے جو یہ تقریب کامیاب ہوئی اور تمام ایوارڈ یافتگان کو بھی بہت بہت مبارک باد قبول ہو اور دوسرا مجھے افسوس ہے کہ میں 26 جنوری کو لاہور میں موجود ہوتے ہوئے بھی تقریب میں شریک نہ ہو سکا۔ ایک تو مجھے تقریب کی تاریخ نہیں پتا تھی اور دوسرا میری غلطی ہے کہ میں نے آفس میں فون کر کے پتا نہیں کیا۔ خیر اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ ماہِ مارچ کا ماہنامہ 4 مارچ کو مل گیا تھا لیکن کچھ مصروفیت کی وجہ سے ابھی تک پڑھ نہیں سکا۔ اس لیے تبصرہ ندارد۔ لیکن اتنا یقین ہے یہ ماہنامہ بھی پچھلے ماہناموں کی طرح آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہو

گا۔صرف ایک گزارش ہے کہ پرچہ تھوڑا سا جلدی بھیج دیا کریں تاکہ 26 یا 27 تک مل جایا کرے۔اس کے ساتھ اجازت، اگلے شمارے تک اللہ حافظ۔

✽ پیارے بھیا! تمہارا تبصرہ، ہماری بصارتوں کا رزق بنا تو سمجھو ہم نے جو ہے، جیسا ہے بس مُنے بھیا سلیمان کا ہے قبول کیا۔خوش رہو، کاش تم یہ بھی سمجھ لو کہ ایک فون نمبر سے بہت یادگار پل محفوظ اور مقروض بھی ہو جاتے ہیں۔ آئندہ اپنا سیل نمبر ضرور لکھنا۔

☆ کراچی سے ہماری آنٹی شاہدہ ذاکر احوالی بن رہی ہیں۔لکھتی ہیں۔مارچ کا شمارہ مل چکا ہے لیکن ابھی صرف احوال اور آپ کی کراچی پر زبردست سی نظم ہی پڑھی ہے اس لیے تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔فروری کا ''عشق نمبر'' بہت شاندار تھا۔سب کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔اپنی پسندیدہ گلوکارہ ناہید اختر کی زندگی کی روداد پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔آخر کار آپ نے ایوارڈ کی تقریب کا وعدہ پورا کر ہی دیا۔اتنی شاندار تقریب کے انعقاد کے لیے آپ اور آپ کی پوری ٹیم مبارک باد کی مستحق ہے۔ایوارڈ حاصل کرنے والے تمام ساتھیوں کو دلی مبارکباد۔تقریب کے احوال کا شدت سے انتظار ہے۔''زہر عشق'' اتنا مزے کا ناول تھا آپ نے اتنی جلدی کیوں ختم کر دیا۔اب آپ کے اگلے ناول کا انتظار ہے۔آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کو اور ادارے کے تمام کارکنان کو صحت ہمت اور کامیابیاں عطا فرمائے اور ہمارا رسالہ یوں ہی دن دوگنی رات چگنی ترقی کرتا رہے، (آمین)۔اگلے خط تک کے لیے اجازت دیجیے۔

✽ پیاری آنٹی! سلامت رہیے۔بہت جلد آپ کی کاوش سچی کہانیاں کے صفحات پر نظر آئے گی۔ آپ کا تبصرہ ہمیں ہر ماہ چاہیے۔

☆ عرصے بعد احوال میں یہ آمد ہے ہماری بہن شازیہ گل کی ضلع مانسہرہ سے۔لکھتی ہیں میں مشکور ہوں اپنے بھائی کاشی چوہان کی جن کی بدولت میں سچی کہانیاں سے جڑی ہوں۔آج میں جو بھی ہوں سچی کہانیاں کی وجہ سے ہی ہوں۔ میری کہانی پہلی بار کاشی بھائی نے شامل اشاعت کر کے مجھے لکھنے کی ہمت دی میری حوصلہ افزائی کی۔میں باقاعدگی سے تو نہیں لکھ پاتی مگر رسالہ پڑھتی باقاعدگی سے ہوں۔فروری کا سچی کہانیاں تھوڑا لیٹ ملا۔سب سے پہلے منزہ جی کی آئینہ دکھاتی معصوم طیبہ کی باتیں آنکھوں کو نم کر گئیں۔اس کے بعد اپنے پسندیدہ سلسلے ''احوال'' میں پہنچی تو کاشی بھائی کی سحر زدہ باتیں ان کے خوب صورت لفظوں میں اپنوں سے گلے شکوے بہت کچھ سمجھنے اور سوچنے پر مجبور کر گئے۔ احوال میں سبھی بہن بھائیوں کے خطوط بہت اچھے لگے۔سلیم فاروقی صاحب کی وفات کی خبر دکھی کر گئی۔اللہ تعالیٰ ان کے اہل خانہ کو صبر عطا فرمائے اور ان کو جنت میں جگہ عطا فرمائے، (آمین)۔جن بہن بھائیوں کو ایوارڈ ملے ان کو بہت بہت مبارک۔رانا حبیب الرحمن بھائی آپ کی کہانی بہت اچھی ہے ہر قسط پڑھنے کے بعد دوسری قسط کا شدت سے انتظار ہوتا ہے۔کاشی بھائی ''زہر عشق'' بہت اچھا ناول تھا اینڈ بھی اچھا کیا آپ نے۔اب انتظار کو مزید نہ بڑھایئے اور اگلا ناول جلدی سے لے آیئے۔کہانیوں میں ہمیشہ کی طرح ''لائف بوائے'' اسماء اعوان اچھی کہانی رہی۔''حق'' اقبال بانو، ''عاشقوں کے امتحان'' ایم قاسم بلوچ، ''جینی سے فاطمہ تک'' مومنہ بتول، ''انا اور امید'' وقاص حسین، ''عشق سراب'' صائمہ عروج، ''پروموشن'' ثمینہ طاہر بٹ، ''تھوڑی سی محبت چاہیے'' فلک شبیر تابش، ''تیرے لیے ہم ہیں بنے'' افتخار چوہدری، ''بس تیری گلی میں'' حمیرا خان، ''محبت کا دی اینڈ'' ضرغام محمود، ''زرد لومڑی'' ایم اے راحت، ''قسمت کی دیوی'' سیدہ تبسم زہرہ، ''قوس قزح'' رانا حبیب الرحمن، ''استانی جی کا عشق'' ممتاز احمد، ''بخت نامہرباں'' نازیہ بتول، ''بے چاری شمو'' ارم ناز، ''بڑی باجی'' عابدہ طارق، ''عشق کی معراج'' عمران مظہر، ''گڑیا'' نسیم سحر، ''تم میرے ہو'' اظہر عباس، ''خانقاہ'' کاوش صدیقی اور سُروں کی ملکہ میری موسٹ

خواتین کی محبوب قلم کار

"رفعت سراج" کا تازہ ترین شاہکار "دامِ دل"

رفعت سراج کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں جو قارئین کی دھڑکنیں بے ترتیب کر رہی ہیں

"**دامِ دل**" ..... دوشیزہ ڈائجسٹ میں مقبولیت کی بلندیوں پر

"**دامِ دل**" ..... کہانی ہے محبت کرنے والے ایک جوڑے کی ..... اور جب محبت کرنے والے سماج کی آنکھوں میں کھٹکنے لگ جائیں تو .....

"**دامِ دل**" ..... کہانی ہے اُس ماں کی ..... جسے بیٹیوں کی پیدائش پر سسرالی رویوں نے سولی چڑھا دیا

"**دامِ دل**" ..... کہانی ہے محبت کی دنیا میں آگ لگانے والے کریہہ چہروں سے نقاب اُتارنے والوں کی

"**دامِ دل**" ..... کہانی ہے معاشرے کے ان لالچی کرداروں کی ..... جن کی ہوس نے محبت کی زمین کو اجاڑ ڈالا

تو پھر پڑھنا نہ بھولیے گا۔

رفعت سراج کا شاہکار ناول "دامِ دل"

آپ کے اپنے ماہنامہ "دوشیزہ" ڈائجسٹ میں ہر ماہ شائع ہو رہا ہے

فیورٹ سنگر ناہید اختر کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ ہائیڈ پارک، تیر نیم کش اور متفرقات اور مسئلہ یہ ہے سبھی سلسلے بہت اچھے ہیں۔ میرا خط بہت طویل ہو رہا ہے اس لیے اب دیجیے اجازت اس دعا کے ساتھ جہاں رہیں خوش رہیں، خوشیاں بانٹیں دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔

☆ بہت پیاری گڑیا بہن! تمہاری محبت سر آنکھوں پر۔ احوال میں پہلے کی طرح باقاعدہ ہو جاؤ یہ تمہارے بھائی کی گزارش ہے اپنا بہت خیال رکھنا اور ہاں بھائی کو اور دولہا بھائی کو سلام کہنا۔

☆ لاہور سے ہماری بہن راحت وفا رانجوت مختصر احوال کے ساتھ شامل احوال ہیں، لکھتی ہیں۔ سدا مثلِ گل خنداں رہیں۔ خیریت بہ عافیت نیک مطلوب کیا حال چال ہیں امید ہے آپ ٹھیک ہوں گے۔ میں مختصر کہانی نمبر کے لیے ایک کہانی بھیج رہی ہوں۔ امید ہے آپ کے معیار پر پورا اترے گی۔ سچی کہانیاں دن بدن بہترین ہوتا جا رہا ہے۔ نئے نئے انداز سے آپ سچی کہانیاں کو بام عروج تک پہنچا رہے ہیں۔ یقیناً آپ کی انتھک محنت کا کمال ہے۔ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب کے بعد سچی کہانیاں کو پذیرائی حاصل ہوئی ہے، جو لوگ نہیں جانتے تھے وہ بھی آج سچی کہانیاں کا ذکر کرتے ہیں۔ آپ جتنا رائٹرز کو قابل تعریف سمجھتے ہیں جتنی اہمیت دیتے ہیں بہت کم لوگ ایسا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسے اور ترقی دے۔

☆ اچھی راحت جی! سلامت رہیے۔ آپ سب کی محبتیں ہی ہمیں کچھ نیا کرنے کا حوصلہ دیتی ہیں۔ کہانی انشاء اللہ مختصر کہانی نمبر میں شامل ہوگی۔

☆ ہمارے بھائی غلام مرتضیٰ علوی چک نمبر 301۔ گوجرہ سے لکھتے ہیں۔ پراسرار نمبر کچھ لیٹ ملا۔ کئی ماہ سے رسالہ لیٹ مل رہا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ پراسرار نمبر لفافہ کھول کر نکالا تو سچی بات ہے سرورق خوفناک نہیں لگا بلکہ اس طرح لگا جیسے جو سرورق اگلے کسی محبت نمبر یا عشق نمبر کو لگانا تھا وہ آپ نے پراسرار نمبر کو لگا دیا (ارے بھیا! کون سی آنکھوں سے دیکھا تھا؟) کاشی بھائی اب کے جب پراسرار نمبر آئے تو سرورق خوفناک ہونا چاہیے (کتنا.....؟ یہ تو بتا دو)۔ منزہ سہام کی شروع کی تحریر تو بس کیا بتاؤں کتنی اچھی لگی۔ تحریر شمارے کی جان ہے۔ ''احوال'' کا ورق کھولا تو محترمہ اقبال بانو کا خط عمدہ لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے مور شاہد بھائی اور سرگودھا کے ممتاز بھائی کے خطوط بھی بہت اچھے لگے۔ آگے بڑھتے ہوئے محترمہ مسز نوید ہاشمی صاحبہ کا طرز تحریر بھی بہت پسند آیا۔ باقی خطوط میں تلہ گنگ کے سلیمان شبیر صاحب، نوبہ ٹیک سنگھ سے محترمہ مصباح نوشین صاحبہ، وہاڑی سے منشی عزیز بھائی کے خطوط ابھی تک پڑھے ہیں اور بہت پسند آئے ہیں۔ خدا احوال کی یہ کہکشاں یوں ہی قائم و دائم رکھے۔ شمارے میں آگے جا کے اب تک جو تحریریں پڑھی ہیں ان میں ایم اے راحت صاحب کی ''زرد لومڑی'' افتخار چوہدری کی ''ہمزاد'' نینا خان کی ''نیا گھر'' پسند آئی ہیں۔ شعروں کا انتخاب اس ماہ بھی ٹاپ پر رہا۔ باقی شمارہ ابھی پڑھ رہا ہوں۔

☆ پیارے بھائی! آپ کا تبصرہ اچھا لگا۔ مشورے کا شکریہ۔ امید ہے اگلے ماہ پھر آپ سے احوال میں ملاقات ہوگی۔

☆ لاہور سے ہماری پیاری بہن حنا بشریٰ لکھتی ہیں۔ امید ہے خیریت سے ہوں گے۔ اللہ آپ پر اور تمام اسٹاف پر اپنا کرم فرمائے، (آمین)۔ فروری کا مہینہ اہل پاکستان کو دکھی کر گیا۔ جب دھماکوں کی گونج سے دل لرز اٹھے..... ابھی تک دل غمگین ہے جن کے پیارے چلے گئے ان کے غم کا کوئی مداوا نہیں کر سکتا۔ اللہ ان سفاک قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچائے اور مرحومین کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے، (آمین)۔ رفعت سراج صاحبہ کے والد کی مغفرت اور درجات کی بلندی کے لیے دعا گو ہوں اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، (آمین)۔ مور شاہد حسین بھیا کی تائی جان اور غلام مرتضیٰ علوی کی خالہ جان کے لیے ڈھیروں مغفرت کی دعائیں۔ پراسرار نمبر کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ سرورق بہت مختلف اور منفرد تھا۔ تقریب کی کامیابی کے بعد بھیا آپ کا حوصلہ اور ہمت کافی بلند دکھائی دیتے

زرد لومڑی

قارئین! بھائی ایم اے راحت ان دنوں صاحبِ فراش ہیں۔ 'زرد لومڑی' کی اقساط موصول نہ ہو پانے کی صورت میں زیرِ اشاعت ناول آپ نہیں پڑھ پائیں گے۔ جیسے ہی راحت بھائی کی طبیعت میں بہتری آئی آپ پھر سے 'زرد لومڑی' پڑھ پائیں گے۔

ہیں۔ کچھ بہت اچھا اور پہلے سے ہٹ کر کرنے کا عزم نظر آتا ہے۔ اللہ پاک آپ کو بہت ہمت عطا فرمائے، (آمین)۔ ''احوال'' کا آغاز آپ نے اتنے عمدہ الفاظ میں کیا کہ کمال ہی کر دیا۔ تین چار بار تو آغاز ہی پڑھا پھر احوال میں داخل ہوئی۔ خطوط بہت جاندار تھے۔ مسز نوید ہاشمی، فرزانہ گل، تنزیلہ عرف تانی، مور شاہد حسین اور بھیا ممتاز احمد صاحب کے علاوہ اقبال بانو صاحبہ کا خط شاندار تھا۔ احوال کے آخر میں بھیا آپ کی نظم نے تو اگلے پچھلے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ کبھی کبھار انسان کچھ ایسا لکھ ڈالتا ہے کہ اسے خود احساس نہیں ہوتا کہ وہ کیا شاہکار لکھ بیٹھا ہے پھر لوگوں سے سن کر اسے احساس ہوتا ہے۔ اللہ پاک آپ کے علم میں اور اضافہ فرمائے، (آمین)۔ تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ''روٹی [illegible] اور [illegible] کون تھی'' نے اپنا [illegible] خون خشک کیا [illegible] بے ہوش ہونے کی کسر رہ گئی تھی۔ [illegible] تحریر [illegible] مہ تھی [illegible] مثال لی کرتی ہیں۔ تحریر میں جان ڈال دیتی ہیں۔ حمیرا خان الفاظ کا [illegible] اتنی خوبصورتی سے کرتی ہیں کہ حیران کر دیتی ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ..... اس کے علاوہ بھیا ممتاز [illegible] شاہد [illegible] بھیا، سپاس گل، نازیہ بتول رضا، عاطر شاہین ان سب کی تحریریں لاجواب تھیں۔ سب نے بہت محنت کی اور پراسرار بنا دیا۔ آخر میں سب لکھنے والوں سے کہنا تھا کہ اپنے قلم کا یوں استعمال کریں کہ آپ کا ایک لفظ کسی بھٹکے ہوئے کے لیے مشعلِ راہ بن جائے اور جب دنیا سے جائیں تو یہ لکھا ہوا خود اپنی ذات کے لیے صدقۂ جاریہ بن جائے۔ سب کے لیے بہت سی دعائیں اپنا اور دوسروں کا بہت خیال رکھیے گا کہ ''محبت واقعی زندگی ہے۔'' اللہ کی مخلوق سے محبت کرنا بھی عبادت ہے۔

✽ اچھی سی گڑیا! تبصرہ شاندار.....! اور کیا لکھوں۔ میری بہن جتنا مجھ سے محبت کرتی ہیں میں خوش نصیب ہوں تم میری سگی نہ ہو کر بھی سگی بہنوں سے بڑھ کر محبت کرتی ہو۔ خدا تمہیں کامیاب کرے گڑیا۔ سلامت رہو۔

☆ فیصل آباد سے ذیشان ریاض لکھتے ہیں۔ کہیے کیسے مزاج ہیں۔ بہت بہت شکریہ ایوارڈ پروگرام کروانے کا۔ مورخہ 26 جنوری کو علی رضا کا فون آ رہا تھا بار بار کہ جانا ہے یا نہیں۔ موسم کی بے رخی بھی جاری تھی ہلکی ہلکی بوندا باندی میں فلائنگ کوچ اڈے میں اترا اور لاہور روانہ ہوا۔ شاہ کوٹ کے قریب علی رضا کا پھر فون آ گیا تو میں نے کہا لاہور ہوتی ہے ملاقات۔ دو گھنٹے بعد لاہور اسٹیشن پر کوچ نے اتار دیا؛ وہاں سے پیلاک کا ایڈریس پوچھا۔ اور پیلاک کے مین گیٹ میں اندر داخل ہوا تو کپڑے بارش سے بھیگ چکے تھے۔ مین گیٹ پر مجید احمد جائی سے ملاقات ہوئی بڑی گرمجوشی سے ملے۔ فیصل آباد میں پہلے ان سے ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ بھی پہچان گئے مجھے۔ لوگ آ رہے تھے اشفاق شاہین آئے۔ تعارف ہوا، ندیم عباس میواتی پتوکی سے، راشد لطیف، فیصل ندیم بھٹی، عبدالعزیز جی آ، قاسم خان بلوچ، منشی محمد عزیز مئے۔ ایک دوسرے سے تعارف ہونے لگا۔ بارش کے قطرے ایک دوسرے سے اٹکھیلیاں کرتے دکھائی دیے۔ تھوڑی دیر بعد دیگر مہمان گرامی آنے لگے۔ کاشی چوہان آئے گلے ملے اور ملتے ہی پہچان لیا۔ بڑی خوشی ہوئی ایک مدت سے آرزو تھی اللہ نے پوری کر دی۔ پروگرام کے بارے میں تفصیلی بات چیت ہوئی۔ علی رضا بھائی بھی پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ خالد فاروق آسی، انتظار حسین ساقی، محمد افضل آزاد، ایم مجاہد چاند، ریاض حسین شاہد بھی پہنچ گئے۔ اسی اثناء میں بارش مزید تیز ہو گئی تو فریدہ جاوید فری نظر آئیں۔ ان سے ان کی بیماری کا حال پوچھا بیماری نے ان کے

چہرے کو مزید مرجھا دیا ہے۔ اللہ ان کو مکمل شفا دے۔ اندر ہال میں تشریف لے گئے تو پروگرام کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ ہال میں خواتین و حضرات تشریف فرما تھے۔ ہال میں موجود خواتین لکھاریوں سے تعارف ہوا محترمہ نسیم سکینہ صدف ڈسکہ سے ملاقات ہوئی۔ مختلف رائٹرز نے اظہار خیال کے لیے اسٹیج کا سہارا لیا۔ طاہرہ جالب صاحبہ نے نظم پیش کی۔ منزہ سہام مرزا کی آمد کا انتظار تھا مگر وہ نہ آسکیں اور نگ زیب لغاری اور راشد محمود دونوں آرٹسٹوں نے اظہار خیال کیا۔ ایوارڈ کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ ساتھ ڈولی صاحبہ ماڈل بھی اپنے جلوے دکھاتی رہیں۔ ممتاز احمد سے بھی تعارف ہوا۔ مجید احمد جائی سے بھابی صائمہ کی خیریت دریافت کی۔ انہوں نے قفس میں رقص کتاب پیش کی۔ عبدالجبار رومی سے ملاقات ہوئی۔ رات کے دس بجے یہ محفل اختتام پذیر ہوئی اور ہم کاشی چوہان سے اجازت لے کر ہال سے باہر آئے اور رات دو بجے ہم واپس فیصل آباد آ گئے۔ یوں ایوارڈ پروگرام کا اختتام ہوا اور سب لکھاری اپنے اپنے گھروں میں واپس آ گئے۔ فروری کا محبت نمبر پڑھا۔ ناہید اختر کو خوش آمدید کہتے ہیں گلوکاری کے میدان میں کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ افتخار چوہدری کی کہانی ''تیرے لیے ہم ہیں بنے'' میں ہیرو دنیا پور جاتے ہیں ہیروئن سے ملنے۔ تو کیا کوئی ہر روز ملتان سے دنیا پور جا سکتا ہے۔ سات یا آٹھ گھنٹے کا روز کا فرلانگ سکتا ہے؟ بہر حال اچھی کہانی تھی۔ بہت خوب۔ ''زرد لومڑی'' ایم اے راحت بہت زبردست۔ ممتاز احمد کی ''استانی جی کا عشق'' لاجواب رہی۔ پہلی دفعہ کنڈیکٹر اور استانی کی عشق کی داستان پڑھی۔ ''برف کے شہر'' قمر علی عباسی بہت خوب۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ ''مسئلہ یہ ہے'' بابا جی کو اللہ لمبی زندگی دے۔ نیکی پھیلا رہے ہیں۔ لیجیے عظمیٰ شکور ''مجھے تم یاد آتے ہو'' بہت خوب۔ کاشی بھائی اجازت چاہتا ہوں زندگی رہی تو اگلے ماہ پھر شرکت کروں گا۔''

✍ پیارے ریاض! تبصرے اور تقریب میں آمد کا شکریہ مگر اب احوال آمد مستقل ہو۔

☆ ثمینہ طاہر بٹ لاہور سے لکھتی ہیں۔ اسلام علیکم کاشی بھائی! کیسے ہیں جناب۔ لیں جی، ایک بار پھر محفل میں لیٹ حاضر ہو رہی ہوں۔ معذرت قبول کریں کیونکہ ابھی تک میری طبیعت سنبھلی نہیں۔ بخار تو کچھ بہتر ہے مگر بلند فشارِ خون (ہائی بلڈ پریشر) تو میرا جانی دشمن بن گیا ہے۔ جان ہی نہیں چھوڑ رہا۔ خیر، یہ تو اب روز کا معمول ٹھہرا۔ آپ سنائیں، کراچی کا موسم کیسا ہے اور کراچی والوں کے مزاج تو بخیر ہیں ناں؟ اللہ کریم سے دعا ہے کہ میرے وطن کے سارے شہر، سارے گاؤں امن و امان کی حالت میں رہیں اور اللہ ہم سب پر اپنا فضل بنائے رکھے اور ہم سب کے حالات کے ساتھ ساتھ مزاج بھی اعتدال میں رہیں۔ آمین ثمہ آمین۔ چلیں جی، اب میں آتی ہوں۔ شمارے کی طرف اور اس کے لیے کاشی بھائی آپ سو فیصد مبارکباد کے مستحق ہیں۔ آپ کی کی گئی محنت اپنے منہ سے آپ بولتی ہے۔ جزاک اللہ خیر۔ منزہ جی کا ''میری طیبہ'' دل کے تاروں کو چھوتا ہوا اداریہ۔ میں منزہ جی کے ساتھ بالکل متفق ہوں، جب تک ہم اپنے اندر چھپے شیطان پر قابو نہیں پائیں گے، ہماری طیبائیں اسی طرح ظلم و بربریت کا شکار ہوتی رہیں گی۔ جزاک اللہ منزہ۔ احوال میں سب ساتھیوں نے خوب رونق لگائی۔ آپ سے ملاقات کرتے، سب کی اچھی اچھی باتوں اور کاشی بھائی کے جوابات پر سر دھنتے ہوئے آگے بڑھے اور اسماء اعوان کی نئی لائف بوائے کہانی کو دل سے سراہا۔ واہ اسماء جی، آپ تو واقعی لاجواب ہیں۔ ہر ماہ اتنی اچھی کہانی لے کر آتی ہیں کہ لائف بوائے پر اعتماد اور زیادہ پختہ ہو جاتا ہے۔ بہت خوب۔ اقبال بانو آپا کا ''حق'' زہرہ کی صادق سے عشق کی خوبصورت کہانی۔ بانو آپا آپ کی ہر تحریر ہی پہلے سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ ماشاءاللہ۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ ایم قاسم خان بلوچ کا ''عاشقوں کے امتحان'' اچھی کوشش۔ ویلڈن قاسم صاحب۔ مومنہ بتول کا ''جینی سے فاطمہ'' واقعی عشق مجازی سے عشقِ حقیقی کی طرف جاتی ایک لازوال تحریر۔ بہت خوب مومنہ۔ جزاک اللہ۔ وقاص حسین کا ''انا اور امید'' اچھی کاوش، ویلڈن! صائمہ عروج کا ''عشق سراب'' نادان لڑکیوں کو سبق سکھاتی ایک اچھی کوشش۔ ملک شبیر تابش کا ''تھوڑی محبت چاہیے'' اچھی تحریر ہے۔ افتخار چوہدری کا

دنیا

میں کس جگہ

سچی کہانیاں

کے چرچے نہیں

آپ سچی کہانیاں کے خریدار بن کر ملک کو

زرِ مبادلہ بھیجیے

اندرون ملک =/890 روپے

ہر ملک، ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

زرِ سالانہ

کویت	55 امریکی ڈالرز	ایران	55 امریکی ڈالرز
سعودی عرب	55 امریکی ڈالرز	سری لنکا	55 امریکی ڈالرز
یو اے ای	55 امریکی ڈالرز	جاپان	55 امریکی ڈالرز
مصر	55 امریکی ڈالرز	لیبیا	55 امریکی ڈالرز
یونان	55 امریکی ڈالرز	ڈنمارک	55 امریکی ڈالرز
فرانس	55 امریکی ڈالرز	جرمنی	55 امریکی ڈالرز
برطانیہ	55 امریکی ڈالرز	ہالینڈ	55 امریکی ڈالرز
ناروے	55 امریکی ڈالرز	پولینڈ	55 امریکی ڈالرز
امریکہ	65 امریکی ڈالرز	کینیڈا	65 امریکی ڈالرز
افریقہ	65 امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	65 امریکی ڈالرز

آج ہی رابطہ کیجیے

88-C II فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبر: 35893122 - 021-35893121

''تیرے لیے ہم ہیں بنے'' خوبصورت محبت کی خوبصورت کہانی۔ ویلڈن۔ حمیرا خان کا ''بس تیسری گلی میں'' ایک اچھی کاوش۔ ضرغام محمود کا ''محبت کا دی اینڈ'' پہلے بھی کہیں پڑھ چکی ہوں۔ ایم اے راحت صاحب کا ''زردلومڑی'' بہت خوبصورت قسط۔ جزاک اللہ سر۔ اللہ پاک آپ کو صحت تندرستی عطا فرمائے، آمین۔ احمد سجاد بابر کا ''سروں کی ملکہ'' ناہید اختر کے بارے میں ایک بہت ہی خوبصورت تحریر۔ جزاک اللہ خیر۔ سیدہ تبسم زہرہ کا ''قسمت کی دیوی'' ایک بہت ہی دلچسپ تحریر۔ جزاک اللہ خیر تبسم جی۔ رانا حبیب الرحمان کا ''قوسِ قزاح'' بہت اچھی تحریر۔ ماشاءاللہ۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ ممتاز احمد کا ''استانی جی کا عشق'' اچھی تحریر۔ قمر علی عباسی کا ''برف کے شہر'' اچھا اور مزے دار سا سفرنامہ پڑھ کے بہت اچھا لگا۔ جزاک اللہ۔ نازیہ بتول رضا کا ''بخت نامہربان'' دکھی دل کی دکھیاسی داستان۔ ویلڈن نازیہ۔ ارم ناز کا ''بیچاری شمو'' ہاہاہاہاہا واہ مزہ آ گیا۔ کیا سوشل قسم کی کہانی لکھی ارم نے۔ بہت خوب ارم۔ زبردست۔ عابدہ طارق کا ''بڑی باجی'' بہت حساس کہانی۔ عمران اظہر کا ''عشق کی معراج'' نسیم سحر کا ''گڑیا'' اظہر عباس کا ''تم میرے ہو'' سب ہی اپنی اپنی جگہ بہترین تھیں۔ خانقاہ، ہائیڈ پارک، تیرنیم کش، متفرقات، غرض کہ پورے کا پورا شمارہ ہی بے مثال رہا۔ جزاک اللہ خیر۔ لیں جی، تبصرہ تو ہو گیا پورا۔ میری کہانیوں کو پسند کرنے والے سب بہن بھائیوں کا تہہ دل سے شکریہ۔ کاشی بھائی۔ میں اپنی خرابی طبع کی وجہ سے اپنا ایوارڈ اور سرٹیفکیٹ لینے خود تو حاضر نہ ہو سکی مگر میں اس اعزاز کے لیے پرل پبلی کیشنز، منزہ جی آپ کی، معزز جیوری اور سب پڑھنے والوں کی بے حد شکر گزار ہوں کی آپ سب نے مجھے اس قابل سمجھا۔ بہت شکریہ جناب اور میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ بھی آپ کے لیے ایسی ہی اچھی اچھی کہانیاں لے کر آتی رہوں گی، انشاءاللہ۔ اگلے ایوارڈ شو کے لیے میں ابھی سے اپنی بکنگ کروا رہی ہوں۔ انشاءاللہ زندگی رہی تو ضرور شامل ہوں گی میں۔ اب اجازت دیں جی۔ خط ذرا لمبا ہی ہو گیا۔ کہیں کاشی بھائی کی قینچی ہی نہ چل جائے۔ اگلے ماہ انشاءاللہ پھر حاضری دوں گی۔ تب تک کے لیے فی امان اللہ۔

✽ پیاری بہن! ہم نے اس تبصرے کے ساتھ ہی آپ کی اگلی ایوارڈ تقریب کے لیے سیٹ کنفرم کر لی ہے، خوش!

☆ کوہاٹ سے ہمارے بہت عزیز ساتھی لکھاری ملازم حسین شیرازی کی احوال میں آمد ہے، لکھتے ہیں۔ فروری 2017ء کے شمارے کا سرورق نہایت خوب صورت دیدہ زیب اور جاذب نظر ہے۔ پیارے رنگوں سے سجا ہوا اداریہ دلوں کو جھنجھوڑنے والا ہے۔ احوال نامے کے شروع میں آپ کی شکایت بھری التجائیں۔ اپنوں کی طرف سے برتی جانے والی بے اعتنائیاں اور لاپروائیوں سے بہت دکھ ہوا۔ محبت کے مدعیان کی حوصلہ افزائیوں کا اہتمام۔ انہیں ذی حیثیت بنانے کی کاوشوں پر اگر تسلیم و رضا اور شکر گزاری کے جذبات مفقود ہوں تو یقیناً دکھ اور صدمے سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ آپ نے صحیح فرمایا۔ کاشی صاحب دل رنجیدہ نہ کریں۔ اپنا فرض ادا کرتے رہیں۔ اللہ پاک کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا۔ اپنی خدمات انجام دیتے رہیں۔ عبادت سے جنت ملتی ہے اور خدمت سے خدا ملتا ہے۔ جسے اللہ پاک مل جائے اسے دونوں جہانوں میں سرخروئی حاصل ہوتی ہے۔ عشق نمبر کی عشق گزیدہ کہانیاں لاجواب ہیں۔ ''استانی جی کا عشق'' از ممتاز احمد۔ عشق کسی دین دھرم، اونچ نیچ، ذات پات، رنگ نسل، امیری غریبی کو نہیں دیکھتا۔ بہترین کہانی تھی۔ ''حق'' اقبال بانو کی واقعی یادگار اور نہ بھولنے والی دلگداز کہانی تھی۔ ''پروموشن'' ثمینہ طاہر بٹ، محبت و ایثار کی بے مثال کہانی۔ ''قوس و قزح'' دلچسپ اور اثر انگیز سلسلہ۔ ''زردلومڑی'' دلچسپیوں اور ایڈونچر سے بھرپور سلسلہ۔ ''سروں کی ملکہ'' آج بھی ان کی سریلی آواز کانوں میں رس گھولتی ہے۔ ناہید اختر کے بارے میں جامع خوب صورت تحریر تھی۔ باقی کہانیاں نہایت عمدہ، شاندار ہیں۔ خط کی طوالت کے پیش نظر ان خوب صورت کہانیوں پر تبصرہ نہ کرنے کی معذرت۔ حنا بشریٰ، بیسٹ رائٹر کے اعزاز سے آپ کو نوازا گیا۔ بہت خوشی ہوئی۔ یہ آپ کی محنت، لگن کا انعام اور میرے دل سے نکلنے والی بے لوث دعاؤں کا ثمر ہے۔ بہت بہت مبارک۔ عابد علی بھٹی، فیصل ندیم

اٹھائیسواں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

وہ تقریب جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔

وہ تقریب جس میں ملک بھر سے قلم کاروں کا کارواں، اپنے محبت کرنے والوں کے روبرو ہوتا ہے۔

قلم کاروں کے قلم کا حق ادا کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش۔

بہت جلد.....

اٹھائیسویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب اپنے روایتی رنگ میں جلوہ گر ہوگی۔

"بس تھوڑا سا انتظار....."

بھٹی، نفیسہ فضل، اعجاز احمد یاد رکھنے کا شکریہ خطوط بہت خوب صورت تحریر کیے۔ مجید احمد جائی، صائمہ مجید، ممتاز احمد سلام عرض ہے۔ تازہ شمارے میں رفعت ناز، تنزیلہ تالی، سلمان بشیر، بشریٰ کنول، اشفاق شاہین، نزاہت افشال احوال نامے میں شریک نہیں ہیں۔ ہر ماہ اپنی خیریت اور احوال سے باخبر رکھا کریں، شکریہ باقی مسئلہ یہ ہے، تیر نیم کش، خانقاہ، ہائیڈ پارک، نہایت مناسب ہیں۔ کاشی چوہان کی نظم لاجواب ہے۔ ایوارڈ کی روداد کا انتظار ہے۔ شرکاء تقریب اور انعام یافتگان کو ایک بار پھر مبارک۔ بے جا خفا ہونے والوں، ایفائے عہد نہ نبھانے والوں کو آئندہ ایسی بے رخیاں نہ دہرانے کی درخواست ہے۔ آخر میں کاشی چوہان صاحب آپ کی محنت اور ہمت کے صلے میں سچی کہانیاں حقیقتاً روز بروز عروج کی منازل طے کر رہا ہے، بہت شکریہ۔

☆ پیارے بھائی! سلامت رہیے۔ آپ کے تبصرے کا بہت انتظار کیا مگر... وائے نصیب پرچہ پریس میں جا چکا تب موصول ہوا۔ لیجیے اب اس ماہ لگا دیا۔

☆ نسیم سحر کراچی سے لکھتی ہیں۔ ڈیئر کاشی بھائی السلام علیکم! سب سے پہلے آپ کو مبارک باد۔ آپ نے سچی کہانیاں کے لکھنے والے اور ساتھ پڑھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ایوارڈ کا اجراء کیا۔ یقیناً حوصلہ افزائی کسی بھی شعبے میں کام کرنے والوں کے لیے مہمیز کا باعث ہوا کرتی ہے۔ اب شمارے کی بات ہو جائے۔ آج میں جنوری اور فروری کے شماروں پر تبصرہ کروں گی۔ پہلے جنوری 2016ء نے ہم سے کئی نامور شخصیات کو دور کر دیا۔ جن میں ایک جنید جمشید بھی ہیں ان کا چہرہ جب جب بھی اسکرین یا کسی اخبار رسالے میں نظر آتا ہے ان کے بچھڑنے کا دکھ بڑھ جاتا ہے۔ احوال حسب معمول اچھا تھا۔ لائف بوائے کہانی بھی نارمل تھی۔ پہلی سچ بیانی ام مناہل کی ''جیون بن باس ٹھہرا'' اچھی لگی۔ پہلے کہا جاتا تھا کہ ماں کا رشتہ بے غرض ہوتا ہے مگر آج کل تو یہ رشتہ بھی خود غرضی اور مفاد پرستی کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ منشی عزیز کی ''بھٹے کے پتھرے'' علاقائی روایت پر مبنی تھی۔ ''اے وطن تیرے لیے'' بھی اچھی تھی۔ وطن کے لیے قربانی دینے والوں کی واقعی کوئی کمی نہیں۔ ''پاسپورٹ'' نے دکھی کیا کہ ہرے پاسپورٹ کے بجائے ہم نیلے لال پاسپورٹ سے متاثر ہوتے ہیں باہر ملکوں میں تو ہماری کوئی ویلیو نہیں، خود اپنے ملک میں بھی ہمیں نیلا لال پاسپورٹ عزت دلاتا ہے۔ فلاحی اداروں کے متعلق عموماً شک کا اظہار کیا جاتا ہے اب یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے کون درست ہے کون غلط اور جب واسطہ پڑتا ہے تو ہی سمجھ آتی ہے خالد نذیر کی کہانی اسی سوچ پر مبنی تھی۔ مجھے جو دوسرے نمبر پر کہانی پسند آئی وہ پرویز احمد کی ''باتنے شاہ کا جادو'' ہے جس میں انہوں نے نہایت خوب صورتی سے کئی پہلوؤں پر بات کی ہے لاڈ پیار میں بچوں کا بگڑنا اور انتہائی حد تک برائیوں میں پڑ جانا نام نہاد عامل اور ان کی گھٹیا حرکات، سسر بہو کے رشتے کا پامال کرنا، لالچ، حسد اور آخر میں توبہ کے راستے پر پلٹ آنا، ویل ڈن۔ شانو، بھوک، ٹھوکر، کشتیاں جلا ڈالیں سب نارمل کہانیاں تھیں۔ نمبر ون جو کہانی ہے وہ ہے ممتاز احمد کی ''بھرم'' ہے۔ رونگٹے کھڑے کر دینے والی حالانکہ موضوع نیا نہیں تھا مگر اس کا اختتام سپر تھا۔ اتنے بڑے گناہ کی سزا ایک معمولی بیماری سے دینا دل دہلا گیا۔ واقعی اللہ بے نیاز ہے اور اس کی حکمت لاجواب۔ شیطان نے میاں بیوی میں نفاق ڈالنے کو ناپسندیدہ کہا تھا کیونکہ یہ گناہ عظیم ہے اسی طرح گھر برباد کرنا وہ بھی عورت کی طرف سے گناہ کبیرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو خاص کر عورتوں کو ہدایت دے اور اس قسم کی حرکتوں سے محفوظ رکھے، (آمین)۔ اب فروری کی بات ہو جائے احوال، اداریہ، لائف بوائے سے ہوتے ہوئے اقبال بانو صاحبہ کی ''حق'' پر پہنچے۔ عورت کی وفاداری تو بہر حال مانی ہوئی چیز ہے۔ فی زمانہ بے شک کم ہو گئی ہے اسی حوالے سے ''استانی کا عشق'' بھی اچھی تھی جس میں عورت نے اپنے سے کم پڑھے شوہر کے ساتھ نا صرف نباہ کیا بلکہ مرنے کے بعد بھی وفادار رہی۔ ''جینی سے فاطمہ تک'' بھی اچھی تھی۔ بے شک محبت ہی اس کائنات کی بنیاد ہے اور ہوس سے پاک محبت یقیناً عشق حقیقی کا پہلا زینہ ہے۔ صائمہ عروج کی ''عشق سراب'' سبق

آموز تھی۔ ہماری ایوارڈ ونر مصنفہ ثمینہ طاہر بٹ کی ''پروموشن'' حساس موضوع پر تھی۔ کبھی کبھی مرد اپنی صلاحیتوں پر اعتبار کرنے کے بجائے بیوی کی خوب صورتی کو استعمال کرتے ہیں جو کہ گناہ کبیرہ ہے۔ وہ تو شہروز کی اچھی تربیت نے نہ صرف اسے گناہ عظیم سے بچایا بلکہ جنید اور خوشبو کو بھی برائی کے رستے پر جانے سے روکا۔ ''تھوڑی سی محبت چاہیے'' عام سی کہانی تھی اور اختتام میں اور عجیب لگا جب ٹی بی کی مریضہ جو دینٹی لیٹر سے اٹھی ہے اتنا رومینٹک جملہ ادا کر رہی ہے۔ ضرغام محمود کی ''محبت کا دی اینڈ'' بہتر تھی۔ ''قسمت کی دیوی'' میں بھی دو باتیں عجیب تھیں ایک تو حکیم صاحب کو پاگل خانے بھیج دیا گیا۔ وہ مرے نہیں مگر پھر بھی سعدیہ بیگم نے بیاہ کیسے رچا لیا۔ دوسرے حکیم صاحب کشتے اور معجون کھا کھا کے ستر سال کی عمر میں بھی شادی کر بیٹھے تو بیگم کنواری کیسے رہ گئیں یہ راز تو تبسم کو بتانا ہی چاہیے۔ ''بخت نامہربان میرا تھا'' اچھی تھی عورت کی عاقبت نااندیشی اور بلاوجہ انتقام کے جذبے سے خود بھی خوار ہوئی اور بچوں کو بھی دربدر کیا۔ کہانی کو پیش کرنے کا انداز بھی مختلف تھا۔ ''بے چاری شو'' اسرم کے انداز میں مزاح جھلکتا ہے جو اچھا لگتا ہے۔ آخر میں آپ کا شکریہ آپ میری کہانی لگائی اور میری ایک کہانی کو پسندیدگی کی سند سے نوازا۔ ایڈیٹر منزہ صاحبہ اور تمام اسٹاف کو بہت سلام اور آپ کو خصوصی سلام دعائیں اور مبارک جس گروپ کا کیپٹن اچھا ہو محنتی ہو وہ یقیناً کامیاب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت، ہمت اور طاقت عطا فرمائے اور ہمیشہ کامیاب رہیں۔''

✿ اچھی نسیم! محنت واقعی عظمت دیتی ہے۔ ہم سب کو اپنے حصے کا کام کرنا چاہیے۔ اتنے خوب صورت تبصرے کے لیے شکریہ۔

☆ راحیلہ منظر جھمرہ سٹی سے لکھتی ہیں۔ سلام! ماہنامہ سچی کہانیاں۔ میرا نام راحیلہ منظر ہے اور میں جھمرہ سٹی فیصل آباد کی رہنے والی ہوں آپ کا رسالہ بہت اچھا ہے۔ بہت اچھا مواد پڑھنے کو ملتا ہے آپ کے رسالے میں، میں ماہنامہ سچی کہانیاں رسالے میں لکھنا چاہتی ہوں۔ پلیز مجھے لکھنے کا موقع دیں۔ آپ کے رسالے کے رائٹر سرور شاذ صاحب کا کہنا ہے آپ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ میں بہت امید کے ساتھ کچھ تحریریں ارسال کر رہی ہوں۔ امید کرتی ہوں آپ میری امید نہیں توڑیں گے اور میری حوصلہ افزائی کریں گے۔ آپ کے جواب کی منتظر۔

✿ پیاری راحیلہ! خوش آمدید! تحریریں پڑھ کر جلد مطلع کریں گے۔

☆ عابدہ طارق لالہ موسیٰ سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم اور تمام ساتھیوں کو نیا سال مبارک ہو۔ ارے بھیا میں تو حیران رہ گئی اتنی بڑی تقریب اور وہ بھی بھیگے موسم میں۔ کیا کہنے بھئی کیا کہنے، ویلڈن۔ ذہن میں ایک سوچ بہت پریشان کر رہی تھی کہ کاشی بھیا کراچی سے آ کر اس تقریب کو شرف بخشیں گے۔ ڈھیروں دعائیں ساتھ تھیں اور جب موسم کی ادا دیکھی تو بھلی تو بہت لگی مگر تقریب کے انتظامات کرنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں تھا اور جو ستاروں پر کمند ڈالنے کی ٹھان لیتے ہیں وہ رستے کی تمام رکاوٹیں ہٹا کر آگے بڑھ جاتے ہیں اور پھر قسمت ان کا ساتھ دیتی ہے۔ یہی سچی کہانیاں کی تقریب کا سماں تھا اتنی شدید بارش کے باوجود تمام مہمان خوش دلی وقت کی پابندی کے ساتھ شریک ہوئے اور جس نظم و ضبط کا خیال رکھا گیا ان لمحات کو قلم بند کرنا بہت مشکل ہے۔ یہی دعا ہے کہ سچی کہانیوں کی تقریبات چلتی رہیں، کامیابیوں اور کامرانیوں کے ساتھ اور میری طرف سے ان تمام رائٹرز کو بہت بہت مبارک باد جو ایوارڈ کے مستحق ٹھہرے اور کاشی بھیا! کی ان تمام کوششوں اور کاوشوں کو سلام جو کراچی سے آ کر پنجاب کے شہر لاہور میں ترتیب دیں۔ میں سچی کہانیاں کا حصہ بنی اس کا سہرا بھی کاشی بھیا کو جاتا ہے جنہوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی اور جس خلوص سے تقریب میں شرکت کی دعوت دی بلکہ ایسا لگا جیسے میں کاشی بھیا سے پہلی بار نہیں پہلے بھی مل چکی ہوں۔ بہت اپنائیت بھرا لہجہ میں بھول نہیں سکتی۔ سلامت رہیں کاشی بھیا۔ لیکن کچھ مجبوریوں کے تحت اس خوب صورت شام بھیگی رت اور حسین تقریب کا حصہ نہ بن سکی۔ خیر۔ بشرط زندگی اگلے سال ضرور یہ بندی حاضری دے گی اور کاشی بھیا! فروری میں میری کہانی (بڑی باجی) کو سچی کہانیاں کی زینت بنا کر پیش کرنے کا تہہ دل سے

شکریہ۔ امید ہے پڑھنے والے خلوص دل سے مجھے ویلکم کہیں گے کہانی میں کوئی جھول کوئی غلطی ہو تو پلیز ضرور بتائیے گا۔ انتظار رہے گا۔ ایک بار پھر تمام رائٹرز اور اسپیشل کاشی بھائی کو ڈھیروں دعائیں اور مبارک باد۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا کوئی غلطی کوتاہی ہوگئی ہو تو معذرت۔ رسالہ ابھی پڑھنے کے مرحلے سے گزر رہا ہے۔ ممتاز احمد صاحب کی کہانی ''استانی جی کا عشق'' کمال کی اسٹوری تھی۔ ''بے ہماری شمو'' بھی بہت خوب صورت تحریر لگی۔ اس کے علاوہ قسمت کی دیوی، گڑیا، تم میرے ہو، پروموشن، حق اس کے علاوہ بھی سب کی سب رائٹرز مبارک باد کے مستحق ہیں۔ جنوری 2017ء کا شمارہ مجھے نہ مل سکا جس کے بارے میں کوئی بھی رائے دینے سے قاصر ہوں۔

☆ عابدہ بی! آپ کی احوال میں آمد نے محظوظ کیا۔ بس اسی طرح شاملِ احوال رہیں۔

☆ فیصل ندیم بھٹی سرگودھا سے لکھتے ہیں۔ محترم کاشی بھیا سب سے پہلے آپ کو پہلا سچی کہانیاں رائٹر ایوارڈ کی تقریب منعقد کرنے پر آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ آپ کراچی سے چل کر لاہور میں آئے، ایوارڈ تقریب کے لیے۔ یہ سارا سہرا کاشی بھیا کے سر پر ہے اور پھر رائٹر حضرات پورے پاکستان سے لاہور میں تقریب کو یادگار بنانے کے لیے پہنچے۔ کاشی بھیا آپ سے مل کر بہت خوشی۔ خدا نے آپ کو بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ آپ استاد ہیں، شاعر ہیں، ادیب ہیں اور ایکٹر بھی ہیں۔ سب سے بڑی خوبی جو میں نے دیکھی کہ آپ ملنسار ہیں محبت کرنے والے انسان ہیں آپ کی محبت اور خلوص کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ تقریب ایوارڈ میں کافی رائٹر خواتین و حضرات سے ملاقات ہوئی بہت اچھا لگا۔ اپنے شہر کو چھوڑ کر لاہور میں تقریب ایوارڈ کروانا بہت مشکل مرحلہ تھا لیکن آپ کی انتھک محنت نے اسے پایہ تکمیل تک پہنچا کر یہ ثابت کیا کہ انسان اگر کسی بھی کام کی نیت کرے تو کامیاب ضرور ہوتا ہے۔ تمام ایوارڈ حاصل کرنے والے خواتین و حضرات کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ ابھی تک تقریب ایوارڈ کے نقش و نگار ذہن میں محفوظ ہیں۔ اب آتے ہیں فروری کے عشق نمبر کی طرف۔ ٹائیٹل میں لڑکی منفرد انداز کے ساتھ نمایاں لگی۔ اشتہارات کو پلٹتے دیکھتے اور پڑھتے ہوئے آخر کار منزہ سہام مرزا کے اداریے پر جا پہنچا۔ اداریے میں معصوم پری طیبہ کی روداد پڑھ کر آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوگئیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کی بیٹی کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ کسی بھی بیٹی کو مجبوری میں مشقت کے لیے کسی ظالم کے گھر نہ جانا پڑے۔ ہماری حکومت کے لیے بھی لمحہ فکریہ ہے۔ ''احوال'' میں کاشی بھیا کی باتیں حقیقت کو آشکار کرتی ہوئیں محسوس کی واقعی دعوے کرنا تو آسان ہے لیکن پورا کرنا بہت مشکل کام ہے۔ احوال میں سب سے پہلے بشیر احمد بھٹی کرسی صدارت پر براجمان تھے۔ سابق ایڈیٹر سلیم فاروقی کو اللہ تعالیٰ اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے لواحقین کو صبر عطا فرمائے، آمین۔ نئے آنے والے احوالیوں کو خوش آمدید جن میں حافظ عابد علی بھٹی، احمد بلال، نینا خان، اعجاز احمد آزاد کشمیر سے خواجہ حسین، حنا بشریٰ، سیما غزل نیہاں کے خطوط زبردست ٹھہرے۔ حنا بشریٰ صاحبہ خط کی پسندیدگی کا شکریہ۔ ممتاز صاحب، مجید جائی، تنزیلہ عرف تائی کو سلام۔ لائف بوائے شیمپو کسی مسیحا سے کم نہیں۔ ''عشق کے امتحان'' احسان کا محبت میں قربانی دینا کمال ہے۔ عشق میں تو امتحان ہوتے ہیں یہ تو جان بھی لے لیتا ہے۔ ''جینی سے فاطمہ تک'' عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کا سفر نا قابل یقین داستان عشق ہے۔ ''انا اور امید'' واصف اپنی انا پر ڈٹا رہا انا اور امید کو ختم کر کے محبت کو پایا جا سکتا ہے۔ ''عشق سراب'' تمنا کا اظہر کے عشق میں ڈوبتا پھرا، اظہر کا نہ ملنا ہی بہتر ثابت ہوا۔ قسمت میں اگر اچھا لکھا ہو تو کچھ بھی برا نہیں ہوتا۔ ''پروموشن'' پروموشن کی خاطر لوگ اس حد تک جا سکتے ہیں کہ اپنے گھر کی عزت کو داؤ پر لگا دیتے ہیں پتا نہیں کیوں۔ ''بس تھوڑی سی محبت چاہیے'' شاذو کی محبت آخر کار اس کو مل گئی۔ کہانی میں ذات پات کے فرق کو ختم کرتے دکھایا گیا ہے جو کہ اچھی سوچ ہے کیونکہ تمام مسلمان برابر ہیں۔ ''تیرے لیے ہم بنے'' صبر کا پھل میٹھا ہی ہوتا ہے جو کہ ملا۔ ''بس تیری کمی میں'' محبت ہو تو ایسی، عروب کی محبت میں وفا تھی۔ ''محبت کا دی اینڈ'' کوئی بھی لڑکی اپنے ہونے والے شوہر کو بری عادتوں میں نہیں قبول کر سکتی۔ ''سروں کی ملکہ'' ناہید اختر کے زندگی اور فن کے بارے میں تفصیل سے پڑھا۔ بلاشبہ

سینئر صحافی شاعر اور ملکوں ملکوں گھومے تجزیہ کار

محمود شام کی زیر ادارت

ماہنامہ

انتہاؤں میں رابطہ

اطراف

کراچی

جولائی 2014ء سے باقاعدگی سے شائع ہونے والا

بین الاقوامی معیار کا پہلا قومی میگزین

☆ ہمارا عزم یونیورسٹیوں، دینی مدارس، تحقیقی اداروں، تربیت گاہوں سے پھوٹنے والی روشنی عوام تک پہنچانا

☆ دُنیا بھر میں پاکستان اور عالم اسلام پر شائع ہونے والی تازہ ترین کتابوں کی تلخیص

☆ پاکستان کے سیاستدانوں، تعلیمی اداروں، سرکاری محکموں کے بارے میں عالمی تحقیقاتی اداروں کی بے لاگ رپورٹیں، آسان اُردو میں

☆ ملک میں سرگرم ایک لاکھ سے زیادہ این جی اوز کی سرگرمیوں سے سجا عوام نامہ

☆ مصوری ☆ سفارت کاری ☆ کتابیں ☆ کامیاب زندگی ☆ فن تعمیر ☆ تندرستی

☆ پاکستان کے اضلاع ☆ موسیقی ☆ ہم اور ہمارے بچے ☆ طنز و مزاح ☆ اُردو ادب سے انتخاب

لائبریریوں، یونیورسٹیوں، دینی مدارس کو خصوصی رعایت

☆ نیوز ایجنٹس کو معقول کمیشن

جو کچھ آپ کے اطراف میں ہے..... ماہ نامہ 'اطراف' میں ہے

نمونے کی مفت کاپی کے لیے خط لکھیے

سُویٹ نمبر 508، لینڈ مارک پلازا، آئی آئی چندریگر روڈ۔ کراچی

Ph: 0092 21 32274661
Mob:0300-8210636

Email: mahmoodshaam@gmail.com Web Site: www.atraafmagazine.com

مئی 2017ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کررہا/کررہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام: _____

مکمل پتا: _____

_____

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

مئی 2017ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی: _____ تعداد صفحات: _____

نام: _____

مکمل پتا: _____

_____

فون/سیل نمبر: _____

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

مئی 2017ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان: _____ مصنف: _____

دوم، عنوان: _____ مصنف: _____

سوم، عنوان: _____ مصنف: _____

نام: _____ شہر: _____

ناہید اختر پاکستان کی بہترین گلوکارہ ہیں۔ ممتاز احمد کی کہانی ''استانی جی کا عشق'' عشق سے بھرپور بہترین کہانی ہے۔ آخر میں تمام قارئین اور اسٹاف کو سلام۔

☆ پیارے فیصل! تبصرہ لیٹ ملا اس لیے اس ماہ شائع کیا جا رہا ہے۔ ہمیشہ کی طرح تبصرہ زبردست رہا تمہارا۔

☆ اسلام آباد سے ہماری پیاری لکھاری رئیسہ خالد رقم طراز ہیں۔ ''صبح سے بادلوں کے تیور خوفناک تھے۔ بدمست ہاتھیوں کی طرح جھومتے اور چنگھاڑتے چلے آ رہے تھے۔ مسلسل کئی دنوں سے بارش ہو رہی تھی اور اس دن تو ہر طرف پانی ہی پانی نظر آ رہا تھا۔ میں عسکری 10 میں بڑی ہوئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے میں اس تقریب میں شرکت کر سکوں گی۔ ہمارے لیے شہر بھی نیا تھا، راستے بھی نئے تھے۔ پھر بھی بارش میں ہی ہم لوگ تقریب میں پہنچنے کے لیے نکل پڑے۔ ڈرائیور کو بھی راستے کا کچھ خاص پتا نہ تھا۔ کافی دیر بھٹکنے کے بعد وہاں پہنچے تو آدھی سے زیادہ تقریب انجام پا چکی تھی۔ بہرحال جتنا دیکھ سکی وہ بہت اچھا اور خوشگوار لگا۔ انتظام بہت اچھا تھا۔ لوگ اپنے ایوارڈ لے کر اپنی جگہ لے لیتے۔ موسیقی کا بھی پروگرام تھا۔ میری نگاہیں بار بار منزہ سہام مرزا کو ڈھونڈ رہی تھیں لیکن پتا چلا کہ وہ نہیں آئی ہیں۔ یہ سچی کہانیاں کی پہلی تقریب تھی۔ امید ہے کہ آئندہ بھی اس طرح کی تقریبات ہوتی رہیں گی۔ اب آتی ہوں ماہ فروری کی کہانیوں کی طرف۔ سب کہانیاں بہت خوب صورت تھیں اور دلچسپ بھی لیکن اقبال بانو کی ''حق'' مومنہ بتول ''جینی سے فاطمہ تک'' قمر علی عباسی ''برف کے شہر'' بڑی باجی، سروں کی ملکہ بہت پسند آئی۔ جنوری میں جن لوگوں نے میری کہانی کو پسند کیا۔ ان کا بہت بہت شکریہ۔ میری طرف سے ان سب لوگوں کو مبارک باد جنہوں نے ایوارڈ حاصل کیے۔ میری دعا ہے کہ سچی کہانیاں کا سفر کاشی چوہان کی سربراہی میں اسی طرح پھلتا پھولتا رہے، آمین۔

☆ اچھی آنٹی! آپ کی آمد نے ہمارے حوصلوں کو مہمیز کیا۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

☆ نعمان احمد آرائیں کی کوٹری سے آمد ہے، لکھتے ہیں۔ ''اکتوبر میں تبصرہ اپنی پریشانیوں کی وجہ سے نہیں کر سکا اور 29 اکتوبر کو ایک جھوٹے الزام میں مجھ کو گھر سے گرفتار کر لیا گیا اور تین دن میں لاک اپ میں رہا اور تیسرے دن

سچی کہانیاں کا ''مختصر کہانی نمبر''

عام شماروں سے قطعی مختلف و منفرد ایک معرکۃ الآرا شمارہ

''مختصر کہانی نمبر''

ہم وہاں تک رسائی رکھتے ہیں

جہاں عام سوچ کی پہنچ نہیں

آپ کے پسندیدہ لکھاریوں کی اعلیٰ پائے کی کہانیوں سے سجا.....

''مختصر کہانی نمبر''

قارئین اور ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔ سچی کہانیاں کا ماہِ مئی کا شمارہ مختصر کہانی نمبر ہوگا۔

کورٹ میں جج نے حکم دیا اور نارا جیل حیدر آباد بھیج دیا جہاں میں پانچ دن رہا اور اس کے بعد ضمانت پر رہا ہوا اور اس کے بعد سے اب تک کورٹ میں حاضریاں لگ رہی ہیں اور جو بندہ مجھ پر فریادی ہے اور ہم نے بھی اس کے خلاف ایس ایس پی ضلع جام شور و تحصیل کوٹری کو ایک درخواست دی اور ایک پٹیشن کورٹ میں دی جس میں ہمیں پولیس پروٹیکشن مل گئی ہے جس کی وجہ سے فریادی ہم سے جان چھڑانا چاہتا ہے کیونکہ اس نے مجھ پر کسی کے کہنے پر کیس کیا تھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک سرکاری ملازم ہوں اور میرے دونوں چھوٹے بھائی آرمی میں ہیں اور وہ لوگ ہماری نوکریاں ختم کروانا چاہتے ہیں، رہم نے ان سے کہا ہے کہ آپ اپنی ساری طاقت لگا دیں اللہ کے حکم سے آپ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ تمام واقعات ہیں جن کی وجہ سے نومبر، دسمبر اور جنوری کے رسالوں پر تبصرہ نہیں کر سکا اور جنوری کے احوال میں سمندری سے میرے تبصرے پر پسندیدگی کا اظہار کیا گیا، مجھے بہت اچھا لگا کیونکہ اپنوں کے شہر سے کسی نے یاد کیا۔ تمام احوالیوں، کہانیاں اور ناول لکھنے والوں میں کاشی چوہان، ایم اے راحت، مسئلہ یہ ہے، ہائیڈ پارک، مراسلے، انتخاب اور تیر نیم کش میں شعر لکھنے والوں کو سلام عرض ہے۔ سچی کہانیاں میں شامل تمام لوگوں کے لیے سلامتی، خوش حالی، تندرستی کی دعا اور جن کے عزیز و اقارب اس دنیائے فانی سے پردہ کر چکے ہیں ان سب کے لیے دعائے مغفرت اور میرے لیے دعا کریں تاکہ میرے سب مسائل ختم ہو جائیں اور مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

پیارے بھیا نعمان! خدا تمہیں تمام پریشانیوں سے نجات دلائے۔ تمہارا تبصرہ احوال میں شامل ہے۔ اگلے ماہ تمہاری آمد کا انتظار رہے گا۔

ساتھیو! اس خط کے ساتھ ہی اس ماہ تک ہماری آپ کی ملاقات اختتام کو پہنچی۔ ایوارڈ نمبر کیسا لگا؟ آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔ اگلے ماہ انشاء اللہ انہی صفحات پر ملاقات ہوگی۔ اجازت سے پہلے تازہ ترین نظم آپ کی بصارتوں کی نذر۔

اے وقت کے بادشہ گرو!

عشق اور مشک چھپائے کب چھپتے ہیں
Border ہٹا کر دیکھ لو
وقت کے بادشہ گرو!!
دونوں طرف اہلِ دل
دیوانہ وار پروانوں کی صورت ملیں گے
کہتے ہیں درد کا رشتہ ہے یار سے
اپنے پیر کے نیچے سے
تھوڑی مٹی اٹھا کر سونگھ لو
گنگا، جمنا، راوی، چناب
اِک جیسا ہی مزہ دیں گے جناب
نظم کی محفل سجا کر دیکھ لو
مے کشی لہور، امرتسر کی سی ہی ملے گی
اہلِ دل کے نزدیک آ کر دیکھ لو
قتیل شفائی، گلزار

اِک سیا سر ور دیں گے
امجد، اختر اِک سے ہی دکھیں گے
عطاء اللہ، پنج، درد نیا دیں گے
لتا، نور جہاں، من بستی میں
گھنٹیاں سی بجا دیں گی
اے وقت کے بادشہ گرو!
محبتوں کی رگوں سے
R.B ٹیسٹ کرنا بند کر دو
عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے
اپنے لفظوں کے ہتھیار کند کر دو
محبتوں کے تاج محل آباد کر دو

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

اظہارِ تشکر

پرل پبلی کیشنز، پہلے سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کے کامیاب انعقاد پر.....

اپنے لکھاریوں، قارئین اور ادب پروروں کا تہہ دل سے شکر گزار ہے۔

اس کے ساتھ ہی ہم زندہ دلانِ لاہور کی محبتوں کے دل سے ممنون ہیں۔

بالخصوص ہم مشکور ہیں، پرنٹ کاسٹ میڈیا، فنکار آن لائن، لاہور ٹی وی، صحافی برادری اور قابلِ عزت مہمانانِ گرامی کے.....

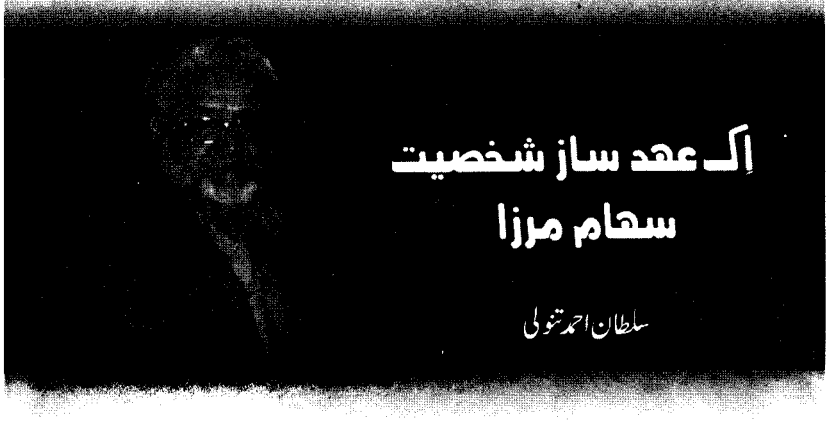

اِک عہد ساز شخصیت
سہام مرزا

سلطان احمد تنولی

یہ ہمارا قومی المیہ ہے کہ ہم نے اپنے محسنوں کو یکسر فراموش کر دیا ہے۔ ان کی خدمات وقربانیوں سے کوئی رہنمائی حاصل نہیں کی اور نہ ہی آگے بڑھنے کا سبق حاصل کیا۔ یہ بھی ایک اور اہم بات ہے کہ جب دنیا سے رخصت ہو گئے جو چھوٹے تھے وہ نمبر دو تھے۔ وہ بڑے تو بن گئے لیکن بڑے نہ بن سکے اور یہی وجہ ہے کہ آج بھری دنیا میں بھٹک رہے ہیں۔ کوئی قائد، کوئی لیڈر ہے، کوئی راہ دکھانے والا نہیں۔

کبھی کوئی کہتا ہے میں تمہارا قائد ہوں، کبھی کوئی کہتا ہے میں تمہارا لیڈر ہوں، کوئی راستہ دکھانے کا دعویٰ کرتا ہے اور کوئی آمر بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ ان محسنوں، رہنماؤں میں ایک نام عظیم صحافی، دانشور، صاحب طرز ادیب سہام مرزا کا ہے۔ سہام مرزا ایک عہد ساز شخصیت اور تاریخ کا دھارا بدلنے والے فرد تھے۔

ان کی آواز میں گرج اور لفظوں میں گونج تھی۔ سہام مرزا صرف نے صحافت ہی میں نہیں بلکہ سیاست، صحافت، اردو ادب میں بھی نئی راہیں نکالیں اور انہیں جوش، جذبہ اور والہانہ پن عطا کیا۔ وہ جس عہد میں زندہ تھے اس وقت صحافت بہت معتبر اور جان جوکھوں میں ڈالنے کا پیشہ تھا۔

سہام مرزا کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو تحریروں کے دائرے میں محدود کرنا مشکل کام ہے۔ ادارہ جنگ سے وہ کافی عرصہ منسلک رہے اور روزنامہ کے طور پر سویرا اور انجام بھی نکالے جو سچ لکھنے کی پاداش میں ایک مطلق العنان اور آمر کی نذر ہو گئے۔ سہام مرزا ایک نابغہ روزگار استعداد کے مالک تھے۔ تعلیم وتعلم کا حصول انہیں گھر ہی سے میسر آ گیا تھا۔ وہ اپنے بزرگوں کے علمی، ادبی، صحافتی اور تعلیمی ورثے کے اہم جانشین تھے۔ انہوں نے صحافتی وقار میں اضافہ کیا اور اس شعبے کو عزت و عروج، راست بازی، حقیقت پسندی اور اظہار بیان کی بے باکی سے آراستہ کیا۔

صحافت برائے صحافت کے بجائے صحافت برائے حصولِ مقاصد کے موجود تھے۔ وہ حقوق نسواں کے بہت بڑے حامی اور داعی تھے۔ خواتین کی علمی اور معاشرتی تربیت اور قوم کی علمی آبیاری کے لیے انہوں نے ماہنامہ دوشیزہ اور سچی کہانیاں کے نام پر دو پرچے بھی نکالے۔

ان کی وفات کے بعد یہ پرچے اب بھی باقاعدگی سے قوم کی علمی تشنگی اور ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان پرچوں کی ادارت محترمہ منزہ سہام مرزا کر رہی ہیں۔ یہ دونوں ماہنامے اردو صحافت کو ترقی کا سفر اور ملت وقوم کی رہنمائی حقوق سے آگہی میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ سلطان نیوز ایجنسی اس ادارے کے ساتھ کافی عرصے سے منسلک ہے اور اس پر فخر کرتا ہے۔

☆☆☆

سپاس نامہ

کاشی چوہان

مدیر اعلیٰ منزہ سہام صاحبہ ناسازیٔ طبع کے باعث تقریب میں شریک نہ ہوسکیں۔ ان کی جانب سے سپاس نامہ مدیر کاشی چوہان نے پیش کیا۔

گرامی قدر جناب صدر! مہمان خصوصی، مندوبین سچی کہانیاں اور معزز حاضرین السلام علیکم!

سب سے پہلے میں تمام شرکائے محفل بالخصوص جناب صدر، مہمان خصوصی کا تہہ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے وقت نکال کر سچی کہانیاں کی اس شام کو رونق بخشی اور اپنی ادب دوستی اور ادب پروری سے نا صرف ہماری بلکہ ان تمام قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کی جو اس تقریب میں موجود ہیں۔

میں قلم قبیلے کے ان ساتھیوں کا بھی انتہائی خلوص دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جو دور دراز علاقوں سے اس تقریب میں شرکت کے لیے بطور خاص آج ہمارے ساتھ موجود ہیں۔ اپنے ہوم ٹاؤن سے اٹھ کر دوسرے شہر جانا بہت بڑا رسک ہوا کرتا ہے مگر میں تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں ان تمام محبت کرنے والوں کا بالخصوص ٹرانس کاسٹ میڈیا کے زوہیب بھٹی صاحب کا جو واقعی خوابوں کو تعبیر دینے کا ہنر جانتے ہیں۔

تقریب کے لیے میرے ایڈیٹر کاشی چوہان نے انتھک محنت کی اور آج ہم سب آپ کے روبرو ہیں۔

جس سفر کا آغاز میرے والد نے کیا تھا۔ میں بھی اسی راہ پر گامزن ہوں۔ دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ ایک روایت بن چکے ہیں ہم کراچی میں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی 27 تقریبات پرل کانٹی نینٹل ہوٹل میں منعقد کر چکے ہیں۔ چراغ سے چراغ جلانے کی روایت کو میں تسلسل کے ساتھ رکھنے کے لیے پہلے سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کا آغاز ایک نئی سوچ اور نئے عزم کے ساتھ کراچی سے نکل کر لاہور میں کر رہے ہیں اگر آپ سب محبت کرنے والوں کا ساتھ رہا تو ہم انشاء اللہ دوشیزہ رائٹرز کی تقریب بھی یہیں کریں گے اور مجھے امید ہے کہ اب یہ سلسلہ یوں ہی جاری و ساری رہے گا۔

معزز سامعین میں اب آپ کا مزید وقت نہیں لوں گی آپ سب یہ جاننے کے لیے بے چین ہوں کہ سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کن کن خوش نصیبوں کو حاصل کیے۔

ایک بار پھر آپ سب کی یہاں آمد کا بہت بہت شکریہ اور باوجود خواہش اور کوشش کے اچانک ناسازی طبیعت کے میں آپ کے روبرو حاضر نہ ہوسکی۔

منزہ سہام مرزا کے لیے۔

وہ جو کہنا آساں ہے
وہ جو کرنا مشکل ہے
جو کہا کیا تم نے
رکھ کے پاؤں سورج پہ
چاند چھو لیا تم نے

☆☆☆

مورخہ 26 جنوری 2017ء کا دن جب قوس وقزح کے بکھرے رنگوں کے جھرمٹ میں پہلے سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی تقریب منعقد ہوئی۔ پہلے تو یہ تقریب فلیٹیز ہوٹل میں ہونا تھی مگر آخری دن چند انتہائی ناگزیر حالات کی بنا پر تقریب پنجابی کمپلیکس لاہور ہال میں منعقد ہوئی۔ تقریب کے روح رواں جناب کاشی چوہان صاحب تو بائیس جنوری کو لاہور پہنچ گئے تھے جب کہ میڈم منزہ سہام صاحبہ نے 26 جنوری کو لاہور پہنچنا تھا مگر عین وقت پر وہ طبیعت کی خرابی کی بناء پر نہ پہنچ سکیں۔ یہ تقریب اپنے وقت کے مطابق مقررہ تاریخ کو منعقد ہوئی۔ تقریب کے انعقاد کے سلسلے میں خصوصی تعاون ٹرانس کاسٹ میڈیا، فن کار آن لائن، لاہور ٹی وی اور صحافی برادری کا شامل حال رہا۔ مورخہ 26 جنوری کی شام جب موسم بھی سرد تھا اور بارش بھی ہو رہی تھی مگر ہال کی تمام کرسیاں فُل ہو چکی تھیں۔ سب مہمان آ چکے تھے۔ ہال کی سب سے آگے والی نشستیں اپنے قابل قدر ان مہمانوں کے لیے وقف کر دی گئی تھیں جنہوں نے ایوارڈ حاصل کرنے والے رائٹرز کو ایوارڈ دینے تھے۔ پروگرام کی میزبانی معروف ٹی وی میزبان دانیہ انور اور عباس رائے نے کی جب کہ ریڈ کارپٹ پر آنے والے معزز مہمانوں کے انٹرویز ٹی وی میزبان نیلم اعجاز نے کیے۔ تقریب کا باقاعدہ آغاز تلاوت کلام پاک سے کیا گیا اور بعد میں انگلش میں ترجمہ بھی کیا گیا۔ اسی طرح نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم بھی پیش کی گئی۔ سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی تقریب میں دانیہ انور اور عباس رائے نے حاضرین محفل کو بتایا کہ آج کے اس دور میں جب جدید ایجادات نے ایک مقام حاصل کر لیا ہے تو وہیں پر سچی کہانیاں جیسا ڈائجسٹ ادب دوستی اور کتاب پڑھنے کی طرف ایک مستحسن قدم ہے۔ سچی کہانیاں بلاشبہ ایک ایسا مجلّہ ہے جس میں قارئین کرام کو کہانیاں، سفر نامے، مشہور ناول کے علاوہ اور بہت کچھ پڑھنے کو مل جاتا ہے۔ پرل پبلی کیشنز کراچی کے زیر اہتمام نکلنے والے دو عدد مجلّے ماہنامہ دوشیزہ اور ماہنامہ سچی کہانیاں ہیں۔ ماہنامہ دوشیزہ کے لیے ادارہ اپنی ستائیس تقاریب کراچی کے پرل کانٹی نینٹل ہوٹل میں منعقد کروا چکا ہے جب کہ پہلے سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی یہ تقریب آج منعقد کی جا رہی ہے۔ اس تقریب کا مقصد ملک بھر سے آئے ہوئے ان تمام رائٹرز کی حوصلہ افزائی، عزت اور قدر افزائی کرتا ہے جن کی خوب صورت تحریروں سے مجلّہ کو سجایا جاتا ہے۔ اس کے بعد ٹرانس کاسٹ میڈیا کے سی ای او جناب زوہیب بھٹی صاحب کو اسٹیج پر بلایا گیا جنہوں نے حاضرین محفل کو بتایا کہ 1970ء میں سہام مرزا نے دنیائے ادب میں پرل پبلی کیشنز کے نام سے ایک ستارہ ٹانکا۔ اس کے بعد تقریب کے ''دولہے'' جناب کاشی چوہان کو اسٹیج پر بلایا گیا تو کاشی چوہان نے اسٹیج پر آ کر سپاس نامہ پیش کیا۔ تقریب میں مندرجہ ذیل مہمانان گرامی نے شرکت کی۔

ڈاکٹر مرتضیٰ مغل (کالم نگار، دانشور، نظریہ پاکستان ٹرسٹ کے رہنما)، پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ تبسم (پوتی صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، شاعرہ، افسانہ نگار، ماہر تعلیم)، عمران مسعود (سابق وزیر تعلیم پنجاب، وائس چانسلر یونیورسٹی آف ساؤتھ ایشیا)، محترمہ آمنہ الفت (سابق ممبر صوبائی اسمبلی، کالم نگار، شاعرہ، معروف فلم رائٹر ناصر ادیب کی اہلیہ)، ڈاکٹر محمد راشد ملک (ضلعی رہنما پاکستان پیپلز پارٹی و سماجی کارکن)، افتخار افی (معروف ڈرامہ رائٹر)، ڈولی (معروف ٹی وی میزبان)، ارشمہ مریم (معروف گلوکارہ)، ڈاکٹر صغریٰ صدف (شاعرہ، ڈائریکٹر پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لینگویج

وقاص حسین، بلال فیاض، کاشی چوہان، ممتاز احمد تقریب کے دوران خوشگوار موڈ میں

آرٹس اینڈ کلچر)، محترمہ دلشاد نسیم (معروف ڈرامہ رائٹر)، اورنگ زیب لغاری (معروف ٹی وی ایکٹر)، راشد محمود (معروف ٹی وی ڈرامہ ایکٹر)، اسد بیگ (ہدایت کار)، صائمہ اختر (معروف گلوکارہ)، شمع لعل، کرن ہزاروی، شبانہ عباد جیسی معروف گلوکارائیں اور بشریٰ ماروی (معروف سندھی گلوکارہ)، فیضان علی فیضی، بلال طاہر، دانش کھچی، طاہر ساقی جیسے ہر دلعزیز گلوکار۔ فیاض بلی (معروف پرفارمر)، روبینہ، پیر شاہ محمد قادری (معروف اسکالر، ناول نگار)، شہزادہ ذوالقرنین (براڈ کاسٹر)، ثروت اشرف (ٹرانسکاسٹ میڈیا)، غلام عباس (ڈائریکٹر ٹرانسکاسٹ میڈیا)، زوہیب بھٹی (سی ای او ٹرانسکاسٹ میڈیا۔ اب پہلا مرحلہ اسٹارٹ ہوا ایوارڈ دینے کا تو اس سلسلے میں ان رائٹرز کو اسٹیج پر بلایا گیا جن کی تخلیقات پر 2014ء میں ان کی تحریروں کو ایوارڈ یافتہ قرار دیا گیا تھا جو رائٹرز اپنا ایوارڈ لینے آئے تھے انھیں بلا کر ایوارڈز دیئے گئے۔ اس کے بعد مہمان خصوصی کو خطاب کے لیے بلایا گیا۔ اگلے مرحلے 2015ء کے ایوارڈز دینے سے پہلے معروف پرفارمر روبینہ کو اسٹیج پر بلایا گیا جنہوں نے ماضی کے مشہور پنجابی گانے پر زبردست پرفارمنس دے کر تمام حاضرین محفل کی داد سمیٹی۔ اب 2015ء کے ایوارڈ یافتگان کو باری باری اسٹیج پر بلایا گیا اور انہیں ایوارڈز سے نوازا گیا۔ اسی اثناء میں معروف ڈراما ایکٹر اورنگ زیب لغاری اور راشد محمود بھی آ چکے تھے جنہیں اسٹیج پر بلایا گیا تھا اور انہوں نے اپنے قیمتی خیالات سے حاضرین محفل کو نوازا۔ ایوارڈ دینے والے مہمان خصوصی نے اپنے خیالات پیش کیے۔ اب 2016ء کے ایوارڈ یافتگان کو ایوارڈز سے نوازنے کے لیے اسٹیج پر بلایا گیا اور ان میں ایوارڈ تقسیم کیے گئے۔ اسی دوران مختلف فنکاروں، گلوکاروں اور پرفارمرز نے اسٹیج پر آ کر اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور حاضرین محفل کی داد سمیٹی۔ ایوارڈ دینے والے مہمان خصوصی نے اپنے قیمتی خیالات سے حاضرین محفل کو نوازا۔

تقریب کے آخر میں اسپیشل ایوارڈز حاصل کرنے والے ان رائٹرز کو اسٹیج پر بلایا گیا جنہوں نے مستقل سلسلے میں یا کسی دوسرے سلسلے میں ریگولر لکھا تھا۔ ملک کی معروف شخصیات نے انہیں ایوارڈز دیئے۔ پروگرام کا آخری آئٹم ''تیرے عشق نچایا'' بہت زبردست اور پر اثر آئٹم تھا اس کے بعد یہ تقریب اپنے اختتام کو پہنچی۔

☆☆☆

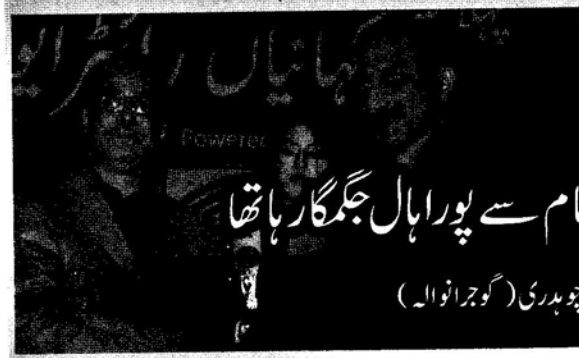

لوگوں کے اژدھام سے پورا ہال جگمگا رہا تھا

افتخار چوہدری (گوجرانوالہ)

کسی بھی معاشرے کی گرومنگ کیلئے صحت مند رجحان رکھنے والی سرگرمیاں وہی حیثیت رکھتی ہیں، جو اہمیت جسم میں روح کو حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے اس تنزلی کے شکار معاشرے میں سچی کہانیاں رائٹر ایوارڈ کسی طرح خوشگوار ہوا کے جھونکے سے کم نہیں تھا۔

میں 26 جنوری کی سرد اور بھیگی ہوئی شام کو جب نیشنل آرٹ کونسل لاہور کے خوبصورت بینکوئٹ ہال میں داخل ہوا تو اس وقت پورا ہال ثقافت کی خوشبو سے معطر تھا۔

سفر کے دوران میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال پناہ گزین تھا کہ تقریب میں چند درجن سے زیادہ احباب نہیں ہوں گے۔ اور تقریب بھی شاید لیٹ شروع ہو۔ کیونکہ ایک تو گھن گرج کے ساتھ بارش ہو رہی تھی اور پھر بارش بھی سرد موسم کی ہو تو گرم لحاف اور بھاپ اٹھتی چائے کی پیالی بہرحال سفر کے مقابلے میں بھلی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے ایک خاص فرد سے ملنے کی چاہت نے سفر کرنے پر مجبور کر دیا۔ مگر یہاں تو تقریب نا صرف اپنے وقت پر شروع ہو چکی تھی بلکہ میرے اندازے کے برعکس مجھے وسیع و عریض ہال کے آخر میں بھی بیٹھنے کے لیے کافی دیر تک کھڑے رہ کر کسی سیٹ کے خالی ہونے کا انتظار کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ ہال کی لابی اور کوریڈورز میں موجود افراد کی گہما گہمی کے سامنے وسیع ہال بھی شرمسار نظر آ رہا تھا۔

میں پوری تقریب کے دوران مہمانوں کے چہرے پڑھنے کی کوشش کرتا رہا، کوئی ایوارڈ حاصل کر کے چہک رہا تھا تو کوئی اپنی سینارٹی کی تکریم تسلیم کیے جانے پر مخمور تھا۔ گھوم پھر کر میری نظریں ایک ہی چہرے پر ٹھہر رہی تھیں، یہ وہ تھا جس نے ان سب کے چہروں پر دھنک کے رنگ بکھیرے تھے۔ جی ہاں آپ بالکل ٹھیک سمجھے۔ میری مراد کاشی بھائی سے ہی ہے۔ بلاشبہ ون مین آرمی کی اصطلاح ان پر ہی صادق آتی ہے۔ اس مخلص انسان نے نے تن تنہا پورے ملک سے لکھاریوں اور فنکاروں کو نا صرف ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا بلکہ آگے بڑھنے اور نئی منزلوں کو تلاشنے کا حوصلہ بھی بخش دیا۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ جب تک ہمارے معاشرے میں کاشی چوہان جیسے حساس نابغہ روزگار ہستیاں موجود ہیں ہماری تہذیب اور ثقافت محفوظ ہاتھوں میں پنپتی رہے گی کیونکہ یہ لوگ اپنی ذات تک کو پس پشت ڈال کر ثقافت اور فن کے اس کارواں کو لیے آگے بڑھ رہے ہیں۔

بلاشبہ انہیں اس پُرخار سفر میں ہر قدم پر کٹھنائیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے میں شدت سے احساس ہوتا ہے کہ نجانے وہ وقت کب آئے گا جب ہم اپنے مفادات سے آگے دیکھنے کے قابل ہوں گے اور ان حساس افراد کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اس کارواں کے لیے تقویت کا باعث بنیں گے۔

بہرحال کاشی بھائی نے جس طرح اتنی بڑی اور پُروقار تقریب کو جس خوبصورت انداز میں پیش کیا اس کے لیے وہ بجا طور پر ستائش اور مبارکباد کے حقدار ہیں۔ ان کا ہر آنے والا نیا شمارہ یہ ثابت کر رہا ہے وہ گہری اور تاریک رات میں اپنے حصے کا دیپ جلائے صبحِ سحر کی اُمید میں ہیں اور اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سفر میں کون کون ان کے ساتھ ہے۔

Pakistanipoint.com
Waqar Azeem

لائف بوائے شیمپو... ایشیا کا سب سے بہتر، سب سے اعلیٰ شیمپو

[اسماء اعوان]

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

آپ دنیا میں ہر چیز کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ مگر حسن؟ حسن کا مقابلہ کوئی کیسے کر سکتا ہے۔ یہ بات کسی کے بھی سمجھ میں نہیں آتی۔

اس نے دو دفعہ صابن سے منہ دھونے کے بعد آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔

صابن رگڑنے سے جلد ہلکی ہلکی سرخ ہو رہی تھی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد جب ذرا سی ہوا لگی تو چہرے کی ساری جلد پھٹے کپڑے جیسی ہو گئی۔

اب کریم ملو..... کریم ملنے کے بعد ایسا ہو جائے گا۔ جیسے چہرے کو تیل کے دریا میں غوطہ دے دیا ہے۔

''ماہی!'' اماں نے دو تین آوازیں ایک ساتھ ہی دے دیں۔

''جی اماں! آ رہی ہوں۔'' اس کے سارے خیالات کا تانا بانا ہی ٹوٹ گیا۔

یہ تو اماں کی عادت تھی جب ذرا سوچ کسی موڑ پر پہنچتی، اماں جھٹ پٹ اُسے ڈسٹرب کر دیتیں۔

''ماہی! تمہیں ہر وقت فارغ بیٹھ کر سوچنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے۔'' اماں نے اُسے دیکھتے ہی گھر کا۔

''تو اماں! ایسی کون سی قیامت آ گئی۔ صرف کچھ سوچ ہی رہی تھی، کوئی ڈاکا..... وغیرہ تو نہیں ڈال رہی تھی نا لیکن آپ..... آپ تو ایسے پریشان ہو جاتی ہیں۔ جیسے کہیں کوئی بم وغیرہ بلاسٹ ہو گیا ہو۔''

''یہ جو تمہاری سوچیں ہیں نا بیٹا! یہ بھی کوئی بم دھماکے سے کم تھوڑا ہی ہیں۔'' اماں نے جل کر کہا۔

اماں کی بات سن کر اُس کا دل یوں ہی اُداس ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

کتنی محبت سے اُس نے چہرہ دھویا تھا مگر سانولے رنگ کا کمپلیکس اُسے کچھ کرنے ہی نہ دیتا تھا۔ بس وہ یہی سوچتی تھی کہ انسان میں کچھ تو ہو جو اُسے دوسروں سے ممتاز رکھ سکے مگر وائے نصیب، اُس میں ایسا کچھ نہ تھا۔ چہرے ہی کی بات نہ تھی۔ اُس کے تو بال بھی بے رونق اور عجیب چھدرے سے تھے۔ گھر سے بہت کم باہر

نکلنے کے باعث اُسے زمانے کی کوئی خاص خبر نہ تھی۔ آئینہ دیکھ کر اُس نے بالوں پر حسرت بھری نگاہ ڈالی اور پھر وہ دل مسوس کر ایک طرف بیٹھ گئی۔

ابھی تو اُس نے نہم کلاس کے پرچے دیے تھے۔ اور اسی دوران لڑکیوں کے خوبصورت بال اور گوری جلد دیکھ کر اُس کے دل میں بھی ہلچل ہوتی تھی مگر جب گھر میں آتی تو بھائی نہ ہونے کا دکھ اُس کے رگ و پے میں دوڑ جاتا اور یتیمی کا آسیب اُسے بری طرح جکڑ لیتا۔ غریب کی دوڑ تو ویسے بھی مسجد سے گھر تک کی ہی ہوتی ہے۔

☆.....☆.....☆

''بیٹا میں نے تجھے پہلے بھی کہا تھا کہ تُو نئی نئی سہیلیاں نہ بنایا کر۔'' اسے سجل کے ساتھ کار میں آتے دیکھ کر انجم نے لتاڑا۔ وہ فوراً سجل پر آیا غصہ بیٹی پر اتارنے لگی۔

''اماں! سجل بہت اچھی لڑکی ہے اور.....''

''اور کیا..... بتا بیٹا..... اور کیا..... میں تجھے جب بھی کچھ کہا کروں اُس پر عمل کر لیا کر بس..... میں تیرے بھلے کے لیے ہی بولتی ہوں۔ دنیا میں نے تجھ سے زیادہ دیکھی ہے۔ بس مجھے نہیں اچھی لگتی ہے وہ لڑکی۔''

اُس تک سک سے تیار لڑکی کو دیکھ کر انجم کا احساس کمتری عود آتا تھا۔ وہ کھل کر کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ اپنی بیٹی کو غربت کے باعث وہ ویسا نہ دکھ سکتی تھی۔ اُس کا صاف ستھرا' سپید چہرا' گھنے لہراتے بال دیکھ کر اپنی بیٹی کی کمائیگی بہت محسوس ہوتی تھی۔

☆.....☆.....☆

اُس کی سجل سے تھوڑے ہی عرصے میں بہت اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ اس لڑکی میں بھی غرور والی کوئی بات نہیں تھی۔ حالانکہ بقول اماں کے وہ بنگلے والے لوگ تھے۔

ماہی نے کتنی ہی دفعہ اماں کو منع کیا تھا کہ اماں سجل کو اس طرح نہیں کہا کریں۔ انجم سجل سے چڑتی نہیں تھی۔ لیکن وہ ماہی کو یہ ضرور احساس دلاتی رہتی تھیں کہ اپنی حیثیت نہیں بھولو۔''

''اور جو بنگلے میں رہے گا' اُسے بنگلہ والا ہی کہا جائے گا بھئی اور اپنا یہ ایک کمرے کا کوارٹر بھی ذرا نظر میں رکھ لیا کرو۔''

''لیکن پھر بھی اماں مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ٹھیک ہے ہم بے مایا لوگ ہیں لیکن کیا ضروری ہے کہ انسان ہر گھڑی اپنی اوقات کو ہی یاد رکھے۔''

''اگر انسان..... خود یاد نہیں رکھے گا تو دوسرے یاد دلا دیں گے۔''

اماں کے اپنے ہی فلسفے تھے اور مزے کی بات یہ کہ وہ ان سارے فلسفوں کو صرف خود تک ہی محدود نہیں رکھتی تھیں۔ اکثر و بیشتر ماہی کو بھی گھول کر پلانے کی کوشش کرتیں۔ یہ اور بات کہ وہ کبھی ہاتھ آ جاتی کبھی نہیں۔ کبھی سن لیتی' کبھی ان سنی کر دیتی لیکن اماں بھی مستقل مزاجی سے لگی ہی رہتیں۔

وقتاً فوقتاً اُسے خوابوں کے جزیرے سے نکال کر حقیقت کی بے رحم موجوں کے حوالے کر دیتیں۔ وہ اس میں بھی خواب کا ایک چھوٹا سا روزن کھول لیتی۔ اماں' جلبلا کر رہ جاتیں۔

''پہلے آئینے میں اپنی شکل تو دیکھ پھر یہ شہزادیوں والے خواب دیکھا کر۔''

''کیا ہوا اماں! آئینہ تو کہتا ہے کہ تم بہت اچھی ہو۔ کیا ہوا' جو ذرا سا رنگ سانولا ہے تو میں ابھی تھوڑے دن پہلے ہی تو اخبار میں پڑھ رہی تھی کہ ہمارے پڑوسی ملک کی ساری ہیروئنیں سوائے ایک دو کو چھوڑ کر سب کالی ہیں' یا سانولی اور یہ سب کچھ جو ہوتا ہے' صرف میک اپ کا کمال ہوتا ہے۔ وہاں کی جتنی میک اپ کمپنیاں ہیں۔ وہ سب بہت فائدے میں ہیں۔''

''اچھا پھر جا کر تم بھی ایک میک اپ کمپنی کھول لو۔''

''اُس سے اچھا یہ نہیں ہے کہ میں ڈرامیک اپ کو ہی استعمال کر کے دیکھولوں۔'' اس نے شرارت سے کہا۔

''ہاں' جاؤ میک اپ کرلو بلکہ تھوپ لو۔ تب بھی فرق کیا پڑے گا۔'' اماں نے بیزاری سے کہا۔

اور یہ تو وہ صحیح کہہ رہی تھیں کہ تب بھی فرق کیا پڑے گا۔

میک اپ کر کے چہرہ تو تبدیل کیا جاسکتا تھا لیکن بال.....

آج ماہی اس کے پاس آئی تو دروازے پر کھڑی سب کچھ سن رہی تھی۔ وہ ذرا سا مسکرائی آج وہ اپنی اس پیاری سہیلی کے بالوں کے لیے ایک بہت آزمودہ اور قیمت میں بہت مناسب شیمپو لائی تھی۔

اس کے والد بہت بڑے بزنس مین تھے لیکن انہوں نے رزقِ حلال کو شعار بنا کر اولاد کی پرورش کی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ غرور نام کی کوئی چیز اس کے سب بہن بھائیوں میں نہ تھی۔ اپنی اس سہیلی سے اُس کی دوستی نہم جماعت کے پیپرز کے دوران ہوئی تھی۔ اس سے باتوں کے دوران وہ جان گئی تھی کہ اس کا مسئلہ کیا ہے۔ اُس نے بالوں کے حوالے سے اُس کے خوبصورت بالوں کی بڑی تعریف کی تھی۔ سجل امیر باپ کی بیٹی ضرور تھی لیکن تھی بہت سادہ..... اُسے اُس کی ماں نے ہمیشہ کوالٹی میں نمبرون شیمپو لائف بوائے استعمال کرایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لائف بوائے کے مسلسل استعمال نے اُس کے بالوں کو قدرتی نگہداشت دے کر مضبوط' گھنا اور چمکدار بنا دیا تھا۔ سب کچھ پیسے سے ممکن نہیں ہوتا۔ کچھ چیزیں صرف تھوڑی سی کیئر مانگتی ہیں اور بس..... اور اب وہ یہی کیئر اپنی سہیلی کو دینا چاہتی تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی انجم آنٹی کے دروازے کی دہلیز پار کر گئی۔ مسکراتے ہوئے انہیں سلام کیا اور اُن کی ناگواری نظر انداز کرتے ہوئے ماہی کے پاس آ گئی۔

''دیکھو آج میں تمہیں دینے کے لیے جو اہم چیز لائی تھی وہ باتوں باتوں میں بھول ہی گئی۔''

''سجل! تو تم نے اماں کی سب باتیں سن لیں؟''

وہ حد درجہ ندامت محسوس کر رہی تھی۔

''ارے چھوڑ و یار! ماؤں ہی کے دم سے تو ساری رونق ہوتی ہے۔ تم کیوں فیل کر رہی ہو۔'' ماہی' سجل کے بڑے پن اور اعلیٰ ظرفی پر قربان ہوگئی۔

''سوری! میں سوری کرتی ہوں اماں کی طرف سے۔'' وہ اُس کے گلے لگ گئی۔

''پلیز ماہی! میں نے قطعاً برا نہیں منایا۔ تم ریلیکس ہو جاؤ۔''

''او کے!''

''یہ لو..... یہ تمہارے لیے..... تمہارے بالوں کے مسائل کا مکمل حل۔'' سجل نے اُسے نئے لائف بوائے شیمپو کی بوتل نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

''لائف بوائے شیمپو!''

''نہیں' نیو لائف بوائے شیمپو! ملک پروٹین اور باداموں کی طاقت لیے نیا لائف بوائے شیمپو جو سب کے بالوں کے لیے آکسیجن جتنا ضروری ہے۔''

''تو کیا تمہیں یقین ہے کہ میرے بالوں پر یہ شیمپو اثر کرے گا؟''

''کیوں نہیں..... 110 فیصد یقین ہے۔ کیونکہ نیا لائف بوائے شیمپو ایشیا کے لوگوں کے بالوں کی ساخت کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہے۔ اسی لیے اثر کرتا ہے۔ تو پھر آج سے کاؤنٹ ڈاؤن اسٹارٹ کرو۔ بلا ناغہ تم نئے لائف بوائے شیمپو سے بالوں کی نگہداشت کرو گی۔ مگر ایک وعدہ بھی مجھ سے کرنا ہوگا۔''

''وعدہ! کیسا وعدہ بھئی!''

''تمہیں ضرورت نہیں ہے گھبرانے کی..... بس وعدہ یہ ہے کہ تم لائف بوائے شیمپو کو آنٹی سے چھپا کر استعمال کرو گی۔''

''مگر وہ کیوں!''

''وہ میں بعد میں بتاؤں گی اب میں چلتی ہوں۔''

''اوکے.....'' ماہی کو حیران چھوڑ کر سجل جا چکی تھی۔

''چلی گئی سہیلی! ارے بیٹا تم بس کم ملا کرو اس لڑکی سے۔'' اماں سجل کے جانے کے بعد پھر سے سجل کی شان میں قصیدہ پڑھنے لگیں مگر اب ماہی کو اماں کی جھڑکیاں بری نہیں لگ رہی تھیں۔ سچ کہا تھا سجل نے..... ان ہی باتوں سے تو رونق ہوتی ہے گھر میں.....

☆.....☆.....☆

ماہی نے نیو لائف بوائے شیمپو کا مسلسل استعمال شروع کیا تو اس کے بالوں میں حیرت انگیز طور پر تبدیلی آنے لگی۔ پہلے تو لائف بوائے شیمپو کے استعمال سے اس کے چھدرے چھدرے بال Straight ہونے لگے اور پھر مکمل طور پر بال سیدھے ہو گئے اور پھر دو مُوہے بال ختم ہو کر اپنی افزائش بڑھانے لگے۔ بال دن بدن خوبصورت ہونے لگے تو اُسے اپنی سانولی سلونی رنگت بھی پُرکشش لگنے لگی اور پھر اس تبدیلی نے اُس کے اعتماد میں اضافہ کیا۔

انجم اُس کی بدلتی شخصیت کو محسوس کر رہی تھی۔ اس کی شخصیت میں تبدیلی مثبت تھی۔ آخر چھ ماہ بعد ماہی کے بال کمر پر لہرانے لگے۔

☆.....☆.....☆

آج سجل پھر سے ماہی کے گھر پر تھی۔ انجم کو اُسے دیکھ کر آج کوفت اور بیزاری محسوس نہ ہوئی تھی۔ آج اُسے اپنی سلونی سی ماہی' گوری چٹی سجل کے مقابلے میں زیادہ پُرکشش محسوس ہو رہی تھی۔ سجل نے یہ تبدیلی فوری محسوس کی اور پھر ماہی کو ٹہوکا مارا۔

''اماں سجل آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔''

''ہاں بولو بیٹی خیر تو ہے ناں۔''

''آنٹی بس بات یہ ہے کہ آپ مجھ سے آدم بیزار تھیں نا۔''

انجم تھوڑا سا جز بز ہوئیں۔

''آنٹی پلیز۔'' سجل نے انجم کے ہاتھ تھامے۔

''آنٹی آپ کا مجھ سے بیزار ہونا ٹھیک تھا لیکن آنٹی اگر آپ خود ماہی کے اصل مسائل کو بھانپ لیتیں تو یقیناً یہ نوبت نہ آتی۔ آپ نے ہمیشہ ماہی کے سانولے رنگ پر چوٹ کی رنگت تو خیر اللہ کا معاملہ ہے۔ مگر اس کے بالوں کو بہتر کرنا تو آپ کے ہاتھ میں تھا۔ شیمپو تو بالوں ہی کے لیے بنائے جاتے ہیں اور نیا لائف بوائے شیمپو تو ہمارے ہی لیے خاص طور پر بنایا گیا ہے۔ اس کے استعمال سے بالوں کے تمام مسائل بڑی حد تک ختم ہو سکتے ہیں۔ مگر ہم لوگ بغیر کچھ تحقیق کیے سب کو برا کہتے ہیں۔ یہ دیکھیے نئے لائف بوائے شیمپو کا کمال۔''

یہ کہہ کر ماہی نے اپنے سر سے دوپٹہ اُتارا تو اُس کے سیاہ چمکیلے' صحت مند بال لہرانے لگے اور بالوں کی خوبصورتی ہی تو لڑکی کا اصل حسن ہوتی ہے۔ جسے دیکھ کر انجم مبہوت ہو کر رہ گئی۔

''ارے میری چندا!'' انجم نے بڑھ کر سجل کو گلے سے لگا لیا۔

''بیٹی میں نے تجھے پہچاننے میں غلطی کی۔ مجھے معاف کر دے۔''

''ارے یہ کیا کہہ رہی ہیں آنٹی..... پلیز مجھے گناہ گار نہ کریں۔ یہ حقیقت آپ کے سامنے ہے۔ اب کبھی یہ نہ کہیے گا۔ اچھے برے سب جگہ ہوتے ہیں مگر سب سے اچھا ہے ہمارا یہ نیا لائف بوائے شیمپو..... لائف بوائے کے نئے اسٹرانگ اینڈ تھک شیمپو سے بال دکھیں 30 فیصد سے زیادہ گھنے اور خوبصورت۔''

''تھینک یو نئے لائف بوائے شیمپو۔'' یہ کہہ کر انجم نے ماہی اور سجل کو گلے سے لگا لیا۔

☆☆.....☆☆

اک حسین یادگار شام

خیر اخان (شاہوٹ)

یادوں کو الفاظ کی شکل دینا (وہ بھی ان یادوں کو جنہیں سوچتے ہوئے آپ خود ہی بار بار کہیں کھو جائیں) بہت مشکل کام ہے مگر کاشی کی فرمائش پر اس خوبصورت یادگار تقریب کا احوال حاضر خدمت ہے۔ آیئے چلتے ہیں تھوڑا پیچھے کی طرف۔

پچھلے کچھ مہینوں سے میں خانہ بدوشوں والی زندگی کے مزے لے رہی ہوں یا یوں سمجھ لیجئے کہ سیروں پر نکلی ہوئی ہوں۔ کبھی اِس بھائی کے پاس تو کبھی اُس بہن کے پاس (آج کل چنیوٹ میں ڈیرے ڈال رکھے ہیں)۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہر ماہ آنے والا پرچہ فوری طور پر نہیں دیکھ پاتی۔ کاشی سے فون پر رابطہ ہوا تو یہ خوش خبری ملی کہ سچی کہانیاں کے پہلی ایوارڈ تقریب کا دن فائنل ہو گیا ہے اور جن لوگوں کو ایوارڈ دیئے جا رہے ہیں ان خوش نصیبوں میں مابدولت کا نام بھی شامل ہے۔ اس قدر ٹھنڈی شام میں بھی یہ خبر سن کر ہمارے اندر بجلی سی دوڑ گئی جوش میں سردی بھی بھول بھال گئے اور فوراً بہن بھائیوں کو اطلاع کی، ہمیشہ کی طرح وہ لوگ میری خوشی میں مجھ سے بھی زیادہ خوش تھے بلکہ باجی زاہدہ نے تو فوراً میرے پاس لاہور پہنچنے کی خوشخبری بھی سنا ڈالی۔ اور جناب باقی کے دن اس خاص دن کے انتظار میں جیسے تیسے گزار کر ہم (میں اور عمران) لاہور پہنچ گئے۔ جہاں ایک اور معاملہ درپیش تھا باجی ثمینہ میرے ساتھ جانا چاہتی تھیں لیکن گھر اور بچوں کی سیٹنگ نہیں ہو پا رہی تھی آخر اللہ اللہ کر کے رات بارہ بجے یہ معاملات طے ہوئے اور باجی ثمینہ کے چہرے پر مسکراہٹ دکھائی دی اور ہم سب نے بھی سکون کا سانس لیا۔ سردیوں کے منتظر رہنے والے کراچی کے معزز مہمان یہاں پہنچے تو لاہور میں خوب ٹھنڈے ٹھار موسم نے ان کا استقبال کیا (یقیناً آپ لوگوں نے انجوائے تو کیا ہوگا کاشی؟)

اور پھر چھبیس جنوری کا دن آن پہنچا خوب تیز ٹھنڈی ہوائیں اور موسلا دھار بارش نے کافی پریشان کر رکھا تھا لگتا نہیں تھا کہ گھر سے نکلنا ممکن ہو سکے گا ہم سب بار بار صحن میں آ کر موسم کا جائزہ لیتے اور التجا کرتے ''اے ابرِ کرم آج اتنا نہ برس'' مگر جناب اس دن تو ابرِ کرم نے ہماری ایک نہ سنی خیر ہم بھی ہم تھے مزے سے تیار ہوئے اور گھر سے نکل پڑے۔ ہماری منزل پنجاب انسٹی ٹیوٹ آرٹس اینڈ کلچر تھی۔ ہم فنکشن کے ٹائم سے پہلے وہاں پہنچ جانا چاہتے تھے تاکہ کچھ دیر کاشی سے گپ شپ بھی ہو سکے۔ مگر جناب موسم سے جنگ کرتے جب ہم وہاں پہنچے تو سچی کہانیاں کی طرف سے کچھ لوگ اینٹرس پر کھڑے مل گئے ان کی رہنمائی پر ہم وہاں رکھی چیئرز پر جا بیٹھے۔ فون کرنے پر پتا چلا کہ کاشی ابھی راستے میں کہیں ہیں۔ اپنے جلدی پہنچنے پر تھوڑا افسوس بھی لیکن پھر ہم نے اس وقت کو انجوائے کرنے کا ارادہ کرتے ہوئے موبائل فونز نکال لیے کہ آج کے دور میں سیل فی سے اچھی مصروفیت بھلا کیا ہو سکتی ہے؟ ہم وہاں بیٹھے ہر آنے جانے والے کو یہ سوچ کر غور غور سے دیکھتے رہے کہ ابھی یہیں کہیں سے کاشی کی آمد ہوگی اور ہم فٹافٹ انہیں پہچان لیں گے (کیونکہ کاشی سے ہی فون پر رابطہ رہتا ہے تو وہی اکلوتے واقف کار بھی تھے اور فطری طور پر ان سے ملنے کی خواہش بھی تھی) تعارف پر معلوم ہوا کہ وہ حنا بشریٰ اور ان کی بہنیں تھیں

،حتا سے تو کوئی خاص بات نہ ہو سکی لیکن اس کی ایک بہن سے سلام دعا ہوئی جو کہ کافی خوش اخلاق اور اچھی لگی اور جب ہمیں اندر جانے کا اشارہ مل گیا۔ سبھی لوگوں نے ہال میں اپنی اپنی سیٹیں سنبھال لیں اور ہر نئے آنے والے کو مسکرا مسکرا کر پہچاننے کی کوشش کرنے لگے۔ میں دل میں سب سے ملنے کی خواہش رکھنے کے باوجود اپنی ریزروڈ نیچر کی وجہ سے بھائی اور بہنوں کے ساتھ ہی بیٹھی رہی۔ ہر بار میں سوچتی ہوں کہ اس بار احوال میں ضرور شرکت کروں گی لیکن کسی نہ کسی وجہ سے یہ ملاقات رہ جاتی ہے (میری فیملی کی نظر میں اس کی سب سے بڑی بلکہ واحد وجہ میری سستی ہے اور مابدولت اس بات سے اختلاف رکھنے کی پوزیشن میں بالکل بھی نہیں ہیں)۔ لیکن اس روز باقی لوگوں کو آپس میں ملتے دیکھ کر یہ بات بہت شدت سے محسوس ہوئی کہ یار اگر احوال میں سب کے ساتھ گپ شپ ہوتی رہی ہوتی تو آج اس قدر اجنبیت نہ محسوس ہوتی۔ خیر جی انتظار ختم ہوا اور فائنلی کاشی صاحب دکھائی دے ہی گئے۔

''وہ دیکھیں وہ کاشی ہے، دیکھا میں نے پہچان لیا نا؟'' بہن بھائی کو یہ اطلاع دیتے ہوئے میں اچھی خاصی پرجوش تھی مگر وہ اتنا مصروف تھے کہ بات کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں تھا۔ ہمارے آگے والی سیٹ پر شائستہ انور آ کر بیٹھیں۔ بہنوں کی گھوریوں اور بھائی کے ٹہوکوں کی وجہ سے اب میں نے بھی سلام دعا لینے کی سوچی اور سب سے پہلے شائستہ جی سے ہی آغاز ہوا۔ کچھ دیر بعد ایک کیوٹ سی محترمہ میرے پاس آئیں اور بولیں ''کیا آپ ہی کاشی کی سسٹر ہیں؟'' اور تب مجھے معلوم ہوا کہ شائستہ جی کاشی کی سسٹر ہیں۔ ابھی فنکشن شروع ہونے میں تھوڑا وقت باقی تھا سو میں عمران کے ساتھ ہال سے باہر نکل آئی تا کہ وہاں موجود لوگوں سے ملاقات کی جا سکے۔ کاشی سے بھی ملاقات ہوئی اور ساتھ ہی شائستہ جی سے بھی بات کرنے کا موقع ملا، اور مجھے افسوس ہونے لگا کہ یار پہلے کیوں نہیں ان سے بات کر لی، اس وقت بھی کہا تھا اور ابھی بھی کہہ رہی ہوں آپ سے مل کر بہت بہت اچھا لگا، اتنی اپنائیت اتنی بے تکلفی واہ کیا بات ہے آپ کی، مجھے لگا ہی نہیں کہ آپ سے پہلی بار مل رہی ہوں۔ اور جناب پھر جب شائستہ جی کو معلوم ہوا کہ میں ماشاء اللہ سے ابھی تک کسی سے بھی نہیں ملی ہوں تو انہوں نے ٹھیک میری بہنوں والے سٹائل میں مجھے تھوڑا سرزنش کیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر رائٹرز سے ملوانے چل دیں اس کے بعد انہوں نے ہی ٹی وی کے لیے ہونے والے انٹرویو کے لیے بھی اصرار سے مجھے آگے بھیجا۔ فنکشن شروع ہو چکا تھا سو ہم واپس ہال میں آ کر بیٹھ گئے۔

پروگرام کی میزبانی کے لیے معروف ٹی وی میزبان دانیہ انور اور عباس رائے سٹیج پر تشریف لائے، دانیہ نیلے کلر کی خوبصورت سے ساڑی میں خود بھی بہت خوبصورت لگ رہی تھیں اور عباس کا لب ولہجہ اور شرارتی انداز ان کی انفرادیت جتا رہا تھا۔ تقریب کا باقاعدہ آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد نعت رسول کریم نے اک سماں باندھ دیا۔ ہم میں سے ہر ایک یہی سوچ رہے تھا کہ شاید یہ تقریب اس کے لیے ہی سب سے زیادہ اہم ہے لیکن وہاں موجود مہمانوں کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اور بھی بہت سے لوگ ہیں جن کے لیے یہ تقریب بہت معنی رکھتی ہے۔ جی ہاں ثقافتی اور ادبی حلقوں کی قدآدم شخصیات کی موجودگی نے محفل میں کچھ اور رنگ بھر دیئے۔ معزز مہمانوں میں ڈاکٹر مرتضیٰ مغل جو کہ کالم نگار اور دانشور ہونے کے ساتھ ساتھ نظریہ پاکستان ٹرسٹ کے رہنما بھی ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ تبسم جو نہ صرف بہت اچھی شاعرہ اور افسانہ نگار ہیں بلکہ ماہر تعلیم بھی ہیں اور ان کا ایک بہت خوبصورت حوالہ یہ بھی ہے کہ وہ صوفی تبسم صاحب کی پوتی ہیں۔ عمران مسعود، سابق وزیر تعلیم پنجاب، وائس چانسلر یونی ورسٹی آف ساؤتھ ایشیا۔ سابق ممبر صوبائی اسمبلی، کالم نگار اور خوبصورت شاعرہ محترمہ آمنہ الفت۔ جانی مانی شخصیت معروف ڈرامہ رائٹر افتخار الٰہی۔ ڈاکٹر صغریٰ صدف جو کہ شاعرہ اور ڈائریکٹر پنجاب انسٹیٹیوٹ آف لینگویج، آرٹس اینڈ کلچر ہیں۔ معروف ڈرامہ ایکٹرز اورنگزیب لغاری اور راشد محمود۔ ہدایت کار اسد بیگ اور دیگر مہمان ہال میں تشریف فرما تھے۔ ان سب کو دیکھ کر دل میں یہی خیال آتا تھا کہ کاشی اور سچی کہانیاں نے مل کر علم و ادب کے سبھی نگینے اس چھوٹے سے ہال میں جمع کر دیئے ہیں۔ کاشی سپاس نامہ پیش کرنے کے لیے سٹیج پر تشریف لائے تو خوب خوب تالیاں بجا کر ان کا استقبال کیا گیا۔ ان کی زبانی ہمیں بھی سچی کہانیاں اور دوشیزہ کے اس سفر کے بارے میں آگاہی

حاصل ہوئی۔ کاشی نے اپنے دلکش لب و لہجے میں اپنی ہی لکھی ہوئی ایک خوبصورت نظم بھی سنائی۔ جس سے منزہ سہام صاحبہ کی عظمت کا علم ہوا۔ ایوارڈز دینے کا سلسلہ شروع ہوا اور باری باری معزز رائٹرز کو سٹیج پر بلایا جانے لگا۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ میرا نام بھی شامل ہے ان ناموں میں، پھر بھی جب دانیہ کو اپنا نام لیتے سنا تو دل میں عجیب سی ہلچل مچ گئی اور جناب یوں سمجھیں کہ میں گویا بادلوں پر چلتی ہوئی سٹیج تک جا پہنچی۔ اور عمران مسعود صاحب جو کہ سابق وزیر تعلیم بھی رہ چکے ہیں انہوں نے مجھے میرا ایوارڈ دیا۔ اگرچہ تعلیمی نظام کے بارے میں بہت سے سوالات تھے جو میں ان سے کرنا چاہتی تھی لیکن وہ ایسا موقع نہیں تھا۔ جناب ایوارڈ لے کر واپس اپنی سیٹ پر پہنچی تو بہنوں نے کھٹا کھٹ تصاویر لے کر مجھ میں وی آئی پی والی فیلنگز جگا دیں۔ ان کے خوشی سے چمکتے چہرے دیکھ کر میں نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ انشاء اللہ باقاعدگی سے لکھا کروں گی۔ اورنگزیب لغاری اور راشد محمود سٹیج پر آئے تو انہیں دیکھ کر بچپن میں دیکھے کئی ڈراموں کے کردار ذہن کے پردے پر روشن ہو گئے خاص طور پر راشد محمود صاحب کو دیکھتے ہی عمران نے کہا یہ ہیں سر کٹے انسان۔ میں نے غور سے دیکھا ان کا سر اپنی جگہ موجود تھا میں نے سوالیہ نظروں سے عمران کی طرف دیکھا تو عمران میری شرارت بھانپ گیا اور جلدی سے کہنے لگا انہوں نے سر کٹے انسان کا رول کیا تھا، اور ہم دونوں ہنس دیے۔ واقعی یہ دونوں اداکار بے مثال اور لاجواب ہیں۔

صائمہ اختر، شمع لعل، کرن ہزروی، شانہ عباس، بشریٰ ماروی، فیضان علی فیضی، بلال طاہر، دانش بھچی، طاہر ساقی، فیاض بلی، فیاض ورسٹائل گروپ اور روبی۔ یہ وہ لوگ تھے جو گاہے بگاہے اپنی پرفارمنس سے لوگوں کو محظوظ کرتے رہے۔ ویسے تو سب ہی اپنی جگہ کمال تھے لیکن پنجاب یونیورسٹی کی طالبہ نے جو ہیر سنائی وہ مزا دے گئی۔ اس بات کا بھی خیال رکھا گیا تھا کہ سندھ اور پنجاب دونوں جگہ کے مہمان پروگرام سے لطف اندوز ہو سکیں اس لیے دونوں صوبوں کی ثقافت کو گانوں اور پرفارمنسز کے ذریعے پیش کیا گیا تھا جس نے پروگرام کو اور زیادہ دلفریب اور منفرد بنا دیا تھا۔

ایوارڈ لینے والوں کی فہرست بہت لمبی ہے ان میں سے کچھ کے نام جو اس وقت ذہن میں آ رہے ہیں وہ یہ ہیں، نفیسہ سعید کراچی، شائستہ انور اسلام آباد، عبدالغفار عابد چیچہ وطنی، مجید احمد اور فصیحہ آصف ملتان سے، ایڈیسن ادریس قسیح کراچی، سید افتخار چوہدری گوجرانوالہ سے اور ایم حسن نظامی صاحب قبولہ شریف سے تشریف لائے تھے۔ لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ کے لیے سید نور کو نامزد کیا گیا جو کہ لاہور سے تشریف لائے تھے۔ حنا بشریٰ اور احمد سجاد بابر کو بیسٹ رائٹر ایوارڈ جبکہ موسٹ پاپولر رائٹر کا ایوارڈ ممتاز احمد اور ارم ناز کو دیا گیا۔ اس سال پہلی بار دیا جانے والا بیسٹ کریٹک کا ایوارڈ جناب جاوید راہی اور محترمہ اقبال بانو نے حاصل کیا۔ سب دوست (جن کے نام یہاں لکھے ہیں اور جن کے نام یہاں لکھنے سے رہ گئے ہیں) آپ سب ساتھیوں کو بہت بہت مبارک باد اور اگلے ایوارڈ فنکشن کے لیے بیسٹ آف لک۔

اور جناب یہ یادگار تقریب اپنے اختتام کو پہنچتے پہنچتے یادوں کا انمول خزانہ ہمارے دامن میں ڈال گئی۔ اس وقت میں سوچ رہی تھی کہ خواب دیکھنا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ خوابوں کو سچ کرنے کے لیے ان تھک محنت بھی چاہیے ہوتی ہے اور پھر خواب سچ ہو جایا کرتے ہیں جس طرح کاشی نے سچی کہانیاں ایوارڈ کا خواب دیکھا اور پھر اپنی محنت اور سچی لگن سے اس خواب کو سچ کر دکھایا۔ لاہور جہاں اس قسم کی تقریب کا کوئی تصور ہے نا روایت۔ نہ ہی کبھی کسی اور نے ہم لوگوں کے بارے میں اس طرح سوچا لیکن کاشی فاصلوں کی پرواہ کیے بنا کراچی سے نکل کر اتنی دور خوشیاں اور محبتیں بکھیرنے لاہور چلے آئے جس کے لیے میرے ساتھ ساتھ یقیناً باقی سب بھی کاشی اور سچی کہانیاں کی باقی ٹیم کے شکر گزار ہیں۔ اس بات کا افسوس ضرور ہے کہ ساتھیوں سے گپ شپ نہیں ہو سکی لیکن انشاء اللہ اگلی تقریب میں پھر ملاقات ہوگی۔ موسم کے خطرناک تیور اور رات کی پھیلتی سیاہی نے آخر ہمیں گھر واپسی پر رضامند کر ہی لیا۔ اور سب کو الوداع کرتے ہم نے واپسی کا سفر اختیار کیا، واپسی کا سفر جو ہمیشہ اداسی لیے ہوتا ہے لیکن دوبارہ ایسی خوبصورت تقریب کا حصہ بننے کی آس دلا کر ہم نے اپنے دل کو اداسی کے چنگل سے چھڑانے کی اپنی سی کوشش ضرور کی تھی۔

☆☆☆

چھوٹی سی ملاقات؟ اک اعزاز عظیم

شمی محمد ریحان (ملتان باری)

26 جنوری کی سہ پہر تین بجے بارش میں بھیگتے ہوئے مقررہ مقام پر پہنچے تو سب سے پہلے مجید احمد جائی سے ملاقات ہوئی۔ وہ اندر لے گئے۔ جہاں راشد لطیف اور فیصل ندیم بھٹی سے تعارف ہوا۔ ان کے بعد اشفاق شاہین، ذیشان ریاض اور پھر بارش کے قطروں کی طرح ٹپ ٹپ کرتے دوستوں کی تعداد بڑھتی گئی۔

حافظ ندیم عباس میواتی جن سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ گلے ملے تو گلاب کی خوشبو رچ بس سی گئی۔ ریاض حسین شاہد، ایم حسن نظامی، عبدالغفار عابد، مہر پرویز احمد دولو، شہزاد شریف اشعر، ممتاز احمد، یاسر وکی اور سب سے بڑھ کر کاشی چوہان سے ملاقات یقیناً یادگار ہے۔ دیگر دوستوں سے بھی گپ شپ ہوئی۔

عبدالجبار رومی انصاری نے بہت انتظار کروایا۔ وہ سات بجے کے بعد تشریف لائے حالانکہ تقریب کا باقاعدہ آغاز چھے بجے ہو گیا تھا۔ عبدالعزیز جی آ اور ان کی مسز سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ مجھ سے قریب ہی شاعرہ فریدہ جاوید فری اور سکینہ نسیم صدف تشریف فرما تھیں۔ بہت دل چاہا کہ ان سے تعارف ہو جائے لیکن اپنی ازلی شرمیلی طبیعت کی وجہ سے یہ حسرت دل میں ہی رہ گئی۔ حالانکہ جب عزیز جی آ صاحب کو سکینہ کی گڑیا سی بلا کر لائی تھی تو میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ میں بھی جا کر تعارف کرواؤں گا لیکن یہ حسرت ہی رہ گئی۔

البتہ دل پر جبر کرتے ہوئے باجی صائمہ بشیر سے تعارف بھی ہوا تھا اور ان کو مبارک باد بھی دی تھی۔ بلاشبہ وہ بہت خوش اخلاق اور ہنس مکھ طبیعت کی مالک ہیں۔

نزاہت افشاں، نیئر شفقت، فوزیہ احسان رانا، احمد سجاد بابر، حنا بشریٰ، نفیسہ فضل، ثمینہ طاہر بٹ، سنبل، نگہت غفار اور رضوانہ کوثر کے علاوہ ملک علی رضا آف فیصل آباد سے نہ ہو سکی۔

ایم افضل آزاد اور محمد بلال فیاض نے پہلی ملاقات میں ہی بہت اچھا تاثر چھوڑا۔

سب ہی دوست بہت محبت کرنے والے اور کشادہ دلی سے ملے۔

یہ چھوٹی سی ملاقات میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ دوستوں کا بہت مشکور ہوں کہ انہوں نے مجھے بہت محبت اور اصرار کے ساتھ رات وہیں رکنے کو کہا لیکن میں اپنی مجبوریوں کی وجہ سے رک نہیں پایا۔ اگر میرے کسی فعل سے کسی کی دل آزاری ہوئی ہو تو تہ دل سے معافی کا خواستگار ہوں۔ بھائی ممتاز احمد کو پلیٹ فارم کے لیے بہت مبارک باد۔

☆☆☆

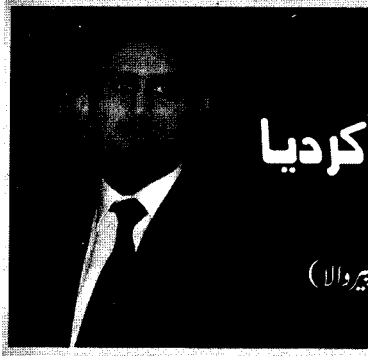

’دل آباد‘ نے معتبر کردیا

نعمان اسحٰق (جلال پور پیروالا)

یہ تو میں ہی جانتا ہوں کہ میں کن مشکلوں سے ایوارڈ تقریب میں پہنچا۔ ملک میں پولیو وائرس کی موجودگی نے ہم دیہی علاقوں میں کام کرنے والے ڈاکٹروں کی چھٹیاں معطل کی ہوئی ہیں اور میں تو جنوری کے مہینے میں پہلے ہی امتحان کے سلسلے میں چھٹیاں لے چکا تھا۔ اب چھٹیاں ملنے کی امید نہ تھی۔ سو میں نے دل پر جبر کر کے خود کو سمجھایا۔ اس بار نہیں اگلی بار تقریب کا حصہ بننا تمہارا نصیب ہے۔ پر دل بے چارہ سمجھنے کو راضی نہ تھا۔ رہی سہی کسر کاشی بھائی کے اصرار نے پوری کر دی۔ تقریب سے ایک دن پہلے کی بات ہے، بادلوں کا موسم تھا۔ ساری رات بارش ہوتی رہی۔ میرے خوابوں میں تقریب کے لمحات بسیرا کرتے رہے۔ صبح بھی بارش تھی مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بڑی مشکلوں سے چھٹی منظور کرائی۔ بھائی کی منتیں کیں کہ مختصر وقت اور بارش، بس پر پانچ سو کلومیٹر دور کا سفر نہ ہوگا۔ گاڑی پر چلیں اور آپ ڈرائیونگ کی خدمات سرانجام دیں۔ شکریہ فرحان بھائی اور منعم کا کہ وہ راضی ہوئے اور میں نے اپنے ایک اور ڈاکٹر دوست عاصم کو بھی ساتھ ملایا اور ہم جلال پور ملتان سے روانہ ہوئے۔ وقت پر لاہور پہنچے۔ وہاں پر بھی بادلوں نے شہر کو دریا بنانے کا عہد کیا ہوا تھا۔ عاصم کے دوست معین کے پاس کپڑے بدلے اور عاصم نے معین کو بھی ساتھ چلنے کی پیشکش کر دی۔ میں پریشان۔ تقریب میں اپنے ساتھ ایک مزید بندہ لانے کی اجازت تھی اور ہم پانچ لوگ۔ بھائی فرحان کہنے لگے میں رک جاتا ہوں۔ اپنے دوستوں سے ملتا ہوں۔ پر اب انہیں اتنی دور لا کر ساتھ نہ لے جانا۔ میں نے کاشی بھائی سے مدعا بیان کیا۔ انہوں نے بخوشی اجازت دے دی اور ہم جا کر قذافی اسٹیڈیم کے پنجاب کلچرل ہال کی کرسیوں پر براجمان ہوئے۔ تقریب اچھی اور منفرد تھی۔ جو کمیاں رہ گئیں وہ انشاء اللہ اگلی تقریب میں نہ ہوں گی۔ کاشی بھائی کی ہمت کہ انہوں نے اپنے شہر کراچی سے پندرہ سو کلومیٹر دور تقریب کا انعقاد کیا۔ تقریب میں بہت سے لکھاریوں کو دور دور سے دیکھا۔ جاوید راہی، ممتاز احمد، مجید جائی، حنا بشریٰ، زمر نعیم، دلشاد نسیم وہ خاتون جو مجھ سے ایک دو نشست فاصلے پر بیٹھی تھیں، انہیں میں عقیلہ حق سمجھا، سلام دعا کی کوشش کی تو معلوم ہوا محترمہ ان کی بھانجی ہیں اور عقیلہ صاحبہ کی نمائندگی کر رہی ہیں اور وہ کیا حسین گھڑی تھی جب مجھے طاہرہ جالب صاحبہ نے اپنے ہاتھوں سے ایوارڈ سے نوازا۔ دل آباد مجھے مجمع میں معتبر کر گئی۔ (بادبان تم بھی کوئی جادو کر دکھاتیں تو کیا بات تھی)۔

کاشی بھائی سے مل کر اچھا لگا۔ خوب دل خوش ہوا۔ وقت کی کمی نے زیادہ باتیں تو نہ کرنے دیں مگر پھر بھی یہ ملاقات یادگار تھی۔ تقریب میں کافی اچھی باتیں تھیں۔ البتہ رقص و موسیقی میرے مزاج کا حصہ نہیں۔ اس پر بات کرنے سے معذرت۔ ٹی وی کے لوگ راشد محمود اور اورنگزیب لغاری کو دیکھ کر دل خوش ہوا۔ لکھاریوں سے بھی سلام دعا کی تمنا تھی مگر محفل کی روشنیوں نے اجازت نہ دی۔

مختصر یہ ایک حسین شام تھی۔ میری تصویر اس بات کی خوب وضاحت کر رہی ہوگی۔ اس تقریب کے لیے شکریہ کاشی، شکریہ پرل پبلی کیشنز۔

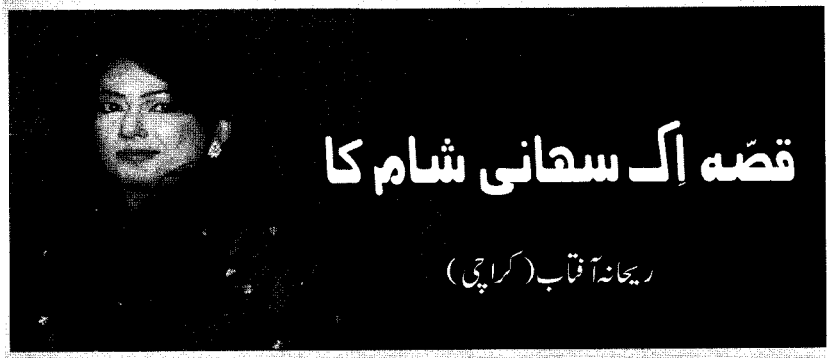

قصّہ اِک سہانی شام کا

ریحانہ آفتاب (کراچی)

لکھنے والے کی جان نکلتا ہے
لفظ لکھنے میں جو قیامت ہے

احساس کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرنا اور اسے اسی طرح محسوس کر کے اس کی قدر دانی کرنا، بہت بڑا وصف ہے، بہت کم ایسے قدر دان ملتے ہیں ورنہ تو ادب کی دنیا بے ادبوں سے بھری پڑی ہے۔ میرا لکھنے کا سفر گو کہ بہت مختصر ہے مگر اس میں بہت پڑاؤ آئے۔ طویل غیر حاضری کے بعد پچھلے سال قلم سے سلسلہ پھر سے جڑا تو یوں ہی ایک تحریر سچی کہانیاں کی نذر کر دی۔ تحریر لگی تعریفیں سمیٹیں اور مجھے لگا یہ باب یہیں بند ہو گیا لیکن نہیں..... کچھ تحریریں اپنا نقش چھوڑ جاتی ہیں۔

روٹین میں گھر آدن تھا جب کاشی سر نے خوش خبری دی کہ وہ میری تحریر کو ایوارڈ کے لیے Nominate کر رہے ہیں۔ ایک لمحے کو لگا انہوں نے مذاق کیا ہے لیکن ان جیسے مخلص اور ذمہ دار بندے سے اس غیر سنجیدگی کی امید نہ تھی۔

لاہور میں تقریب کی بابت سن کر جی میں آیا، انکار کر دوں لیکن ذہن نے فوراً ''سوچ لو'' کا پیغام دیا۔ سچ پوچھیں تو مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ فقط پہلی تحریر کسی پرچے پہ لگنا اور اس کا ایوارڈ کے لیے منتخب ہونا جہاں باعثِ اعزاز تھا، وہیں باعثِ حیران بھی۔ اور اس پر سونے پر سہاگا جب فرینڈز اور فیملی کو بتایا تو انہوں نے بھی حیرت سے استفسار کیا۔

''ہیں واقعی، کس ادارے کی طرف سے؟''

(لو جی، ہماری صلاحیتوں پر کسی کو بھروسا ہی نہیں۔ ہیرے کی قدر جوہری کو ہوتی ہے۔ میں نے بھی دل بہلا لیا)۔

لاہور جانے کے لیے تیاری شروع کی۔ سفر کی روداد لکھنے بیٹھی تو تحریر مزید طویل ہو جائے گی۔ سفر بے حد یادگار رہا۔ فیملی کا ساتھ..... خوب صورت موسم کراچی میں موسم کے مزاج ذرا نارمل ہی رہتے ہیں لیکن جب لاہور میں قدم پڑے تو رم جھم برستے موسم نے استقبال کیا۔

نکھرا نکھرا موسم جہاں موڈ پہ خوشگوار اثرات چھوڑ گیا تھا وہیں ایوارڈ کی خوشی میں میں بھی کھلکھلا رہی تھی۔ فریش ہونے کے بعد فیملی لاہور کے سفر کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ (پاکستانی اور کراچی والے ہیں بھئی، ایک تیر سے کئی شکار کر لیتے ہیں) اور اور پھر ایسے خوب صورت موسم میں کمروں میں دبک کے بیٹھنا نہایت بدذوقی ہوتی اور ہم بدذوق نہیں تھے۔ بادشاہوں کے شہر نے خوب مسحور کیا۔ بالآخر 26 جنوری کی سہانی شام نے بھی اپنے پر پھیلا لیے۔

صبح سے ہی برستے بادلوں نے نہایت خوب صورت سماں باندھ رکھا تھا۔ رم جھم برستی پھوار میں لاہور کی بھیگی شاہراہوں سے ہوتے ہوئے مقررہ وقت سے تھوڑا لیٹ پہنچے تو قذافی اسٹیڈیم پنجاب کمپلیکس میں رنگ و نور کی محفل بس سجا ہی چاہتی تھی۔ معزز اینکر نے باقاعدہ تقریب کی آغاز کی نوید دی۔ حمدِ کلام پاک سے تقریب کی بنیاد رکھی گئی تو سرورِ کونین کی خوب صورت مدح سرائی بھی ہوئی۔ سبحان اللہ!

کاشی چوہان سر نے منزہ سہام صاحبہ کی کمی کو دور کرتے نہایت عمدہ انداز میں سپاس نامہ پیش کیا۔ جہاں بانی کی کاوشوں کا عمل دخل کسی پرچے کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے وہیں ایڈیٹر کی شب و روز کی انتھک محنت کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ادب سے تعلق رکھنے والے معتبر اشخاص کو مختلف شہروں سے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنا فی زمانہ مصروف دور میں بہت مشکل کام ہے لیکن سر کاشی چوہان نے سچی کہانیاں کی پہلی تقریب کا اتنا بہترین آغاز کر کے اسے ناممکنات میں سے ممکنات کے کٹہرے

میں لا کھڑا کیا۔ خراب موسم کے باوجود بھی کوئی بھی چیئر خالی نہیں تھی اور یہ بات کامیابی کا ضامن تھی۔

ایوارڈز کے لیے رائٹرز کے نام کی پکار پڑنے لگی اور پھر دل ساعت بن گیا۔ تالیوں کی گونج، اینکرز کی کھٹی میٹھی پر مزاح نوک جھونک میں یہ اعزاز یکے بعد دیگر رائٹرز کو دیا جانے لگا اور بالآخر میری باری بھی آ گئی۔ ایوارڈ وصول کرتے جہاں رب کائنات کی شکر گزار تھی وہیں سر کاشی چوہان کی بھی احسان مند ہوں کہ جوہری کی نظر انہوں نے پائی ہے۔

تقریب کے شرکاء کسی لمحے بوریت محسوس نہ کریں اس ضمن میں انٹرٹینمنٹ کا بھی بھرپور اہتمام کیا گیا تھا۔ خوب صورت آوازیں اور عمدہ پرفارمنسز نے تقریب کی رونق کو مزید دوبالا کر دیا تھا۔

خنک ماحول میں چائے کی چسکیاں لیتے وقت اختتام پہ یہی دعا تھی کہ اللہ کرے سچی کہانیاں ایسی تقریبات کا ہر سال اس سے بھی زیادہ احسن طریقے سے انعقاد کر کے رائٹرز کی حوصلہ افزائی کرے۔ ایک چھوٹا سا ایوارڈ بہت بڑی خوشی دے گیا۔ میری امی تقریب میں جس قدر خوش تھیں وہ میرے لیے جہاں باعث فرحت تھا، وہیں لوٹ کر آنے کے بعد ابو کو ایوارڈ دکھایا تو ان کے چہرے کی وہ خوشی بیان سے باہر ہے۔

جس طرح اپنے دوستوں اور سرکل میں ابو فخر سے ایوارڈ دکھا رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر میرا دل اتنا بڑا ہو رہا ہے کہ بس خواہش ہے اسی طرح اپنے والد محترم کو خوشیاں دیتی رہوں۔

شکر ہے رب العزت کا کہ اس نے اس لائق بنایا اور احسان مند ہوں سر کاشی چوہان کی جنہوں نے مجھے اس اعزاز سے نوازا۔

☆☆☆

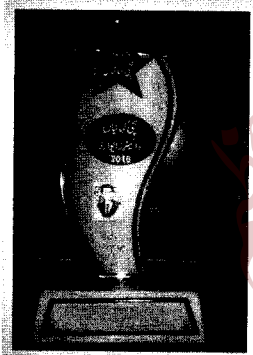

مجھے ہمیشہ یاد رہے گا

یاسر وکی (دیپال پور)

ایوارڈ فنکشن میں شرکت کے لیے لاہور پہنچا۔ جناب آج موسم بھی کافی خراب تھا اور سردی بھی اپنے زوروں پر تھی۔ بارش تھی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ پہلے تو سوچا کے رہنے دیتا ہوں پھر سوچا کہ یار اگر وہ لوگ کراچی سے یہاں آ سکتے ہیں تو کیا میں دیپال پور سے لاہور نہیں جا سکتا۔ خیر دو گھنٹے کا سفر کر کے وہاں پہنچا بارش کافی تیز تھی۔ گاڑی سے نکل کر ہال کے اندر جاتے جاتے میرے سارے کپڑے بھیگ گئے خیر اندر کا ماحول جوں ہی دیکھا تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اندر ہر طرف رائٹر شاعر میلوں دور سے آئے ہوئے تھے اور ان کو ایوارڈز سے نوازا جا رہا تھا کیا بتاؤں جب اسٹیج پر میری نظر پڑی تو اور بھی حیرانگی ہوئی کیوں کہ یہاں جن کو میں دیکھا وہ شاید میرا خواب تھے۔ یہاں ایوارڈز کے لیے ایکٹر حضرات بھی آئے ہوئے تھے۔ کافی سنگر لوگ بھی اپنا اپنا کام سرانجام دے رہے تھے۔ خدا قسم میری زندگی کا پہلا ایسا شو تھا جو میں نے انینڈ کیا تھا۔ اس خوشی میں مجھے افسوس بھی ہو رہا تھا کہ کاش آج اگر ہم بھی سچی کہانیاں کے رائٹر ہوتے تو اسٹیج پر ہمیں بھی بلایا جاتا لیکن تب کیا پچھتانا جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ ہم تو دوسرے رسالوں میں دھکے کھاتے پھرتے تھے لیکن جو رائٹر کی عزت یہاں سچی کہانیاں میں دیکھی وہ کہیں اور نہیں دیکھی۔ خیر جب کاشی بھائی سے ملا تو دل باغ باغ ہو گیا۔ کاشی بھائی آپ کافی سندر ہو ہاہاہا.....! سوری پر جو سچ ہے وہ تو سچ ہی ہے نا۔ خیر بڑا مزہ آیا۔ آج سے میں نے دل میں عہد کر لیا ہے اگر لکھوں گا تو صرف سچی کہانیاں میں نہیں تو نہیں لکھوں گا۔ مجید احمد جائی صاحب آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ ملک علی رضا، منشی عزیز مئے، آپ سے بھی مل کر خوشی ہوئی۔

☆☆☆

خواہش سے تعبیر تک

رضوانہ کوثر (لاہور)

میری شروع سے خواہش تھی کہ سہام پبلی کیشنز کی ایوارڈ تقریب میں شامل ہو کر اپنے سب پیارے احباب کی سنگت میں بیٹھوں مگر دوشیزہ، سچی کہانیاں، آئیڈیل اور ادارے سے نکلنے والے سب شماروں سے ابتداء سے ہی شمولیت کے باوجود یہ خواہش پوری نہ کر سکی گو کہ منزہ نے بھی ہر دفعہ دعوت نامہ بھجوا کر مجھے مان دیا مگر لاہور میں ہوتے ہوئے خواہش اور کوشش کے باوجود نہ پہنچ پائی۔ صد شکر کہ سچی کہانیاں کی پہلی ایوارڈ تقریب ہی منزہ اور کاشی نے لاہور میں منعقد کر دی اور وہ بھی میرے گھر سے کافی نزدیک کہ طبیعت خراب ہونے کے باوجود بھی میں اسی پہنچ گئی۔ بہر حال برستی بارش میں قذافی آرٹ ہال تک پہنچی۔ داخل ہوتے ہی گہما گہمی کے احساس سے دل خوش ہو گیا۔ میں محبت کی ماری وقت سے پہلے گئی تھی۔ کاشی بھاگ بھاگ کر ذمہ داری انجام دے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وقفوں سے سب مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی اور رونق میں اضافہ بھی۔ کچھ دیر بعد زمر نعیم اور اس کے بعد نسیم نیازی، اختر بھائی (شوہر) اور شان (بھتیجے) کے ساتھ موجود تھیں۔ ہال کی گیلری میں۔ دلشاد نسیم بھی آ گئیں۔ میڈیا والے پہلے سے ہی موجود کیمروں میں سب محفوظ کر رہے تھے۔ بھائی ممتاز اور جاوید راہی ایک دن پہلے ہی موجود تھے اور کاشی کے ساتھ قدم بقدم تھے۔ کچھ دیر بعد مہمانوں کی آمد میں تیزی آ گئی۔ بلال فیاض سے تعارف ہوا۔ میں اس کی پہلی کہانی سے (جو کہ ماہنامہ آئیڈیل میں چھپی تھی) پہلے ہی اس کی صلاحیت کو داد دے چکی تھی۔ ماشاء اللہ بہت ڈیسنٹ بچہ لگا (کیونکہ میرے بیٹوں سے بھی چھوٹا ہے) راحت وفا اپنے شوہر طارق کے ساتھ آئیں۔ پھر ممتاز بھائی کی فیملی سرگودھا سے۔ ہمارے بہت پیارے نوجوان رائٹر موجود تھے جو کہ اوکاڑہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، ملتان اور دور دراز سے تشریف لائے تھے۔ گیلری میں ہی میڈیا والوں نے گھیرا۔ سچی کہانیاں کے بارے میں بات کرنے کے لیے جو کہ آن دی ریکارڈ ہے۔ دلشاد نسیم، زمر نعیم، نسیم نیازی، ممتاز احمد اور بہت سے دیگر رائٹرز نے اور میں نے پرل پبلی کیشنز ماہنامہ سچی کہانیاں، دوشیزہ، آئیڈیل کے بارے میں تعارف اور خیالات کا اظہار کیا۔ سب مہمانوں کو ہال میں بیٹھنے کی دعوت دی۔ اندر کافی گہما گہمی کا سماں پیدا ہوا۔ اسٹیج پر ایک طرف بہت سے خوب صورت ایوارڈز سجے تھے۔ ایک طرف مائیک سنبھالے اناؤنسر خوش آمدید اور اپنی باتوں سے محظوظ کر رہے تھے۔ پھر مہمان خصوصی سابق وزیر جنگلات، اداکار راشد محمود، اورنگ زیب لغاری، صوفی تبسم کی پوتی ڈاکٹر فوزیہ اور سب مہمان گرامی کی آمد بڑھتی گئی اور رونق دوبالا ہوتی گئی۔ شیما عبدالقیوم، حنا بشریٰ، فصیحہ آصف (ملتان سے آمد)، فریدہ جاوید فری، فریدہ خانم، چکوال سے عبدالعزیز جی آ، نسیم سکینہ

صدف (ڈسکہ سے) شامل ہوئے۔ فصیحہ سے ملنے اسے دیکھنے کا بتہ اشتیاق تھا اور راحت وفا سے بھی لاہور میں ہوتے ہوئے رابطہ ہوتے ہوئے بھی یہ سہرا منزہ آپ کے اور کاشی کے سر سجا۔ بہت سے پیارے ساتھیوں کے نام بھی معلوم نہ ہو سکے۔ اس خوب صورت تقریب سے لطف اندوز ہونے کے لیے سب نے نشستیں سنبھالیں۔ میرے دائیں بائیں زمر نعیم، نسیم نیازی، راحت وفا راجپوت تھیں۔ پیاری منزہ آپ ناسازی طبع اور اقبال بانو طبیعت کی خرابی وجہ سے شامل نہ ہوئے، آپ کی کمی شدت سے محسوس ہوتی رہی۔ تقریب کا آغاز تلاوت کلام پاک اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا۔ پھر دلشاد نسیم جی کو اسٹیج پر ایوارڈ دینے کے لیے بلایا گیا اور سب سے پہلا ایوارڈ اناؤس ہوا تو میں اتنا خوش ہوئی اس مان پر کہ میری کہانی ''عجب مقدر ہے میرا'' پر تھا۔ پیاری منزہ اور عزیز بیٹے کاشی میں آپ سب کی شکر گزار ہوں۔ اس مان اور عزت افزائی پر۔ پھر یہ سلسلہ چلتا ہی گیا۔ ایوارد تقسیم کے دوران وقفے وقفے سے رنگا رنگ پروگرام بھی چلتے رہے۔ سنبل کا ایوارڈ زمر نعیم نے اور اقبال بانو کا نسیم نیازی نے وصول کیا۔ احمد سجاد بابر، سنبل اور ایڈیسن ادریس مسیح ایوارڈ یافتہ ہونے کے باوجود آنہ سکے۔ ان کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ یہ سب بہت اچھا ہی نہیں بلکہ بہترین لکھنے والے ہیں۔ حنا بشریٰ، شیما عبدالقیوم بھی بہت اچھی رائٹر ہیں۔ شائستہ چک شہزاد سے آئیں۔ ایوارڈ ملا۔ شائستہ سے کچھ ٹائم کمپنی کی بہت اچھا لگا۔ اسی طرح ہنستے مسکراتے ایوارڈ تقسیم کے بعد سب کو ملنے کا موقع ملا۔ فصیحہ آصف سے مل بیٹھنے کا جو ولولہ اور جوش تھا بالکل ادھورا رہ گیا کیونکہ وہ فریدہ جاوید فری کی طرف آئیں۔ ملتان سے اپنے بھانجے کے ساتھ اور فریدہ نے واپسی کی جلدی میں یہ موقع ہی نہ دیا کیونکہ فصیحہ نے رات فریدہ کی طرف رک کے صبح ملتان واپس روانہ ہونا تھا۔ جو لوگ دوسرے شہروں سے شمولیت کے لیے آئے انہوں نے بھی واپس جانا تھا۔ کیونکہ سردی کافی تھی۔ اس دوران بارش بھی مسلسل تھی۔ اس کے باوجود سب بڑی محبت سے سفر کر کے شامل ہوئے۔ کاشی کی بیوی اور بیٹوں سے ملاقات کی۔ ماشاء اللہ دیان اور عبدالرحمن خاصے پیارے بچے ہیں۔ دیان نے سب کو سچی کہانیاں کا تازہ شمارہ فرداً فرداً پیش کیا۔ سب کے ہاتھوں میں جنوری 2017ء کا سچی کہانیاں جگمگا رہا تھا۔ یوں ملتے ملاتے گھروں کو واپسی ہوئی۔ منزہ بہت شکریہ اور مبارک لاہور میں تقریب منعقد کرنے کا اور کاشی تمہاری محنت اور بھاگ دوڑ سے یہ سب

رضوانہ کوثر دلشاد نسیم کے ہاتھ سے اپنا ایوارڈ وصول کر رہی ہیں

انتظام (کراچی سے لاہور آ کر) کر کے تقریب کو کامیاب بنانے پر بہت مبارک اور شاباش تمہارا حق ہے بیٹا اور منزہ ڈیئر آپ کی کمی بہت زیادہ محسوس کی۔ جناب سہام مرزا کو یاد کرتے ہوئے اور انہوں نے آپ سے پہلی تعارفی ملاقات کراتے ہوئے جو الفاظ مجھے کہے تھے کہ رضوانہ یہ منزہ میری بیٹی جو انشاء اللہ میری جانشین ثابت ہوگی۔ منزہ ایک دفعہ پھر آپ اور کاشی کے لیے بہت مبارک اور دعائیں۔

☆☆☆

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

فیضیہ آصف خان (ملتان)

محترم قارئین کرام السلام علیکم! کافی مہینوں سے اِک خبر گردش کر رہی تھی کہ سچی کہانیاں کی ایوارڈ تقریب لاہور میں منعقد کی جائے گی۔ سو دل بلیوں اچھلنے لگا۔ سہیلیوں سے ملنے کو مچلنے لگا۔ آخر کار پتا چلا کہ 26 جنوری کو یہ تقریب لاہور میں ہو گی۔ یوں جانے کی تیاری ہونے لگی۔ آخر کار 26 جنوری کو سخت سردی اور بارش میں صبح 10 بجے ڈائیو ٹرمینل پہنچے اور لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ سفر دھیرے دھیرے تمام ہونے لگا۔ مجھے بہت انتظار تھا ان لمحات کا جب میں اپنی ان جان سے عزیز ہستیوں سے ملوں گی، جن سے صرف آواز کا رشتہ تھا۔

فریدہ جاوید فری صاحبہ نے ہمیں شرفِ میزبانی بخشا۔ شام ساڑھے چار بجے کے لگ بھگ لاہور پہنچے اور فریدہ صاحبہ کے دولت خانے پر جانے کے لیے دھڑکتے دل سے سفر طے کرنے لگے۔ شادمان کے سرسبز علاقے میں ان کا خوب صورت گھر جب آیا تو دھڑکن مزید تیز ہو گئی۔ یہاں بھی بارش پورے شدومد سے جاری تھی۔ تقریب کا وقت قریب آ رہا تھا اور دل مسرت کی لے پر تھرک رہا تھا۔ فریدہ صاحبہ نے ہمیں دیکھتے ہی ایسا پرتپاک استقبال کیا کہ مدتوں یاد رہے گا۔ پھر لذیذ کھانا کھلایا۔ اس کے بعد تیار ہو کر انہی کے ہمراہ ہم پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لٹریچر پہنچے جہاں تقریب کا اہتمام تھا۔ فریدہ فری نے بہت خوب صورت گلابی زرق برق لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ جس میں وہ کانچ کی گڑیا لگ رہی تھیں جیسے ہی ہم گیٹ میں داخل ہوئے سب سے پہلے بھائی کاشی چوہان نے خوش آمدید کہا اور محبت و شفقت سے سر پر ہاتھ رکھا۔ ان سے ذرا فاصلے پر آپی رضوانہ کوثر، پیاری نسیم نیازی اور دلکش سی زمر نعیم تینوں نے مجھے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے کر پیار و خلوص کی برسات کر ڈالی۔ میں ان کی محبت کی دل سے ممنون ہوں کہ ان کے چہروں پر سچی محبت جھلک رہی تھی۔ مہمانوں سے جگہ بھرتی جا رہی تھی ایسے میں بشریٰ سعید احمد، اشفاق شاہین، طاہر ساقی اور دیگر سے ملاقات ہوئی۔ تقریب کی جگہ داخل ہوئے تو کافی لوگ آ چکے تھے۔

تلاوت کے بعد نعتِ رسول مقبولؐ سے فیض یاب ہوئے۔ بے شمار چہرے تھے، روشن اور ذہانت سے پر آنکھوں والے، مہمانانِ گرامی میں ڈاکٹر صغریٰ صدف، آمنہ الفت، فنکار برادری میں راشد محمود، اورنگ زیب لغاری اور گلوکاروں نے اپنے اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ تقریب اپنے عروج پر تھی۔ ایوارڈز دیئے جا رہے تھے۔ محترمہ دلشاد نسیم صاحبہ نے خوبصورت گفتگو کی اور دل موہ لیا اسی دوران میری بہت اچھی سہیلی فریدہ خانم آ گئیں اور ہم دونوں دیوانوں کی طرح ملے۔ مجھے اب انتظار تھا تو نسیم سکینہ صدف کا آخر کار وہ دورانِ تقریب آ ہی گئیں۔ ہم دونوں بے ساختہ لپٹ گئے۔ میرے لیے یہ لمحات بے حد یادگار تھے اور یہی مصرع لبوں پر آتا رہا

'تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے'

چاند چہرے اور ستارہ آنکھوں والے پڑھے لکھے لوگوں سے ہال پُر تھا۔ ایوارڈ دیئے جا رہے تھے، میوزک، نغمے، سب باری باری ہو رہے تھے۔ مجھے میری کہانی، آخری دعا، پر سرٹیفکیٹ دیا گیا، شکریہ۔ یوں یہ تقریب شام چھ بجے سے رات دس بجے تک جاری رہی خوب صورت کمپیئرنگ سے ماحول گرمائے رکھا۔ تقریب کے اختتام پر راحت وفا

راجپوت بہت خلوص سے ملیں۔ یوں ہم سب سے مل کر۔ کچھ تصاویر بنوا کر خوشگوار لمحات کو دل میں لیے واپس ہو لیے۔ آنکھیں نم تھیں مگر دل خوشی سے بھرے تھے۔ صرف ایک شکوہ رہا کہ.....! خیر جانے دیجیے۔ سب سے ملاقات ہوئی۔ اپنی کافی ساری کتابیں تحفتاً دیں۔ اسی طرح فیصل آباد کے بھائی علی رضا بھٹی نے بھی اپنی کتاب دی اور ڈاکٹر طارق محمود ڈسکہ والے بھی میری کتاب لے کر خوش ہوئے۔ عبدالعزیز جی آ بہت نفیس بزرگ لگے، بھائی شاہد مغل سے بھی تعارف ہوا۔ یوں ہم بارش سے لطف اندوز ہوئے فریدہ جاوید فری کے گھر آ گئے۔ دل بے حد مطمئن، فرحاں و شاداں تھا، کہ کسی بہانے سب سے ملاقات ہوگئی۔

ایسی تقاریب ہوتی رہنی چاہیں تاکہ گاہے بگاہے ملاقات ہوتی رہے۔ تقریب کو سجانے اور انتظامیہ کو مبارکباد پیش ہے۔ پورے جنوبی پنجاب سے آئے ہوئے مصنفین نے اپنا قیمتی وقت نکال کر اسے رونق بخشی۔ امید ہے کہ آپ کو یہ آنکھوں دیکھا حال پسند آیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے اور ہر مشکل سے دور کر کے آپ کے لیے آسانیاں پیدا کرے، آمین۔

☆☆☆

محبت زندہ باد!

شاہد محمود مغل (کاموکے)

جب مجھے کاشی چوہان کا فون آیا کہ 26 جنوری 2017ء کو سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ تقریب کا اہتمام کیا ہے جو کہ کراچی کی بجائے لاہور میں منعقد ہو رہا ہے۔ آپ نے ضرور آنا ہے۔ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی میری خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ بڑی بے چینی سے دن گزارے اور 26 جنوری کا دن آیا۔ بارش نے مایوس کر دیا۔ محکمہ موسمیات کے مطابق بارشیں ہفتہ بھر رہنی تھیں۔ میرا بہت دل چاہ رہا تھا لاہور جانے کو کیونکہ وہاں بہت سے بڑے بڑے ملک کے نامور لوگ جن کو صرف میں نے پڑھا تھا، ادبی رسائل میں تو ان سے ملنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ خیر بارش میں بھی دیہات کی کچی پکی سڑکوں سے ہوتا ہوا میں کاموکی آیا۔ ساتھ میں اپنا ایک ڈریس لیا اور ایک دوست کے فلیٹ میں اسے چینج کیا۔ اسٹاپ پر لاہور جانے والی بس کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ ایک گھنٹے بعد شدید بارش میں بس نے شکل دکھائی اور میں اپنے کپڑوں کو بچاتا ہوا لاہور روانہ ہو گیا۔ تقریباً پونے چار بجے میں پنجاب کمپلیکس میں پہنچا تو صدر دروازے پر کاشی چوہان نے محبت سے مسکراتے ہوئے گلے لگایا۔ ہال اندر سے بھی بہت خوب صورت تھا۔ میں ایک خالی نشست پر بیٹھ گیا۔ ابھی چند مہمان ہی آئے تھے۔ میں مسرت محسوس کر رہا تھا کہ ٹی وی میں اس طرح کے شو دیکھتے تھے اور آج میں خود بھی شریک ہوں۔ پھر برستی بارش میں جوق در جوق مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا اور تقریب کا آغاز اللہ کے پاک نام سے شروع ہوا تو نامور رائٹرز اور پھر سرسنگیت نے لوگوں کو مدہوش کر دیا۔ میڈیا والے بھی اس شو کی کوریج کر رہے تھے۔ تقریباً پانچ گھنٹے تک ایوارڈز کا سلسلہ چلتا رہا پھر ختم ہونے کے بعد ملنے ملانے کا سلسلہ چلتا رہا۔ سب ایک دوسرے کے ساتھ سیلفیاں بناتے رہے۔ میں نے بھی اپنے پسندیدہ رائٹرز کے ساتھ سیلفی بنائی۔ پھر مہمانوں نے اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔ چونکہ رات زیادہ ہو گئی تھی تو میں پھر کاموکی ٹھہر گیا۔ اپنے دوست کے پاس اور صبح اپنے گھر گیا۔ خوشی سے جھومتا۔ واقعی محبت زندہ باد ہے!

☆☆☆

میں بھی اک کردار تھا اس کہانی کا

(قاسم حسین (رحیم یار خان)

ایوارڈ پانے کی خواہش کس کو نہیں ہوتی۔تقریباً سبھی چاہتے ہیں کہ ان کو ایوارڈ سے نوازا جائے چاہے وہ اچھا لکھنے والے ہوں یا نہ ہوں لیکن بات یہ بھی ہے کہ ہر لکھنے والا اپنی طرف سے سب سے بیسٹ ہی لکھتا ہے۔کوئی نہیں چاہتا کہ اس کا لکھا ردی کی ٹوکری میں جائے۔اپنی نظر میں ہر کوئی اپنی کہانی پر آسکر ایوارڈ کا حقدار ہوتا ہے لیکن ہائے یہ زمانے والے ظالم لوگ۔ایوارڈ کی اگر قیمت دیکھی جائے تو کچھ بھی نہیں ہوتی۔کوئی کباڑیہ لے کر آپ کو ایک بھی پیسہ نہ دے لیکن اگر اس کی اہمیت دیکھی جائے تو اس سے زیادہ قیمتی چیز اور دنیا میں کہیں نہیں۔کیونکہ یہ آپ کو بتاتا ہے کہ آپ کس قدر قابل اور باکمال ہیں۔

ایوارڈ کا ذکر جب بھی احوال میں کوئی کرتا تو دل میں ایوارڈ پانے کی حسرت جاگ اُٹھتی کہ مجھے بھی ایوارڈ ملے۔لیکن اگلے ہی لمحے حقیقت کا سامنا ہو جاتا کہ میں تو ابھی آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں پھر مجھے کیسے ایوارڈ مل سکتا ہے اور حسرت ایک دم سے مر جاتی۔اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ میں نے کبھی بھی خود کو اچھا لکھنے والوں میں شمار نہیں کیا تھا۔مجھے ہمیشہ یہی لگتا تھا کہ میں نے جو لکھا ہے کچھ خاص نہیں لکھا۔اور اکثر ایسا بھی ہوتا کہ میں نے کئی کہانیاں خود ہی ردی کی ٹوکری میں ڈال دیں کہ معیار پر پورا نہیں اترتیں۔اس کے پیچھے وجہ یہ تھی کہ میری کوئی بھی کہانی جلدی شائع نہیں ہوئی اور اگر ایوریج نکالی جائے تو پورا سال بنتا ہے کہانی شائع ہونے میں۔اس سے مجھے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ میں کیسا لکھتا ہوں۔اچھا لکھتا ہوتا تو ظاہر ہے جلد نمبر آجاتا کہانی کا۔۔۔۔۔۔

2015 کی رائٹر ایوارڈ فہرست شائع ہوئی تو اُس میں میری کہانی کا نام بھی شامل کیا گیا تھا لیکن شہر کا نام غلط لکھا گیا تو کسی نے کہا بھائی اتنا بھی اترانے کی ضرورت نہیں ہو سکتا ہے غلطی سے تمہارا نام لکھا گیا ہو اب تم اتنا بھی اچھا نہیں لکھتے کہ تمہیں ایوارڈ ملے۔تب مجھے اس پر غصہ نہیں آیا بلکہ میں اس کی بات سے اگیری ہو گیا تھا کہ ہاں بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔

اور پھر جب اگلی کہانی بھیجی تو اس کو چھپنے میں آٹھ ماہ لگ گئے اور تب تک مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں واقعی اچھا نہیں لکھتا۔اور پھر اس کے بعد دل اچاٹ ہو چکا تھا کہ جب معیار پہ لکھ ہی نہیں سکتا تو بہتر ہے لکھنا ہی چھوڑ دیا جائے۔اور پھر چار ماہ بعد رائٹر ایوارڈ فہرست شائع ہوئی تو اس میں ایک بار پھر میرا نام شامل تھا لیکن مجھے پڑھ کر کوئی خاص خوشی محسوس نہیں ہوئی تھی۔اور نہ ہی میں نے اس کو کوئی اہمیت دی تھی۔کیونکہ میں دلی طور پر نہ لکھنے کا ارادہ کر چکا تھا۔گھر والوں نے پوچھا کہ تقریب میں جاؤ گے؟ تو میں نے انکار کر دیا کہ نہیں۔کچھ دن بعد پھر اس موضوع پر بات چھڑ گئی تو ''میں سوچوں گا'' کہہ کر ٹال دیا۔اور پھر ایک صبح موبائل کی

بیل کی آواز پر آنکھ کھلی تو دیکھا کوئی انجان نمبر تھا۔ کال اٹینڈ کی اور آواز پہچاننے کی کوشش کی کہ کون ہو سکتا ہے؟ بہت کوشش کے باوجود بھی میں پہچان نہ سکا۔ اور جو چیز کنفیوز کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ آواز انجان تھی لیکن لہجہ اپنوں والا تھا۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے نہ میں پہچان پایا نہ دوسری طرف سے بتایا گیا۔ آخر میں سوچنے لگا کہ کون ہو سکتا ہے جو یہ جانتا ہے کہ میں لکھتا بھی ہوں۔ کیونکہ میرے تو رشتہ داروں میں بھی بہت کم لوگ جانتے ہیں اور دوست وہ جانتے ہیں جو بہت قریبی ہیں۔ میں کنفیوز تھا کہ آخر ایسا کون ہے جو مجھے جانتا ہے لیکن میں اسے نہیں جانتا اور پھر تھک ہار کر میں نے اندھیرے میں تیر مارنا شروع کر دیے تھے اور آخر کار ایک ٹھکانے پر لگ ہی گیا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ وہ ''کاشی چوہان صاحب'' تھے اور پھر ان سے بات کرنے کے بعد ذہن ایک دم سے بدل گیا تھا۔ اور میں تقریب میں جانے کیلئے خود کو تیار کر چکا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اگر کاشی چوہان صاحب کی طرف سے فارمیلٹی کال موصول ہوتی تو میں تو ہرگز تقریب میں نہ آتا۔ یہ ان کی محبت بھری کال کا اثر تھا کہ میں خود کو تقریب میں آنے کے لیے روک نہ پایا۔ کال سے فری ہوتے ہی پہلی فرصت میں کمپنی والوں کو کال کی تھی۔ اور 26 تاریخ کی چھٹی کی درخواست دے دی تھی جو کہ اسی وقت قبول ہو گئی تھی۔ اور میں اُس طرف سے بھی ٹینشن فری ہو گیا تھا۔ باقی کے دن بڑی تیزی سے گزرے تھے۔ اور وہ دن آ گیا تھا جب مجھے رحیم یار خان سے لاہور کی طرف روانہ ہونا تھا۔

گھر سے جب نکلا تو موسم ابر آلود تھا ٹھنڈی ہوا اور سردی اپنا آپ دکھا رہی تھی۔ دوست ریلوے اسٹیشن پر چھوڑنے آیا تھا۔ اسٹیشن پر آئے تو معلوم ہوا شالیمار ایکسپریس حسب معمول آدھا گھنٹہ لیٹ ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اور پھر ٹرین آنے تک ہم دونوں نے گپیں لڑائی تھیں۔ اور پھر اللہ اللہ کر کے گاڑی پلیٹ فارم پر آئی تھی۔ دوست سے مل کر میں مطلوبہ ڈبے میں سوار ہوا تھا اور پھر اپنے برتھ پر ایک لمبا سانس لیتے ہوئے جا بیٹھا تھا۔ کیونکہ آگے کا آٹھ دس گھنٹے کا لمبا سفر تھا۔ اور اس کو کاٹنے کے لیے میرے پاس چند چپس اور نمکو کے پیکٹ اور ایک عدد رسالہ تھا۔ جن سے صرف ملتان تک کا سفر کٹنا تھا۔ اور باقی کا پرانے دوستوں کو میسج کر کے جن کے ساتھ عرصہ ہوا تھا کبھی بات نہیں ہوئی تھی۔ راستے میں ہی پتا چلا کہ لاہور کے موسم کے تیور کافی خطرناک ہو چکے ہیں صبح سے بارش ہو رہی ہے اور اب تک جاری ہے۔

گیارہ بجے کے قریب کاشی چوہان صاحب کا میسج آیا کہ تقریب کی جگہ بدل گئی ہے۔ اور میں نے بھی پڑھ کر شکر ادا کیا تھا کیونکہ پرانا ایڈریس گوگل پر سرچ کرنے سے بھی نہیں مل رہا تھا۔ اور نیا ایڈریس آسانی سے مل گیا تھا۔ لاہور اسٹیشن پر گاڑی نے ایک بجے اتارا تھا۔ اور جب باہر نکلا تو ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اور سڑکوں پر جمع پانی سارا حال کہہ رہا تھا۔ باہر نکل کر پھوپو جی کے گھر کی جانب جانے والے رکشہ میں جا بیٹھا تھا۔ رکشہ ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ بارش نے ویلکم کہہ دیا تھا اور گھر جاتے جاتے میں پوری طرح سے بھیگ چکا تھا۔ اور دانت تقریباً بجنے لگے تھے۔ گھر پہنچتے پہنچتے پونے دو ہو گئے تھے۔ گھر پہنچا تو کزن اور پھوپو جاگ رہے تھے میرے انتظار میں۔

کپڑے تبدیل کر کے جب میں بستر میں آیا تو میرے نانا کرنے کے باوجود پھوپو نے گرم دودھ کا مگ میرے ہاتھ میں تھما دیا تھا اور پھر حال احوال بتاتے ہوئے تین بج گئے تھے۔

صبح جب آنکھ کھلی تو گیارہ بج رہے تھے۔ اور باہر بارش کبھی ہلکی ہو جاتی تو کبھی پھر تیز ہو جاتی۔ موسم کا حال دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا تھا کہ اگر ایسا ہی چلتا رہا تو وہاں پہنچوں گا کیسے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں تک آ کر بھی شامل نہ ہو سکوں۔

گیارہ سے چار بجے کا وقت بڑی مشکل سے گزرا تھا۔ کبھی بارش تیز ہوتی کبھی کم ہو جاتی۔ کبھی میں چھت پر چلا جاتا کبھی نیچے آ جاتا کیونکہ کرنے کو کچھ تھا نہیں۔ ادھر تین بجے تو ادھر بارش زور سے شروع ہو گئی تھی اور میں کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھا بارش کے رکنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ساڑھے تین ہوئے پھر چار

ہوئے۔ بارش نے نہ رکنے کی قسم کھا رکھی تھی اور پھر سوا چار بجے کے قریب بارش ہلکی ہوئی تھی اور یہی موقع تھا میرے نکلنے کا۔

کزن تھوڑی دیر پہلے کام سے واپس آیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ چلو گے ساتھ۔ تو وہ پوچھنے لگا کہاں؟ تو میں نے کہا قذافی اسٹیڈیم۔ تھوڑا سا کام ہے وہاں جانا ہے اور ایک دوست کو ملنا ہے۔ تو اس نے کوئی اہمیت نہیں دی اور جانے سے انکار کر دیا۔ بارش جیسے ہی ہلکی ہوئی تھی۔ میں گھر سے نکل آیا تھا۔ مین روڈ سے آکر آٹو لیا تھا۔ اور آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد قذافی اسٹیڈیم کے دروازے پر تھا۔

سٹیڈیم کے دروازے پر جب میں اترا تو ہلکی بارش تیز ہونے لگی تھی۔ جوں جوں قدم پنجا کمپلیکس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بارش تیز اور تیز تر ہو رہی تھی۔ بارش کے ساتھ ہی میرے قدموں کی اسپیڈ بھی بڑھ گئی تھی۔ بھاگنے کے انداز میں اندر داخل ہوا تھا اور پھر موبائل نکال کر کاشی صاحب کو کال کی تھی۔ کیونکہ وہاں سارے اجنبی چہرے ہی نظر آرہے تھے۔ کاشی صاحب باہر آتے ہی کمال محبت سے گلے ملے تھے۔

کال کی طرح حقیقت میں بھی ویسے ہی تھے۔ کوئی ایڈینوٹ نظر نہیں آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ بات آگے بڑھتی ان کو کسی نے آواز دی اور وہ اُن کی طرف چلے گئے تھے۔ اور میں ان کے پیچھے ہی داخلی دروازے سے اندر داخل ہوا تھا۔

ہال میں داخل ہوا تو کاشی چوہان صاحب بہت مصروف نظر آرہے تھے۔ ہال میں ابھی تھوڑے مہمان ہی نظر آرہے تھے۔ پروگرام کی تیاری بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔ سچی کہانیاں کا بینر سٹیج پر کھڑا کیا جا رہا تھا۔ ایک طرف ایوارڈز کو ترتیب سے رکھا جا رہا تھا۔ دوسری طرف خاص مہمانوں کے نام کرسیوں پر چپکائے جا رہے تھے۔ ساؤنڈ سسٹم والے اپنے ساؤنڈ کو ترتیب دے رہے تھے۔ ہر کوئی بڑا مصروف نظر آرہا تھا۔ کاشی چوہان صاحب کچھ زیادہ ہی مصروف نظر آرہے تھے۔ ایک لمحہ پہلے جہاں نظر آتے اگلے ہی لمحے وہاں سے غائب ہو جاتے۔

میں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر گیلری پر جا بیٹھا تھا۔ جہاں پہلے ہی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ آہستہ آہستہ ہال مہمانوں سے بھرنے لگا تھا۔ اور رونق بڑھنے لگی تھی چار پانچ کیمرہ مین گھوم رہے تھے اور مووی بنا رہے تھے۔ اور کچھ لوگ سیلفیاں بنانے میں مصروف تھے۔

اسٹیج کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں ہر چیز کو ترتیب دیا گیا تھا۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد میزبان اسٹیج پر خوبصورت آواز اور حسین چہروں کے ساتھ دانیہ انور اور عباس رائے جلوہ گر ہوئے تھے۔

تقریب کا آغاز قرآن پاک کی تلاوت سے قاری صاحب نے بڑی خوبصورت آواز میں کیا تھا۔ تلاوت نے روح کو کافی پرسکون کیا تھا۔ تلاوت کے بعد نعتِ رسولِ مقبول نے سامعین کو اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ مہمان اب بھی آرہے تھے اور خصوصی مہمان بھی آہستہ آہستہ اپنی سیٹ سنبھال رہے تھے۔ اور ہال میں موجود لوگ تالیوں سے ان کا ویلکم کر رہے تھے۔

اور پھر ایوارڈ دینے کا سلسلہ 2014 سے شروع ہوا تھا۔ 2014 کے چند رائیٹرز کو ایوارڈ دیا گیا تھا۔ اور پھر اس کے بعد 2015 کے رائیٹرز کو ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ مہمانوں کے آنے کا سلسلہ اب بھی جاری تھا۔ اور مہمانوں سے ہال کھچا کھچ بھرنے لگا تھا۔ یہ سب کاشی چوہان صاحب کی محبت کا کرشمہ تھا کہ موسم خراب ہونے کے باوجود لوگ تقریب میں کھنچے چلے آرہے تھے۔ اور آنے والے مہمان صرف لاہور شہر سے نہیں آرہے تھے بلکہ دور دراز کے علاقوں سے آئے تھے۔ میرا جس سے بھی تعارف ہوا وہ لاہور سے باہر کا ہی تھا۔

2015 کے ایوارڈ کی تقسیم کے بعد ایک خوبصورت پرفارمنس کو شامل کیا گیا۔ جس نے تقریب کا موسم تبدیل کیا تھا۔ کچھ لوگ بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اس بدلے رنگ کو دیکھ کر شاید ان کو اس کی اُمید نہیں تھی۔

ہمارے معزز مہمانوں میں بڑی نامور شخصیات شامل تھیں جن میں ڈاکٹر مرتضیٰ مغل کالم نگار دانشور نظریہ پاکستان ٹرسٹ کے رہنما، پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ

تبسم شاعرہ افسانہ نگار ماہر تعلیم جو کہ صوفی غلام تبسم کی پوتی ہیں۔ عمران مسعود سابق وزیر تعلیم پنجاب وائس چانسلر یونیورسٹی آف سادتھ ایشیا، محترمہ آمنہ الفت سابق ممبر صوبائی اسمبلی کالم نگار شاعرہ اور معروف فلم رائٹر ناصر ادیب کی بیوی، افتخار افی معروف ڈرامہ رائٹر، ڈولی معروف ٹی وی میزبان، ڈاکٹر صغریٰ صدف شاعرہ ڈائریکٹر پنجاب انسٹیٹیوٹ آف لینگویج آرٹس اینڈ کلچر، راشد محمود، معروف ڈرامہ ایکٹر، اورنگزیب لغاری۔ معروف ڈرامہ ایکٹر اسد بیگ، حبیب جالب کی بیٹی، ڈرامہ ایکٹر تحسین جنہوں نے محفل کو رونق بخشی۔

ایک خوبصورت پرفارمنس کے بعد ایوارڈ کا سلسلہ ایک بار پھر سے شروع ہوا تھا۔ اب کی بار 16 20 کے جنوری کے رائٹرز سے سلسلہ شروع ہوا تھا۔ مہمانِ خصوصی کو سٹیج پر دعوت دی گئی تھی ایوارڈ دینے کے لیے۔ چند ایوارڈ دیے گئے تھے۔ اس کے بعد ایوارڈ کا سلسلہ روک دیا گیا تھا اور ایک مشہور گلوکار کو سٹیج پر اپنی آواز کا جادو دکھانے کے لیے دعوت دی گئی تھی۔ گلوکار نے اپنی آواز کا جادو جگایا تھا اور رکے ہوئے ایوارڈ دینے کے سلسلے کو ایک بار پھر سے شروع کیا گیا تھا۔

اور پھر یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھتا رہا کچھ ایوارڈ دینے کے بعد ایک پرفارمنس ہوتی اور کچھ ایوارڈ دیے جاتے۔ پھر کوئی گلوکار آ کر اپنی آواز کے سُر بکھیرتا اور پھر ایوارڈ کا سلسلہ چل نکلتا اسی دوران مہمانِ خصوصی کو سٹیج پر آنے کی دعوت دی گئی۔

اسی درمیان ہماری بھی باری آئی ہم بھی ایوارڈ لے کر واپس اپنی جگہ پہنچے۔ ایوارڈ دینے کا سلسلہ ایک دم سے تیز ہوا تھا۔ یہ تیزی وقت کی کمی کی وجہ سے آئی تھی۔ کیونکہ وقت کم تھا اور ایوارڈز اور بہت سی پرفارمنسز باقی تھیں۔

کچھ رائٹر کسی مجبوری کی وجہ سے خود نہیں آ سکے تھے ان کی جگہ رشتہ داروں نے ایوارڈ وصول کیے تھے۔

اسٹیج پر میلا سا لگ گیا تھا ایک طرف کاشی چوہان صاحب ایوارڈ سرٹیفکیٹ تقسیم کر رہے تھے۔

گلوکارہ جنہوں نے اپنی آواز سے محظوظ کیا ان میں صائمہ اختر، شمع لال، کرن ہزوری، شبانہ عباس، بشریٰ ماروی شامل تھیں۔ اور میل گلوکاروں میں فیضان علی فیضی، بلال طاہر، دانش کھچی، طاہر ساقی نے اپنی آواز سے رونق بڑھائی۔

تقریب کی آخری پرفارمنس صوفیانہ تھی۔ تقریب ختم ہوئی تو تقریباً سبھی لوگ اپنی جگہ چھوڑ کے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ میں بھی اپنی جگہ سے اُٹھا تھا اور میری آنکھیں کاشی چوہان صاحب کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اور پھر وہ مجھے نظر آ ہی گئے وہ لوگوں سے گھرے ہوئے تھے اور جانے والوں کو رخصت کر رہے تھے۔

کاشی چوہان صاحب سے جب میں نے رخصت چاہی تو انہوں نے روک لیا کہ چلے جانا رکو ابھی۔ اور میں ایک طرف کھڑا ہو گیا اور وہ سینئر رائٹرز کو کمپنی دینے لگے جو جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ انہیں رخصت کر کے کاشی چوہان صاحب میری طرف متوجہ ہوئے تھے۔ ابھی تھوڑی بات ہی ہوئی تھی کہ کسی نے ان کو آواز دی تھی۔ اور وہ ان کی طرف چلے گئے۔ اب ایک کاشی چوہان صاحب اور اتنی چاہنے والے۔ بڑی مشکل کے ساتھ وہ سب سنبھال رہے تھے، لیکن سب کچھ خوش اسلوبی سے۔ اور میں ایک طرف کھڑا ان کو بھاگتا دوڑتا دیکھ رہا تھا اور پھر تھوڑی دیر بعد کاشی چوہان صاحب سب کو رخصت کر چکے تھے۔ ہم تین لوگ رہ گئے تھے کاشی چوہان صاحب بلال فیاض اور میں۔ ہم تینوں اکٹھے باہر نکلے۔ باہر آ کر ہم نے فوٹو گرافر سے تصویر بنوائی اور کافی لوگ کامیاب تقریب کی کاشی چوہان صاحب کو مبارکباد دے رہے تھے کہ اتنا بڑا پروگرام اتنے کم وقت میں انہوں نے اچھے طریقے سے مینج کیا تھا۔ اور یہ بس کاشی چوہان صاحب ہی کر سکتے تھے اور پھر تھوڑی دیر بعد ہم پنجاب کمپلیکس کی عمارت سے باہر نکل آئے تھے۔ کاشی چوہان صاحب کو ان کی گاڑی کے قریب چھوڑا تھا اور ان سے اجازت لے کر میں واپسی کے سفر پر نکل آیا تھا۔

☆☆☆

میرے دل کی بات

نعیم بیگ، صدف (ڈھنگ)

ملک کی ممتاز اور معرف صحافی، افسانہ نگار اور کالم نویس محترمہ منزہ سہام مرزا کے رسالے سچی کہانیاں کی انعامی تقریب پذیرائی پنجاب انسٹی ٹیوٹ لاہور کے زیر اہتمام منعقد کی گئی۔ سب سے پہلے تو منزہ جی کی کمی بہت محسوس کی۔ محفل میں جن کے دم سے رنگ بکھرنے تھے۔ وہ نہ آسکی تھیں۔ انسان کا خواب سے رشتہ جڑا ہے۔ خواب ہی تو ہیں۔ جن سے انسان کی زندگی میں کچھ دل کشی باقی ہے، جب یہ آس بھی ٹوٹ جاتی ہے تو انسان پاگل بھی ہوسکتا ہے یا پھر خودکشی کر لیتا ہے۔ ادب کے سلسلے میں کاشی چوہان نے آسوں کے ٹوٹنے کے باوجود خودکشی نہیں کی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس دیو تک بہت کم لوگ پہنچیں گے۔ 26 جنوری 2017ء ماہنامہ سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی تقریب کا دن بھی کیسا خون خشک کر دینے والا دن تھا۔ اس تاریخ سے بھی پہلے مجھے کاشی چوہان نے بتایا تھا کہ سچی کہانیاں کے ایوارڈز کے سلسلے میں منزہ سہام مرزا ایک تقریب کرنا چاہتی ہیں۔ میں بہت خوش ہوئی۔ تقریب سے ہفتہ پہلے ہمیں تقریب میں شامل ہونے کی دعوت ملی تو 26 جنوری کی شام برستی بارش میں، آصف محمود مغل میرے ہسبینڈ اور بیٹا خلیل گلریز اور کشف آصف میری بیٹی کے ساتھ ہم وقت مقررہ پر پنجاب انسٹی ٹیوٹ پہنچے۔ دیکھا تو حال میں بے شمار لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر براجمان تھے۔ ایک طرف جناب کاشی چوہان صاحب آنے والے معزز مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ دوسری طرف خوش رنگ لباس میں ڈولی کھڑی تھیں۔ اس وقت سارا ہال بھر چکا تھا۔ شام کا وقت تھا اور اب بھی کچھ احباب چلے آرہے تھے۔ اس کے بعد میں اور کشف بھی ایک سائیڈ میں جا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد میری دوست فصیحہ آصف خان نے مجھے اپنے پاس بلا لیا جہاں فریدہ جاوید فری، فریدہ خانم، زمر نعیم، رضوانہ بوٹر، نسیم نیازی اور راحت وفا راجپوت بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ بھی ہماری بہت پیاری دوستوں میں شامل تھیں۔ عباس رائے اور دانیہ انور مائیک کے سامنے آئے اور تقریب کا آغاز ہو گیا۔ خوب رواں زبان میں بڑی معلوماتی اور عالمانہ باتیں ہوئیں۔ آنے والے مہمانوں نے خوب خوب صورت باتیں کیں۔ جن سے ایمان بھی روشن ہوا اور اچھا لکھنے کی جستجو بھی بڑھی۔ آنے والے مہمانوں میں ڈاکٹر صغریٰ صدف نے چند بڑی اہم اور دور رس نتائج والی باتیں کیں جن میں خلوص تھا۔ معاملات کی نزاکت کا احساس تھا۔ انہوں نے جو کچھ بھی کہا وہ ایک پاکستانی ادیبہ ہی کہہ سکتی تھیں۔ اس لیے ہمارے مسائل مشترکہ ہوتے ہوئے بھی ملکی فیصلوں کی بنیاد پر مختلف ہیں۔ پھر برصغیر کے بڑے شاعر صوفی غلام تبسم کی پوتی ڈاکٹر فوزیہ تبسم تشریف لائیں۔ انہوں نے منزہ سہام مرزا کی حوصلہ افزائی فرمائی اور ادبی رسالوں کی حالتِ زار کا جو نقشہ کھینچا وہ بڑا دلدوز تھا۔ ڈاکٹر فوزیہ تبسم کی زبان میں جو مٹھاس تھی اس نے معاملے کی ساری باتوں میں شیرینی گھول دی۔ ہماری تحریروں میں مولوی مدن والی بات پیدا نہیں ہوسکتی۔ پھر ڈراما آرٹسٹ اور ٹی وی کے نمائندہ اورنگ زیب لغاری نے تقریر کی۔ بڑا سلجھا ہوا لہجہ۔ نہ جانے انہیں سچی کہانیاں کے بارے میں اتنی معلومات کیسے تھیں۔ ضرور وہ سچی کہانیاں اور دوشیزہ کو پڑھتے ہوں گے۔ وہ جناب محترم سہام مرزا صاحب سے بھی واقف تھے۔ پھر راشد محمود آئے۔ یہ بھی کمال کے ایکٹر ہیں۔ انہوں نے اشفاق احمد کے بارے میں چند جملے کہے اور ماحول کو گرما کے رکھ دیا کہ ہمارے ہاں اردو میں اچھے لٹریچر کی ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے عمدہ اور معیاری رسائل ہمارے ادب اور معاشرہ کی نہایت بیش قیمت خدمت سرانجام

دے رہے ہیں۔ ایسے رسائل کی حوصلہ افزائی کی اشد ضرورت ہے اگر ہمارے تعلیمی ادارے اس قسم کے رسائل کو باقاعدگی سے اپنی لائبریری میں منگوا کر طلبہ میں ان کے مطالعے کا شوق پیدا کریں تو اس سے نہ صرف طلبہ و طالبات کو ایسا لٹریچر مہیا ہوگا جو ان کی شخصیت و سیرت کی تشکیل میں فائدہ مند ہوگا بلکہ اس سے رسائل اور جرائد کو اپنا معیار بلند کرنے کا موقع بھی ملے گا۔ اسد بیگ، غلام عباس اور زوہیب رمضان بھٹی کے بعد سرسنگیت کا مظاہرہ ہوا جس میں معروف گلوکارہ ارشمہ مریم، صائمہ اختر، شمع لال، کرن ہزاروی، شبانہ عباس نے سرسنگیت میں حاضرین کے دل موہ لیے اور بشریٰ ماروی، معروف سندھی گلوکارہ کی خوش گوئی خوش لباسی پر سبھی جھوم اٹھے۔ اس کے بعد کاشی چوہان نے سامعین سے جی بھر کے داد پائی۔ سچی کہانیاں کی اس تقریب ایوارڈز کی الیکٹرونک میڈیا، پرنٹ میڈیا نے کوریج کی۔ کاشی چوہان نے سچی کہانیاں کی مدیرہ کی جانب سے سچی کہانیاں کا تازہ شمارہ سب آنے والے مہمانوں کو گفٹ کیا۔ سچی کہانیاں کی تقریبِ ایوارڈ میں ناول نگار، افسانہ نگار، شاعر، بھائی دستگیر شہزاد کے ایوارڈ کی بات نہ کروں تو میرے تاثرات نامکمل نظر آتے ہیں۔ تین کتابوں کے مصنف دستگیر شہزاد کی تحقیقات عشق کا معاملہ ہے اس سے واقعی لے کا نہیں چلتا عشق بھاگ کے کیا ہے۔

پر آسانی سے شرف بازیابی بخشتا ہے۔ اس کے لیے زندگی صرف کرنی پڑتی ہے۔ جگر خون ہوجاتا ہے۔ غالب نے شاید اسی کیفیت کو اپنے شعر میں بیان کیا ہے کہ

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

دستگیر شہزاد سچی کہانیاں کے قارئین کے لیے جرم و سزا کی کہانیاں لکھتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے تقریب میں شامل تو نہ ہو سکے ان کا ایوارڈ ڈسکہ سے آئی ہوئی ان کی بھانجی کشف آصف (یعنی کہ میری بیٹی) نے وصول کیا۔ لیجیے سچی کہانیاں کی تقریب اپنے انجام کو پہنچی۔ اس کے متعلق باتیں بھی ختم ہوئیں۔ اب میں سوچ رہی ہوں اگر وقت ٹھہر سکتا تو میں اس سے پوچھ لیتی کہ تو بہلاوے دینے کا عادی کیوں ہے اور تو کیوں بادشاہ سے لے کر فقیر تک سے کیوں مذاق کرتا ہے۔ بہلاووں کو جیسے زبان مل گئی اگر ہمارا وجود نہ ہوتا تو اس دنیا میں سوائے مایوسیوں کے اور کچھ نہ ہوتا۔ میں بلاوجہ پریشان تھی بہلاووں کا وجود ضروری ہے۔

☆☆☆

موسٹ پاپولر ایوارڈ یافتہ رائٹر!

ارم ناز

السلام علیکم! پڑھنے والے مجھے ارم ناز کے نام سے جانتے ہیں۔ دو سال سے موسٹ پاپولر رائٹر کا ایوارڈ لے رہی ہوں۔ میرے آباؤ اجداد میں دور دور تک کوئی رائٹر نہیں۔ یہ "بیماری" صرف مجھے ہی ہے۔ تقریب میں شرکت نہ کرنے کا بہت افسوس ہے کچھ ذمہ داریاں ایسی ہیں کہ میں ایک دن کے لیے بھی کہیں نہیں جاسکتی مگر اپنی کہانیوں کے ذریعے آپ لوگوں کے درمیان موجود رہتی ہوں۔ آپ لوگ میری کہانیاں پسند کرتے ہیں میرے لیے یہی ایوارڈ ہے۔ گھر میں تو میرے کاندھے پر کوئی شاباش کی تھپکی نہیں دیتا، یہاں تو گھر کی مرغی دال برابر والا حساب ہے۔ میں کہانیوں کی صورت حقیقت بیان کرتی ہوں۔ نہ خود خوش فہمی کا پرندہ پالتی ہوں نہ دوسروں کو اس کا مشورہ دیتی ہوں۔ اپنی ہر کہانی کی کسی بھی ایک لائن میں ارم ناز موجود ہوتی ہے۔ میرے پسندیدہ رائٹر سعادت حسن منٹو ہیں۔

پیارے کاشی نے مجھے ایوارڈ تقریب کا احوال لکھنے کا کہا تو میں نے سوچا کل لکھ دوں گا۔ اور پھر پورا مہینہ گزر گیا وہ "کل" نہ آئی۔ کاشی نے دوبارہ یاد دہانی کروائی تو مجھے بے حد شرمندگی ہو (اگر سستی کا کو ایوارڈ ہوتا تو پہلا مجھے ہی ملتا)۔

اب لکھنے بیٹھا ہوں تو 26 جنوری 2017 کی اس بھیگی شام کے رنگا رنگ مناظر کسی فلم کی طرح میری آنکھوں کے سامنے چل رہے ہیں۔ یہ وہ شام تھی جب خوابوں کو حقیقت کا روپ ملا۔

ایوارڈ تقریب سے زیادہ مجھے کاشی سے ملنے کی خوشی تھی۔ فوڈ اسٹریٹ (پرانی انارکلی۔ لاہور) میں ہم لوگ ملے تو احسن شہزاد (میرا پیارا دوست) حیران تھا کہ کیا واقعی یہ دونوں لڑکے ایک دوسرے سے پہلی دفعہ مل رہے ہیں؟ حقیقتاً ہمیں قطعی احساس نہیں ہوا کہ ہم پہلی بار مل رہے ہیں۔ کاشی سے وہ پہلی ملاقات میرے لیے یادگار رہی۔ بقول احسن شہزاد کاشی ایک زندہ دل اور زرخیز دماغ انسان ہے۔

ایوارڈ تقریب کی شام بھیگی بھیگی اور سرد تھی، گو کہ اس تقریب کے لیے کوئی انویٹیشن کارڈز وغیرہ نہیں بھیجے گئے تھے مگر باوجود اس کے لکھاریوں کی ایک کثیر تعداد نے کاشی چوہان اور ماہنامہ سچی کہانیاں سے اپنی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے پاکستان کے 30 مختلف شہروں سے بھرپور شرکت کر کے، پنجاب انسٹیٹیوٹ آف لینگویجز اینڈ کلچر (پلاک) میں منعقد ہونے والی، "پہلا سچی کہانیاں رائٹر ایوارڈز" کی تقریب کو چار چاند لگا دیے۔

حمد و نعت سے تقریب کا آغاز ہوا۔ دانیہ انور اور عباس رائے کی کمپیئرنگ نے تقریب کو خوب رنگ بخشا۔ بہت سے لوگ جن کا میں نے صرف نام پڑھا تھا آج ان سے ملاقات کر کے دلی خوشی ہو رہی تھی۔ سینئر لکھاری اور ڈرامہ رائٹر دلشاد نسیم اس کے علاوہ زمر نعیم، پیارے ممتاز بھائی، پیاری آپی رضوانہ کوثر، منشی عزیز مئے، وقاص حسین، عبدالعزیز جی آ صاحب، اور بہت سے لکھاری شامل ہیں جن کا نام یہاں نہیں لکھ پایا۔ بھائی ممتاز احمد اور آپی رضوانہ کوثر آپ لوگ جس پیار اور خلوص سے ملے، اس بات پر یقین پختہ ہو گیا کہ واقعی ہم سب ایک فیملی کی طرح ہیں۔

ماہنامہ سچی کہانیاں اور ماہنامہ دوشیزہ کے ساتھ ساتھ ٹرانسکا سٹ میڈیا کے ڈائریکٹر غلام عباس، سی ای او زوہیب رمضان بھٹی کی بھرپور کوششوں سے تقریب کامیاب ہوئی۔ فنکار آن لائین کی نیلم اعجاز اور لاہور ٹی وی کے نعمان مسعود صاحب نے آنے والے مہمانوں اور ہم سب لکھاریوں کو اپنی رائے کے اظہار کا موقع دیا۔ بلاشبہ یہ سب رائٹرز کے لئے یادگار لمحات تھے۔ پنجاب انسٹیٹیوٹ آف لینگویجز اینڈ کلچر قذافی سٹیڈیم لاہور میں منعقد ہونے والی اس یادگار سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی تقریب کو، آج نیوز، سما نیوز، نیو ٹی وی، سچ نیوز، لاہور ٹی وی، اب تک نیوز، چینل 5، دن نیوز اور سٹی 42، نے خوبصورت طریقے سے کوریج دی۔

تقریب میں 30 شہروں سے آنے والے

پیارے پیارے لکھاریوں کے علاوہ ملک کی نامور شخصیات نے بھرپور شرکت کی۔ جن میں، کالم نگار و دانشور ڈاکٹر مرتضیٰ ممغل (مہمان خصوصی)، شاعرہ و افسانہ نگار پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ تبسم (پوتی صوفی غلام مصطفیٰ تبسم)، سابق وزیر تعلیم پنجاب اور وائس چانسلر یونیورسٹی آف ساؤتھ ایشیاء عمران مسعود صاحب، سابق ممبر صوبائی اسمبلی کالم نگار شاعرہ اور معروف رائٹر ناصر ادیب کی اہلیہ محترمہ آمنہ الفت، معروف شاعرہ اور پلاک کی ڈائریکٹر ڈاکٹر صغریٰ صدف، پاکستان کے نامور ترین اداکار راشد محمود اور اورنگ زیب لغاری کی شرکت نے تقریب کو وقار بخشا۔ معروف ڈرامہ رائٹر افتخار رافی، ٹی وی میزبان اور ماڈل ڈولی نے بھی تقریب میں شرکت کی۔

فیمیل سنگرز میں صائمہ اختر، ارشمہ مریم، شمع لعل، کرن ہزاروی، اور شبانہ عباس نے اپنی خوبصورت آواز سے ایوارڈ تقریب کی اس بھیگی شام کو یادگار بنا دیا۔ معروف سندھی گلوکارہ بشریٰ ماروی بھی خاص طور پر حیدرآباد سے اس تقریب میں تشریف لائیں اور اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ میل سنگرز میں فیضان فیضی، بلال طاہر اور دانش بھٹی کی آوازوں نے دل موہ لیا۔ بہت سی شاندار پرفارمنسز نے اس ادبی تقریب کو فن کا تڑکا لگایا۔ فیاض بلی، ورسٹائل گروپ اور روبینہ نے خوبصورت پرفارمنسز پیش کیں۔ مجھے خاص طور پر "تیرے عشق نچایا" پہ کی گئی پرفارمنس بہت پسند آئی۔

اس تقریب کا احوال لکھتے ہوئے مجھے، بہت ہی کیوٹ عبدالرحمن (کاشی چوہان کا چھوٹا بیٹا) بار بار یاد آ رہا ہے جسے تصویروں میں تو کئی بار دیکھا تھا مگر تقریب والے دن جب وہ مجھے نظر آیا تو اسے گود میں اٹھا کر بے اختیار ہی بھینچ ڈالا اور اس لمحے ایوزر (ممتاز احمد صاحب کا بیٹا) نے ان خوبصورت لمحات کو اپنے کیمرے میں قید کر لیا۔

سچی کہانیاں کی طرف سے مجھے میری تحریر "جرس" پر ایوارڈ دیا گیا۔ یہ ایوارڈ میں نے سابق وزیر تعلیم پنجاب اور یو ایس اے کے وی سی سے وصول کیا۔

پوری تقریب میں میں اور کاشی ساتھ ساتھ رہے۔

کاشی مسلسل متحرک رہا میں نے اسے ایک لمحے کے لئے بھی سکون سے بیٹھے نہیں پایا۔ میں اس کی ہمت کی داد دیے بنا نہ رہ سکا جس نے اس تقریب کو کامیاب بنانے کے لئے دن رات محنت کی۔ اور سب نے دیکھا کہ کس طرح اس کی محنت رنگ لائی۔

آخر میں اپنے پسندیدہ لیجنڈ اداکار راشد محمود صاحب کی ایک بات شیئر کرنا چاہوں گا جو میرے دل کو چھو گئی کہ "شکر ہے ہمارے ملک میں سچ کہنے والوں کو ایوارڈ سے نوازا جا رہا ہے۔

تقریب کا ایک ایک لمحہ میرے لیے یادگار اور لکھاری دوستوں سے ملنے کی خوشی لازوال ہے۔ سب کچھ لکھنے بیٹھوں تو بیسیوں صفحات بھر جائیں گے۔

آخر میں میری طرف سے منزہ سہام، ادارہ سچی کہانیاں اور دوشیزہ کو ایسی شاندار اور یادگار تقریب منعقد کرانے پر بے حد مبارکباد، امید کرتا ہوں کہ ادارے نے سچ کہنے والوں کو ایوارڈ دینے کی جو روایت شروع کی ہے یہ جاری و ساری رہے گی۔

☆☆☆

بھیگی بھیگی محبت بھری شام!

تاثر خان بلوچ (نوابشاہ)

26 جنوری 2017ء بروز جمعرات کی حسین ترین شام بھی کیا خوب شام تھی۔ ہلکی ہلکی بارش کی رم جھم میں بھیگی یہ وہ ٹھنڈی اور حسین شام تھی جس شام پہلی سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ تقریب اپنی پوری شان وشوکت، پروقار اور نہایت محبتوں اور چاہتوں سے منائی گئی جس میں ملک کے کئی بڑے بڑے ایکٹر، سنگرز اور ادبی دنیا سے تعلق رکھنے والے ستاروں نے شرکت فرما کر اس تقریب کو اور بھی خوب صورت بنا دیا تھا۔ یہ تو لوگوں کی کاشی بھائی اور اس تقریب سے خصوصی محبت رہی کہ وہ بارش اور ٹھنڈ میں بھی اس تقریب میں پہنچے اور کاشی بھائی نے بھی تمام لوگوں کو جو اس تقریب میں آئے تھے سب کو پیار اور محبت سے نوازا۔

کاشی بھائی تو نہایت پرخلوص اور پیار کرنے والے انسان ہیں۔ ہم تو کاشی بھائی کے پیار سے بہت متاثر ہوئے۔ پیارے کاشی بھائی نے وہ سب کچھ سچ اور حقیقت کر دکھایا جو انہوں نے سچی کہانیاں کے رائٹرز اور قارئین سے وعدہ کیا تھا۔

یہ تقریب صرف ایکٹر یا سنگرز کے لیے ہی نہیں منعقد کی گئی تھی بلکہ یہ تقریب تو ادبی دنیا سے تعلق رکھنے والے ادبی لوگوں اور خصوصاً سچی کہانیاں کے قارئین اور رائٹرز حضرات کی حوصلہ افزائی اور ان کے قلم کی اچھائی اور بہتری کی نشاندہی کے لیے سجائی گئی تھی۔

اس تقریب میں ادب سے تعلق رکھنے والی بڑی بڑی ہستیاں دیکھیں۔ واہ بھئی واہ خوب مزہ آیا بہت ہی اچھے انداز میں رائٹرز حضرات کو اسٹیج پر بلا کر ایوارڈ دیئے جا رہے تھے اور ان کی خوب حوصلہ افزائی بھی کی جا رہی تھی۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ کاشی بھائی نے میڈیا کوریج کا بہت اعلیٰ انتظام کیا ہوا تھا۔ جو بھی ہو رہا تھا ہر حال میں سب کچھ بہت ہی اچھا ہو رہا تھا۔ یہ تقریب ہمیشہ یاد رہے گی۔ میں اتنی اچھی تقریب اور محفل کو پایہ تکمیل تک پہنچانے پر کاشی بھیا کو خصوصی طور پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ان لوگوں کو بھی جنہوں نے اس تقریب میں شرکت کی۔ اس تقریب میں پیارے بھائی ممتاز احمد سے بھی ملاقات ہوئی۔

ممتاز بھائی سے مل کر پتا چلا کہ وہ نہایت سادہ دل اور لوگوں سے محبت کرنے والے انسان ہیں۔ ممتاز بھائی نے بھی اس تقریب کو اپنی خدمات اور محبت سے خوب نوازا۔ اللہ ان کو بھی ہمیشہ سلامت رکھے، (آمین)۔

اس کے بعد علی رضا (فیصل آباد)، مجید احمد جائی (ملتان)، ایم حسن نظامی (قبولہ شریف)، عبدالغفار عابد (چیچہ وطنی)، منشی محمد عزیز مئے (لڈن، وہاڑی) سے بھی ملاقات رہی۔ تقریب میں کاشی بھائی کی محنت نے خوب رنگ جمایا۔ اللہ ان کو ہمیشہ سلامت رکھے۔

☆☆☆

اِس شہر میں سب کچھ تھا، بس تیری کمی تھی

شائستہ انور (اسلام آباد)

ڈیئر منزہ اور کاشی چوہان السلام علیکم! سب سے پہلے تو میں آپ کو بہت بہت مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ پر اتنا دلکش اور خوب صورت پروگرام لاہور شہر میں پیش کرنے پر اور تمام رائٹرز جو کہ ایوارڈ یافتہ ہیں۔ بہت بہت مبارک باد پیش کرتی ہوں اور پروگرام دیکھ کر اس قدر خوشی محسوس ہوئی کہ پہلا پروگرام ہی اتنا بھرپور اور شاندار تو آگے دیکھئے، کس قدر رائٹرز کی پذیرائی ہوگی یقیناً اور اس پر طرہ امتیاز کہیں کہ پہلی ہی تقریب میں ماشاء اللہ تمام مہمانان گرامی دور دراز سے آئے ہوئے تھے۔ تقریب کی رونق بڑھانے اور دلچسپی اور شوق کا اندازہ تو اس بات سے لگایئے کہ تمام مہمانوں نے اس قدر بارش کے موسم میں بھی تقریب کو عزت بخش کر کامیاب اور حسین بنایا اور تقریب میں شرکت کر کے پہلی دفعہ یہ اندازہ ہوا کہ فن اور ادب کی اس قدر پذیرائی اور کہیں اس کی مثال نہیں ملتی اور تقریب میں تمام مہمانوں کا اخلاق و محبت بہت قابل ذکر ہے۔ ہر ایک سے ملاقات کر کے اس بات کا بالکل اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کئی مہمانوں سے پہلی ملاقات ہے۔ ماشاء اللہ رضوانہ کوثر صاحبہ کا اخلاق تو ویسے ہی جادو اثر ہے۔ نادیہ ملک دھیمے مزاج والی بہت اچھی لگیں۔ دلکش زمر نعیم صاحبہ بھی بہت محبت سے ملیں۔ دلشاد نسیم صاحبہ کا تو اپنا ہی انداز ہے اور راحت وفا راجپوت صاحبہ، حنا بشریٰ صاحبہ اور حمیرا خان بھی بہت دل کو بھائیں اور ہمارے سب سے اچھے بھائی ممتاز احمد صاحب کا تو جواب ہی نہیں، ماشاء اللہ بہت ہی اچھی اور سلجھی فیملی والے ہیں اور بہت محبت والے بھائی ہیں۔ جاوید راہی صاحب بھی بہت شفیق انداز میں ملے اور رفگرال بھائی سے بھی ملاقات ہوئی۔ شیما صاحبہ بھی بہت محبت سے ملیں اور ماشاء اللہ زبردست کمپیئرنگ اور انجوائے منٹ کے ساتھ بہت یادگار تقریب رہی۔ اور اورنگزیب لغاری اور راشد محمود جیسے عظیم فنکاروں نے تقریب کو عزت بخشی ماشاء اللہ بے شک ایک بھرپور اور دلکش پروگرام تھا جسے کافی عرصہ تک یاد رکھا جائے گا اور کاشی چوہان صاحب کی محنت، لگن جو کہ پروگرام کے کامیاب ہونے کی زندہ دلیل ہے اور منزہ آپ کی کمی بھی بہت محسوس ہوئی۔ ''اس شہر میں سب کچھ تھا بس اک تیری کمی تھی'' بہرحال قصہ مختصر ہم تقریب کے بعد لاہور شہر کی بھرپور سیر و تفریح کے بعد بہت سی خوش کن اور بھرپور یادیں لے کر واپس اپنے شہر ہرے بھرے خاموش نظاروں میں واپس اسلام آباد آ گئے۔ تمام آفس ممبران اور تمام احباب کو سلام و دعا۔

☆☆☆

سچی کہانیاں کا پہلا ایوارڈ

بشریٰ سید احمد (لاہور)

سچی کہانیاں کا پہلا ایوارڈ، ایوارڈ کی پہلی تقریب...

پہلی بار ہی کاشی نے زندہ دلانِ لاہور کے لاہوریوں کے دل جیت لیے۔ یعنی تقریب منعقد کرنے کے لیے قرعۂ فال لاہور کے نام نکلا اور یوں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ یہ تقریب 26 جنوری 2017ء کو قذافی اسٹیڈیم لاہور کے پنجابی کمپلیکس میں انجام پائی جس کا انتظار کئی ماہ سے نہیں بلکہ کئی سالوں سے تھا اور جس کا وعدہ کاشی نے کیا تھا اور کاشی کوئی وعدہ کرے اور اسے پورا نہ کرے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ آخر کار انتظار کی گڑیاں ختم ہوئیں اور جنوری کی سرد شام کو اس تقریب کا آغاز ہوا۔

اس دن لاہور کا موسم بھی بڑا عاشقانہ تھا۔ گہرے بادل آئے ہوئے تھے اور بارش بھی وقفے وقفے سے برس رہی تھی۔ سارا شہر جل تھل تھا۔ کوئی اور جگہ ہوتی تو شاید کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال دیتی مگر یہ تھی اپنے سچی کہانیاں کے پہلے رائٹرز ایوارڈ کی تقریب جس میں مجھے ہر حال میں، ہر موسم میں شامل ہونا ہی تھا۔

تو جناب پھر اللہ کا نام لے کر موسم کی پروا کیے بغیر میں اپنے بڑے بیٹے سنی اور دونوں بیٹیوں ایمل اور مشعل کو لے کر قذافی اسٹیڈیم کی طرف چل پڑی۔ کچھ تو شوقِ جنوں، کچھ بے تابی اور کچھ موسم کی مستیاں ان سب نے مل کر بیس منٹ کے راستے کو لمبا کر کے چالیس منٹ کا کر دیا۔

خدا خدا کر کے یہ دوریاں ختم ہوئیں اور ہم ایوارڈ کی تقریب میں پہنچے جہاں کاشی پہلے ہی بے تابی سے ہم سب کا انتظار کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی اور اسے دیکھ کر ہمیں اطمینان ہوا۔ اپنی ساتھی رائٹرز سے مل کر بے پناہ خوشی ہوئی سب سے پہلے رضوانہ آپی سے ملاقات ہوئی۔ ان کے گلے لگ کر ساری تھکن اتر گئی جو پچھلے دو ہفتے سے طاری تھی۔ ان دنوں میرے چچا کے بیٹا اور بیٹی دونوں کی اکٹھی شادی طے پائی ہے جو 7 اپریل کو ہے اس کی تیاریاں، روز بازار کے چکر، آنا جانا لگا ہوا تھا۔ ان تھکا دینے والے دنوں میں سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی تقریب کی چکا چوند نے سب بھلا دیا۔ نسیم نیازی سے بھی ملاقات ہوئی، اچھا لگا۔ ہر کوئی منزہ سہام صاحبہ کی عدم موجودگی کا پوچھ رہا تھا۔ کاشی نے ان کی ناساز طبیعت کے بارے میں بتایا تو دل سے ان کے لیے دعا نکلی۔

تقریب کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا پھر نعتِ رسول مقبول پیش کی گئی۔ تقریب کے میزبان دانیہ انور اور عباس رائے تھے جنہوں نے بہت خوب صورتی سے تقریب کو آگے بڑھایا۔

تقریب میں وقفے وقفے سے مختلف فنکاروں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا جن میں شبانہ عباس (معروف گلوکارہ)، بشریٰ ماروی (معروف گلوکارہ)، فیضان علی فیضی (گلوکار)، بلال طاہر (گلوکار)، دانش کھچی (نامور گلوکار)، طاہر ساقی (موسیقار گلوکار)، فیاض بلی (معروف پرفارمر)، فیاض وراسٹائل گروپ، روبینہ (پرفارمر)، پیر شاہ محمد قادری (معروف اسکالر ناول نگار) کے علاوہ اس شاندار تقریب میں ٹی وی، اردو اور پنجابی فلموں کے مشہور اداکار اورنگ زیب لغاری اور ارشد محمود بھی مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شامل تھے۔ تمام فنکاروں کے فن کے مظاہرے کے بعد

ایوارڈ یافتہ رائٹرز کو ایک ایک کر کے ایوارڈز دینے کا سلسلہ شروع ہوا سب سے پہلے دلشاد نسیم نے اپنے خیالات کا اظہار بہت خوب صورت الفاظ میں کیا۔ پھر رائٹرز کی آمد شروع ہوئی تو سماں ہی بدل گیا۔ ماحول نے یکا یک ادبی محفل کی شکل اختیار کر لی۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ رائٹرز کے نام کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دیتی یا پھر تالیوں کی گونج۔ آخر کار میرا بھی نام پکارا گیا۔ مجھے جناب صوفی تبسم (مرحوم) مشہور شاعر کی پوتی ڈاکٹر فوزیہ تبسم نے ایوارڈ دیا جو خود مشہور شاعرہ ہیں۔ اس تقریب میں سارا ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ ہر چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ پریشانیوں اور گھٹن زدہ زندگی سے چند پل چرا کر کاشی نے ہمارا دامن خوشیوں سے بھر دیا۔ اس تقریب میں کاشی کے دونوں بیٹے دیان اور ننھے منے بہت پیارے سے عبدالرحمن اور کاشی کی دوشیزہ سی بیوی اسماء سے ملاقات ہوئی، اللہ سب کو سلامت رکھے۔ کمی تھی تو صرف منزہ سہام مرزا صاحب کی اگر وہ ہوتیں تو تقریب کو چار چاند لگ جاتے۔ باقی تو کراچی والے لاہور والوں کا دل لوٹ کر لے گئے۔ سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی پہلی ہی تقریب اتنی شاندار اور جاندار تھی کہ سالوں لاہوری یاد رکھیں گے، ویل ڈن کاشی۔

☆☆☆

حوصلوں کو سلام ہے!

ایم حنیف عاصم بلوچ (میاں چنوں)

محترم جناب بھائی کاشی چوہان محبتوں بھرے ڈھیروں سلام و دعائیں۔ ماہنامہ سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ تقریب کے بہانے میں آپ اور بہت سی بڑی بڑی نامور شخصیات جن پر شعبہ ادب وفنون لطیفہ کے انتہائی قابل احترام لوگوں سے بالمشافہ ملاقات ہوئی۔ یقین مانیے میرے لیے یہ وقت نہ صرف انتہائی خوشیوں کا تھا بلکہ باعث افتخار بھی تھا کہ آپ نے مجھے اس تقریب میں بلوا کر نہ صرف عزت بخشی بلکہ بہت سی ہستیوں سے ملنے کا بہترین موقع بھی فراہم کیا۔ میں دلی طور پر آپ کی ہمت اور حوصلے کو داد دیتا ہوں کہ آپ اپنے گھر سے اتنی دور پردیس میں جا کر اس انتہائی اہم پروقار تقریب کا بہترین نہ صرف انعقاد کیا بلکہ بہت سے دوستوں کو بھی اکٹھے مل بیٹھنے کا بہترین موقع فراہم کیا۔ یقیناً آپ کی یہ بہت بڑی محنت اور ہمت تھی۔ آپ بہترین داد کے مستحق ہیں۔ کاشی بھائی آپ جس بہترین خلوص کا مظاہرہ ہم سب رائٹرز سے کیا اور اتنی زیادہ محبتیں دیں۔ کم از کم میں تو بہت ہی متاثر ہوا ہوں۔ یہ ہر لحاظ سے ایک بہترین تقریب تھی۔ مجھے امید ہے کہ آپ آئندہ بھی اسی لگن اور خلوص سے ہم لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہیں گے۔ آپ سے تو مل کر متاثر ہوا ہی محترم جناب بھائی ممتاز احمد سرگودھا سے بھی مل کر بہت متاثر ہوا اور ان سے مجھے بہت ہی محبتیں اور پیار ملا۔ وہ واقعی بے حد نفیس اور انتہائی بااخلاق انسان ہیں۔ ان کا ہر ایک سے اتنے پیار سے ملنا یقیناً ان کا بڑا پن ہے۔ دیگر تمام دوست بھی بہت اچھے لوگ ثابت ہوئے۔ کاشی بھائی آپ واقعی دلوں کو جوڑنے والے انسان ہیں۔ آپ کو اتنی اچھی رائٹرز ایوارڈ تقریب منعقد کروانے پر بہت بہت مبارکیں۔ اللہ آپ کو ہمیشہ ثابت قدم وخوش وخرم رکھے، آمین۔

☆☆☆

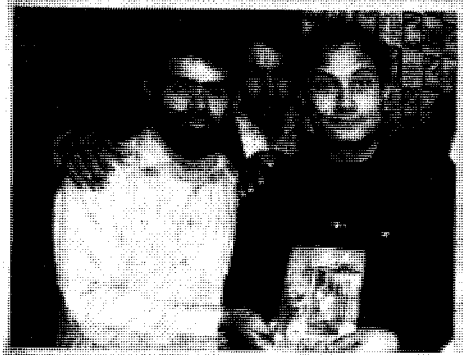

پہلی ایوارڈ تقریب کی حسین یادیں

مجید رحمانی (ملتان)

لاہور داتا کی نگری واحد شہر ہے جہاں سب سے زیادہ ادبی تقریبات ہوتی ہیں۔ 26 جنوری 2017 کی خوبصورت شام اور بارش کی آنکھ مچولی دل کو لبھا رہی تھی اور ہم بھی زندہ دلوں کے شہر لاہور میں ایک پُروقار تقریب میں شرکت کے لئے ملتان سے لاہور پہنچے تھے۔ جی ہاں ایک ایسی تقریب جس نے کئی دنوں سے ہلچل مچا رکھی تھی۔ سچی کہانیاں کراچی کی پہلی ایوارڈ تقریب لاہور میں منعقد ہونے جا رہی تھی اور لکھاری، قارئین اور باذوق ادبی لوگ اس تقریب کی زینت بننے کے لئے کب سے بے تاب تھے۔ انتظار کی گھڑیاں آخر اختتام پذیر ہوئیں اور وہ دن آن پہنچا۔ جہاں چہرے کھل اُٹھے تھے وہاں موسم نے بھی اس تقریب کو چار چاند لگانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔ ٹھنڈی ہوائیں اور بارش نے دلوں کو مسرور کر دیا۔ دلوں میں محبت اور خوشی کے جذبات پھوٹنے لگے۔ لبوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں سرور سا چھانے لگا۔ آنے والے سفر کی تھکان سے بے نیاز ہو گئے۔

ماہنامہ سچی کہانیاں کی پہلی ایوارڈ پُروقار تقریب قذافی اسٹیڈیم کے ملحقہ عمارت پنجاب انسٹیٹوٹ آف لینگویج، آرٹس اینڈ کلچر میں منعقد کی گئی۔ ادبی، ثقافتی لوگوں کی کثیر تعداد نے شرکت کر کے نہ صرف تقریب کو چار چاند لگا دیئے بلکہ محبتوں کے گلشن کھلا دیئے۔ مقررہ وقت سے پہلے ہی ہال فل ہو گیا۔ رنگ برنگے ملبوسات میں خواتین و حضرات نے قوسِ قزح کا رنگ بھر دیا۔ لڑکیاں پرستان سے آئی پریاں لگ رہی تھیں تو لڑکے کوہ قاف کے شہزادے، ان شہزادوں کے شہنشاہ ''کاشی چوہان'' کی سج دھج نرالی تھی۔ لبوں پر مسکراہٹ کے سچے پھول سجے تھے۔

یہ سچی کہانیاں کی پہلی ایوارڈ تقریب تھی جس میں پاکستان کے کونے کونے سے باذوق لوگوں نے شرکت کی تھی۔ تقریبات کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے تقریب کا باقاعدہ آغاز تلاوت قرآن مجید سے ہوا۔ پروگرام کی میزبانی معروف ٹی وی میزبان دانیہ انور اور عباس رائے نے کی۔ ریڈ کارپٹ پر آنے والے معزز مہمانوں کے انٹرویوز ٹی وی میزبان نیم اعجاز نے کئے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے مہمانانِ گرامی نے شرکت کر کے تقریب کو رونق بخشی جن میں سے چند کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔ ڈاکٹر مرتضیٰ مغل (کالم نگار، دانشور، نظریہ پاکستان ٹرسٹ کے رہنما) پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ تبسم (شاعرہ، افسانہ نگار، ماہر تعلیم اور پوتی صوفی غلام تبسم) عمران مسعود (سابق وزیر تعلیم پنجاب، وائس چانسلر یونی ورسٹی آف ساؤتھ ایشیا) محترمہ آمنہ الفت (سابق ممبر صوبائی اسمبلی، کالم نگار، شاعرہ۔ معروف فلم رائٹر ناصر ادیب کی اہلیہ اور ان کی کراچی میں مصروفیات کی وجہ سے آمنہ الفت کی شرکت) افتخار الٰہی (معروف ڈرامہ رائٹر) ڈولی (معروف ٹی وی میزبان) ارشمہ مریم (معروف گلوکارہ) ڈاکٹر صغریٰ صدف (شاعرہ، ڈائریکٹر پنجاب انسٹیٹوٹ آف لینگویج، آرٹس اینڈ کلچر) دلشاد نسیم (معروف ڈرامہ رائٹر) اورنگزیب لغاری (معروف ڈرامہ ایکٹر) راشد محمود (معروف ڈرامہ ایکٹر) اسد بیگ (ہدایت کار) صائمہ اختر (معروف گلوکارہ) شمع لعل (معروف گلوکارہ) کرن ہزروی (معروف گلوکارہ) شانہ عباس (معروف گلوکارہ) بشریٰ ماروی (معروف سندھی گلوکارہ) فیضان علی فیضی (گلوکار) بلال طاہر (گلوکار) دانش کھچی (نامور گلوکار) طاہر ساتی (شاعر، گلوکار) فیاض بلی (معروف پرفارمر) فیاض ورسٹائل گروپ، روبینہ (معروف پرفارمر) پیر شاہ محمد قادری (معروف اسکالر، ناول نگار) شہزادہ ذوالقرنین

(براڈ کاسٹر) ثروت اشرف (ٹرانس کاسٹ میڈیا) غلام عباس (ڈائریکٹر ٹرانس کاسٹ میڈیا) زوہیب رمضان بھٹی (سی ای او ٹرانس کاسٹ میڈیا)۔

تلاوت کلام پاک کے بعد تقریب کو آگے بڑھاتے ہوئے دانیہ انور اور عباس رائے نے سُریلی آواز میں ایوارڈ یافتگان کو اسٹیج پر بُلانا شروع کیا تو ہال تالیوں کی آواز سے گونج اُٹھا۔ مہمانانِ گرامی کے ہاتھوں ایوارڈ دِلوائے گئے اور مہمانانِ گرامی کے خوبصورت خیالات سُننے کو ملے۔ کلوگاروں نے اپنی آواز سے شرکاء کے دِل موہ لے لیے اور اداکاروں کی کمال اداکاری نے شرکاء کو داد دینے پر مجبور کر دیا۔ کاشی چوہان نے ماہنامہ سچی کہانیاں کا پس منظر پیش کیا اور داد سمیٹی۔

ماہنامہ سچی کہانیاں کی پہلی تقریب میں 2014، 2015، 2016 کے بہترین لکھاریوں کو ایوارڈ سے نوازا گیا اور اس سلسلے کو جاری وساری رکھنے کی یقین دہانی بھی کرائی گئی۔ یہ شاندار تقریب بغیر بریک کے مسلسل تین گھنٹے جاری رہی۔ حاضرین محفل نے تقریب کو خوب سراہا اور سر دُھنتے رہے۔ میزبانوں نے اپنے شیریں لب و لہجے سے شرکاء کو محظوظ کیا تو گلوکاروں نے اپنی مترنم آواز سے داد وصول کی۔ تقریب کے آخر میں سیلفیاں لی گئیں اور اِن پُرمسرت لمحات کو ہمیشہ کے لیے قید کر لیا گیا۔ ہنستے مسکراتے دوستوں نے ایک دوسرے کو الوداع کیا اور ڈھیروں دُعاؤں اور محبتوں کے ساتھ اپنی اپنی منزل کو روانہ ہو گئے۔ اس تقریب نے بہت سے دوستوں سے ملوایا اور میں آ۔ اُمید کرتا ہوں یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ مدتوں جن کی کہانیاں لفظوں کے روپ میں پڑھتے تھے، اُن کے ساتھ پُرلطف لمحات گزار کر دِل باغ باغ ہو گیا۔

تقریبِ تقسیمِ انعامات

اشفاق شاہین (حجرہ شاہ مقیم)

سچی کہانیاں نے اس بار تو نئی روایت ڈال دی۔ لاہور پروگرام کا انعقاد کر کے جب پتا چلا کہ اس دفعہ لاہور میں پروگرام منعقد ہونا ہے تو خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ 26 تاریخ سے کچھ دن پہلے وینیو کا اعلان ہوا تو کنفرم ہو گیا اور پروگرام میں جانے کی تیاری شروع کر دی۔ تقریباً 120 کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے 25 کو ہی لاہور پہنچ گئے تھے۔ رات گئے پتا چلا کہ وینیو بدل گیا ہے کسی وجہ سے، اسی وقت کافی دوستوں کو بتایا جو رابطے میں تھے۔ دوستوں سے ملنے کی اتنی خوشی تھی کہ دو گھنٹے پہلے ہی قذافی اسٹیڈیم پہنچ گئے جہاں مجید جانی اور دیگر دوست ہم سے بھی پہلے موجود تھے۔ کاشی بھائی کی چمک دمک قابلِ رشک تھی۔ ممتاز صاحب آف سرگودھا کاشی صاحب کے ساتھ تھے۔ ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ان سے ان کی کتاب بھی تحفے میں پائی۔ پروگرام سے پہلے عبدالغفار عابد، شہزاد، اشعر، مہر پرویز، حسن نظامی، فیصل ندیم، علی رضا، عبدالعزیز جی آ، ندیم میواتی اور کئی اور احباب سے بھی ملاقات ہوئی بہت خوشی ہوئی۔ کاشی بھائی نے مہمانوں کو ریسیو کرنے کی ذمہ داری ناچیز پر ڈال دی جس سے عہدہ برآں ہونے کی بھرپور سعی کی۔ مقررہ وقت پر پروگرام شروع ہوا تو ہم بھی اپنی سیٹ پر براجمان ہو گئے۔ پروگرام کی رونق دیکھنے لائق تھی۔ تلاوت و نعت کے بعد کاشی بھائی نے سپاس نامہ پیش کیا۔ انہوں نے گویا سمندر کو کوزے میں بند کر دیا۔ نپے تلے الفاظ، کمپیئرنگ بھی بہت اچھی رہی۔ گانوں نے ماحول کو گرمائے رکھا۔ تمام فنکاروں نے بھرپور حصہ ڈال کر محفل کو چار چاند لگا دیے۔ تمام احباب جن کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ انتہائی خوش تھے، ان کو ایک بار پھر بہت بہت مبارک باد۔ ادارے کو اتنا بہترین پروگرام کرنے پر ڈھیروں مبارک باد اور درخواست ہے کہ آئندہ بھی نہ صرف سچی کہانیاں بلکہ دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ بھی اس بار لاہور میں ہی کیا جائے۔

ایک بھیگی بھیگی شام

راحت ناراچوت (لاہور)

کہتے ہیں لاہور کی شام بہت خوب صورت ہوتی ہے۔ ہم نے بھی کبھی غور نہیں کیا تھا مگر 26 جنوری 2017ء کو محسوس ہوا کہ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں ایک تو لاہور کی شام دوسری بھیگی ہوئی شام اور لاہور کی خوب صورت شام کو اور خوب صورت بنانے میں جس شخص کا کمال ہے اس کا نام ہے کاشی چوہان۔

کاشی چوہان نے جس کام کا بیڑہ اٹھایا تھا وہ کوئی آسان کام نہیں تھا مگر کاشی نے ثابت کر دیا کہ

ارادے جن کے پختہ ہوں، نظر جن کی خدا پر ہو
طلاطم خیز موجوں سے، وہ گھبرایا نہیں کرتے

پرل پبلی کیشنز ایک معتبر نام ہے اور دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب سالوں سے روشنیوں کے شہر کراچی میں منعقد کی جارہی ہے۔ سچی کہانیاں پرل والوں کا دوسرا معتبر نام ہے۔ جس نے سچی کہانی کو روایتی کہانی سے نکال کر ادبی کہانی کی صف میں کھڑا کر دیا اور بلاشبہ یہ کمال کاشی کا ہی ہے کہ انہوں نے سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی پہلی تقریب کو لاہور میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ بظاہر ناممکن کام تھا۔ ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں آ کر تقریب کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ کاشی نے نا صرف فیصلہ کیا بلکہ اسے پایہ تکمیل تک بھی پہنچایا جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر کے لیے کن کٹھنائیوں کا سامنا کرنا پڑا یہ وہی جانتے ہیں۔ اس باحوصلہ شخص نے 26 جنوری کو رائٹرز کا ایک گلستان سجا دیا اور برستے بادلوں کی گھن گرج اور تیز بارش میں سب پہنچے۔ اس شام جو رائٹرز کے لیے سجی تھی۔ ایک یادگار شام کا روپ دھار لیا اور ہر ایک کی آنکھوں میں ایک ہی تحریر تھی۔ ہر ایک کے ہونٹوں پر یہی الفاظ تھے کہ کاشی چوہان نے ایک کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ وہ سب لوگ جنہیں ناموں سے جانتے تھے۔ ان سے مل کر بے حد اچھا لگا و یک انوکھی خوشی کا احساس ہوا۔ رضوانہ کوثر، جن کا نام ادارے کے لیے اور جاننے والوں میں ایک معتبر نام ہے۔ ان سے اکثر فون پر بات ہوتی تھی۔ آواز سے ہی اتنی شفیق لگتی ہیں۔ ان سے ملنا اور سامنے بات کرنے کی بڑی خواہش تھی اور جب ان سے ملی تو اپنی آواز کی طرح ہی نام شفیق اور محبت سے بھری ہوئی تھیں۔ بالکل ایسے

رکے تو چاند چلے تو ہواؤں جیسا ہے
وہ شخص دھوپ میں دیکھو تو چھاؤں جیسا

مجھے ایوارڈ ملا اور اس کا سہرا بلاشبہ رضوانہ کوثر کے سر ہے انہوں نے ہی میرا تعارف دوشیزہ اور سچی کہانیاں میں کروایا تھا۔ رضوانہ جی شکریہ نوازش۔ تقریب میں بہت سے رائٹرز، ماڈلز، اداکار شامل ہوئے۔ ٹرائس کاسٹ میڈیا کے زیر اہتمام ہونے والی رائٹرز ایوارڈ تقریب میں ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل تھے۔ ایک گلستان تھا جس میں ہر طرح کے پھول تھے۔ دلشاد نسیم باوقار اور اپنی تحریروں کی طرح شاندار لگیں۔ نسیم نیازی سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اتنی پیاری مسکراہٹ، اتنی خوب صورت ہیں کہ دل میں اتر جائیں۔ مسکراتی ہیں تو ان کی آنکھیں

بھی مسکراتی ہیں نسیم جی!

تم وہ دعا ہو جو مانگی جاتی ہے
سخت گرمی میں بارشوں کے لیے

زمر نعیم سے تو ان کے حسن کے رعب سے زیادہ بات نہ کر سکے۔ دلکش اور نازک خاتون۔ خوب صورت ہاتھوں میں سجی انگوٹھیاں ہاتھوں کی خوب صورتی اور بڑھا رہی تھیں۔ میں تو چپکے چپکے ان کے ہاتھ دیکھتی رہی۔

زمر جی

آنکھیں جیسے کومل کرنیں چاندی جیسے ہاتھ
پریتم تم کو چاند کہوں یا میرے چاند کی رات

اس کے علاوہ فصیحہ آصف خان، ہنس مکھ خاتون، سچی کہانی لکھنے میں فصیحہ کا کوئی جواب نہیں۔ فریدہ فری اور سکینہ صدف سے بھی ملاقات رہی۔ سادہ سی حنا بشریٰ، الفاظ کے جادوگر ممتاز احمد سے بھی ملنا ہوا۔ شیما عبدالقیوم معصوم سی ہیں۔

فلم اور ٹی وی کے بہت سے نام تقریب میں شامل تھے۔ ٹی وی رائٹرز بھی موجود تھے۔ ورائٹی پروگرام بھی اچھے رہے۔ اورنگ زیب لغاری اور سپر آرٹسٹ راشد محمود نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ہم رائٹرز کے لیے جو خراج تحسین پیش کیا۔ وہ ان کی ادب دوستی کا مظہر ہے راشد محمود نے کہا۔ ''یہ لوگ جو سامنے بیٹھے ہیں یہ لفظوں کے بادشاہ ہیں۔ میں ان کے سامنے کیا کہوں۔ ہم لوگ تو ان کے لکھے ہوئے الفاظ بولتے ہیں فلم اور ڈرامے میں۔ یہ عظیم لوگ ہیں۔''

ایسی سچی بات کہنے کا حوصلہ بلاشبہ اعلیٰ ظرف لوگوں میں ہوتا ہے۔ شروع سے آخر تک تقریب شاندار رہی۔ باہر بارش نے دھوم مچا رکھی تھی سردی عروج پر تھی اور ہال کے اندر خلوص محبت اور خوشی فخر کی گرمی تھی۔ سب ایک قبیلے کے لوگ تھے۔ بے لوث مسکراہٹ کے ساتھ ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔

اس نفسانفسی اور مصروفیت کے دور میں جہاں اپنے آپ سے بھی ملنا مختصر ہوتا جا رہا ہے۔ وہیں کاشی چوہان نے پاکستان میں بکھرے ہوئے رائٹرز کو ایک چھت کے نیچے جمع کر دیا۔ اس جوان میں جذبہ ہے، حوصلہ ہے اور کچھ کر گزرنے کی ہمت ہے۔ یقیناً کچھ لوگ نے اعتراض بھی کیے ہوں گے۔ تنقید بھی کی ہوگی مگر صرف یہ سوچیے کہ زبان سے لفظ نکالنا تو بہت آسان ہے مگر ایک صوبے سے اٹھ کر دوسرے صوبے میں جا کر اتنا بڑا پروگرام کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ تنقید کرنے والے حوصلہ افزائی نہیں کر سکتے تو حوصلہ شکنی بھی نہ کریں کاشی چوہان پاکستان کے دل لاہور میں آئے تھے اور لاہور والوں نے انہیں دلی طور پر خوش آمدید کہا۔ ویل ڈن کاشی چوہان صاحب۔ اللہ تعالیٰ آپ کے حوصلوں کو مزید وسعت دے اور ہر سال ایسی خوب صورت محفل سجتی رہے۔ آمین۔

☆☆☆☆

پنجاب یونیورسٹی کی طالبہ نے ہیر سنا کر میلہ لوٹ لیا

تعبیرِ خواب

زمر نعیم (لاہور)

کاشی بھائی! کچھ خواب ہم سوتی آنکھوں سے نہیں جاگتی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور دیکھتے چلے جاتے ہیں کہ کوئی تو ایسا دن ہوگا جب یہ سچ بن کر ہمارے سامنے مجسم و فروزاں ہوں گے۔ ہماری امیدیں اسے سینچ کر پروان چڑھاتی ہیں اور کاوشوں کا لہو خوش رنگ، حرارت بخش شمعیں روشن کرتا چلا جاتا ہے۔ سچی کہانیاں رائٹر ایوارڈ بھی یقیناً ایسا ہی خواب تھا جس کو تعبیر دینے کی لگن منزہ سہام کے ساتھ کاشی چوہان کو بھی تھی۔ بالآخر اس خواب کو تعبیر دینے کا دن اور وقت مقرر ہوا۔ ہم جیسوں، ادب دوست لوگوں کو عجب سی بے قراری تھی۔ لاہور میں اس تقریب کا انعقاد تھا اور موسم سرد اور شدید تر۔ 26 جنوری بارش کی پیشن گوئیاں۔ عجب گومگو سی کیفیت تھی۔ باوثوق اطلاعات کے باوجود دل میں بے یقینی اندیشے پیدا کر رہی تھی کہ کہیں تقریب منسوخ نہ ہو جائے اور میں اپنے گھر والوں کے سامنے شرمندہ نہ ہو جاؤں۔ کیونکہ اس کے حوالے سے کافی مہینوں سے پلاننگ کر رکھی تھی اور ہفتے میں ایک دو بار تو ضرور رضوانہ آپی اور نسیم نیازی سے بات چیت ہوتی تھی بلکہ میں تو رضوانہ کوثر آپی سے برملا کہتی تھی کہ میں آپ کی مہمان ہوں اور ان کا دل تو آپ جانتے ہیں کہ کتنا بڑا ہے۔ ایک میں کیا ساری دنیا بھی ان کے دل میں سمٹ جائے تو ان کے دل کی فراخی کم نہ ہو۔ بہرحال کاشی بھائی کی آمد کا پتا چلا تو بے یقینی اور اندیشے ختم ہو گئے لیکن موسم کی شدت اور موسلا دھار بارش نے ارادوں کو متزلزل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مگر دل نے کہا کہ کچھ بھی ہو ضرور جانا ہے۔ سو مسلسل ہوتی بارش کے بعد بھی خود کو جانے پر آمادہ کیا۔ کیونکہ وہاں سب سے ملنے کی خواہش کھینچ رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اتنے شدید موسم اور بارش میں گھر سے نکلنا میرے لیے الگ تجربہ ہے۔ عین وقت پر (یعنی گھر سے نکلنے سے پہلے) رضوانہ آپی کے فون نے جگہ کی تبدیلی کا بتایا کہ تقریب کا انعقاد فیلیٹیز ہوٹل کے بجائے قذافی اسٹیڈیم کے پنجابی کمپلیکس میں ہوگا۔ وہ مجھے صبح ایس ایم ایس بھی کر چکی تھیں۔ یہ میری کوتاہی تھی کہ میں پڑھ نہیں سکی۔ فلیٹیز میرے گھر سے قریب تھا اور الحمرا کافی دور۔ اس پر برستی بارش، چھوٹے بھائی کی ٹانگ میں درد تھا۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ رکشہ گھر تک کیسے منگواؤں۔ سب سے چھوٹے بھائی کو اس کے آفس سے بلوایا اور پھر اپنے لیے رکشہ منگوایا۔ تب کہیں جا کر میں تنہا عازمِ سفر ہوئی۔ مختصر سفر تھا مگر بارش نے طویل کر دیا۔

خدا خدا کر کے پنجابی کمپلیکس پہنچی تو پہلے تو کوئی شناسا چہرہ نظر نہیں آیا۔ چند قدم آگے بڑھی تو کاشی بھائی نے پرتپاک خیر مقدم کر کے احساس دلا دیا کہ نہ آتی تو پچھتاوا رہتا۔

رضوانہ آپی پہلے سے ہال میں براجمان میرا

حوصلہ بڑھا رہی تھیں۔ اپنی مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ شائستہ بھی تشریف فرما تھیں۔ رضوانہ آپی نے تعارف کروا کر شناسائی بڑھائی۔ کاشی کی سسٹر اسلام آباد سے تشریف لائی تھیں۔ ہال میں کئی ایک لکھاری بیٹھے تھے۔ جن کے ناموں سے شناسائی تھی۔ چہروں سے نہیں۔ رضوانہ آپی یہ فریضہ انجام دے رہی تھیں۔ راحت وفا راجپوت سے پہلی ملاقات ہوئی بہت اچھا لگا۔ فصیحہ سے فون پر تو بات چیت رہتی ہے۔ تقریب میں مل کر ایسا لگا ہی نہیں کہ پہلی ملاقات ہے۔ فریدہ جاوید فری، دلشاد نسیم، نسیم سکینہ صدف، فریدہ خانم، ممتاز احمد اوان کی فیملی، نسیم نیازی، بشریٰ سعید فیملی اور باقی سب لکھاری۔ برستی بارش کے باوجود اس خواب کی تعبیر بن کر موجود تھے جو ہر قاری اور لکھاری و دوشیزہ اور سچی کہانیاں کی آنکھوں میں سوتا جاگتا رہا تھا۔ منتظمین اور کاشی بھائی کی کوششوں کا منہ بولتا ثبوت سلسلہ تقسیم ایوارڈ شروع ہوا تو پہلا ایوارڈ ہی رضوانہ آپی کا تھا۔ ہمیں تو ایسا لگ رہا تھا کہ یہ ایوارڈ ان کے ساتھ ہمیں (مجھے اور نسیم نیازی) کو بھی ملا ہے۔ ڈراما آرٹسٹ دانیہ اور عباس رائے کی کمپیئرنگ نے اپنی صلاحیتوں اور کارکردگی سے ہال کے حاضرین کو وقفے وقفے سے محظوظ کیا۔ ایک کمی تھی تو منزہ سہام اور ان کی فیملی کی جو ناسازی طبع کے باعث شریکِ تقریب نہ ہو سکی تھیں۔ ان کی غیر موجودگی سے یقیناً کاشی بھائی پر بڑی ذمہ داری آپڑی تھی۔ تمام مہمانانِ گرامی کے علاوہ منتظمین کے ساتھ بھی رابطہ رکھنا آسان کام نہیں تھا۔ پھر بھی تمام مراحل بخیر و خوبی انجام پذیر ہوئے۔ پرنٹ کاسٹ میڈیا، فنکار آن لائن لاہور ٹی وی نے تقریب کی کوریج کر کے یہ احساس دوچند کر دیا کہ سچی کہانیاں کی مقبولیت پرل پبلی کیشنز کے لیے ہی نہیں ہمارے لیے بھی باعث فخر ہے۔ تقریب میں شرکت کے بعد یہ خوشگوار انکشاف ہوا کہ مجھے بھی اسٹیج پر جانا پڑے گا۔ اپنا نہیں سنبل کا ایوارڈ لینے اور نسیم کی بھی یقیناً یہی کیفیت تھی۔ وہ بھی اقبال بانو صاحبہ کا ایوارڈ وصول کر کے ایسا ہی محسوس کر رہی تھیں۔ اس تقریب میں فرزانہ آغا کو بھی آنا تھا مگر وہ بھی مصروفیت کی وجہ سے بروقت نہ پہنچ سکیں۔ بہرحال ایک یادگار شام سبھی کے ذہنوں اور یادداشتوں میں محفوظ ہو گئی۔ اس شام کی خوشگواری کو برقرار رکھنے کے لیے میں نسیم نیازی اور اختر بھائی (نسیم کے شوہر) کی بے حد ممنون و مشکور ہوں جنہوں نے اتنے شدید برستے موسم میں ممجھے اور رضوانہ آپی کو گھر واپس چھوڑنے کا ذمہ اٹھایا۔

زمر نعیم سلطان احمد تنولی سے ایوارڈ وصول کرتے ہوئے

حالانکہ میرا گھر ان کے راستے سے مخالف تھا۔ پھر بھی وہ لوگ مجھے گھر تک چھوڑنے آئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انہیں صحت و سلامتی کے ساتھ دنیا کی ہر نعمت اور آخرت میں جزائے خیر عطا کرے، آمین ثم آمین۔

آخر میں سبھی ایوارڈ ونرز کو دلی مبارک باد پیش کرتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ آئندہ اس سے بھی زیادہ اچھی اور خوشگوار تقریبات ادارہ دوشیزہ و سچی کہانیاں منعقد کرتا رہے اور ہم سبھی ایسی پیاری یادداشتیں اپنے ذہنوں میں محفوظ کرتے رہیں، آمین۔

☆☆☆

تقریب کا آنکھوں دیکھا حال

طاہر ساقی (پورے والا)

ملک کے سب سے بڑے اور انٹرنیشنل لیول ڈائجسٹ سچی کہانیاں اور دوشیزہ کے زیر اہتمام سالانہ رائیٹر ایوارڈ تقریب 2017ء قدافی سٹیڈیم پنجاب کلچرل کمپلیکس لاہور میں منعقد ہوئی جس میں نامور شخصیات کے علاوہ سچی کہانیاں میں لکھنے والے خواتین وحضرات کی حوصلہ افزائی کے لئے ان کو ایوارڈز اور شیلڈ سے نوازا گیا اس تقریب کی تیاری کے لئے ایک سال قبل میرے دوست کاشی چوہان ادیب ممتاز احمد بڑے ذوق وشوق سے بڑے مشکل مراحل طے کرتے ہوئے اس تقریب کو منعقد کرانے میں کامیاب ہوئے۔

علم دوست کاشی چوہان نے بتایا کہ پرل پبلی کیشنز کے زیر اہتمام 35 سالوں سے شائع ہونے والے اس ماہنامے کی پہلی تقریب منائی جارہی ہے لیکن صوبہ پنجاب میں مقیم کچھ دوستوں کے اصرار پر اس کو لاہور میں منعقد کرانے کا فیصلہ کیا گیا اور لاہور سرگودہا کے علم دوستوں نے یہ ذمہ داری قبول کی 26 جنوری 2017ء سال رواں کی یہ پُروقار تقریب بروز جمعرات دن 10 بجے بمقام فیلیٹر ہوٹل لاہور منعقد ہونا تھی مگر بعد میں ملکی حالات کے پیش نظر اس کو محدود کر کے پنجاب کلچرل کمپلیکس قدافی سٹیڈیم لاہور میں تبدیل کر دیا گیا جس کے چیف آرگنائزر ایڈیٹر سچی کہانیاں کاشی چوہان اور ان کے معاون ڈاکٹر غلام عباس، شعیب بھٹی اور ممتاز احمد تھے جنہوں نے اس تقریب میں مہمانان خاص اور عام کو مدعو کیا۔ بنیادی طور پر اس تقریب کا مقصد مصنفین کو ان کے لکھنے کے اعتراف میں ان کو ایوارڈ دینا ہے تاکہ وہ اس صحت مند مقابلے میں بہتر سے بہتر تحریروں کو لکھنے میں مزید نکھار پیدا کر سکیں۔

سطور بالا میں اس کی وضاحت کرنا اس لئے مقصود ہے کہ قارئین کو معلوم ہو سکے کہ پرل پبلی کیشنز اپنی نصف صدی پورے کرنے جارہا ہے اور نصف صدی پر محیط یہ خاردار سفر ہے کیونکہ رائیٹر شاید لکھنے کے بعد اپنی کہانیوں کا ریکارڈ محفوظ نہ کر سکے مگر سچی کہانیاں ہی وہ واحد جریدہ ہے جس نے اپنے محدود مالی وسائل میں کہانیوں کو کمپوزنگ، پرنٹنگ اور ترسیل کے مشکل مراحل سے گذار کر قارئین کو اپنی کہانیاں کتاب کی شکل میں محفوظ کر کے قارئین کے ہاتھوں میگزین میں شائع کر کے لاکھوں قارئین تک پہنچانے کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے اور ایک عام آدمی کر پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر متعارف کرا کے ان کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔

رائیٹر ایوارڈ 2017ء کی تقریب کا آغاز شام 7 بجے ہونا تھا مگر اپنے علم دوست ممتاز احمد کے حکم پر ایک گھنٹہ پہلے معروف صحافی دوست ڈاکٹر ریاض ہاشمی کے ہمراہ سکیم موڑ سے قدافی سٹیڈیم پہنچے تو موسلا دھار بارش تھی اور ہم بڑی تیزی سے پنجاب کلچرل ہال کی طرف دوڑے وہاں پر موجود میزبانوں نے ہمارا والہانہ استقبال کیا کاشی چوہان نے ہمیں اپنی نشستوں پر بٹھایا اور ہمیں اپنی ذمہ داریاں سونپ کر اپنے کام

میں مصروف ہوگئے۔ مہمانان گرامی کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا اور یہ تقریب 8 بجے کے قریب شروع ہوگئی۔ تلاوت کلام اور نعت کے بعد باقاعدہ نظامت کے فرائض سرانجام دینے والی دانیہ اور عباس رائے نے باری باری مہمانوں کو سٹیج پر بلانا شروع کیا۔

تقریب کو دلچسپ بنانے کے لئے ایوارڈ حاصل کرنے والوں کو بلانے کے ساتھ ساتھ آنے والی شخصیات کو اظہار گفتگو کو موقع بھی دیا گیا اور ساتھ ساتھ محفل موسیقی کا دور بھی تقریب کا حصہ رہا تقریب کے آغاز میں ایڈیٹر کاشی چوہان نے استقبالیہ پیش

حاضرین محفل تقریب سے محظوظ ہوتے ہوئے محو انہماک ہیں

کرتے ہوئے کہا کہ ماہنامہ سچی کہانیاں کے بانی سہام مرزا اور ان کی ٹیم کو خراج تحسین کے مستحق ہیں کہ انہوں نے لکھنے والوں کے لئے ایک پلیٹ فارم مہیا کر کے سیکڑوں رائیٹر متعارف کرائے۔

آنے والے نئے لکھاریوں کے لیے اکیڈمی کا درجہ رکھتے تھے۔ تقریب میں ملک بھر سے دانشوروں، ادیبوں فنکاروں اور صحافیوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ تقریب میں جن شخصیات کے ہاتھوں ایوارڈ تقسیم کرائے گئے ان میں ڈاکٹر مرتضیٰ مغل کالم نگار، پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ تبسم، عمران مسعود سابق وزیر تعلیم، آمنہ الفت سابق ممبر قومی اسمبلی، ڈاکٹر ارشد، الفتار انی، مصنف ممتاز احمد، اینکر ماڈل ڈولی، شاعر صغرا صدف، اداکار اورنگ زیب لغاری، راشد محمود، اسد بیگ، گلوکار کرن ہزاروی، شبانہ عباس، بشریٰ ماروی، فیضان علی فیضی، بلال طاہر، دانش کھچی، موسیقار طاہر ساقی، فیاض بلی، حمیرا ارشد، پیر شاہ قادری، شہزادہ ذوالقرنین، روینہ، ثروت اشرف، ریشماں مریم، دلشاد نسیم، شمع لعل و دیگر نے سٹیج پر پرفارم بھی کیا اور ایوارڈ بھی وصول کئے۔

یہ رنگا رنگ تقریب تقریباً رات گیارہ بجے اختتام پذیر ہوئی، تقریب میں معززین نے سچی کہانیاں کی پوری ٹیم اور خصوصاً کاشی چوہان کی کاوشوں کی تعریف کی اور انہیں تقریب منعقد کرانے پر مبارکباد پیش کی۔ تقریب میں شیلڈ اور ایوارڈ حاصل کرنے والوں نے بھی میزبان کاشی چوہان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے کراچی سندھ سے آکر پنجاب میں اپنے لکھنے والوں سے جس محبت اور خلوص کا اظہار کیا ہے ہم ان کے جذبوں کو سلام پیش کرتے ہیں۔ کاشی چوہان نے کہا کہ انشاء اللہ آپ کے تعاون سے آئندہ یہ سالانہ تقریب اسلام آباد میں منعقد ہوگی جس میں ملک بھر سے اپنے نئے لکھاریوں کو ایوارڈ اور شیلڈ سے نوازا جائے گا تاکہ یہ روایت قائم رہے اور دیے سے دیا جلتا رہے۔

☆☆☆

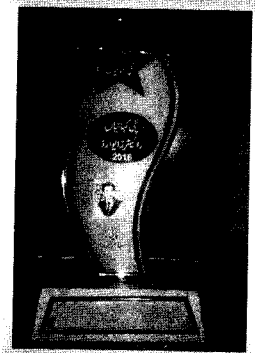

میں آپ کو مان گیا!

ملک علی رضا (فیصل آباد)

سچی کہانیاں رائٹر ایوارڈ 26 جنوری بروز جمعرات شام سات بجے پیلاک قذافی اسٹیڈیم میں دھوم دھام سے شروع ہوا۔ میں فیصل آباد سے بھاگتا دوڑتا ہانپتے کانپتے لاہور خیریت سے پیلاک پانچ بجے پہنچا تو ٹیرس میں محترم خالد فاروق، سنبل ملک، عاصی، حاجی فرزند علی صدیقی، محترم انتظار حسین ساقی، راحیلہ منظر اور میرے پیارے دوست افضل آزاد، ذیشان ریاض، عرفان سونی میرا انتظار کر رہے تھے۔ سب سے پہلے کاشی چوہان صاحب سے ملاقات ہوئی۔

زندگی میں پہلی بار ایسے حوصلے والا بندہ دیکھا جو اتنا بڑا پروگرام اکیلا کروا رہا تھا۔ بہت خوب چوہان صاحب دی گریٹ۔

آج میں میڈم منزہ سہام کی ٹیم کو مان گیا واقعی کراچی والے بہت تیز ہیں۔ خیر سچی کہانیاں اور ٹرانس کاسٹ میڈیا کے تعاون سے یہ پُروقار تقریب سوا سات بجے شروع ہوئی۔

پروگرام نعت شریف سے شروع ہوا اس موقع پر محترم کاشی چوہان نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ادب و علم سے ہی لوگوں میں شعور پیدا ہوتا ہے اور انسان کے اندر ایک لگن پیدا ہوتی ہے۔

جتنے بھی رائٹرز، اداکار موجود ہیں اس وقت وہ سب ملک کے Hero ہیں اور ساری ادبی کامیابیاں انہی لوگوں سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے سچی کہانیاں ایوارڈ جیتنے والوں کو مبارک باد پیش کی اور پرنٹ میڈیا کا شکریہ ادا کیا۔

ایوارڈ حاصل کرنے والے احباب محترم ممتاز احمد، قاسم بلوچ، نسیم سکینہ صدف، فصیحہ آصف خان، ریاض شاہد، ایم حسن نظامی، ارم ناز، صداقت حسین کو میری طرف سے بہت مبارک قبول ہو اور اسی طرح ادب کی خدمت کرتے رہیں۔

ٹی وی سے تعلق رکھنے والے کمپیئرز نے پروگرام کو چار چاند لگائے جس پر میں دونوں کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ پروگرام کا انتظام ایسا تھا کہ دل کرتا تھا کبھی ختم نہ ہو۔ پروگرام کے آخر میں مس ڈولی اور کاشی چوہان صاحب نے ہم جیسے احباب کے ساتھ گروپ فوٹو بنوائے۔

آخر میں ان احباب سے گزارش ہے جو کہتے ہیں ہم پروگرام میں ضرور آئیں گے مگر افسوس ایسا پروگرام مس کر دیتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں بہت افسوس ہوا۔

آخر میں دل سے دعا ہے کہ پرل پبلی کیشنز منزہ سہام، کاشی چوہان، دانیال شمسی کو خدا پاک دن دگنی رات چوگنی ترقی دے، ہم سب کی کوششیں آپ کے ساتھ ہیں کہ ڈائجسٹ خوب ترقی کرے، آمین۔

☆☆☆

تھینک یو سچی کہانیاں!

عبدالغفار عابد (چیچہ وطنی)

ہر ادارے کے ایڈیٹر کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح' کسی انداز میں اپنے لکھاری وقاری حضرات کے لیے کوئی ایسا کام کرے جس سے ان کی حوصلہ افزائی ہو۔ کاشی چوہان پر اللہ تعالیٰ کی خاص کرم نوازی تھی کہ اس نے وہ کارنامہ سرانجام دیا جو کوئی اور ایڈیٹر نہ دے سکا۔ 26 جنوری کو قذافی اسٹیڈیم کا پنجابی کمپلیکس لاہور کا ہال حاضرین سے فل بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف گہما گہمی نظر آرہی تھی۔ سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ حاصل کرنے والے لکھاری تو خوشی سے سرشار تھے مگر ان کے ساتھ ساتھ اس تقریب میں شرکت کرنے والا ہر فرد یہاں آکر خوشی محسوس کررہا تھا۔ اس تقریب کو میڈیا اور شوبزنس سے وابستہ لوگوں نے بھی خوب انجوائے کیا۔ ایوارڈ اور سرٹیفکیٹ حاصل کرنے والوں کو مخصوص سیٹیں دی گئی تھیں۔ کاشی چوہان کی ہدایت پر کچھ دوستوں نے مہمانوں کی رہنمائی کے فرائض احسن طریقے سے انجام دیے۔ تقریب کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ پھر کبھی ایوارڈ کا سلسلہ ہوتا اور کبھی اسٹیج پر موسیقی سے ہال گونجنے لگتا۔ پاکستان بھر سے آئے ہوئے رائٹرز کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ کچھ مہمانوں کو ادارے کی طرف سے اسپیشل ایوارڈ بھی دیئے گئے۔ ملک بھر کے نامور رائٹرز اور شعراء اکرام کے ساتھ ساتھ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے بھی سچی کہانیاں ڈائجسٹ اور ایوارڈ تقریب کو سراہتے ہوئے اچھے لفظوں میں اپنے پاکیزہ دلی جذبات کا اظہار کیا، جہاں ادب سے وابستہ لوگوں کی شرکت نے اس تقریب کو کامیاب بنایا۔ وہاں میڈیا اور شوبزنس کے لوگوں نے اس تقریب کو خوب صورت بھی بنایا۔ حاضرین نے باجی منزہ کو بہت مس کیا۔ کاشی چوہان نے باجی منزہ کی کمی پوری کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وقفے وقفے سے اسٹیج پر آکر ادارہ سچی کہانیاں کی ادب دوستی پر روشنی ڈالتے رہے۔ کراچی سے شائع ہونے والے کسی ماہنامہ نے آج تک اپنے لکھاریوں کے لیے لاہور میں تقریب نہیں منعقد کرائی۔ سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ تقریب لاہور میں منعقد کرا کے کاشی چوہان نے اہل ادب کے ساتھ ساتھ اہل پنجاب کے دل بھی جیتے۔ ہال میں بیٹھے کچھ لوگوں کی زبانی یہ بھی کہتے سنا کہ ہمیں تو پتا ہی نہیں تھا کہ سچی کہانیاں بھی کوئی ڈائجسٹ ہے جو کراچی سے باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ کاشی چوہان نے ادارے کی سرپرست باجی منزہ سہام کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ میں ذاتی مصروفیات کی وجہ سے اس تقریب میں شرکت نہیں کرسکی انشاء اللہ اگلی بار میں اپنی حاضری کو یقینی بناؤں گی۔ سچی کہانیاں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ نئے لکھاریوں کی تحریروں کو قابل اشاعت بنا کر نہ صرف انہیں شائع کرتا بلکہ ان کی بہترین تحریروں پر رائٹرز کو ایوارڈ و سرٹیفکیٹس سے بھی نوازتا ہے۔ میں ادارے کی طرف سے اپنے رائٹرز کا شکریہ ادا کرتی ہوں جو دور دراز علاقوں سے سفر طے کر کے آئے اور آج کی اس تقریب کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ آخر میں تمام ایوارڈ حاصل کرنے والے رائٹرز کو مبارک باد دیتا ہوں اور سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کو پررونق بنانے والے حاضرین اور لاہور اس تقریب کا اہتمام کرانے پر کاشی چوہان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں امید ہے کہ ہر سال سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ تقریب لاہور میں منعقد ہوا کرے گی۔

☆☆☆

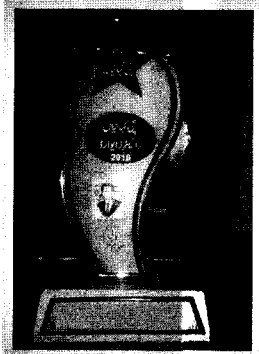

رنگوں، روشنیوں والی شام

حنا بشریٰ (لاہور)

سچی کہانیاں ایوارڈز 2016ء کی اناؤنسمنٹ کے بعد جب اپنا نام ایوارڈ یافتہ لکھاریوں میں دیکھا تو دل کی حالت کچھ عجیب سی ہوگئی۔ کبھی ہوتا ہے ناں یوں بھی کہ بہت اچانک ہی آپ کو زبردست قسم کی خوش خبری سننے کو ملے اور خوش خبری بھی وہ کہ جس کی تمنا نے آپ کے دل کو بہت عرصہ سے بے چین کیا ہوا ہو تو یہی حال اپنا بھی ہوا دل دھڑک دھڑک کر بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ چند لمحے تو خوب غور کر کے پڑھا کہ کہیں غلطی سے تو نہیں چھپ گیا نام (اپنے بارے میں کافی کسر نفسی سے کام لیا کرتی ہوں۔ ہمیشہ جس برائی کی بہت ڈانٹ بھی سنا کرتی ہوں کہ کیوں خود کو اتنا پیچھے رکھتی ہو) خیر فٹافٹ ادارے کو فون ملایا، محترم بھائی کاشی چوہان نے ہنستے ہنستے اور ڈانٹتے ڈانٹتے تصدیق کی اور وہی اسٹینڈرڈ جملے جو گھر والوں سے بھی سنا کرتی ہوں کہ آخر کیوں خود پر یقین نہیں۔ بہنا واقعی اتنا اچھا لکھتی ہو کہ قارئین کی پسند کی اور ایوارڈ کی حقدار ٹھہری ہو۔ بہرحال تصدیق کے بعد اپنے عزیز شوہر کو فون پر ایوارڈ یافتہ ہونے کے متعلق بتایا جس پر وہ بے حد اور بے انتہا خوش ہوئے ان کے بعد فرداً فرداً فیملی کو مطلع کیا اور تہنیت کے فون اور میسجز موصول کیے۔ اب انتظار تھا تقریب کے منعقد ہونے کا جو کہ لاہور میں ہونی تھی۔ بروز جمعرات مورخہ 26 جنوری اس دن کے انتظار میں محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً دن گن گن کر گزارنا شروع کیے۔ لاہور میں سردی اپنے جوبن پر تھی۔ سردی میرا پسندیدہ موسم بھی ہے سو دل بھی خوب باغ و بہار تھا مگر ارمانوں پر اوس گرنا شروع ہوئی۔ جمعرات کی صبح سے ہی موسم نے یکدم کروٹ لی اور کالے کالے بادل جمع ہونا شروع ہو گئے۔ آج کے دن شوہر صاحب نے آفس سے رخصت طلب کی ہوئی تھی۔ موسم نے تو تیور دکھائے ہی دکھائے ساتھ میڈ بھی غائب ہوئی..... ''ہائے فہداب کیا ہو گا۔'' میں مارے فکرمندی کے بار بار ان کو ہولاتی۔

''ارے بیگم آندھی آئے یا تیز بارشوں کے جھکڑ! خاکسار نے بھی قسم کھائی ہے اپنی زوجہ کو منزل تک پہنچانے کی۔'' موسم کے ساتھ ساتھ فہد کی شوخیاں بھی عروج پر تھیں میں انہیں سوائے گھورنے کے اور کچھ کرنے کا لائق نہ تھی لہٰذا گھر کے کام بھی سمیٹتی رہی اور تیاری بھی ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ کاشی بھائی کی کالز بھی ساتھ ساتھ تھیں۔ دو بجے اور موسلا دھار بارش شروع ہوئی میں کپڑے استری کر رہی تھی اصل پریشانی دونوں بچوں کی تھی۔ میری بڑی بیٹی جو کہ ساڑھے تین سال کی ہے [illegible] سے فلو میں مبتلا تھی اور چھوٹی تو خیر اسی مہینے [illegible] ہوئی ہے۔ بہرحال تیاری شروع کی۔ خوش قسمتی سے [illegible] صود میرے آشیانے سے بھی قریب تھی۔ ہم ماڈل ٹاؤن میں رہائش پذیر ہیں اور قذافی اسٹیڈیم تک پہنچنے [illegible] 20 منٹ لگتے تھے۔ خیر 4 بجے ہم سب تیار ہو [illegible] ئے۔ بھیگا بھیگا موسم اور سرد ہوائیں، واہ مزہ آ [illegible] ی موسم انجوائے کر رہی

تھیں۔ میں نے بلیک شارٹ سلک کا سوٹ پہنا تھا جب کہ ساتھ گرم مفلر اسٹائل کا ہاف سوئیٹر تھا جب کہ شوہر نامدار بلیو جینز شرٹ اور بلیک کوٹ میں کافی سے زیادہ ہینڈسم اور چارمنگ لگ رہے تھے۔

''کیا بات ہے بہت گھور رہی ہو۔'' انہیں بھی میری بار بار ان پر اٹھتی نظروں کا احساس ہو گیا تھا۔

''بہت اچھے لگ رہے ہیں آپ، ماشاءاللہ!''

''اچھا!'' انہوں نے اچھا کافی لمبا کھینچا اور مسکرائے۔

''جی جناب!'' میں بھی مسکرا دی اور دل میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا جس نے ایک بہترین رفیقِ حیات سے نوازا جو میری تمام صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں میرے ساتھ ساتھ رہے ہمیشہ اور آج ایوارڈ کے لیے وہ مجھ سے زیادہ پرجوش اور خوش تھے۔ خیر ہم پنجابی کمپلیکس کے سامنے اترے تو سامنے سے کاشی بھائی نظر آئے۔ وہ بھی بلیک کوٹ میں خوب جچ رہے تھے۔ خوب گرم جوشی سے ملے۔ فہد بھی ان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ ہم ان کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ اندر کا ماحول کافی گرم اور خوشگوار تھا۔ مہمان ابھی آنا شروع ہو رہے تھے۔ کچھ چہرے جانے پہچانے اور باقیوں سے صفحات کے ذریعے کی پہچان تھی۔ کافی اچھا سیٹ اپ تھا۔ اسٹیج پر ایک طرف سائیڈ ٹیبل پر لائن سے رکھے گئے۔ ایوارڈز نگاہوں کو خوب جچ رہے تھے اور جچتے بھی کیوں ناں! آخر کسی ایک پر اپنا بھی جو نام تھا۔ کچھ ہی دیر میں تقریب کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ تمام سیٹیں رفتہ رفتہ لوگوں سے بھرتی جا رہی تھیں۔ لوگ ایک دوسرے کو دیکھتے اور اپنائیت سے مسکراتے، ظاہر ہے سب کا تعلق ایک قبیلے سے جو جڑا تھا، قلم قبیلہ، تمام فیملی ممبرز..... وہاں رضوانہ کوثر آنٹی سے ملاقات ہوئی۔ کافی سوئیٹ اور پیاری سی جن سے مل کر قطعاً اجنبیت کا احساس نہ ہوا۔ میرے ساتھ نادیہ ملک بیٹھی تھیں۔ ان سے دوستی ہو گئی جو آج بھی قائم ہے۔ تقریب کا آغاز تلاوتِ قرآن پاک سے ہوا۔ اس کے بعد خوب صورت سی نعت نے سماں باندھ دیا۔ زندہ دلانِ لاہور میں منعقد ہونے والی تقریب اپنی تمام تر رعنائیوں سے شروع ہو چکی تھی۔ خاتون کمپیئر اور محترم کمپیئر بھی شاہم کو خوب صورت بنانے میں کسی سے ہرگز کم نہ تھے۔ منزہ سہام اپنی کسی نجی مصروفیت کی بناء پر غالباً نہیں آسکی تھیں لہٰذا سپاس نامہ بھی ان کی طرف سے پیارے کاشی بھائی نے پڑھا اور کیا خوب پڑھا کہ دل میں مزید تحریک بڑھی کہ اب قلم صفحات سے ہرگز ہرگز تعلق نہیں توڑنا۔ خوب صورت گانوں نے ایک سماں سا باندھ رکھا تھا۔ اب بالآخر باری آگئی تھی۔ ایوارڈز کی اناؤنسمنٹ کی تو دل میں اچھے جذبات کے ساتھ لکھاری اسٹیج پر آتے اور ہنستے مسکراتے ایوارڈز وصول کرتے۔ دھڑا دھڑ تصویریں اور ویڈیو بن رہی تھیں۔ کاشی بھائی کی صرف جھلک ہی دکھائی دیتی رہی۔ تمام تقریب کے دوران وہ یہاں بھی نہایت جانفشانی سے تقریب کو اور مکمل اور خوب صورت بنانے میں جُتے ہوئے تھے۔ جس طرح ہر مہینے کے شمارے کو سجاتے سنوارتے ہیں اسی طرح وہ اس تقریب کو منفرد اور مکمل بنانے میں جُتے ہوئے تھے۔ نام پکارے جاتے رہے اور مصنفین اپنا اعزاز وصول کرتے رہے۔ باہر موسم لحہ بہ لحہ گہرا ہو رہا تھا۔ میں بار بار فکرمندی سے گھڑی بھی دیکھتی، چھوٹی بیٹی بہت ڈسٹرب ہونے لگی تھی کیونکہ میں جلدی جلدی میں اس کا دودھ رکھنا بھول گئی تھی۔ تقریب کا رنگ لحہ بہ لحہ کھلتا جا رہا تھا۔ خوب صورت برجستہ جملے، گانے.....! تقریب کیا تھی گویا رنگ اور روشنی کی کہکشاں تھی۔ جہاں ہر ستارہ اپنی مثال آپ تھا۔ میں یہ سب دیکھ رہی تھی انجوائے کر رہی تھی کہ میرا نام اناؤنس کیا جانے لگا۔ خوشی کا لمحہ تھا جو آکر رک سا گیا۔ میں دھیمے دھیمے خود کو سنبھالتی اپنی بیٹی کا ہاتھ تھامے اسٹیج پر پہنچ گئی۔ ایوارڈ ہاتھ میں لیا تو ایوب تحاشا، بے حساب یاد آئے۔ مجھے یہاں تک پہنچانے میں میرے پیارے محترم والد عبدالقیوم مرحوم کا ہاتھ تھا اور رہے گا۔ میری کہانیوں کو سننا، تصحیح کرنا، ان کے عنوان تجویز کرنا یہ سب وہ ہی کیا کرتے تھے۔ میں نے ایوارڈ ریسیو کیا اور دل ہی دل میں ادارے کا سہام مرزا کا منزہ سہام کا اور پیارے قارئین کا شکریہ ادا کیا۔ جیو پرل پبلی کیشنز! جیو منزہ سہام، جیو بھیا کاشی چوہان! ٹھنڈ چونکہ کافی بڑھ چکی تھی اور واپسی کا مرحلہ سر کرنا باقی تھا سو ہم کاشی بھائی سے الوداعیہ ملاقات کرتے لوٹ آئے۔ اس وعدے اور امید کے ساتھ کہ جلد ہی یہ تقریب اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ دوبارہ سنائی جائے گی۔

☆☆☆

اپنے دیس سے، اپنے شہروں سے موصولہ، وہ سچ بیانیاں
جن کو پڑھ کر، اپنی مٹی کی خوش بُو، آس پاس محسوس ہوتی ہے

پہلی سچ بیانی

داؤ

افتخار چوہدری

بس ایک داؤ نے اُس شخص کی زندگی بدل دی اور دوسرے داؤ نے اُسے واپس وہیں لا کھڑا کیا

کنگ سائز کے لگژری کچن میں بیش قیمتی بلیک گرینائٹ اور سُپر وائٹ ماربل کو کاریگروں نے اتنے خوبصورت کمبی نیشن سے فٹ کیا تھا کہ اسے دیکھنے والا مبہوت رہ جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اٹالین اسپیسریز کی فٹنگ اور دیار کی خوشبو دار لکڑی سے دلکش اور نفیس مینا کاری کی گئی تھی، جس کی وجہ سے پورا کچن وڈ آرٹ کا ایک نادر شاہ کار لگ رہا تھا۔

اس وقت بلیک گرینائٹ کی شیلف میں فٹ کیے گئے کوکنگ رینج پر موجود کئی برنروں میں سے ایک جل رہا تھا جس کی آگ تیز ہونے کی وجہ سے اس کے اوپر رکھے ہوئے توے سے دھواں نکل رہا تھا۔ قریب ہی شیلف سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوئی مریم اپنے کسی خیال میں مگن تھی۔

جیسے ہی اس کی نظر گرم ہو چکے توے پر پڑی تو وہ چونک کر خیالوں کی دنیا سے باہر نکل آئی اور جلدی سے آٹے کے پیڑے کو بیلن کی مدد سے چپاتی کی شکل میں لے آئی۔ ابھی وہ چپاتی کو گرم توے پر ڈال ہی رہی تھی جبکہ اس کی بیٹی نورین نے اسے مخاطب کیا۔

''مما فریج کا دروازہ نہیں کھل رہا، کیا آپ نے اسے لاک کیا ہے۔''

''نہیں بیٹی، بھلا میں کیوں لاک کروں گی، ابھی چند منٹ پہلے ہی میں نے آٹا نکالا ہے تب تو آرام سے کھل گیا تھا اب کیوں نہیں کھل رہا۔'' اس نے پیچھے کی جانب دیکھتے ہوئے فریج کے دروازے پر زور آزمائی کرتی ہوئی نورین کو جواب دیا تو اس کے لہجے میں حیرت کا عنصر نمایاں تھا۔

''تو پھر اب یہ کھل کیوں نہیں رہا۔'' نورین نے بڑبڑاتے ہوئے خود کلامی کی۔ وہ ابھی سکول سے لوٹی تھی، شاید اسے پانی کی بوتل چاہیے تھی وہ فریج کے دروازے کو زور لگا کر کھولنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ناکامی کی وجہ سے اس پر جھنجھلاہٹ طاری ہو چکی تھی۔

''تم ہٹو، میں دیکھتی ہوں۔'' مریم نے اسے ایک طرف ہٹنے کا اشارہ کیا اور پھر فریج کے دروازے پر موجود ہینڈل کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو دروازہ آرام سے کھلتا چلا گیا۔

''نورین یہ ہر وقت مذاق کرنے کی عادت تمہیں لے ڈوبے گی۔'' اس نے انتہائی غصے سے کہا۔ جبکہ اس کے چہرے پر نورین کی اس حرکت کے لیے ناپسندیدگی کے آثار ابھر آئے تھے۔

''یہ یہ کیسے ہوگیا۔ مما آپ جیسی چاہیں قسم لے لیں یہ واقعی نہیں کھل رہا تھا۔ میں نے اپنی طرف سے پورا زور لگا کر دیکھا تھا۔'' نورین نے اپنے کانوں سے ہینڈفری اتارتے ہوئے حیرت سے بگڑے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ وہ کبھی اپنی امی کی طرف اور کبھی چوپٹ کھلے ہوئے فریج کے دروازے کو دیکھ رہی تھی جو اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ مریم مزید کچھ کہتی اسے کوئی چیز جلنے کی بُو آئی تو اس کی نظریں کوکنگ رینج کی طرف اٹھ گئیں، جہاں توے پر موجود چپاتی بری طرح سے جل رہی تھی۔ وہ بوکھلا کر اس طرف دوڑی اور جلدی سے توے کو اٹھا کر ساتھ ہی موجود سینک میں رکھ دیا

چپاتی جل کر توے سے چپک گئی تھی، اس نے توے کو صاف کرنے کے لیے کوکنگ رینج کے اوپر بنے ہوئے خوبصورت کیبنوں میں سے ایک کیبنٹ کو کھول کر چمٹا نکالنے کے لیے اس میں ہاتھ ڈالا تو اسے ایسے محسوس ہوا جیسے اس کے ہاتھ کو کسی نے آہنی گرفت میں جکڑ لیا ہو۔

اس احساس سے ہی اس کے پورے وجود میں سنسناہٹ دوڑ گئی، اس کے ذہن کے کسی گوشے میں احساس ابھرا کہ نورین کی طرح وہ بھی کسی وہم میں مبتلا ہوگئی ہے، اس نے گھبرا کر ہاتھ واپس کھینچنا چاہا مگر اس کا وہم حقیقت کا روپ دھار چکا تھا۔ اس کا ہاتھ واقعی کیبنٹ کے اندر کسی نے پکڑ لیا تھا، جس کی گرفت ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی، اس نے مدد کیلئے فریج کی طرف دیکھا جہاں چند لمحے پہلے نورین کھڑی تھی، مگر اب وہ وہاں نہیں تھی، نورین پانی کی بوتل لے کر واپس جا چکی تھی۔

''نورین!'' مریم نے اپنی بیٹی کو آواز دی۔

جو خوف اور وحشت سے کانپ رہی تھی، اس کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی، آواز بمشکل کچن سے باہر تک گئی ہوگی، اسے اپنے مجروح بازو کے روئیں کانٹوں کی طرح کھڑے ہوتے ہوئے نظر آتے، اس سے پہلے

کہ وہ دوبارہ نورین کو آواز دیتی کچن کا دروازہ خود بخود بند ہو گیا، دروازے کو ایسے بند ہوتا دیکھ کر مریم کی آنکھیں موت کے خوف سے پھٹنے کی حد تک پھیل گئیں، اس کا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ اس کے دھڑکنے کی آواز سینے سے باہر تک سنائی دے رہی تھی، اس نے ہمت کر کے اپنا ہاتھ چھڑانے کے لیے دوسرے ہاتھ کو کیبنٹ میں لے جا کر اس آہنی گرفت کو اپنے ہاتھ سے ہٹانا چاہا مگر اس کی یہ تدبیر بھی الٹی گلے پڑ گئی، اس آہنی گرفت نے اس کے دوسرے ہاتھ کو بھی اپنی گرفت میں لے کر اوپر کی طرف کھینچ لیا، جس سے مریم کے پاؤں زمین سے فٹ بھر اوپر اٹھ گئے، اور وہ ہوا میں معلق ہو گئی اس کا سارا جسم بازوؤں کے سہارے ہوا میں جھول رہا تھا، جبکہ بازو کیبنٹ کے کنارے پر ٹکے ہوئے تھے، تیز کناروں کی وجہ سے اس کے بازو بری طرح زخمی ہو چکے تھے، جن سے خون نکل نکل کر پورے جسم کو بھگو رہا تھا، مریم کے منہ سے نکلنے والی وحشت بھری چیخیں کمرے میں گونج رہی تھیں، برنر عین اس کے پیٹ کے قریب جل رہا تھا۔ اس کے لیے آگ کی تپش ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی، اور پھر واقعی کچھ ہی دیر میں شعلوں نے اس کی ریشمی قمیض کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، تو وہ اس عذاب سے بچنے کے لیے ہذیانی انداز میں تڑپنے اور چیخنے لگی، کچن میں جلتے ہوئے گوشت اور چربی کی سڑانڈ پھیلنے لگی، جلنے کی اتنی زیادہ تکلیف تھی کہ مریم کے ذہن پر بار بار اندھیرا چھانے لگا اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اگر وہ بے ہوش ہو گئی تو اس کی موت یقینی ہو جائے گی زندہ رہنے کی شدید خواہش میں وہ خود کو کسی نہ کسی طرح ہوش میں رکھے ہوئے تھی چیخ چیخ کر اس کا گلا بیٹھ چکا تھا جبکہ بازوؤں کے بل لٹکنے سے بازو کندھوں سمیت شل ہو چکے تھے، تکلیف کی وجہ سے نقاہت اس قدر غالب آ چکی تھی کہ اب اس کے منہ سے چیخوں کی بجائے کراہیں نکل رہی تھیں، اس نے اپنے جسم میں موجود بچی کھچی توانائی کو قوت ارادی کے بل بوتے پر اکھٹا کیا اور بازوؤں کو اکڑا کر فضا میں جھولتے ہوئے اپنے جسم کو اوپر اٹھانے لگی، تھوڑی سی کوشش سے ہی وہ اپنے پیروں کو اس حد تک اوپر اٹھانے میں کامیاب ہو گئی کہ اس کا ایک پاؤں کوکنگ رینج پر جبکہ دوسرا پاؤں شیلف کے کنارے پر ٹک گیا اس طرح کرنے سے اس کے بازوؤں کو شدید تکلیف سے نجات مل گئی، اگر وہ مزید کچھ دیر ایسے ہی فضا میں جھولتی رہتی تو اس کے کندھوں کے جوڑ نکلنے یقینی تھے، اب اس کا چہرہ کیبنٹ کے عین سامنے تھا کیبنٹ میں نظر پڑتے ہی اس کا جسم ایک بار پھر سے لرزنے لگا۔ وہ چاہنے کے باوجود چیخ نہ مار سکی کیبنٹ میں سیاہ رنگ کا گرگٹ نما ایک عجیب الخلقت چھوٹا سا جانور اس کے بازوؤں کو جکڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی گول مٹول آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دھک رہی تھیں جبکہ اس پورے جسم پر پھنسیاں ابھری ہوئی تھی، جن سے رطوبت بہہ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جسامت کے لحاظ سے کئی گنا بڑے تھے مگر ان کی بناوٹ ہو بہو انسانی ہاتھوں جیسی تھی، مگر اس کے لمبے اور نوکیلے ناخن لوہے جیسے لگ رہے تھے۔ مجموعی طور پر اس کا نظارہ کراہیت انگیز تھا، چند لمحے پہلے مریم کے ذہن پر اندھیرا چھا رہا تھا مگر اس گرگٹ کی شکل والے کالے سیاہ جانور کو دیکھ کر اس کے ذہن پر غالب آنے والا اندھیرا چھٹ سا گیا، وہ چند لمحوں کے لیے جلنے سے ہونے والی اذیت تک بھول گئی اور ایک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ بہر حال خوف سے لاشعوری طور پر اس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا، اسی لمحے جانور نے اپنی گرفت میں موجود بازوؤں کو جھٹکا دے کر اپنی طرف کھینچا تو مریم کا چہرہ عین کیبنٹ کے کھلے ہوئے دروازے کے اندر پہنچ گیا۔

اب دونوں کے درمیان محض چند انچ کا فاصلہ تھا۔ مریم کو اس عفریت کی سرخ آنکھیں اپنے وجود کے آر پار ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں، جبکہ اس کی بدبودار سانسیں سیدھا مریم کے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں، اسے لگا کہ پہلے تو وہ بے ہوش ہونے سے بچ گئی تھی، مگر اب وہ اس موذی کے منہ سے نکلنے والی بدبو کی وجہ سے خود کو بے ہوش ہونے سے نہیں روک پائے گی۔

جانور نے غصے بھری غراہٹ سے منہ کھولا تو منہ کے اندر سے لیس دار مادے کی تاریں ٹوٹتی ہوئی نظر آنے لگیں۔اس کے نوکیلے دانتوں کی کئی قطاریں تھیں جو کسی شارک کے دانتوں سے مشابہہ لگ رہے تھے جبکہ زبان لمبی اور کئی شاخہ تھی۔اچانک ہی وہ پورے زور سے غرایا تو اس کے منہ سے لیس دار مادہ کسی پچکاری کی صورت میں نکل کر سیدھا مریم کے چہرے پر آ گرا، جس سے اس کا سارا چہرہ بھر گیا۔خوف کی وجہ سے اس کا منہ پہلے سے ہی کھلا ہوا تھا اسی لیے کافی مقدار میں مادہ اس کے منہ میں بھی چلا گیا اس کا ذائقہ زہر کی طرح کڑوا اور کسیلا تھا۔کڑواہٹ مریم کی برداشت سے کہیں زیادہ تھی۔

وہ ایسے تڑپی جیسے مچھلی پانی سے باہر نزع کے عالم میں پھڑکتی ہے۔

اس طرح تڑپنے سے اس کے پاؤں شیلف اور کوکنگ رینج کے کناروں سے پھسل گئے تو اس کا جسم ایک جھٹکے سے واپس نیچے کی طرف گرا۔جھٹکا اتنا شدید تھا کہ اس کے ہاتھ جانور کے گرفت سے نکل گئے اور وہ سیدھا فرش پر پہلو کے بل آ گری۔

اس کے گرنے سے ایسی آواز بلند ہوئی جیسے اسکے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو، ہڈی ٹوٹنے کی ناقابل برداشت اذیت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔چیخنے کی کوشش میں اسکے گلے سے محض غرغراہٹ کی سی آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سانس نہیں لے پا رہی۔

اسی لمحے مریم کی آنکھ کھل گئی تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور وحشت بھری نظروں سے اردگرد دیکھنے لگی۔وہ کچن کے فرش کے بجائے اپنے بیڈروم کے نرم و گداز بیڈ پر موجود تھی، ڈراؤنا خواب دیکھنے سے اسکا پورا جسم پسینے سے شرابور ہونے کے ساتھ خوف سے ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔وہ گہرے سانس ایسے لے رہی تھی جیسے کسی لمبے فاصلے سے دوڑتی ہوئی آ رہی ہو۔

اتنا بھیانک خواب اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔اُسے خود کو نارمل کرنے میں کافی وقت لگ گیا۔حالت سنبھلنے پر اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا تو صبح کے تین بج رہے تھے۔رات بیت چلی تھی مگر اس کا شوہر دوستوں کے ساتھ گیا ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا۔بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر پانی سے بھرا ہوا جگ اور گلاس موجود تھا اس نے ایک گلاس پانی پیا اور بستر سے نکل آئی، اور پھر ڈریسنگ ٹیبل پر پڑے ہوئے سیل فون کو اٹھاتے ہوئے بیڈ روم سے باہر آ گئی۔ملحقہ کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھا تو اس کی بیٹی نورین اپنے بیڈ پر بے سدھ سو رہی تھی۔اس نے دروازے کو واپس بے آواز طریقے سے بند کر دیا اور وہاں سے لان میں آ گئی۔باہر کافی زیادہ سردی تھی مگر اسے یہاں اچھا لگ رہا تھا۔

''بیگم صاب خیریت!'' پٹھان چوکیدار نے گیٹ کے ساتھ موجود سکیورٹی روم سے نکل کر اس کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، نورخان، بس مجھے نیند نہیں آ رہی تھی تو سوچا کچھ دیر واک کر لوں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا تو نورخان وہیں سے پلٹ گیا۔

اس کے ذہن میں خواب کسی فلمی سین کی طرح گردش کر رہا تھا۔اس کے دل میں بار بار اپنے ماموں پروفیسر عبدالمالک صاحب کو فون کر کے اس خواب کی تعبیر پوچھنے کا خیال آ رہا تھا۔وہ تاریخ کے پروفیسر تھے، اور اس کے علاوہ انہیں خوابوں کی تعبیر بتانے کے لیے پورے ملک میں اتھارٹی کا درجہ حاصل تھا، وہ اس وقت انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی، مگر اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اسے آنے والا خواب محض ایک خواب نہیں بلکہ کوئی اشارہ ہے، مگر اس کا ذہن اس اشارے کا ادراک نہیں کر پا رہا تھا۔اسی ادھیڑبن میں اس نے پروفیسر صاحب کا نمبر ڈائل کر دیا۔دوسری بیل پر ہی کال ریسیو کر لی گئی۔

''خیریت بیٹی! اس وقت کال کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔دوسری طرف سے پروفیسر صاحب کی تشویش زدہ سی آواز سنائی دی۔

''سوری ماموں میں نے بے وقت آپ کو پریشان

کیا۔'' اس کے لہجے میں حقیقی شرمندگی تھی۔ نمبر ڈائل کرنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ خواب کی تعبیر صبح بھی پوچھی جا سکتی تھی، خوامخوا میں انہیں اس وقت پریشان کیا۔

''نہیں بیٹی میں تہجد کے لیے اٹھ چکا تھا، تم بتاؤ اس وقت کیسے فون کیا۔'' ان کے لہجے سے ابھی تک پریشانی جھلک رہی تھی۔

''ماموں میں نے ابھی ایک انتہائی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے جس نے مجھے حد سے زیادہ خوفزدہ کر دیا ہے اس لیے میں چاہتے ہوئے بھی خود کو فون کرنے سے روک نہیں پائی اور آپ کو اس وقت پریشان کر دیا۔'' مریم نے کال کرنے کا مقصد بیان کر دیا۔

''ہاں بیٹا بعض اوقات انسان ایسے خواب دیکھ لیتا ہے کہ اس پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ تم جزویات سمیت اپنا خواب مجھے سناؤ، ہو سکتا ہے مجھے کچھ سمجھ آ جائے۔'' پروفیسر صاحب نے تجسس سے پوچھا۔ جواب میں اس نے اپنا خواب مکمل تفصیل سے دہرا دیا۔

''ماموں کیا آپ لائن پر موجود ہیں مریم نے اپنی بات ختم کرنے کے چند لمحوں بعد پوچھا۔ کیونکہ اس کی بات ختم ہونے کے بعد بھی دوسری طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد دوسری طرف سے ایک گہری سانس لینے کی آواز سنائی دی۔

''ہاں بیٹی میں نے تمام تفصیل سن لی ہے۔ پروفیسر صاحب نے ایسے جواب دیا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہوں کچھ دیر مزید خاموشی کے بعد وہ ایک بار پھر گویا ہوئے۔

''مریم بیٹی تم نے بہت اچھا کیا جو مجھے ابھی فون کر لیا۔ مجھے تمہارے خواب کی سمجھ آ گئی ہے۔ یہ عام خوابوں کی طرح نیند کے تیسرے درجے کی کیفیت والا خواب نہیں ہے بلکہ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو یہ خواب ہی نہیں ہے بلکہ لاشعور کے کسی انتہائی ماہر نے تم پر یہ کیفیت طاری کر کے ایک پیغام دیا ہے، اس لیے اب میں تمہیں چند نصیحتیں کرنے جا رہا ہوں انہیں غور سے سنو اور پھر ان پر من وعن عمل کرو۔ ورنہ نقصان تمہاری سوچ سے بھی زیادہ ہو سکتا ہے۔''

''جی ماموں آپ حکم کریں میں ویسا ہی کروں گی جیسے آپ کہیں گے۔'' مریم نے پریشان لہجے میں جواب دیا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اگر ماموں کہہ رہے ہیں کہ بہت زیادہ نقصان ہو سکتا ہے تو ان کی کہی ہوئی بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی تھی۔

پروفیسر صاحب اسے اس خوفناک خواب کے شر سے محفوظ رہنے کا لائحہ عمل بتانے لگے اور مریم ان کی بتائی ہوئی باتوں کو اپنے حافظے میں محفوظ کرنے لگی۔

☆.....☆

آبنوسی کلر کی لکڑی سے بنی ہوئی گول میز پر داؤ کی رقم بڑھتے بڑھتے ایک ڈھیر کی صورت اختیار کر چکی تھی، داؤ بڑھنے کے ساتھ ہی ماحول میں موجود تناؤ کا تناسب بھی بتدریج بڑھتا جا رہا تھا، جس کی وجہ سے کمرے میں پراسراری خاموشی چھائی ہوئی تھی، میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھے ہوئے افراد کے چہرے ستے ہوئے تھے۔

آصف اور شاکر مزید داؤ بڑھانے سے ہینڈز اپ کر چکے تھے، اس لیے اب فائنل راؤنڈ اویس اور عمران کے درمیان تھا، دونوں اپنی کامیابی کو یقینی سمجھ کر اپنی زندگی کی تمام جمع پونجی داؤ پر لگا چکے تھے۔

آصف نے یہ گھر اپنے دوستوں کے لیے وقف کیا ہوا تھا، اس کے دوست اکثر یہاں اکٹھے ہو کر پینے پلانے کی محفلیں جمایا کرتے تھے، کبھی کبھار موڈ میں آ کر چھوٹی موٹی شرطیں بھی لگا لیا کرتے تھے، مگر آج ہنسی مذاق میں شروع ہونے والی بازی نے اس وقت سنگین رخ اختیار کر لیا جب عمران نے اپنے پاس موجود نقد رقم ختم ہونے پر ایک کروڑ روپے کا چیک داؤ کی رقم پر رکھ کر سب کو چیلنج کرنے کے انداز میں دیکھا۔

وہ ایک سٹاکسٹ بروکر تھا، اس نے کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کیا تھا، آج بھی اسے پکا یقین ہو چکا تھا کہ اس کے پاس موجود پتے اس کے مدمقابل تمام حریفوں کے پتوں سے بہتر ہیں۔ وہ اپنی جیت کو یقینی سمجھتے ہوئے

آخری حد تک چلا گیا۔

اس کے جارحانہ انداز کو دیکھتے ہوئے آصف اور شاکر نے سمجھداری کا ثبوت دیا اور کھیل سے کنارہ کش ہو گئے۔

جب کہ ان کے برعکس اویس نے اپنے آبائی گھر کی چابیاں چیک کے اوپر رکھ دیں۔ اس کی اس حرکت پر آصف اور شاکر اسے حیرانگی سے ایسے دیکھنے لگے جیسے انہیں اس کی دماغی حالت پر شک گزرا ہو۔

''تم ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو رہے ہو۔ میں تمھیں ایک موقع دیتا ہوں کہ چابیاں واپس اٹھا لو اور کھیل سے دست بردار ہو جاؤ ورنہ کہیں تمھیں آج رات فٹ پاتھ پر نہ گزارنی پڑ جائے۔'' عمران نے طنزیہ انداز میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''داؤ کو زیادہ بڑھا کر تم خود اپنے جذباتی ہونے کا اظہار کر چکے ہو، اب میرا کسی بھی صورت پیچھے ہٹنا ناممکن ہے۔ تم اپنے پتے شو کرواؤ۔'' اویس نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا تو اس کے لہجے کا اعتماد بتا رہا تھا کہ اسے اپنے پاس موجود پتوں پر مکمل بھروسہ ہے۔

''او کے جناب اگر تم نے مکمل برباد ہونے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' عمران نے بے نیازی سے جواب دیتے ہوئے اپنے پتے الٹ دیے۔ جیسے ہی اویس کی نظر الٹے ہوئے پتوں پر پڑی تو اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اس کے تمام اندازے غلط ثابت چکے تھے۔ اب گزرا ہوا وقت واپس نہیں آ سکتا تھا، اسے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے ابھی اس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہ اپنے کارڈز ہی سیدھے کر دیتا۔ اس کی پتلی حالت دیکھ کر شاکر نے اس کے سامنے میز پر موجود پتے سیدھے کر دیے، تو عمران نے فاتحانہ انداز میں میز پر پڑی ہوئی دولت کے ڈھیر کو دونوں ہاتھوں سے اپنی طرف سمیٹ لیا اس کے چہرے پر فتح کا غرور چمکنے لگا تھا۔

اویس کافی دیر تک کسی بت کی طرح بیٹھا رہا پھر آہستہ آہستہ اس کی حالت بہتر نظر آنے لگی۔ اس وقت تک عمران میز سے رقم سمیٹنے کے ساتھ ساتھ شاکر اور آصف سے گرینڈ جیت کی مبارک باد بھی وصول کر چکا تھا۔

''آج تو بہت دیر ہو چکی ہے کل رات تم دونوں کے لیے میری طرف سے اسپیشل پارٹی ہے۔'' عمران نے آصف اور شاکر کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا، اور پھر اویس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''یہ لو پہلی بھیک میری طرف سے قبول کرو۔'' اس نے پانچ کا سکہ اس کی طرف اچھالتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ سکہ ہوا میں گھومتا ہوا سیدھا اویس کی جھولی میں جا گرا۔

تو اس نے بنا کوئی جواب دیے لاشعوری انداز میں سکے کو اٹھا کر مٹھی میں دبا لیا۔

آج عمران کی قسمت اس پر مہربان کیا ہوئی کہ وہ سر سے پاؤں تک تکبر اور غرور کی مجسم تصویر بن گیا تھا، اویس کے لیے مزید بیٹھے رہنا دشوار ہو چکا تھا وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

''رات گہری ہو چکی ہے اس وقت کہاں جاؤ گے، میرے خیال میں رات یہیں گزار لو۔'' آصف نے اسے ہمدردانہ آفر کی۔

''نو تھینکس، اویس نے شکست خوردہ مسکراہٹ سے جواب دیا، اور بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا، باہر نکلتے ہی ایک سرد ہوا کے جھونکے نے اس کا استقبال کیا، وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں سنسان سڑک کے کنارے چلنے لگا۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا، گھر میں دولت کی ریل پیل اور اکلوتا ہونے کے باوجود اس میں کوئی بگاڑ پیدا نہیں ہوا تھا، وہ ایک پڑھا لکھا سلجھا ہوا نوجوان تھا، مگر گزشتہ سال اس کی زندگی میں ایسا حادثہ ہوا جس نے اسے توڑ کر رکھ دیا۔ وہ ایک روڈ ایکسیڈینٹ تھا جس میں اس کے والدین نے موقعے پر ہی اپنی جان، جانِ آفرین کے سپرد کر دی تھی کار اتنے خوفناک انداز میں ٹرک سے ٹکرائی تھی کہ بعد میں کار کی باڈی کاٹ کر لاشیں باہر نکالنا پڑی تھیں۔ اس کا کل

جہان ہی والدین کے گرد گھومتا تھا، ان کے جانے کے بعد جیسے سب کچھ ختم ہو گیا۔ ایم سی، ایس، کا فائنل ایئر درمیان میں ہی رہ گیا اور والد کا کاروبار ٹھپ ہو گیا۔ اسے خود کو سنبھالنے میں کئی ماہ لگ گئے، پھر ایک دن اس کی ملاقات آصف سے ہوئی تو اس نے اویس کو بھی اپنے دوستوں میں شامل کر لیا، اس طرح اویس کی راتیں بھی مصروف گزرنے لگی۔

چلتے ہوئے اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ ایک پارک کے پاس سے گزر رہا تھا، وہ رک گیا، اور پھر پارک میں داخل ہو گیا اندر ہر طرف ہو کا عالم تھا جگہ جگہ قمقمے جل رہے تھے مگر پھر بھی ہر چیز پر اندھیرا غالب محسوس ہو رہا تھا، شاید اماوس کی رات ہونے کی وجہ سے ایسے لگ رہا تھا، وہ ایک سنگی بینچ پر بیٹھ گیا، پھر نجانے کتنے پہر گزر گئے وہ کسی بت کی طرح سٹیچو بنا بیٹھا رہا، اس نے حتمی طور پر خودکشی کا فیصلہ کر لیا تھا اب وہ اپنی زندگی کو ختم کرنے کے مختلف پہلوؤں پر غور کر رہا تھا، مگر اسے کوئی ایسا آئیڈیا نہیں سوجھ رہا تھا جس سے وہ بنا اذیت کے خودکشی کر سکتا۔

''بیٹا رات بارہ بجے کے بعد پارک میں داخلہ منع ہے۔'' کسی نے اسے عقب سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس نے پیچھے کی جانب مڑ کر دیکھا تو اسے مخاطب کرنے والا ایک لمبے قد کا ادھیڑ عمر باریش شخص تھا جس نے سر پر پگڑی باندھی ہوئی تھی۔

''بزرگوں پارک کا گیٹ کھلا ہوا دیکھا تو اندر آ گیا۔'' اس نے جواب دیا تو اسے خود اپنی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''ہاں بیٹا ٹھیک کہہ رہے ہو آج مجھے گیٹ کو تالا لگانا یاد نہیں رہا، ابھی یاد آیا تو تالا لگانے کے لیے گیٹ کی طرف ہی جا رہا تھا کہ تم نظر آ گئے۔ ویسے موسم سرد ہونے کی وجہ سے لوگ آج کل کم ہی ادھر کا رخ کرتے ہیں۔'' اس باریش ادھیڑ عمر شخص نے اویس کے قریب ہی بینچ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ مجھے صبح تک یہاں بیٹھا رہنے دیں تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔'' اویس نے اسے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

''اتنے سرد موسم میں تو گھر سے بھاگنے والے یا نشی بھی اس طرف کا رخ نہیں کرتے چہ جائیکہ تم جیسا بابو ٹائپ نوجوان یہاں رات گزارنے کی بات کر رہا ہے۔ یہاں سردی کافی زیادہ ہے صبح تک تو تم بیمار پڑ جاؤ گے، اگر رات گزارنی ہے تو اس طرف میرا کمرہ ہے وہاں آ جاؤں۔'' اس نے پارک کے ایک کونے میں بنے ہوئے سکیورٹی روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے آفر کی۔

''شکریہ میری یہ جیکٹ لیدر کی ہے، اس لیے مجھے کچھ خاص سردی نہیں لگ رہی۔'' اویس نے ایک بار پھر اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''بیٹا انسان پر اچھے بُرے وقت آتے رہتے ہیں۔ ہمیں خدا کی رحمت سے مایوس ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اچھے دن نہیں رہے تو یہ برے دن بھی کٹ جائیں گے مگر صبر شرط ہے۔

تم کافی پریشان لگ رہے ہو۔ مجھے بزرگ سمجھ کر ہی میری بات مان جاؤ۔'' اس بار ادھیڑ عمر شخص نے کہا تو اس کے لہجے میں خلوص اور اصرار جھلک رہا تھا۔ اویس ایک گہری سانس لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''ٹھیک ہے جناب چلیں۔'' اس نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''تم کمرے میں چلو، میں گیٹ کو تالا لگا کر آتا ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ جبکہ اویس ٹہلتا ہوا سکیورٹی روم میں آ گیا۔ اندر کوئلوں کی انگیٹھی دہک رہی تھی اطراف میں چارپائیاں بھی موجود تھیں۔

''بیٹھ جاؤ، میں تمھارے لیے چائے بناتا ہوں۔'' اس ادھیڑ عمر شخص نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ تو اویس چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''میرا نام علاؤالدین ہے، میں کئی سالوں سے یہاں چوکیداری کر رہا ہوں۔'' اس نے اپنا تعارف

گرواتے ہوئے کہا، اور ایک طرف رکھا ہوا لوہے کا اسٹینڈ اٹھا کر کوئلوں کی انگیٹھی پر رکھ دیا اور پھر اس پر چائے بنانے کے لیے ایلومونیم کی ایک دیگچی رکھ دی۔ دیگچی بیرونی طرف سے کالی سیاہ ہو چکی تھی، وہ نجانے کب سے زیر استعمال تھی۔

اویس یک ٹک دہکتے ہوئے کوئلوں کو دیکھے جا رہا تھا۔ وہ اس وقت چونکہ جب علاؤالدین نے چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھائی۔

''بیٹا لگتا ہے کچھ زیادہ ہی چوٹ کھائے ہوئے ہو۔'' علاؤالدین نے اپنی پیالی سے چائے کا سِپ لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں بزرگوں ایسی کوئی بات تمہیں ہے بس تھوڑا پریشان تھا تو اس طرف چلا آیا۔'' اویس نے گول مول سا جواب دیا۔

''پریشانی شیئر کرنے سے من ہلکا ہو جاتا ہے، اور اگر انسان پریشانی کو حل کرنے کے بجائے اپنے اندر ہی اکٹھی کرتا رہے تو یہ ناسور بن جاتی ہیں۔ پھر ان کا علاج ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا ہے۔ علاؤالدین نے اسے فلسفیانہ انداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔

''مجھے ایک بات بتائیں، اگر کوئی انسان بیمار ہو تو ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے، اور اگر مذہبی یا قانونی مسئلہ درپیش ہو تو مولانا یا وکیل کے پاس جاتا ہے۔ ایسے ہے کہ نہیں۔''

اویس نے مدلل انداز میں بات کرتے ہوئے آخر میں اپنی بات کی تصدیق چاہی۔ تو علاؤالدین نے اثبات میں سر ہلا کر اس کی بات کے ٹھیک ہونے کی تصدیق کر دی۔

''تو آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کے پاس دینی یا دنیاوی ایسی کون سی ڈگری ہے جس سے میں یہ مان لوں کہ آپ میرا مسئلہ سن کر اسے حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، آجا کے آپ ہیں تو ایک معمولی چوکیدار ہی نا، جو میرا مسئلہ سن کر اسے پوری طرح سمجھنے کی بھی استطاعت نہیں رکھتا، سوائے ہمدردی کے چند الفاظ کہنے کے۔'' اس نے بظاہر انتہائی شائستہ انداز میں اپنی بات کی وضاحت کی تھی مگر اس کے الفاظ کی کاٹ بہرحال بہت زیادہ تیز تھی۔ اس کی بات سن کر علاؤالدین کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''نوجوان ایک بات یاد رکھنا ظاہری حالت دیکھ کر باطن کو پہچاننے کا نروان حاصل کرنے والے کو اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر انجینئر یا مولانا جیسا لاحقہ لگانے کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان چیزوں کی ضرورت ان لوگوں کو ہوتی ہے، جنہوں نے دنیا کمانے کے لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دو جمع دو چار کرنا سیکھا ہوتا ہے۔ میں صرف انسانیت کی خدمت پر یقین رکھتا ہوں، چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہو اور آج میں اسی انسانیت کی بنیاد پر تمہاری مدد ضرور کروں گا۔ تاکہ تمہیں اس مایوسی کی کیفیت میں کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے روک سکوں۔ تم کچھ دیر پہلے تک خودکشی کرنے کا سوچ رہے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

علاؤالدین نے اویس کی آنکھوں میں براہ راست جھانکتے ہوئے پوچھا۔

تو اویس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر ایسے گزرا جیسے اس کی چوری بیچ چوراہے میں پکڑی گئی ہو۔

وہ کوئی جواب دینے کی بجائے مسلسل اس پراسرار چوکیدار کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد علاؤالدین نے ایک گہرا سانس لیا اور آنکھیں بند کرتے ہوئے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا، ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ مراقبے میں چلا گیا ہو۔

وہ یوگا کے ایک مخصوص اسٹائل پدمنی آسن کے انداز میں بیٹھا تھا۔ اویس حیرانگی سے اس کی طرف دیکھ اور سوچ رہا تھا کہ وہ کوئی شعبدہ باز ہے یا واقعی روحانیت کے کسی مرتبے پر فائز کوئی اہم شخصیت ہے، چند منٹ بعد ہی اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''ہوں... تو یہ مسئلہ ہے۔'' اس نے ایک لمبا ہنکارہ بھرتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھا نہیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔'' اویس جو اسی کی طرف متوجہ تھا اس نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''بنیادی طور پر تم شریف ابن شریف ہو، مگر والدین کا سایا سر سے اٹھتے ہی تم بھٹک گئے اور تمھیں برے دوستوں کی صحبت نے آج اس حال تک پہنچا دیا ہے کہ اپنی جنت بھی اپنے ہی ہاتھوں سے دے کر آرہے ہو۔''

علاؤالدین نے اپنی بات ختم کی تو اویس چارپائی سے اچھل کر نیچے اتر آیا، جیسے وہاں اچانک کانٹے نکل آئے ہوں۔

''آ آ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟'' اس نے پوچھا تو اس کے لہجے میں حیرت کے ساتھ ساتھ خوف کا عنصر بھی نمایاں تھا۔

''بس بیٹا اس بندے پر اللہ کا خاص کرم ہے، میں کوشش کرتا ہوں کہ تمھارا گھر واپس مل جائے، مگر اب تمھیں کامل توبہ کرنی پڑے گی۔'' علاؤالدین نے اسے آبائی اثاثہ واپس دلانے کو توبہ سے مشروط کیا تو اویس زور زور سے اثبات میں سر ہلانے لگا جیسے وہ توبہ کرنے کے لیے بے چین ہو۔

''تو پھر ٹھیک ہے وہ سکہ مجھے دو جو تمھیں بھیک میں ملا ہے۔'' علاؤالدین نے اس کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ اویس نے اپنی مٹھی میں بند سکہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ علاؤالدین ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں اور مراقبے میں چلا گیا۔

جبکہ اویس اسے ایسے حیرانگی سے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے سائنس اور ٹیکنالوجی کی اس اکیسویں صدی میں فرعون مصر کا کوئی جادوگر اچانک نمودار ہو کر اس کے سامنے آبیٹھا ہو۔

☆.....☆

وسیع و عریض لان میں مریم پریشانی کے عالم میں ٹہل رہی تھی۔

وہ پروفیسر صاحب سے اپنے خواب کی تعبیر سن کر دہل گئی تھی، اس کا شوہر حرام ذریعے سے کمائی ہوئی روزی سے انہیں پال رہا تھا۔ جس کی وجہ سے گھر پر نحوستوں کے بادل چھائے ہوئے تھے، اور عنقریب ان پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹنے والے تھے۔

پروفیسر صاحب کے مطابق اگر فوری ادراک نہ کیا گیا تو اگلے چند دن میں ہی سب کچھ خزاں رسیدہ پتوں کی طرح بکھرنے والا تھا۔

گیٹ کے باہر عمران کی کار کا مخصوص ہارن سن کر وہ چونک کر رک گئی، پھر نور خان کے گیٹ کھولنے پر عمران کار کو پورچ میں لے آیا۔

جب وہ کار سے اترا تو اس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا، جو کافی وزنی لگ رہا تھا۔

جیسے ہی اس کی نظر مریم پر پڑی تو وہ ٹھٹھک گیا، اور پھر بیگ کو وہیں کار کے پاس رکھ کر لان میں کھڑی مریم کے پاس چلا آیا۔

''خیریت بیگم طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' اس نے بے قراری سے پوچھا۔

مریم کوئی جواب دینے کی بجائے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

''تم جواب کیوں نہیں دے رہی ہو۔ اس نے مریم کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

''عمران کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔'' مریم نے رندھے ہوئے لہجے میں پوچھا، اس کی بات سن کر عمران کا قہقہہ ہر طرف پھیلے ہوئے سناٹے کو چیر گیا۔

''یار ساری دنیا سے لڑ کر تمھیں حاصل کیا ہے، ایک تم ہی تو میری اپنی ہو اس دنیا میں، میری سچی محبت کی گواہی تو پوری یونیورسٹی دیا کرتی تھی، کیا تم بھول گئی ہو وہ سب جو یہ سوال پوچھنے کی ضرورت پیش آئی۔''

عمران نے بات تو قہقہے سے شروع کی تھی مگر اختتام تک اس کا لہجہ خاصا سنجیدہ ہو چکا تھا۔

''اگر تمھیں مجھ سے واقعی میں سچی محبت ہے تو یہ جو کچھ تم گھر لائے ہو ابھی واپس لے جاؤ اور جن کا ہے انہیں واپس کر آؤ۔'' مریم نے کار کے قریب رکھے ہوئے

بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''کیا میرے دوستوں میں سے کسی کا فون آیا تھا۔'' عمران نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے الٹا سوال پوچھ لیا، اس کے لہجے میں شدید حیرت چھلک رہی تھی۔

''نہیں۔'' مریم نے مختصر سا جواب دیا۔

''تو پھر تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ اس بیگ میں کیا ہے اور میں اسے کہاں سے لا رہا ہوں۔''

اس نے بدستور حیرانگی سے پوچھا۔ تو مریم نے خواب آنے سے لے کر پروفیسر صاحب سے تعبیر پوچھنے تک کا تمام واقعہ تفصیل سے دہرا دیا۔

''عمران مجھے یہ حرام نہیں چاہیے۔ میں روکھی سوکھی کھا کر گزارا کرلوں گی، مگر میں اس گھر کو بکھرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی، پلیز میری بات مان لو۔ اس نے بے قاعدہ روتے ہوئے التجا کی۔

''میری جان ایک چھوٹے سے خواب کو تم نے خود پر اتنا حاوی کرلیا ہے۔ یہ دولت میں کسی سے چھین کر نہیں لایا، بلکہ یہ میری محنت کی کمائی ہے، چلو اندر چل کر اس بارے میں بات کرتے ہیں۔'' عمران نے پیار بھرے لہجے میں اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

مریم نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''اگر تم اس بیگ کو گھر کے اندر لے کر گئے تو پھر سمجھ لو کہ تمہاری مریم مرگئی۔ میں ابھی یہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔'' اس نے دوٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ عمران سکتے کی حالت میں آگیا، وہ بے یقینی کی کیفیت میں اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ پندرہ سال میں پہلا موقع تھا، جب وہ اپنی کسی بات پر اس حد تک اڑ گئی تھی کہ اس نے گھر چھوڑنے کی دھمکی دے ڈالی تھی۔ ان دونوں نے اپنی اپنی فیملی کو ناراض کر کے شادی کی تھی۔ ابھی عمران اسے قائل کرنے کے لیے اپنے ذہن میں الفاظ ترتیب دے ہی رہا تھا کہ اچانک گھر کے اندر سے نورین کی چیخیں بلند ہونے لگی۔

وہ دونوں بدحواس ہو کر اندر کی جانب دوڑے، کمرے کا منظر دیکھ کر ان کی آنکھیں خوف سے پھٹی رہ گئیں۔ نورین بیڈ پر پڑی بری طرح تڑپ رہی تھی، اور خود اپنے ہاتھوں سے گلے کو دباتے ہوئے چیخ رہی تھی۔

''نورین میری بچی۔'' عمران بے قراری سے اسے پکارتے ہوئے بیڈ کی طرف لپکا۔ اسی لمحے نورین ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگی۔

''پاپا کوئی میرا گلا دبا رہا تھا اس لیے مجھے سانس نہیں آرہا تھا۔'' نورین نے روتے ہوئے ہچکیوں کے دوران بتایا۔ مریم اسے دلاسہ دیتے ہوئے عمران پر پھٹ پڑی۔

''کیا ابھی بھی تمھیں میرے خواب پر کوئی شک ہے۔'' وہ کافی دیر تک الجھے ہوئے انداز میں مریم کی طرف دیکھتا رہا، اور پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنے سیل فون سے اویس کا نمبر ڈائل کر دیا۔

''ہیلو۔'' دوسری طرف رابطہ ہونے پر اویس کی حیرت زدہ سی آواز سنائی دی۔

''اویس پلیز انکار مت کرنا، ابھی اسی وقت میرے گھر پہنچو، مجھے تم سے ایک انتہائی ضروری بات کرنی ہے۔'' عمران نے التجائیہ انداز میں کہا تو دوسری جانب چند لمحے خاموشی چھائی رہی، پھر اویس کی آواز ابھری۔ ''اوکے میں آتا ہوں۔''

اس کا جواب سن کر عمران کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی، اس کے بعد آصف اور شاکر کو بھی فون کر کے فوراً گھر پہنچنے کے لیے کہہ دیا۔

''ڈرو نہیں بیٹا میں وعدہ کرتا ہوں آئندہ آپ کے ساتھ کبھی ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میرے لیے تم دونوں سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔''

عمران نے اپنی بیٹی کو دلاسا دیتے ہوئے کہا اس کے پُراعتماد لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ مریم کے خواب پر یقین کر چکا ہے، اور اب وہ اپنے گھر پر چھا جانے والے نحوست کے بادلوں کا سدباب کرنے کا تہیہ کر چکا ہے۔

☆☆☆

اِک گناہ کی قیمت

دستگیر شہزاد

اُس عورت کی داستانِ عبرت، جو تاعمر ایک گناہ کی قیمت چکاتی رہی

یادوں کی بوجھل چٹانیں میرے ذہن پر گر رہی تھیں۔ ابھی ابھی میں مسز شمسی کے یہاں سے لوٹی تھی اور جیسے میرے جسم میں سے کسی نے سب کچھ نچوڑ لیا ہو۔ میں بے سدھ سی صوفے پر آ گری۔ آنکھیں جیسے خود بخود ہی بند ہو گئیں اور یادوں کا پگھلا ہوا سیسہ میری نسوں میں سے گزرنے لگا۔

پورے بیس سال پہلے کی بات تھی جب عقیل صاحب کے ساتھ پورا ایک سال رہنے کے بعد مائیکے گئی تھی اور اپنے ماں باپ بہن بھائیوں کے ساتھ دو ماہ گزارنے کے بعد لوٹی تھی۔ دو ماہ..... کتنا طویل عرصہ لگا تھا مجھے۔ ہم دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے تھے۔ عقیل صاحب نے دو ماہ کے عرصے میں مجھے دس طویل خط لکھے اور بے شمار فون کئے تھے جن میں عشق و محبت کی وہی گرمی تھی جو شادی سے پہلے ان کے خطوط اور فون میں ہوتی تھی۔ ہر خط رات گئے لکھا گیا تھا اور ہر فون فری ٹائم میں کرتے تھے اور ایک ایک لفظ میں پیار کے پھول کھلے ہوتے تھے اور میں دو ماہ میں ہی اپنے مائیکے سے لوٹ آئی۔ وہ مائکہ جس میں کبھی میرے لئے سب کچھ تھا۔ اب عقیل صاحب کے بغیر مجھے بالکل صحرا معلوم پڑتا تھا اور جب میں واپس لاہور پہنچی تو عقیل صاحب نے میرا استقبال بڑی گرمجوشی سے کیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ ''میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا میری جان! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا''۔

جیسے طویل سفر کی تھکان جاتی رہی۔ میں کھل اٹھی تھی، میں نکھر آئی تھی لیکن جب اسی شام میری پڑوسن مسز شمسی نے باتوں باتوں میں مجھے بتایا کہ ایک دن عقیل صاحب کسی عورت کو گھر لائے تھے اور وہ عورت رات بھر یہیں رہی تھی تو میرے دل پر جیسے کسی نے کوئی بوجھل پتھر رکھ دیا۔ میرا دل بُری طرح سے ڈوبنے لگا تھا۔ رات کو کھانے کی میز پر میں نے عقیل صاحب سے اس بارے میں پوچھا تو وہ نوالہ وہیں روک کر میری طرف دیکھنے لگے۔ ''تمہیں کس نے بتایا؟''

''کسی نے بھی بتایا ہو، یہ سچ ہے نا؟''

عقیل صاحب نے نوالہ منہ میں رکھا اسے چبایا یا نگلا اور پھر بولے۔

''ہاں، سچ ہے۔ میں تم سے جھوٹ نہیں بول سکتا''۔ میں سکتے میں آ گئی۔ کیا یہ واقعی سچ ہے۔

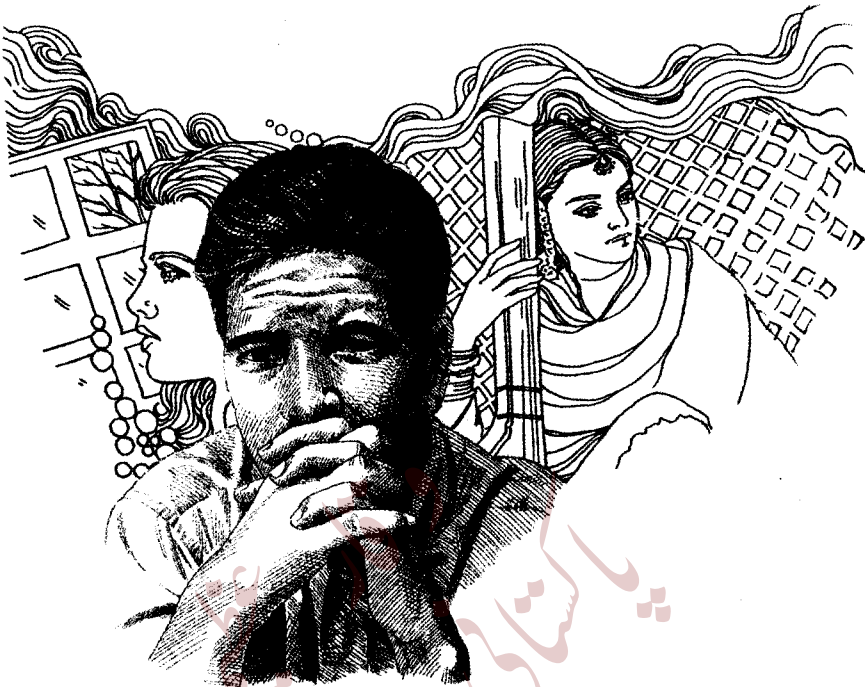

میری غیر موجودگی میں ایک غیر عورت یہاں رات گزارے میرے اس شوہر کے ساتھ جس نے شادی سے پہلے بھی اور شادی کے بعد بھی صرف میری محبت کا دم بھرا تھا۔ اپنی ساری محبت، اپنا سارا پیار صرف میرے لئے وقف رکھا تھا۔ یہ معمولی بات نہیں تھی۔ میں نے کوشش کی کہ میری آواز نہ بھرائے، میری آنکھیں نہ بھیگیں لیکن میں ضبط نہ کر سکی۔ میری آواز میں گہرے دکھ کی حلاوت آ گئی۔

''کیوں؟''

''میری سیکرٹری تھی''۔ انہوں نے بڑے آرام سے کہا۔ ''میں تمہارے بغیر بہت گھبرا گیا تھا۔ میرا جی نہیں لگتا تھا۔ اکیلے کھانا کھاتے کھاتے تنگ آ گیا تھا میں۔ اس کے علاوہ.....''

''تو کیا اس کا یہی علاج تھا؟''

''تم عورت ہو، تم مرد کے جذبات کو نہیں سمجھ سکو گی۔ اس کے لئے پیار اور جنس دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہوتی ہیں''۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، نپ کن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے میں اٹھ کھڑی ہوئی اور بنا کچھ بولے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ عقیل صاحب بھی فوراً پیچھے پیچھے پہنچے۔

''ڈارلنگ! میں نے تم سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی لیکن اسی لئے میں تمہیں یہ بات نہیں بتانا چاہتا تھا۔ جانے کس نے بتا دیا تم کو''۔

میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایک تو گناہ، اس پر پردہ پوشی۔ کیا یہی میرے خوابوں کا دیوتا ہے جس کے ہاتھ میں میں نے اپنی زندگی کی لگام دے دی ہے۔ کیا یہی میرے تمام سپنوں کی تعبیر ہے جو میں نے اپنے گھر کے ویران کونوں، آنگن میں لگے درختوں کے سایوں، چھت کی وسعتوں، کالج کے ویران گھنٹوں اور ہوسٹل کی کنواری راتوں میں دیکھے تھے۔ میرے چہرے پر دکھ پھیل گیا۔ عقیل صاحب میرے دراز بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگے۔

''مجھ سے غلطی ہو گئی ڈارلنگ! مجھے معاف کر دو، میں بہت شرمندہ ہوں''۔

''کیا معاف کر دوں؟'' میں نے سسک کر کہا۔
''آپ سے دو ماہ بھی صبر نہیں ہوا''۔
''میں نے پہلے کہا کہ مرد اس معاملے میں مختلف ہوتا ہے''۔ عقیل نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''بعض اوقات وہ وقتی ضرورت کے تحت بہک بھی جاتا ہے لیکن اس کا پیار، اس کا دلی جذبہ نہیں مرتا۔ شازیہ! میں نے زندگی میں صرف تمہیں چاہا ہے اور اب بھی صرف تمہیں چاہتا ہوں۔ وہ لڑکی تمہاری جوتی کے برابر بھی نہیں۔ صرف شراب کا ایک پیگ تھا، سگریٹ کا ایک کش تھا جس کی اہمیت ضرورت ختم ہو جانے کے بعد کچھ بھی نہیں رہتی۔ مرد کا پیار ان سے کہیں بلند ہوتا ہے۔ پھر بھی میں تم سے معافی مانگتا ہوں''۔
''کیا معافی مانگنے سے بات ختم ہو جاتی ہے؟''
''اگر تم معاف کر دو''۔
''اگر یہ غلطی مجھ سے ہو جاتی تو کیا آپ معاف کر دیتے؟''
عقیل کو جیسے کوئی جواب نہ سوجھا، چہرے کا رنگ ہی بدل گیا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے دیکھتے رہے، پھر بولے۔ ''مرد کی طرح عورت کے لئے یہ بات اتنی معمولی نہیں ہوتی''۔
میں پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میرا تو سب کچھ اجڑ گیا، سارے سپنے، ساری دنیا۔ عقیل صاحب مجھے دلاسہ دیتے رہے، سمجھاتے رہے لیکن میں ایک ایسی لڑکی تھی جو ہمیشہ رویے میں کھیلتی رہی تھی۔ اعلیٰ سوسائٹی میں سانس لیتی تھی، محفلوں میں رونق محفل بنی رہتی تھی۔ مختلف لوگوں سے اپنے حسن کی تعریفیں سنتی رہی تھی۔ اس کے باوجود شروع سے مجھے زندگی کی اعلیٰ قدروں پر یقین تھا۔ میں نے زندگی میں اگر کسی مرد کا تصور بھی کیا تھا تو وہ صرف عقیل صاحب تھے اور اس وفا کا، اس پرستش کا، اس محبت کا، آج مجھے یہ صلہ ملا تھا۔ عقیل صاحب بیڈ پر بیٹھ گئے۔
''میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایسا پھر زندگی میں کبھی نہیں ہو گا''۔ انہوں نے مجھے منانا شروع کر دیا۔ ''غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔ کیا تم..... جو میری سب کچھ ہو، مجھے معاف نہیں کرو گی''۔
''نہیں، نہیں''۔ میں تقریباً چیخی۔ ''آج رات میں تنہائی چاہتی ہوں، مجھے اکیلا چھوڑ دیجئے۔ میں وعدہ کرتی ہوں، میں بھولنے کی کوشش کروں گی''۔
عقیل صاحب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ''بھول جانا اور معاف کر دینا ہی عظمت ہوتی ہے''۔ وہ میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولے۔ ''اور مجھے یقین ہے کہ تم ایک معمولی لڑکی نہیں ہو''۔ اور وہ گڈ نائٹ کہہ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔
لیکن مجھے نیند آ ہی نہیں رہی تھی۔ رہ رہ کر یہ خیال مجھے تڑپا رہا تھا کہ اس کمرے میں اسی بیڈ پر اس عورت نے رات گزاری ہو گی۔ وہی جملے جو صرف میرے لئے مخصوص تھے، اُس عورت کے کانوں میں بھی سرگوشی کے انداز میں کہے گئے ہوں گے۔ ساری رات میں نے کروٹیں بدلتے گزار دی اور جب صبح میں اٹھی تو میری آنکھیں سرخ تھیں۔ میرا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ دن بھر میں نے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش کی لیکن کوئی مصروفیت میرے دل کے اس بوجھ کو ہلکا نہ کر سکی۔ میں اپنے ہی گھر میں اپنے آپ کو بیگانہ محسوس کر رہی تھی۔ ہر چیز سے مجھے پرایا پن ٹپکتا دکھائی دیتا تھا۔ باوجود پوری کوشش کے رات کو بھی میرا رویہ تبدیل نہ ہو سکا۔ اب میری آنکھوں میں آنسو نہیں تھے، آواز میں درد کی حلاوت نہیں تھی لیکن ہر چیز میں سرد مہری تھی۔ میں اپنے آپ کو برف محسوس کر رہی تھی۔ میرے شوہر نے بہت کوشش کی، بہت سمجھایا لیکن اپنے اور عقیل صاحب کے درمیان مجھے ہمیشہ ایک دیوار سی محسوس ہوئی جسے ہر کوشش کے باوجود نہ میں پھاند سکی، نہ گرا سکی۔

☆.....☆

اس سے اگلا دن بھی گزر گیا اور اس سے اگلا بھی۔ چوتھی شام کو عقیل صاحب ایک بہت بڑی خبر لائے۔ انہیں اسسٹنٹ منیجر سے منیجر بنا دیا گیا تھا اور کسی کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے اگلی صبح چند دنوں کے لئے وہ لاہور جا رہے تھے۔ بہت خوش تھے وہ اور آج کی رات اہتمام سے گزارنا چاہتے تھے۔ محبت کا سرور بھی میرے دل کے بوجھ کو ہلکا نہ کر سکا۔ چپ چاپ میں گانے سنتی

رہی۔ عقیل صاحب کی باتیں سنتی رہی۔ ایک بیوی کی طرح نہیں بلکہ محض ایک دوست کی طرح ساتھ بیٹھی رہی۔ نہ میرے دل نے عقیل صاحب کی ضرورت محسوس کی، نہ ہونٹوں سے ان کے لئے شہد ٹپکا نہ میرا جسم ان کے لئے پگھلا۔ نہ میری زلفیں انہیں دیکھ کر لہرائیں نہ میری آنکھوں کا جادو ان کے لئے جاگا۔ عقیل صاحب کو خاصا بُرا لگا اور قدرے اداس ہو کر وہ بولے۔

''ایک معمولی سی غلطی کی اتنی بڑی سزا نہ دو شازیہ!''

لیکن میں طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر کے اٹھ گئی اور ساری رات پلکوں میں کاٹ دی۔ میں بالکل نہ سو سکی۔ بس تکیہ رکھ کر اپنے خوابوں کو اجڑتا دیکھتی رہی تھی اور صبح عقیل صاحب لاہور چلے گئے تھے۔

☆.....☆

دوپہر کو بہت دیر تک میں اپنی پڑوسن مسز شمسی کے پاس بیٹھی رہی اور اس واقعے کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ مسز شمسی زمانہ شناس عورت تھی، شادی کو پانچ چھ سال ہو گئے تھے۔ پہلا بیٹا چار سال کا ہو گیا تھا اور ان دنوں وہ پھر امید سے تھیں۔ اس لئے زیادہ تر اپنے کمرے میں لیٹی رہتیں۔ جب انہوں نے میری یہ حالت دیکھی تو انہیں اپنی غلطی پر بہت افسوس ہوا۔ انہیں خیال بھی نہیں آیا تھا کہ مجھ پر اس بات کا اتنا اثر ہو گا اور باوجود شوہر کے معافی مانگنے کے میں اپنے آپ کو اتنا بیمار، اتنا پژمردہ بنا لوں گی۔ وہ مجھے سمجھاتی رہیں کہ تمہارا شوہر ٹھیک کہتا ہے۔ مرد کی فطرت، مرد کی نفسیات عورت سے مختلف ہوتی ہیں اور اس سے محبت یا شادی پر کوئی اثر پڑنا ضروری نہیں۔ زندگی میں ایک آدھ بار کوئی بھی مرد بہک سکتا ہے۔ عورت کو اس کے بارے میں اپنے نظریے سے نہیں سوچنا چاہئے۔ عورت کی بات اور ہے۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق مسز شمسی عام طور پر اپنے کمرے میں رہتی تھیں۔ مسٹر شمسی ٹور پر گئے ہوئے تھے اور وہ ایک دن میں ہی لوٹنے والے تھے۔ میں وہاں چلی جاتی، اس طرح دونوں کا وقت کٹ جاتا۔ مسز شمسی کی باتوں نے میرے بوجھ کو قدرے ہلکا کر دیا تھا لیکن ختم کرنے میں ناکام رہی تھی۔ پھر بھی مجھ کو ان کی باتوں سے اطمینان ہو رہا تھا۔ اس لئے اپنا کام ختم کر کے میں یہاں آ بیٹھتی۔

چند دنوں کے بعد مسٹر شمسی آ گئے۔ اپنی بیوی اور بیٹے کے لئے وہ کتنا کچھ لائے تھے۔ مسز شمسی نے مجھے سب کچھ دکھایا۔ کتنے خوش تھے وہ دونوں، کتنا خوش تھا وہ گھر، مجھے رشک آنے لگا۔ دوسرے ہی دن ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق مسز شمسی کو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا اور اگلی شام کو مسٹر شمسی جب میرے گھر آئے تو بہت خوش تھے۔ ان کے یہاں ایک اور لڑکا ہوا تھا۔ پہلے بیٹے کی طرح ہی خوب صورت اور پیارا۔ پارٹی وہ بعد میں دینے والے تھے لیکن ان کی خواہش تھی کہ میں ایک دیرینہ پڑوسن کی حیثیت سے آج ان کے ہاں آؤں اور کھانا بھی وہیں کھاؤں۔ بیٹے کی خوشی تھوڑی بہت آج ہی منالی جائے۔

ہمارا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا معمول کی بات تھی۔ میں ان کے گھر چلی گئی اور بہت دیر تک ان کے بیٹے شرجیل سے دل بہلاتی رہی۔ مسٹر شمسی نے نوکر کو خاص اہتمام سے کھانا بنانے کو کہا۔ بازار سے کچھ مٹھائی اور آئس کریم وغیرہ بھی منگوالی گئی۔ یہ ہنستا بستا گھر دیکھ کر مسٹر شمسی اور مسز شمسی کی سکھی زندگی اور نئے بیٹے کی خوشی دیکھ کر میری اداسی پھر عود کر آئی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے میری ازدواجی زندگی بالکل برباد ہو گئی ہے اور ایسی خوشی مجھے کبھی نصیب نہیں ہو گی۔ جب آپسی پیار کی بنیادی اینٹ ہی نکل جائے تو ازدواجی زندگی کی عمارت کیونکر کھڑی رہ سکتی ہے۔ مسٹر شمسی کے یہاں مغربی موسیقی کا اچھا خاصا خزانہ موجود تھا۔ آج اس کا منہ کھول دیا گیا۔ موسیقی بجتی رہی، شرجیل کچھ دیر تک اس کی دھن پر اپنے چھوٹے چھوٹے قدم تھرکاتا رہا، پھر کھانے کی میز پر آ گیا۔ شرجیل کھانا ختم کر چکا تو بڑے ادب سے اس نے نپ کن سے ہاتھ پونچھے اور اپنی توتلی زبان میں بولا۔ آنٹی! اب میں سوؤں گا، بُرا مت مانیئے گا۔ اچھا گڈ نائٹ..... گڈ نائٹ ڈیڈی! اور وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں اسے دیکھتی رہی۔ شرجیل کتنا پیارا بچہ تھا اور کتنا ذہین بھی۔ ابھی سے تمام آداب محفل سے واقف اور نہ جانے کیوں میری اداسی اور بڑھ گئی۔

''آپ بہت اداس ہیں''۔ مسٹر شمسی نے کوک کا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹی چھوٹی باتوں پر اداس نہیں ہونا چاہئے''۔

میرے دل پر چوٹ سی لگی تو مسز شمسی بھی وجہ جانتے ہیں۔ مسز شمسی نے انہیں بتایا ہوگا، سب ہی کو تو معلوم ہے کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے میں سنبھل کر بولی۔

''کئی چھوٹی باتیں چند لوگوں کے لئے بڑی بھی ہوتی ہیں''۔

''میں جانتا ہوں''۔ مسٹر شمسی نے کہا۔ ''دراصل شرجیل کی ماں نے آپ کو بتا کر بہت بڑی غلطی کی، میں نے تو اس سے کہا تھا کہ خاموش رہنا لیکن عورتوں کے پیٹ میں بات نہیں پچتی۔ خیر یہ اتنی بڑی بات نہیں کہ آپ اسے زندگی بھر کا روگ بنالیں۔ آپ کی عمر ہی کیا ہے، ابھی خوامخواہ کی پریشانیوں سے آپ کو دور رہنا چاہئے''۔

وہ مجھے بہت دیر تک سمجھاتے رہے، ہمدردی کے چند بول سن کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میرے رخساروں پر بہنے لگے۔ شمسی نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور بڑھ کر میرے رخساروں سے آنسو پونچھنے لگے۔ پھر میرے چہرے پر ان کی آنکھیں گڑ گئیں۔

''کچھ لوگ اداس ہو کر کتنے حسین ہو جاتے ہیں''۔ وہ میری پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولے۔ ''یہ مجھے آج پتہ چلا''۔

جواب میں مَیں نے اپنی آنکھیں اٹھائیں ور ان کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ ان کی آنکھوں سے میں نے سب کچھ پڑھ لیا تھا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا، مجھے کپکپی سی ہوئی، میں اٹھ کر کھڑا ہونا چاہتی تھی کہ مسٹر شمسی نے دونوں ہاتھ میرے کاندھوں پر رکھ کر مجھے بٹھا دیا۔ میں کانپنے لگی لیکن مسز شمسی کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ پیار سے بولے۔ ''یہ سوچنے کا ڈھنگ ہی تمہاری ساری تکلیف، سارے غم کی وجہ ہے''۔ تب میں نے سوچا، ٹھیک ہی تو ہے۔ شاید یہ میرا شوہر سے انتقام ہو۔ شاید یہی میرے دکھ کو کم کر دے۔ شاید یہی میرا علاج ہو اور اس رات میں نے انتقاماً وہ سب کچھ جواب تک میرے شوہر کے لئے وقف تھا، شمسی کے حوالے کر دیا اور اپنی زندگی کے پہلے گناہ دہکتے ہوئے انگارے پر زبان رکھ دی۔

☆.....☆

دوسرے دن واقعی مجھے ایک سکون سا محسوس ہوا۔ میرے دل کے کسی گوشے میں انتقام کی جو آگ سلگ رہی تھی، بجھ چکی تھی اور میں بہت خوش تھی کہ میری زندگی میں جو کچھ کھو گیا تھا، میں نے پھر پالیا ہے۔ اس شام کو جب عقیل صاحب لاہور سے لوٹے تو یہ دیکھ کر خوشی سے ناچ اٹھے کہ میں نے انہیں معاف کر دیا ہے اور اب وہ سب کچھ اسی پہلی سی شدت کے ساتھ پھر ان کا اپنا ہے جسے وہ اپنی ایک غلطی سے کھو بیٹھے تھے۔ ہم دونوں پھر ہنسی خوشی رہنے لگے بلکہ ہم ایک دوسرے سے اور بھی زیادہ محبت کرنے لگے۔

مسز شمسی نوزائیدہ بچے کو لے کر گھر واپس آئیں تو شمسی صاحب نے اپنے گھر پر بڑی شاندار پارٹی دی۔ میں پہلے شرمندہ اور پشیمان تھی اور مسٹر شمسی کے سامنے جاتے ہوئے گھبراتی تھی لیکن پارٹی میں مَیں نے دیکھا کہ مسٹر شمسی اپنی بیوی کو اتنی پیاری نظروں سے دیکھ رہے ہیں اور اتنے خوش ہیں کہ لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہا رہے ہیں تو مجھے عقیل صاحب کی اس بات پر یقین آ گیا کہ کسی وقتی ضرورت کے تحت مرد کبھی کبھار بہک جاتا ہے لیکن اس کی محبت اس کا پیار کبھی نہیں مرتا۔

☆.....☆

چند ہفتوں کے بعد میرے اندر جسمانی تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں۔ مجھے کچھ شک سا ہوا اور جب میں اپنی ایک ڈاکٹر دوست سے ملی تو مجھے پتہ چلا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ میں بہت خوش ہوئی، عقیل صاحب بھی بہت خوش ہوئے۔ ہم ایک پیارے سے خوبصورت سے بچے کے خواہاں تھے لیکن اسی وقت ایک شک سیاہ ناگ کی طرح مجھے ڈستا ہوا گزر گیا کہ یہ بچہ کس کا ہے، اس کا باپ کون ہے؟ احتیاطاً میں نے عقیل صاحب سے کہا کہ ابھی اس کے بارے میں کسی کو نہ بتایا جائے۔ چند ماہ یہ راز ہی رہے تو مزہ آئے گا اور عقیل صاحب بخوشی مان گئے۔ دن

گزرنے لگے، چند دن میں اس شک کی شکار رہی لیکن اس کے بعد میں نے اپنے دل کو سمجھا لیا کہ نہیں یہ بچہ میرے شوہر کا ہی ہے۔ میں چاہتی تھی میرا بچہ میرے شوہر کا ہی ہو۔ ہم دونوں کا سانجھا ہو اور ہر بار جب بھی میرے دل میں شک نے انگڑائی لی میں نے یہی سوچ کر اپنے دل کو سمجھا لیا لیکن جب جب یہ خیال پیدا ہوتا، میں بے چین ہو جاتی۔ کبھی کبھی تو رات گئے تک مجھ کو نیند نہ آتی۔ جیسے جیسے امید کا دن نزدیک آتا جاتا میری خوشی بھی بڑھتی جاتی اور پھر میں اداس بھی ہو جاتی۔

میں نے زندگی میں ایک صرف ایک بڑا گناہ کیا تھا اور اب تک میں اس کی خاصی سزا بھگت چکی تھی اور بار بار اللہ سے دعا کر رہی تھی کہ وہ مجھے اس گناہ کو بھول جانے کا موقع دے۔ ہمیشہ کی طرح زندگی کی اعلیٰ قدروں پر مجھے اب بھی یقین تھا اور آخر وہ دن آ ہی گیا۔ مجھ کو ہسپتال داخل کر دیا گیا۔ ایک تو پہلا بچہ، اس پر میری ذہنی کشمکش، درد کے دریا سے گزرنے کے لئے مجھے کوئی سہارا نہیں مل رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد میں بچوں کی طرح بلکنے لگتی۔ میری دیرینہ خواہش تھی کہ پہلا بیٹا ہو، بالکل میرے شوہر جیسا گول مٹول، بھورے بال، گورا رنگ، خوبصورت لمبی ناک اور میں اس کا نام چاند رکھ دوں۔ پتہ نہیں کیوں مجھے چاند سے زیادہ بہتر اور کوئی نام نہیں لگتا تھا اور میں اپنے بیٹے کا نام چاند ہی رکھنا چاہتی تھی لیکن میرے شوہر کی خواہش تھی کہ بیٹی ہو جو بہت حسین ہو اور گھر میں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں اور گھر کو چار چاند لگ جائیں۔

اور پھر میرے شوہر کی خواہش پوری ہو گئی میں نے ایک گول مٹول سرخ سپید بچی کو جنم دیا۔ عقیل صاحب کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ دفتر میں ہزاروں روپے کی مٹھائی بانٹ دی اور گھر کو چھوٹے بڑے رنگ برنگے کھلونوں سے بھر دیا۔ تین روز کی بچی کو لے کر جب میں گھر پہنچی تو بچی کو عقیل صاحب نے گود میں اٹھا لیا اور اس کے سیاہ بالوں، ہلکی بھوری آنکھوں، دودھیا رنگ اور سرخ ہونٹوں کو دیکھ کر جھوم اٹھے۔

''چاند تمہارا اب اگلی بار ہو گا''۔ انہوں نے کہا۔

''ہم تو اس کا نام ماہ نور رکھیں گے۔ بالکل کسی شاعر کا خیال لگتی ہے''۔ اور بیٹی کا نام ماہ نور رکھ دیا گیا۔

☆.....☆

مسز شمسی ایک دن آئیں تو بچی کو چومتے ہوئے بولیں۔ ''اسے تو لڑکا ہونا چاہئے تھا، لڑکی بالکل نہیں لگتی''۔ پھر شرارت سے مجھ کو دیکھ کر کہنے لگیں۔ ''یہ شرجیل کی بچپن کی تصویر دیکھو تو ذرا بھی فرق نہیں محسوس ہوتا۔ ناک نقشہ بالکل ایک ہے، خیریت تو ہے نا!''

جواب میں میں مسکرا دی، حالانکہ میرا دل ہی جانتا تھا کہ اس جملے نے مجھ پر کیا اثر کیا تھا۔ مسز شمسی بچی کو چومتے ہوئے بولیں۔ ''جیتی رہے چاند کا ٹکڑا ہے''۔

جب میں نے بچی میں نہ اپنے شوہر کے بالوں کی جھلک دیکھی تھی نہ ناک کا وہ تیکھا پن، نہ اپنے نقوش کا کوئی روپ، تب ہی میرا شک یقین میں بدل گیا تھا لیکن میں نے کسی طرح اپنے آپ کو سمجھا لیا تھا کہ بعض اوقات ماں اور باپ میں سے کسی کا روپ بھی بچے میں نہیں ہوتا لیکن اب سب کچھ میرے سامنے عیاں تھا۔ یہ بچی میرے شوہر کی نہیں تھی، ہم دونوں کی صحبت کی پیداوار نہیں تھی بلکہ ایک گناہ کی پیداوار تھی۔

ایک دن جب میں مسز شمسی کے یہاں جا کر شرجیل کی بچپن کی تصویریں دیکھ کر آئی تو بات اور بھی صاف ہو گئی لیکن اب میں کر ہی کیا سکتی تھی۔ ایک گناہ جو میں نے کیا تھا، اس کا پھل میرے سامنے تھا اور اس کی قیمت مجھے بہر حال چکانی تھی۔ جب میں عقیل صاحب کو ماہ نور کو چومتے چاٹتے پیار کرتے دیکھتی تو میرے جذبات عجیب ہوتے۔ عقیل صاحب کتنے سیدھے تھے۔ مجھ پر کتنا بھروسہ کرتے تھے لیکن کاش! وہ جانتے کہ ان کی واحد اولاد بھی ان کی اپنی نہیں۔

ماہ نور بڑی ہو گئی اور سکول جانے لگی۔ سب لوگ شرجیل اور اس کو بہن بھائی سمجھتے تھے۔ وہ دونوں بھائیوں کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ ان کے ساتھ ہی سکول جاتی اور نرسری کلاس میں تھی اور شرجیل اس وقت پانچویں سٹینڈرڈ میں تھا اور اس کا چھوٹا بھائی نبیل پہلے سٹینڈرڈ میں۔ سکول سے آنے کے بعد بھی زیادہ وقت وہ ان ہی کے گھر میں رہتی، کبھی کبھی کھیلتی کھیلتی سو جاتی تو

میں اسے اٹھا کر لاتی۔ ماہ نور اس گھر کو پرایا گھر نہ سمجھتی تھی اور مسز شمسی بھی اسے اپنی بیٹی کی طرح ہی پیار کرتی تھیں۔ ایک دن ماہ نور سکول سے آ کر میرے گھٹنے سے لگ کے بڑے اداس لہجے میں کہنے لگی۔ ماں! یہ شرجیل اور نبیل کتنے اچھے ہیں، کاش! وہ میرے بھائی ہوتے۔

میرا دل بیٹھ گیا، بچ کی کتنی زبانیں ہوتی جا رہی تھیں۔ کیا ایک دن یہ راز کھل جائے گا؟ کیا ایک دن سب کو پتہ چل جائے گا۔ کیا ایک دن واقعی سب کو پتہ چل جائے گا کہ ماہ نور میری بیٹی دراصل کسی کی بیٹی ہے، میرا دل بیٹھ رہا تھا لیکن میں نے بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''تیرے بھائی ہی تو ہیں بیٹا''۔

''نہیں سچ مچ کے بھائی تھوڑے ہی ہیں''۔ ماہ نور کے چہرے کا رنگ، اس کے ہونٹوں کی پھڑ پھڑاہٹ، اس کی آنکھوں کی اداسی بتا رہی تھی کہ یہ اس کے دل کی آواز ہے۔

میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور زور سے بھینچ لیا، اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

کئی سال گزر گئے، ماہ نور کے بعد ہمارے یہاں کوئی اور بچہ نہ ہوا۔ حالانکہ ہماری دلی خواہش تھی کہ کم سے کم ایک بیٹا پیدا ہو جاتا۔ ایک دن بنا عقیل صاحب کو بتائے میں اپنی ڈاکٹر دوست سے ملی اور اسے اپنا معائنہ کرنے کو کہا کہ کیا وجہ ہے کہ ماہ نور کے بعد میرے یہاں اور کوئی بچہ نہیں ہوا۔ ڈاکٹر نے سارا معائنہ کیا اور ہر چیز کی رپورٹ دیکھنے کے بعد کہا کہ تم میں کسی طرح کی کوئی خرابی نہیں ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ خرابی میرے شوہر میں ہے اور بغیر ان کا معائنہ کئے یہ کہنا بڑا مشکل تھا کہ ہم دونوں کسی بچے کو جنم دے سکیں گے یا نہیں۔

میں کانپ اٹھی، یہ ایک اور شبوت تھا۔ چپ چاپ ہو کر میں گھر پر پڑی رہی۔ لاکھ خواہش کے باوجود میں عقیل صاحب کو ڈاکٹر سے ملنے کا مشورہ نہ دے سکی۔ ڈاکٹر کا معائنہ کہیں ہماری بنی بنائی ازدواجی زندگی کو ہی نہ نیست و نابود کر دے۔ میں نے سب کچھ اللہ کے سہارے چھوڑ دیا۔ دونوں گھروں کا یہ خوشحالی کا زمانہ تھا۔ قدرت کی ہر نعمت ہمیں میسر تھی۔ دن ہنسی خوشی گزر رہے تھے، میں بھی بس کبھی کبھار اس حادثے کے بارے میں سوچتی تھی۔ ماہ نور کالج میں پڑھنے لگی تھی نبیل بھی کالج میں تھا۔ شرجیل انجینئرنگ پڑھنے کے لئے کراچی چلا گیا تھا اور چھٹیوں میں بھی کم آتا تھا۔ اسے اپنے کورس کے لئے کہیں نہ کہیں جانا پڑتا۔ آتا بھی تو ہفتے دس دن میں واپس چلا جاتا۔ عید اور دوسرے تہواروں پر ان کے یہاں اس کے گرینٹنگ کارڈ آتے تھے یا پھر مسز شمسی سے اس کی خیر و عافیت معلوم ہو جاتی۔ وقت گزرتا گیا۔ شرجیل انجینئرنگ کر کے واپس آ گیا اور دس پندرہ دنوں میں ہی اسے ایک اچھی خاصی نوکری بھی مل گئی۔ مسز شمسی کے یہاں بڑی دھوم دھام ہوئی۔ ایک بہت بڑی پارٹی دی گئی۔ میں اور عقیل صاحب اور ماہ نور بھی دن بھر انتظامات میں مصروف رہے۔ دونوں گھر اتنے گھل مل گئے تھے کہ اب ہماری خوشیاں اور غم ایک ہی ہو گئے تھے۔ مجھ کو بھی شرجیل بہت پسند تھا بالکل اپنے بیٹے کی طرح لگتا تھا۔ ماہ نور اور اس کی شکل بھی کتنی ملتی تھی اور اب جب میں نے اس کو اتنے لمبے عرصے بعد دیکھا تھا تو میرا دل خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ کتنا خوبصورت جوان نکلا تھا شرجیل، لمبا اونچا، خوب صورت سڈول، باتیں کرتا تو لگتا منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔

ماہ نور سارا دن مسز شمسی کا ہاتھ بٹاتی رہی۔ اکیلی نے سارے گھر کو سجایا، مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا۔ دعوت میں بھی وہ شرجیل کے ساتھ کھڑی مہمانوں کا شکریہ ادا کرتی رہی۔ دعوت ختم ہوئی تو مسز شمسی نے ماہ نور کو گلے سے لگا لیا۔

''کاش! اللہ نے تمہیں میری بیٹی بنایا ہوتا''۔ انہوں نے کہا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولیں۔ ''تمہاری دولت میرے دونوں بیٹوں سے زیادہ ہے''۔

میں مسکرا دی، حالانکہ میرا رونے کو جی چاہا۔ یہ دولت مسز شمسی کی نہ سہی اس کے شوہر کی تو ہے۔ یہ بات اور ہے کہ اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا، کوئی بھی نہیں جانتا اور کبھی بھی کسی کو پتہ نہیں لگے گا۔ اس وقت شرجیل وہاں آ گیا۔ مسز شمسی اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔ تمہاری ہی بات کر رہی ہوں۔ شرجیل شرما گیا لیکن شرارتاً تھینک یو ممی کہہ کر دوسرے کمرے میں چلا

گیا۔ ماہ نور بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔ مسز شمسی میرے ہاتھ تھام کر بولیں۔

''بہن! مجھ غریب کو اپنی یہ دولت دے دو۔''

''تمہاری ہی تو ہے''۔ میرے منہ سے نکل گیا۔

میرا سر چکرانے لگا تھا۔ میز کے سہارے سے میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ میرا دل ڈوب رہا تھا۔ ایک بھائی اور بہن کی شادی؟ کیا پہلے میں نے اپنے اس گناہ کی کم سزا بھگتی ہے، جواب اور سزا لوں گی اور ایک اور گناہ کروں گی''۔

مسز شمسی ساتھ کی کرسی پر بیٹھ گئیں اور بولیں۔

''شرجیل اور ماہ نور ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں۔ پھر اس سے ہم دو گھروں، دو خاندانوں کا رشتہ اور بھی مضبوط ہو جائے گا''۔

مجھ کو جیسے بخار چڑھتا جا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا تھا لیکن میں دل کی حالت کسی پر ظاہر نہ کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے اپنی ساری قوت سے میں نے مسکرانے کی کوشش کی اور کہا۔ میں عقیل صاحب سے بات کروں گی اور اس کے بعد طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر کے وہاں سے چلی آئی۔ ماہ نور ساتھ آنے لگی تو میں نے اسے اپنے ڈیڈی کے ساتھ آنے کے لئے کہہ دیا۔ میں تنہائی چاہتی تھی جیسے کسی نے میرے جسم سے سب کچھ نچوڑ لیا ہو۔ گھر پہنچتے ہی میں بے سدھ سی صوفے پر آ گری۔ آنکھیں جیسے خود بخود بند ہو گئیں اور یادوں کا پگھلا ہوا شیشہ میری نسوں سے گزرنے لگا۔ یادوں کی بوجھل چٹانیں میرے ذہن پر گر رہی تھیں اور میں درد سے تڑپ رہی تھی، بلک رہی تھی۔

دروازے کی گھنٹی بجی، نوکر نے دروازہ کھولا۔ عقیل صاحب اور ماہ نور لوٹے تھے۔ میں آنکھیں بند کئے لیٹی رہی۔ مجھے سوتا سمجھ کر ماہ نور عقیل صاحب کو گڈ نائٹ کہہ کر چلی گئی اور عقیل صاحب بھی اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ میں چپ چاپ اداس لیٹی ہوئی تھی۔

رات کتنی ویران، کتنی آزردہ، کتنی بھیانک تھی۔ آج میرا دل ڈوبتا جا رہا تھا، جس دکھ کو میں گزشتہ بیس سال سے محسوس کر رہی تھی آج اس نے مجھے پوری شدت سے دبوچ لیا تھا اور اس کے لئے میں کسی کی مدد نہیں لے سکتی تھی۔ سب کچھ مجھے اکیلے بھگتنا تھا۔ مجھے اکیلے مقابلہ کرنا تھا اور اس کے لئے میرے پاس ہمت تھی نہ طاقت۔ رات میری آنکھوں پر تپتے ہاتھ رکھ کر سوتی رہی اور میں کروٹیں بدلتی رہی، سوچتی رہی۔

ماہ نور اور شرجیل ایک دوسرے کو چاہتے ہیں، شرجیل نے ہی اپنے ماں باپ سے بات کرنے کے لئے کہا تھا۔ بات شروع ہونے سے پہلے ماہ نور کا وہاں سے چلے جانا ایک اور ثبوت تھا کہ وہ اس کی پسند کی شادی ہو گی۔ وہ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے رہے ہیں۔ سب ہی تو شرجیل کو پسند کرتے رہے ہیں۔ ماہ نور کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتا کہ اس کی شادی سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ اگر میں اسے اکیلے بیٹھ کر سمجھاؤں بھی تو اسے کچھ سمجھ نہیں آئے گا۔ وہ ابھی ایک کنواری لڑکی ہے، شرجیل اس کی پہلی محبت ہے اور پہلی محبت ہمیشہ شدید ہوتی ہے۔ انگ انگ میں نس نس میں بس جاتی ہے۔ پھر ابھی وہ جانتی ہی کیا ہے کہ عورت کیا ہوتی ہے، مرد کیا ہوتا ہے، گناہ کیا ہوتا ہے، کیوں ہوتا ہے۔ اس کے لئے بہت بڑی، بہت انہونی بات ہو گی۔ بہت بڑا صدمہ ہو گا اسے۔ نہیں نہیں، ایسی بات کوئی ماں اپنی جوان بیٹی سے ہرگز نہیں کہہ سکتی۔

تو پھر میں کیا کروں، مسز شمسی سے بات کروں، عورت ہے شاید سب کچھ سمجھ جائے لیکن میرے درد کو وہ بھی نہ سمجھ سکے گی۔ گناہ تو کئی عورتوں نے کئے ہوں گے لیکن ایسی سزا کسی نے نہ بھگتی ہو گی اور جس نے بھگتی نہ ہو۔ وہ اس درد کو کیا سمجھے گی، وہ مجھے ہی بُرا سمجھے گی۔ اس کی نظر میں میری عزت جاتی رہے گی۔ نہیں نہیں، میں مسز شمسی کو بھی نہیں بتا سکتی۔ بھیانک رات اپنے عروج پر تھی۔ ذہن جیسے چیتھڑے ہو گیا تھا، خیالات حالات کی چوٹ سے گھائل، بے حال پریشانیوں اور اداسیوں کی وادیوں میں بھٹک رہے تھے۔ کبھی ادھر جاتے، کبھی اُدھر اور مرہم کہیں نہ مل رہا تھا۔ دوا کہیں بھی نہ تھی۔

مجھے سب کچھ عقیل صاحب سے کہہ دینا چاہئے۔ ساری کہانی سنا دینی چاہئے۔ بہت نہ سہی، تھوڑے بہت اس کے ذمہ دار وہ بھی ہیں۔ شاید وہ معاف کر دیں اور اس شادی کو روک لیں لیکن مرد مرد ہے۔

عورت کا یہ گناہ کبھی معاف نہیں کرسکتا۔ انہیں یہ جان کر بہت دکھ ہوگا کہ میں ایک دو نہیں، مستقل بیس سال ان کو دھوکا دیتی رہی ہوں۔ وہ بچی جس کو اپنے جگر کا ٹکڑا سمجھتے رہے ہیں، بے انتہا محبت کرتے رہے ہیں ہرگز ان کی نہیں ہے۔ یہ ان کے لئے بہت بڑا دکھ ہوگا۔ اتنے سالوں کی کھڑی ہوئی ازدواجی زندگی کی یہ عمارت پلک جھپکتے ہی زمین پر آرہے گی۔ میں یہ بھی نہیں کرسکتی۔ تو میں کیا کروں؟

اس وقت میں بالکل ایک ویران محل کی طرح تھی جس میں تیز وتند ہوا فراٹے بھرتی، کراہتی گزر رہی ہو۔ کئی بار میرا دل چاہا کہ اس بھیانک رات کی صبح نہ ہو۔ یا صبح ہو تو میں نہ دیکھوں۔ پڑے پڑے میری روح پرواز کر جائے لیکن اس کے بعد بھی تو میں اس شادی کو نہیں روک سکتی۔ میرے بعد بھی تو کسی پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ تو میں مسٹر شمسی سے بات کروں لیکن پتہ نہیں انہیں یاد بھی ہو یا نہیں۔ اتنے سال بیت گئے۔ ان کی کسی بات سے کبھی یہ اندازہ نہیں ہوا کہ ان کے ذہن میں یہ بات محفوظ ہے۔ بیس سال پہلے کی ان کی ایک معمولی سی بات میں انہیں کیسے یاد دلا سکوں گی جس نے میری زندگی کو جلتے ہوئے جنگل میں ڈال دیا ہے۔ جہاں میں بالکل تنہا ہوں اور ہر طرف آگ ہے۔ انگارے ہیں، شعلے ہیں اور میری جان ہے کہ نکل نہیں رہی اور لگاتار بیس سال سے میں جل رہی ہوں بھن رہی ہوں۔

☆.....☆

میرا سارا جسم دکھ رہا تھا، آنکھیں سوج گئی تھیں اور ایک ہی رات میں ان کے گرد سیاہ حلقے نمایاں ہو گئے تھے اور میری عمر کئی سال بڑھ گئی تھی، صبح عقیل صاحب نے ناشتے پر مجھے بتایا کہ رات پارٹی میں شمسی صاحب نے ماہ نور کا رشتہ شرجیل کے لئے مانگا تھا، انہوں نے ہاں کردی۔ اب صرف میری ہاں کی دیر ہے۔ دونوں کی منگنی کردی جائے۔ شرجیل سے اچھا لڑکا ہمیں کہیں نہیں ملے گا۔ اس کے علاوہ دونوں ایک دوسرے کو بچپن سے چاہتے ہیں۔ جیسے غم کے وحشی درندے نے میرے دل پر اپنے دانت گاڑ دیئے اور نوچ نوچ کر کھانے لگا۔ میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جیسے درد کو دبانے کی کوشش کی اور کہا ابھی جلدی کیا ہے، بچپنے میں شادی کی کیا فکر؟

''میں شادی کی نہیں منگنی کی بات کر رہا ہوں''۔ عقیل صاحب نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''بیس سال کی لڑکی بچی نہیں ہوتی۔ پھر شادی تو اگلے سال ہی ہوگی''۔

اپنی ساری ہمت یکجا کرتے ہوئے میں نے کہا۔ ''کوئی اور لڑکا نہیں مل سکتا؟''

''پاگل ہوگئی ہو کیا؟'' عقیل صاحب بگڑ کر بولے۔ ''کیا کمی ہے شرجیل میں؟ ہم اسے بچپن سے جانتے ہیں، ایسا لڑکا ملنا مشکل نہیں، ناممکن ہے''۔ میں لاجواب سی ہوگئی۔ ''جیسے آپ کی مرضی''۔

عقیل صاحب دفتر چلے گئے تو میں اور بھی بے چین ہوگئی۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ یہ دوسرا گناہ بھی میری قسمت میں لکھا ہے لیکن اتنا بڑا گناہ؟ ماہ نور کالج کے لئے تیار ہوگئی تو میرے پاس آئی۔

''ماں! میں کالج سے ذرا دیر میں آؤں گی''۔ اس نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''شرجیل میرے لئے کچھ شاپنگ کرنا چاہتا ہے''۔

میں نے بیٹی کے معصوم کھلے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ خوشی سے کتنی پُر امید ہو رہی تھی وہ۔ کیا میں اس کی یہ خوشی، ساری خوشیاں لوٹ لوں، کیا میں اسے اس کی پہلی محبت، اس کے پاکیزہ خوابوں سے محروم کر کے کنگال کر دوں۔ ایک ماں کے لئے اس سے بڑی بدقسمتی کیا ہوسکتی ہے لیکن اس کی قسمت میں یہی لکھا ہے اور میں کچھ بھی تو نہیں کرسکتی۔

''تُو بہت چاہتی ہے نا شرجیل کو''۔ میں نے اپنے لہجے میں پیار سمونے کی کوشش کی، بیٹی کا شرماتا ہوا لال لال چہرہ دیکھ کر میرے کلیجے پر سانپ لوٹ گئے۔ میں نے کہا۔ ''لیکن وہ ہمیشہ تیرے بھائی کی طرح رہا ہے۔ اس سے تیری شادی نہیں ہوسکتی''۔ کلیجے پر پتھر رکھ کر میں نے کہہ دیا۔ ماہ نور جیسے کانپ اٹھی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ ایک لمحہ وہ میرے چہرے کی طرف دیکھتی رہی، پتھر کی طرح کٹھور چہرے کی طرف اور اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ماہ نور رو رہی تھی لیکن میں خاموش رہی۔ ایک گناہ گار کی طرح، خونی کی طرح۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے بیٹی کو

اٹھایا اور سینے سے لگا کر سسکنے لگی۔ پھر سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری خوشی مجھے سب سے پیاری ہے، بیٹی! لیکن میں مجبور ہوں''۔ ماہ نور پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھ کو دیکھنے لگی۔ جیسے میری حالت دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گئی ہو اور اب جیسے رو بھی نہ سکتی ہو۔ میں نے کہا۔ ''شام کو جلدی آ جانا، میں تمہیں سب بتا دوں گی''۔

ماہ نور اپنے آپ کو سنبھالتی، ہاتھ میں ایک ہی فائل کا جیسے منوں بوجھ اٹھائے۔ ایک اجڑی ہوئی دوشیزہ کی طرح قدم اٹھاتی باہر نکل گئی اور میں تکیے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کیا میں اپنی بیٹی کو سب کچھ بتا سکتی ہوں۔ میں نے سوچا ہرگز نہیں، بتانے سے پہلے ہی میں زمین میں گڑ جاؤں گی یا بتانے کے بعد اپنی بیٹی کو زمین میں گڑا ہوا دیکھوں گی۔ جانے میں کب تک یوں ہی پڑی رہی، انگاروں پر لوٹتی رہی۔ مجھے سب سے زیادہ دکھ تھا کہ آج پہلی بار میں نے اپنی اکلوتی لاڈلی بیٹی کا دل توڑا ہے۔ وہ بھی اس خواہش پر جو ایک لڑکی کی جائز خواہش ہوتی ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس سے معافی مانگوں گی اور کوئی اور طریقہ سوچوں گی یا پھر سب کچھ اللہ پر چھوڑ دوں گی۔ ایک گناہ گار کا، ایک مفلس کا، ایک بے سہارا کا، ایک بے مددگار کا، صرف اللہ ہی تو سہارا ہوتا ہے۔

☆.....☆

دوپہر کو مسز شمسی آئیں اور مجھے دیکھ کر بولیں۔ ''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا!''

''ہاں، رات کو ذرا بخار آ گیا تھا، اب ٹھیک ہوں''۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ بولیں۔

''کیا ماہ نور کے لئے تمہیں شرجیل پسند نہیں؟''

''مجھے شرجیل سے پیارا اس دنیا میں اور کوئی لڑکا نہیں لگتا، تم جانتی ہو بالکل میرا بیٹا ہے''۔ میں نے کہا۔

''پر تم نے کیوں پوچھا؟'' میں نے جیسے ناٹک کے مکالمے بولے۔

''یوں ہی!'' مسز شمسی نے صفائی دی۔ ''کل تم نے کوئی جواب نہ دیا اور ایسے چلی آئیں جیسے تمہیں یہ رشتہ پسند نہیں''۔

''میری طبیعت خراب تھی''۔ میں نے کھانستے ہوئے کہا۔ ''اپنا بیٹا کسے پسند نہ ہوگا''۔ مسز شمسی خوش ہو گئیں۔ بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔ انہیں فخر تھا کہ اتنے سالوں تک ان دو گھروں کی اتنی اچھی نبھتی رہی ہے اور اب تو دونوں گھر ایک ہو گئے ہیں۔ پھر نوکر چائے لے آیا اور مسز شمسی چائے پی کر مجھ کو آرام کرنے کے لئے کہہ کر چلی گئی۔ آج ان کی پشت سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ بہت خوش ہیں۔

☆.....☆

شام کو ماہ نور کا بیٹا سے جلدی آ گئی۔ اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔ آنکھیں لگتا تھا کئی بار رو چکی ہیں۔ پلکوں پر رکے ہوئے آنسو دیکھ کر ریگستان کے کنوؤں کی یاد آتی تھی۔ فائل کو ایک کونے میں رکھ کر وہ چپ چاپ دوسرے کمرے میں جانے لگی۔ میں سسک پڑی اور روہانسی آواز میں کہا۔

''بیٹی میرے پاس آؤ۔'' ماہ نور رکی، مڑی اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ اپنے جسم کے ہر انگ کو بانہوں میں بنا کر میں نے ماہ نور کو ان میں بھینچ لیا۔

''مجھے معاف کر دے بیٹی! میں بھول گئی تھی کہ تو جوان ہو گئی ہے۔ اس خیال نے ہی مجھے پاگل بنا دیا تھا کہ اب تو ہمارے پاس نہیں رہے گی۔ ماں کا دل ہی ایسا ہوتا ہے، بیٹی کی شادی پر خوشی سے ناچتا بھی ہے اور دھاڑیں مار مار کر روتا بھی ہے''۔

ماہ نور کی آنکھیں بھی چھلک آئیں، خوشی سے۔

''میری ماں، میری اچھی ماں!'' اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے کے آنسو پونچھنے لگیں اور پھر سر سے سر جوڑے دھیرے دھیرے ماں بیٹیوں جیسی باتیں کرنے لگیں۔ دروازے پر گھنٹی بجی، نوکر نے دروازہ کھولا تو شرجیل آیا تھا۔ آتے ہی بڑے ادب سے اس نے مجھے گڈ ایوننگ کہا اور بولا۔

''آنٹی میں نے سنا آپ ماہ نور کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینے کو تیار نہیں ہیں۔ میں جانتا ہوں آپ ماہ نور کو کتنا چاہتی ہیں، اسی لئے یہ کہنے آیا ہوں کہ آپ مجھے پرایا نہ سمجھیں، میں ماہ نور کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھوں

گا۔ اس کے ساتھ ہی میرا جہان ہے اور آنٹی ہم دونوں کی خوشی آپ کے ہاتھ میں ہے''۔

ماہ نور شرجیل کی باتیں سن کر شرمائی اور اس نے بیڈ پر بیٹھے بیٹھے گردن اپنے گھٹنوں میں دے دی پھر وہیں سے آنکھیں اٹھا کر شرجیل کو دیکھنے لگی۔ ان میں پیار بھی تھا، مسرت بھی اور ناز بھی میں نے ایک نظر شرجیل کی طرف دیکھا، دوسری نظر ماہ نور کو، پھر مسکرانے کی کوشش کی۔

''نہیں بیٹا، آپ فکر نہ کر، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آؤ بیٹھو یہاں تم سیدھے دفتر سے آ رہے ہو نا؟'' اور میں نوکر کو چائے اور ساتھ میں کچھ لانے کے لئے کہنے چلی گئی۔ میرے کمرے سے جاتے ہی جلدی جلدی ماہ نور نے ساری باتیں شرجیل کو بتا دیں کہ اب سب ٹھیک ہو جائے گا اور دونوں کی آنکھوں میں ستارے اور چہرے پر چاند چمکنے لگے۔

تھوڑی دیر میں چائے وغیرہ آ گئی لیکن شرجیل اتنا خوش تھا کہ بس کسی طرح دو گھونٹ بھر کے کھڑا ہو گیا اور اجازت لے کے دروازے سے نکل گیا۔

رات پھر آ گئی۔ میں نے کھانے پر بس ساتھ ہی دیا۔ عقیل صاحب ماہ نور کے ساتھ اس کی شادی کی تیاریوں کے پلان بنانے لگے اور ماہ نور اٹھ کے اپنے بیڈ پر آ گئی اور پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ عقیل صاحب آئے تو بہت تھکے ہوئے تھے۔ اپنے بیڈ پر سو گئے۔

☆.....☆

رات نے پھر اپنی سیاہ جٹائیں کھول دیں اور لال لال آنکھیں اور بڑے بڑے دانت دکھانے لگی۔ یہ رات کل سے بھی زیادہ بھیانک تھی۔ میں نے بہت آنکھیں بند کیں۔ سب کچھ اپنے ذہن سے نکالنے کی کوشش کی لیکن رات رات تھی۔ اس نے مجھ پر اپنے دانت گاڑ ہی دیئے اور صرف ایک بار کیا ہوا گناہ میرے چاروں طرف ناچنے لگا۔ رات جیسے ایک پھانس کی طرح میرے دل میں پھنس گئی اور میں درد سے تڑپتی رہی بلکتی رہی لیکن پھانس نہ نکلی۔ تو میرے دل سے خون کی دھار بہنے لگی۔ ایک زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتی ہوئی میں اٹھ بیٹھی۔ یہ رات میری زندگی کی نہ بھولنے والی رات تھی۔

صبح جب عقیل صاحب دفتر چلے گئے اور ماہ نور کالج چلی گئی۔ تو میں نے شرجیل کو دفتر فون کر کے فوراً گھر آنے کے لئے کہا اور نوکر کو بازار شاپنگ کے لئے بھیج دیا۔ شرجیل جب میرے کمرے میں داخل ہوا تو ٹھٹک کے رہ گیا۔ میں کئی سالوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ میرے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر جیسے ہزاروں جھریاں ابھر آئی تھیں۔

''کیا بات ہے آنٹی؟'' شرجیل میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''شرجیل بیٹا!'' میں نے دھیرے سے کہا۔ ''مجھے معاف کر دینا، میں نے تجھے یہ بتانے کے لئے بلایا ہے کہ تمہاری اور ماہ نور کی شادی نہیں ہو سکتی''۔

''جی!'' شرجیل نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ ''تو پھر کس سے کرنا چاہتی ہیں آپ؟''

''تجھ سے اچھا اور کوئی نہیں ملے گا شرجیل! میں تجھے اس کا ہاتھ پکڑا کر پھولی نہ سماتی لیکن میں کیا کہوں''۔ مجھ کو سانس لینی پڑی، ختم ہوتی ہوئی قوت کو میں نے پھر سنبھالا اور کہا۔ ''تم دونوں بہن بھائی لگتے ہو''۔

''جی؟'' شرجیل کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''آپ کا مطلب؟''

''تم نے دیکھا نہیں؟'' میں بولتی رہی۔ ''تم دونوں کی شکل کتنی ملتی ہے۔ یہ کہتے ہوئے میں شرم سے پانی پانی ہو رہی ہوں کہ ماہ نور تمہارے ڈیڈی کی ہی بیٹی ہے''۔ شرجیل کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ بچہ نہیں تھا، سب کچھ سمجھتا تھا۔

''لیکن ڈیڈی.....'' اس نے کچھ کہنے کی ناکام کوشش کی، اس کا گلا خشک ہوتا جا رہا تھا۔

''تمہارے ڈیڈی کا اس میں قصور نہیں''۔ میں نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''قصور میری قسمت کا ہے۔ انہیں تو شاید پتہ بھی نہ ہو کہ ماہ نور انہی کی بیٹی ہے۔ صرف میں ہی جانتی ہوں۔ یہ سب کچھ ایک کمزور لمحے میں ہو گیا تھا اور میں اب تک سزا بھگت رہی ہوں۔ کسی سے بھی نہیں

کہہ سکتی۔ نہ مسٹر شمسی سے، نہ تمہاری ماں سے، نہ ماہ نور سے۔ تم سیانے ہو، پڑھے لکھے ہو، جانتے ہو عورت کے لئے یہ بات کتنی بڑی ہوتی ہے۔ میں نے یہ سب تم سے کہہ کر تمہیں اپنا سب کچھ بنا لیا ہے۔ ایسی بیٹی ماہ نور سے بھی زیادہ تم ہی اس انہونی کو ہونے سے روک لو۔ بھائی بہن کی شادی کیسے ہو سکتی ہے؟''

شرجیل جیسے بت بن گیا تھا، میرا لہجہ ایسا تھا کہ اسے کسی بات پر بھی شک نہ رہا۔ وہ پہلے سے بھی حیران تھا کہ اسے اتنا پسند کرنے کے باوجود میں اس رشتے پر خوش کیوں نہیں ہوں۔ اب سب کچھ صاف ہو گیا تھا۔

''لیکن آپ جو کہہ رہی ہیں یہ غلط بھی ہو سکتا ہے''۔ پھر بھی اس نے مدھم آواز میں کہا۔ ''میں اس کا پتہ کروں گا''۔

''کیسے؟.....ایک ماں سے زیادہ اس بات کو کون سمجھ سکتا ہے۔ ہمارے کوئی بچہ نہیں تھا، ماہ نور میرے ایک، صرف ایک گناہ کا پھول ہے۔ اس کے بعد میں اور عقیل صاحب کی لاکھ خواہش کے باوجود ہمارے گھر اور کوئی پھول نہ کھل سکا''۔

''اف، اوہ! یہ میں کیا سن رہا ہوں''۔ شرجیل نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا، اس کی آواز بھرا گئی۔ ''نہیں نہیں، ماہ نور میری بہن نہیں ہو سکتی، میں اسے چاہتا ہوں، اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں''۔

''حوصلہ رکھو بیٹا!'' میں نے شرجیل کے مضبوط کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''تم صرف یہ خیال دل سے نکال دو۔ تم میں خود بخود سب کچھ سہنے کی طاقت آ جائے گی۔ اب تم ہی میرا سہارا ہو، میرا تو کچھ بھی نہیں رہا''۔ بہت ضبط کے باوجود میری آواز رو ہانسی ہو گئی اور میں سسکنے لگی۔

شرجیل اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ نہیں ہو سکتا، میں اپنا اور ماہ نور کا خون ٹسٹ کراؤں گا۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا''۔ تھوڑی دیر تک وہ یوں ہی کھڑا ایک طرف تکتا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے باہر نکل گیا۔ جیسے سب کچھ کھو کر۔ میں بہت دیر تک پڑی سسکتی رہی پھر مجھے محسوس ہوا۔ میرے دل سے سارا بوجھ اتر گیا ہے۔ شرجیل سیانا لڑکا ہے، ضرور اس شادی سے باز آ جائے گا۔ ضرور اس مسئلے کو حل کر دے گا۔ میں سارا دن ایسے خیالوں میں ہی گم رہی۔ شام کو ماہ نور آ گئی، پھر عقیل صاحب بھی آ گئے۔ پھر رات کے کھانے کا وقت آ گیا۔ میں بھی کھانے پر آ بیٹھی اور دل نہ ہونے پر بھی تھوڑا بہت کھانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں ماہ نور کی طرف بھی دیکھ رہی تھی۔ اسے بہت صدمہ پہنچے گا لیکن چند دنوں کے بعد وہ ضرور سنبھل جائے گی۔ اللہ اسے ضرور سہنے کی طاقت دے گا۔

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

عقیل صاحب نے ٹیلی فون اٹھایا اور سننے لگے۔ میں نے جب ان کا چہرہ دیکھا تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کچھ پوچھنا چاہا لیکن جیسے گلے سے آواز ہی نہ نکل سکی۔ ریسیور رکھ کر عقیل صاحب نے ماہ نور کو دیکھا، ان کے چہرے پر عجیب تاثرات تھے۔ پھر میری طرف دیکھنے لگے ایسے کہ میں کانپنے لگی۔ ان کا چہرہ بالکل لٹک گیا تھا۔ جلدی سے کار کی چابی کوٹ کی جیب سے نکالتے ہوئے بولے۔ ''میں شمسی صاحب کے پاس جا رہا ہوں''۔ اور تیزی کے ساتھ باہر نکل گئے۔

کار سٹارٹ کرنے کی آواز آئی، کھانا وہیں چھوڑ کر میں اٹھ گئی۔ خاموشی سے اپنے کمرے تک آنے میں مجھے یوں لگا جیسے میں نے ہزاروں میل سفر طے کیا ہو۔ رات گئے عقیل صاحب لوٹے اور آ کر انہوں نے شرجیل کی موت کی خبر سنائی۔ ایک حادثے میں اس کا سر پچک گیا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اس نے بہت زیادہ شراب پی رکھی تھی، میری جیسے جان نکل گئی۔ ایک چیخ مار کر میں بیڈ پر جا گری اور دھاڑیں مار مار کے رونے لگی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ کیا اتنا کچھ بھگتنے پر بھی میں اپنے ایک صرف ایک گناہ کی قیمت نہیں چکا سکی تھی۔ جو اللہ نے اب مجھے یہ ایسی سزا دی تھی جو مجھے ہمیشہ کے لئے نیم مردہ کر دے اور جب تک جیوں میری نسوں میں، میرے دل میں، میری روح میں، انگاروں کی طرح سلگ سلگ کر مجھے تڑپاتی رہے گی۔

☆☆☆

بدلہ

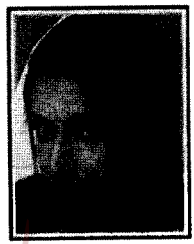

کرن شبیر

اُس معصوم شخص کی داستان، جسے مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی تختہ دار پر لٹکا دیا گیا

رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ گھڑیال نے گیارہ بجائے تو میں اپنے دفتر سے اٹھ گیا۔ میرے قدم اس بیرک کی طرف اٹھ رہے تھے جس میں نفیس کو رکھا گیا تھا۔ وہ اسم بامسمیٰ تھا۔ نہایت نفیس اور شستہ زبان بولنے والا اس کا بیرک سب سے الگ تھلگ تھا۔ میں دھیرے دھیرے اس طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ مختلف جگہ ڈیوٹی پر تعینات سپاہی کھڑے تھے جو مجھے دیکھ کر الرٹ ہو جاتے تھے۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے میں اس مخصوص بیرک کی طرف بڑھتا جا رہا تھا اس بیرک کے سامنے پہنچ کر میں کھڑا ہو گیا۔ نظر گھما کر سلاخوں کے پار دیکھا۔ وہ بستر پر سر جھکائے بیٹھا ہوا کسی گہری سوچ میں گم تھا میں نے کھنکھار کر اسے متوجہ کیا۔ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ میں نے اسے آواز دی۔ ''کیسے ہو نفیس؟''

''جی بہتر ہوں۔''

''سگریٹ پیو گے؟''

''نو تھینکس، میں نے کبھی نہیں پی۔'' اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تھینکس میری بیوی کا تکیہ کلام تھا۔''

''اچھا..... شاید شکریہ کہنے کی اس کی عادت ہو گی۔ یہ ایک اچھی عادت ہے۔''

''جی ہاں، وہ بات بات پر تھینکس کہتی تھی۔'' نفیس نے سرشار لہجے میں بتایا۔ اس کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا۔

''اچھا نفیس یہ بتاؤ کچھ کھانے کا دل ہے بولو کیا کھاؤ گے؟''

''کیا میری پھانسی کا آرڈر آ گیا ہے؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''کیس عدالت میں ہے مجھے کیا خبر۔'' میں نے نظریں چرا کر کہا۔ ''تم نے یہ سوال کیوں پوچھا؟''

''آپ نے خواہش کا جو پوچھا۔'' اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ شاید نہیں یقیناً وہ بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔

''تم نے بتایا نہیں کیا کھانا چاہتے ہو؟'' میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''آپ نے پوچھ ہی لیا تو سجی کھلا دیں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

مسکراتے وقت اس کے ہونٹوں پر نسوانی کھنچاؤ سا
ہو جاتا جو کچھ عجیب سا لگتا۔ مرد پر مردانگی کی چھاپ
بہتر لگتی ہے۔ جب سے وہ میری جیل میں آیا ہے وہ
ہندی سے نائی کے پاس جاتا ہے۔ شاید کلین شیو رہنا
اسے بہت پسند تھا۔ عام قیدیوں کو یہ سہولت نہیں دی جاتی
لیکن اس کے ساتھ میں نے رعایت کی تھی۔ ایک مہینے
پہلے نائی سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کی فرمائش پوری کر دیا
کرے۔ صبح صبح نائی اس کی بیرک میں آجاتا۔ اس کی

قہقہہ لگاتا ہے مگر میں اسے روکنا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ
میں سمجھ رہا تھا کہ وہ ہنسی کے پردے میں اپنا غم چھپانا چاہتا
ہے۔ وہ اسی سعی میں مصروف تھا۔ قہقہے کی گونج ختم ہوئی تو
وہ سلاخوں کے مزید نزدیک آگیا اور بولا ــــ ''جانتے ہیں
میری بیوی بجی کیوں پسند کرتی تھی؟''

''کیوں؟''

''ایک بار میں نے سوال کیا تھا بلکہ باتوں کے
جواب میں کہا تھا کہ تمہیں بجی کیوں پسند ہے تو وہ بولی

شیونگ کے بعد ہی نائی کسی دوسری طرف جاتا تھا۔ اس
وقت بھی صبح کی شیو کا تازہ پن نظر آرہا تھا۔ میں نے اس
کے چہرے پر نظریں جما کر کہا۔ ''بجی اچھی منگوا دوں،
کوئی خاص دکان؟ جہاں کی بجی زیادہ پسند ہے؟''

''جی نہیں، بس بجی ہو، یہی کافی ہے۔'' وہ بولا۔

''دراصل بجی میری بیوی کو بہت پسند تھی۔'' اس نے
پھر قہقہہ لگایا۔ بات بات پر اس کا قہقہہ لگانا مجھے عجیب سا
لگتا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ قہقہے کھوکھلے ہیں۔ وہ زبردستی

تھی۔ ''جنت میں بجی تو ملے گی نہیں کیونکہ بجی کے لیے
جانور کو ذبح کیا جانا ضروری ہے اور جنت میں کسی کو ذبح
کیا نہیں جاسکتا۔ اس لیے میں زندگی میں زیادہ سے زیادہ
بجی کھا لینا چاہتی ہوں۔'' اس نے پھر قہقہہ لگایا۔

''گویا تم بھی اس لیے بجی کھانا چاہتے ہو۔'' میں
نے بھی ہنس کر جواباً کہا۔

''یہ بات بھی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ بجی
کھانے سے جسم گرم رہتا ہے۔ یہ بات بھی میری بیوی

نائلہ نے کہی تھی۔'' اس نے پھر قہقہہ لگایا۔

''ہاں یہ بات تو ہے کہ سچی جسم میں گرمی پیدا کرتی ہے۔''

''جسم کی گرمی پر ایک واقعہ یاد آ گیا گو کہ یہ واقعہ کچھ شرمناک ہے مگر سنا دیتا ہوں میں۔'' اس نے کچھ لہجے میں کہا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ ذہن میں پیدا ہونے والے ہیجان سے بچنے کے لیے ایسی باتیں کر رہا ہے۔ قہقہے میں خود کو چھپا رہا ہے۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا اس لیے اسے زیادہ سے زیادہ موقع دے رہا تھا۔ اس لیے کہا۔

''ہاں تم کوئی واقعہ سنا رہے تھے۔''

''جی، یہ واقعہ میری سہاگ رات کا ہے۔ میں ٹھہرا کراچی کا بندہ شادی ہوئی شیخوپورہ کی لڑکی سے۔ دراصل نائلہ میرے دور کی رشتے دار تھی۔ اماں نے پسند کیا اور مجھے ہاں کرنی پڑی۔ برأت کراچی سے گئی تھی اس لیے پہلی رات کا انتظام وہیں کیا گیا تھا۔ وہ سردی کا موسم تھا اور میں ٹھہرا کراچی والا، جہاں سردی بس احساس کرانے کو آتی ہے کہ سردی کا احساس کرنا ہو تو دسمبر جنوری میں آئس کریم کھا کر کمبل اوڑھ لو، گویا کراچی کے رہنے والے کے لیے شیخوپورہ کی سردی! میں کانپنے لگا تھا۔ اس حالت میں مجھے دلہن کے پاس بھیجا گیا۔ میں سکڑا سمٹا اس کے سامنے پہنچا اور بیڈ پر بیٹھتے ہی پوچھا۔ ''کیا شیخوپورہ والے بغیر کمبل کے رات گزارتے ہیں؟''

میری بات پر دلہن نے مسکرا کر بیڈ کے نیچے سے کمبل نکالا اور مجھے دیتے ہوئے بولی۔ ''میری سہیلیوں نے یہ حرکت کی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر کراچی والے نے کمبل کی فرمائش نہیں کی اور رات گزاری تو سمجھ لینا اس میں بہت گرمی ہے، سردی سہنے کی گرمی۔ اس کا اندازہ لگانے کا یہ آسان طریقہ ہے۔''

''تو جناب میں اپنے سیدھے پن میں پہلے ہی امتحان میں فیل ہو گیا تھا۔'' وہ بات ختم کر کے مسکرانے لگا تھا۔

میں نے نرم لہجے میں اجازت لی اور اپنے دفتر کی طرف چل پڑا۔ رات میں ہی اس کے تمام نمٹانے تھے۔ کاغذات مکمل کرنے تھے۔ میں اپنے کمرے میں پہنچ کر اس کی فائل دیکھنے لگا تبھی ایک بات نظر آ گئی جس کے متعلق پوچھنے دوبارہ اس کے پاس آنا پڑا۔ وہ اسی طرح فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا جسے دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''گویا میرا شک مکمل ہے کہ میرے لیے پھانسی کا حکم نامہ جاری ہو چکا ہے۔''

''یہ بات کیوں ذہن پر بٹھا لی ہے۔ جو حکم نامہ جاری ہوگا اسے تعمیل کرنا میری مجبوری ہے۔ حکم نامہ آئے گا تو میں تمہیں بتا دوں گا۔''

''میری بیوی کی بھی یہی عادت تھی کہ وہ ہر بات کھل کر نہیں بتاتی تھی۔ جب میں پوچھتا تو کہتی۔ بتا دوں گی۔''

''تم اپنی بیوی سے بہت محبت کرتے تھے؟''

''جی ہاں بہت محبت کرتا تھا۔'' کہہ کر وہ دیوار کو گھورنے لگا جیسے دیوار پر اس کی بیوی کی تصویر چسپاں ہو۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''اسی بیوی کے قتل کا الزام مجھ پر لگا ہے اس الزام کے تحت مجھے پھانسی دی جائے گی۔''

میں نے اس کے غمزدہ چہرے پر نظریں جما کر پوچھا۔ ''تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ تمہیں پھانسی ہوگی۔''

''حالات و واقعات یہی بتاتے ہیں۔ نچلی عدالت نے بھی میرے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ یہی کچھ اعلیٰ عدالت بھی کرے گی۔ قانون ثبوت کی عینک سے انصاف تلاش کرتا ہے اور وکیل نے میرے خلاف ثبوت کا پہاڑ کھڑا کر دیا ہے۔ پورے دو سال ہو گئے اس عرصے میں کتنے سارے واقعات سامنے آئے۔ میں دم بخود ہوں کہ لوگ ایک چہرے پر کتنے چہرے سجائے رکھتے ہیں۔ کیوں احسان فراموشی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔''

''کس نے احسان فراموشی کی؟'' میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''آخری پیشی پر مخالف وکیل نے جو گواہ پیش کیا تھا میں اس کے متعلق بتا رہا ہوں۔'' اس نے دکھی لہجے میں کہا۔

''وہ کون تھا؟'' میں نے پوچھا۔ ''دراصل میں اس کو موقع دینا چاہتا تھا کہ وہ اپنے دل کی ہر بات بتا دے۔ اس کے دل میں کوئی بات رہ نہ جائے۔

اس نے اس غمزدہ لہجے میں بتانا شروع کیا۔ ''مجھے جب کٹہرے میں پہنچایا گیا تو مخالف وکیل نے پہلا سوال کیا۔ کیا یہ بات صحیح ہے کہ آپ کے گھر جمیلہ آتی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ''اس کی عمر کیا ہو گی۔'' جواباً میں نے کہا کہ یہی کوئی چودہ پندرہ سال، سولہ بھی ہو سکتی ہے۔ میرے جواب پر وکیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''گویا وہ کھلتی ہوئی کلی ہے اسی وجہ سے آپ کے گھر میں میاں بیوی میں جھگڑا ہوا کرتا تھا۔''

میں اس کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔ وہ ایک رکیک الزام لگا رہا تھا۔ میرے اندر غصے کی لہر اٹھ رہی تھی مگر یہ موقع نہیں تھا اگر غصے میں آجاتا تو بات مزید بڑھ جاتی اس لیے اپنے لہجے کو نرم بنا کر میں نے جواب دیا۔

''ایسا کون سا گھر ہے جہاں میاں بیوی میں تکرار نہیں ہوتی لیکن اس تکرار کا آپ غلط مطلب لے رہے ہو۔ میری بیوی میری زندگی تھی میں اسے بہت چاہتا تھا۔ اس لیے وہ کبھی کبھی زیادہ ہی بول جاتی تھی مگر میں اس کی بات کا برا نہیں مناتا تھا۔ نہایت رسان سے بول کر اس کے غصے کو ٹھنڈا کر دیا کرتا تھا۔''

میرے جواب پر وکیل نے کہا۔ ''کیا یہ بات صحیح ہے کہ آپ کی بیوی اسے پسند نہیں کرتی تھی اور نوکری سے نکالنے کی بات کرتی تھی۔''

اس کی اس بات پر مجھے یاد آگیا کہ اس واردات سے دو دن پہلے کی بات ہے، میری بیوی نے ناخوشگوار لہجے میں کہا تھا کہ وہ جمیلہ کو نوکری سے نکالنا چاہتی ہے۔ دوسری ماسی ڈھونڈ رہی ہے۔ میں نے پوچھا تھا کہ وہ ایسا کیوں سوچ رہی ہے تو اس نے کہا تھا کہ مجھے اس کے چال چلن پر شبہ ہے۔ وہ گھنٹے گھنٹے بھر چوکیدار کے کمرے میں گھسی رہتی ہے۔ اس پر میں نے کہا تھا تو کیا ہوا۔ وقت گزاری کے لیے گپیں لگانے جاتی ہو گی۔ بچی ہے اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کرنا ہی بہتر ہو گا۔''

''اونہہ! بچی ہے۔'' میری بیوی نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔ ''بچی نہیں پکی حرافہ ہے۔''

وہ بضد تھی کہ اسے نکال دیا جائے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کے پیٹ پر لات پڑے۔ اس بات پر کافی دیر بحث ہوتی رہی۔ میں نے سمجھانے کے لیے کہا بھی کہ چوکیدار کا کیبن اتنا بڑا نہیں ہے کہ کوئی غلط بات سوچی جائے مگر اس کی رٹ تھی کہ جمیلہ جب بھی واپس آتی ہے اس کے جسم سے گولڈ فلیک سگریٹ کی ناگوار بو آتی ہے۔ یہ بو ہی اس کا جرم ثابت کرنے کو کافی ہے۔

اس دن کے بعد بھی وہ کئی بار لڑی کہ آخر آپ کو اس لڑکی سے اتنی ہمدردی کیوں ہے اور میرا ایک ہی جواب تھا کہ انسانی ہمدردی۔''

وہ اپنی بات ختم کر کے خاموش ہو گیا۔

اس کی باتوں کا انداز بہت پیارا تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر نپے تلے انداز میں بولتا تھا اور اس کی یہی بات مجھے پسند تھی۔ کاش اس سے میری ملاقات یہاں نہ ہوئی ہوتی۔ بہ حیثیت قیدی نہ ملا ہوتا تو میں اسے دوست بنا لیتا۔ خوب باتیں کرتا۔ یوں ہی میں یار باش آدمی کہلاتا ہوں، میرے بہت سے دوست ہیں جن کے ساتھ بیٹھ کر میں گھنٹوں باتیں کرتا ہوں، خود بولتا کم ہوں لیکن دوسروں کو بولنے کا موقع زیادہ دیتا ہوں۔ یہی میری عادت ہے۔ اس طرح دوسروں کا تجربہ پورا پورا خود میں سلب کر لیتا ہوں۔ ایک یہی نہیں کئی اور قیدیوں سے بھی میں اسی طرح گھل مل کر باتیں کرتا ہوں۔ جیل میں آنے والے زیادہ تر قیدی محبت کے بھوکے ہوتے ہیں اس لیے وہ میرے سامنے اپنی پوری زندگی کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ اپنا تمام درد بیان کر دیتے ہیں۔ جیسے یہ اپنی ایک ایک بات بیان کرتا جا رہا ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر سے نظر ہٹا کر کہا۔

''گولڈ فلیک کی بو مجھے بھی سخت ناپسند ہے۔ اس اردلی کو بھی میں ناپسند کرتا ہوں جو مجھے ملا ہے۔ کیونکہ وہ چین اسموکر ہے۔ دن بھر میں بگلا سگریٹ کی کئی ڈبیاں پیتا ہے۔ آخری پیشی پر کیا ہوا جس کی وجہ سے انسانیت پر سے تمہارا اعتماد متزلزل ہوا۔ اگر مناسب سمجھو تو یہ بھی بتا دو۔''

''اجی صاحب ہونا کیا تھا۔ اس دن جب مجھے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا تو مخالف وکیل نے ایک رکیک

الزام لگا دیا کہ آپ اور آپ کی بیوی کے درمیان تکرار ہوئی تھی اور اس کی وجہ جمیلہ تھی۔ وہ چودہ پندرہ سال کی بچی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اکثر گھروں میں غربت کا فائدہ اٹھانے کے لیے گھر کے مرد ماسیوں کی بچیوں پر ہاتھ صاف کرتے رہتے ہیں۔ آپ بھی اسی تاک میں تھے اور آپ کی راہ میں آپ کی بیوی آ گئی۔''

''جی نہیں، یہ غلط ہے۔'' میں نے چیخ کر کہا تھا۔

''پھر حقیقت کیا ہے۔ اس روز کیا ہوا تھا کھل کے بتائیں۔'' وکیل نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ پیدا ہوا وکیل تو شیطان نے کہا۔ لو آج ہم بھی صاحب اولاد ہو گئے۔ واقعی وہ وکیل شیطان کی اولاد تھا۔ اس نے الزامات کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ میں جتنا خود کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا وہ اس قدر تیزی سے مجھے دلدل میں کھینچ رہا تھا۔ اس کے سوال کا جواب دینے کے لیے میں اس دن کے واقعات یاد کر رہا تھا۔ کچھ بھی کر لیں لیکن حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتے۔ آپ نے جرم کیا ہے۔ ایک گھناؤنا جرم آپ مجرم ہیں۔''

اس کی اس بات پر میرے وکیل نے کھڑے ہو کر کہا۔ ''اپنی بات کو کسی کے منہ سے کہلوانا صحیح نہیں ہے۔ میرے قابل دوست کو اپنے جرم کا اندازہ بدلنا ہوگا۔''

مخالف وکیل نے میرے وکیل کی بات پر مسکرا کر کہا۔ ''تو یہ جواب دینے میں اتنی دیر کیوں کر رہے ہیں۔''

اس تابڑ توڑ حملے سے گھبرا کر میں نے جلدی سے کہا۔ ''اس دن میں دفتر میں کام نمٹا رہا تھا کہ بیوی کا فون آیا۔ فوراً آ جائیں۔ اس بے وقت کے بلاوے پر میں نے پوچھا۔ ''کوئی خاص بات، ایسی کیا بات ہوگئی تمہارے لہجے سے ایسا لگ رہا ہے کہ تم کافی غصے میں ہو۔''

''بس میں نے کہہ دیا نا، جلدی آ جائیں۔'' کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔ وہ کوئی بھی بات کھل کر کہتی ہی نہیں تھی۔ ہر بات کو چھپا لیتی تھی یا بہت بعد میں بتاتی تھی۔ اس کی اس عادت سے میں پریشان رہتا تھا۔ فون آ چکا تھا۔ لہجے میں بھی کچھ خاص تبدیلی محسوس ہوئی تھی اس لیے میں نے دفتر سے چھٹی لی اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

''اور گھر پہنچ کر آپ نے کام دکھا دیا۔'' مخالف وکیل نے پھر زبانی حملہ کر دیا۔

میں نے خود پر ضبط کر کے جواب دیا۔ ''جب میں گھر پہنچا تو باہر کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ چوکیدار اپنے کیبن میں موجود نہیں تھا۔ اکثر وہ نکڑ کی دکان سے سگریٹ لینے چلا جاتا تھا۔ دکان زیادہ دور نہیں تھی اس لیے دروازہ کھلا چھوڑ جاتا تھا۔ اس لیے میں نے توجہ نہیں دی اور اندر داخل ہو گیا۔ برآمدے کا مرکزی دروازہ بھی کھلا ہوا تھا جب کہ میری بیوی کی عادت تھی کہ وہ اندر والے دروازے کو بند رکھتی تھی۔ اتنی اہم بات کی جانب بھی میں نے توجہ نہ دی اور اندر داخل ہو گیا۔ اندر پہنچ کر میں نے نائلہ کو آواز دی مگر اس نے جواب نہ دیا۔ پھر میں نے جمیلہ کو آواز دی۔ وہ بھی غائب تھی۔ میں نائلہ کو آواز دیتا ہوا ڈرائنگ روم سے ڈائننگ اور پھر بیڈ روم میں آ گیا مگر وہ نظر نہ آئی۔ میں نے باتھ روم میں بھی جھانک کر دیکھ لیا وہ وہاں بھی نہ تھی باتھ روم خالی پڑا تھا۔ تب میں کچن کی طرف بڑھا۔ نائلہ کچن میں ہوتی تھی تو ہانڈی کی خوشبو ڈائننگ روم میں پھیلی رہتی اور میری آواز بھی بہ آسانی سن لیتی اس لیے میں نے ادھر توجہ نہیں دی تھی مگر جب کہیں نظر نہ آئی تو میں اس طرف چل پڑا۔ کچن میں جھانکتے ہی میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ وہ فرش پر چت پڑی تھی۔ اس کا گلا کٹا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔'' میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ مخالف وکیل نے کھڑے ہو کر جملہ پورا کیا۔

''اور آپ خوف زدہ ہو کر گھر سے بھاگ نکلے..... یہی ناں؟''

''جی ہاں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلا کر کہا۔

''آپ ایک تعلیم یافتہ، باشعور ایک اونچے عہدے پر فائز جوان ہیں۔ قانون کا علم بھی رکھتے ہیں۔ ایسی حالت میں لوگ دوسروں کو مدد کے لیے بلاتے ہیں لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ آپ بنگلے سے نکل کر سیدھے..... انٹرسٹی بس اسٹاپ کے ہوٹل میں جا بیٹھے، کیوں؟''

اس کے اس سوال پر میں نے نیچی آواز میں کہا۔

"دراصل میرا ذہن الجھ گیا تھا اس لیے۔ ہوٹل کے خاموش ماحول میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

"آپ سوچ رہے تھے۔" مخالف وکیل نے الزام لگایا۔ "کس طرح بیوی کی لاش سے پیچھا چھڑاؤں۔ کہاں لے جا کر پھینکوں۔"

اس الزام کا جواب ثبوت سے دیا جاسکتا تھا جو میرے پاس نہیں تھا۔ ازل سے میں ڈرپوک اور الجھ جانے والا جو ہوں اس لیے میں خاموش تھا کہ مخالف وکیل نے کہا۔

"می لارڈ! میں اب اس قتل کی ایک اہم گواہ کو پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔"

اجازت ملتے ہی اس نے گواہ کو کٹہرے میں لا کر کھڑا کر دیا۔ اسے دیکھ کر مجھے کچھ حوصلہ ملا کیونکہ وہ جمیلہ تھی جس کی ہمدردی میں، میں نائلہ سے لڑا کرتا تھا۔ وکیل نے میری طرف اشارہ کر کے اس سے پوچھا۔ "جمیلہ کیا تم اسے جانتی ہو؟" تو وہ بولی۔ "جی ہاں میں اس کے گھر میں کام کرتی تھی۔"

وکیل نے کہا۔ "کیا یہ صحیح ہے کہ تمہاری وجہ سے یہ اپنی بیوی سے لڑا کرتے تھے۔"

وہ بولی۔ "جی ہاں، بی بی جی مجھے نوکری سے نکالنا چاہتی تھی مگر صاحب جی انکاری تھے۔ وہ بی بی جی کو سمجھاتے تھے کہ ایسا نہ کرو۔"

جمیلہ کی بات ختم ہوتے ہی وکیل نے کہا۔ "می لارڈ! ان دونوں کے درمیان جو رشتہ جنم لے چکا تھا وہ نائلہ کیا کوئی بھی بیوی برداشت نہیں کر سکتی اسی لیے دونوں میں فساد برپا ہوتا۔"

اس بات پر میرے وکیل نے کھڑے ہو کر کہا۔ "کسی کی ہمدردی میں بولنا جرم تو نہیں ہے میرا موکل ایک سیدھا سادہ، رحم دل اور اصول پرست شخص ہے اس لیے وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کی لگی لگائی نوکری کو چھینے۔"

"نہیں جناب!" مخالف وکیل نے کہا۔ "دراصل ملزم کو دوسری لڑکی تلاش کرنے میں دقت ہوتی اس لیے وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"یہ الزام ہے۔" میں تقریباً چیخ پڑا تھا کہ مخالف وکیل نے مجھ سے کہا۔

"سچ بتاؤ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ جیسے ہی بیگم صاحبہ باہر جاتیں بلکہ صاحب خود مشورہ دے کر اسے بھیجتے

سچی کہانیاں کا مقبول ترین سلسلہ "پلیٹ فارم"

اسٹیشن پر جنم لینے والی کہانیاں..... جن میں جدائی اور ملن کے وصل بھی شامل ہے۔

ممتاز احمد کے قلم سے خوش اثر، رسیلی، زہریلی کہانیاں، نازیبا، ناز پیشگاں کے قصے

فتنہ سامانیاں، جولانیاں لیے پلیٹ فارم نمبر کی سوغاتیں... ...

جنہیں قارئین سچی کہانیاں نے اپنی پسندیدگی سے نواز کر امر کر دیا۔

"پلیٹ فارم" اب کتابی شکل میں دستیاب ہے۔

قیمت صرف =/500 روپے۔

زیر اہتمام: طلوع اشک پبلی کیشنز

رابطہ: 0300-4850461/0333-4524137

Email : tulooashk@yahoo.com

پھرے جیسے ہی وہ باہر نکلتی صاحب تمہیں اپنے کمرے میں بلا لیتے تھے۔''

میں اس کا جواب سننے کے لیے ہمہ تن گوش تھا کہ وہ بولی۔''جی ہاں..... میرے نہ کرنے کے باوجود۔'' اس کا جواب سن کر میں سکتے کی کیفیت میں آ گیا۔

جمیلہ سے ایسے جھوٹ کی توقع نہیں تھی۔ میں تو اس کی غربت پر ترس کھا کر اس کی ہر ممکن مدد کرتا رہتا تھا۔ نائلہ سے چھپ کر وقتاً فوقتاً اسے پیسے بھی دیا کرتا تھا۔ جب اور جتنا مانگتی میں فوراً دے دیا کرتا تھا۔ پھر بھی اس نے ایسا جھوٹ بولا۔

اس کی بات سن کر جج نے عدالت برخاست کر دی کہ اگلی پیشی پر فیصلہ سنا دیا جائے گا۔ میں نے ہوا کا رخ پہچان لیا تھا۔ سمجھ گیا تھا کہ پھانسی کا پھندا میرا مقدر بن چکا ہے۔ اسی لیے میں بے چینی سے اس وقت کا انتظار کر رہا ہوں جب میں اس مکار دنیا سے کوچ کر جاؤں۔''

نفیس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ اس کا لہجہ بہت کچھ کہہ رہا تھا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ پھانسی کے مجرم آخر وقت تک خود کو بے قصور کہتے رہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جب جلاد کالا نقاب چہرے پر چڑھا دیتا ہے تب وہی مجرم چیخ چیخ کر کہتا ہے کہ اے اللہ میرے گناہ معاف کر دے۔ میں نے یہ جرم غلطی سے کیا۔ شیطان کے بہکاوے میں آ کر کیا ہے۔ اس لیے میں نے اس کی بات کو اہمیت نہ دی اور اس کی بیرک سے لوٹ آیا۔

مجھے معلوم تھا اس کے ساتھ اچھا خاصا وقت گزار چکا ہوں۔ رات آخری حصے میں داخل ہو چکی ہے اب سے کچھ دیر بعد مجھے پھر اسی بیرک میں آنا ہے۔ اسی لیے سونے کے بجائے دفتر کی طرف آ گیا۔ اردلی بھی جاگ رہا تھا اسے چائے بنانے کا کہہ کر میں پھر سے نفیس کی فائل کا مطالعہ کرنے لگا۔ اس کی فائل سے یہ بات پتا چل چکی تھی کہ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ ایک ماں تھی جو ایک سال پہلے فوت ہو چکی تھی۔ اب جو کچھ بھی کرنا تھا جیل انتظامیہ کو ہی کرنا تھا۔ میں نے فائل بند کر کے فیتہ باندھا اور سر کو کرسی سے ٹکا کر اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرے اردگرد اتنے سارے قیدی تھے مگر پتا نہیں کیوں نفیس سے ایک انسیت سی محسوس کرنے لگا تھا۔ اسی لیے میں آج کی رات اس کے ساتھ گزار رہا تھا۔ شاید وہ بھی سمجھ چکا تھا اس لیے جاگ رہا تھا۔

فجر کی اذان سے ذرا پہلے مولوی صاحب آ گئے۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ جا کر نفیس کو غسل وغیرہ میں مدد دیں، پھر نماز پڑھا دیں وہ اس کے بیرک کی طرف چلے گئے۔ میں دفتر میں بیٹھا گھڑی کی سوئیوں کی طرف دیکھتا رہا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ نماز پڑھ کر میں بھی نفیس کے بیرک میں پہنچ گیا۔

وہ پرسکون تھا۔ زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا۔ میں نے ساتھ آئے دونوں سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے بیرک کا تالا کھولا۔ اسے باہر نکالا۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کیا پھر کہا۔

''سر میں رات میں ہی سمجھ گیا تھا پھر بھی آپ کا شکریہ کہ آپ نے میرا خیال رکھا اگر روز حشر ملاقات ہوئی تو بھی شکریہ ادا کرتے ہی پائیں گے۔'' پھر اس نے آگے کی سمت قدم اٹھا دیا۔''میں بے قصور ہوں، پھر بھی سب کا قصور معاف کیا۔''

میں بھی اس کے ساتھ مرے مرے قدموں سے چل پڑا۔ جلاد نے تختہ تیار کر لیا ہوگا۔ بس کچھ دیر کی بات ہے یہ قصہ اختتام پذیر ہو جائے گا۔ میں سوچ میں گم اس کے ساتھ چلا جا رہا تھا کہ وہ میرے دفتر کے سامنے رک گیا۔ اس نے کھڑے ہو کر زور زور سے سانس لی اور پھر رک کر بولا۔''سر یہ بو کیسی ہے؟''

میں نے بھی فضا میں زور سے سانس کھینچی پھر کہا۔ ''یہ گولڈ فلیک سگریٹ کی بو ہے۔''

اس نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہی..... یہی بو تھی، نائلہ کے کپڑوں سے یہی بو آ رہی تھی۔''

میرے اندر کچھ چھن سے ہوا، بات کی تہہ تک میں پہنچ گیا تھا مگر میں مجبور تھا۔ عدالت کے حکم کو رد نہیں کر سکتا تھا، اب اپیل کا وقت بھی تو نہیں تھا۔

☆☆☆

دنیائے جستجو

تسنیم منیر علوی

غلط فہمی سے جنمی اِک چھوٹی سی محبت کی بہت بڑی کہانی، جو بطورِ خاص دبئی سے بھیجی گئی

ہم نے ہینڈ کیری جہاز کے اوپری حصے میں رکھ کر نشستی (حفاظتی) بیلٹ باندھی، تو ایسا لگا جیسے ایک بند قبا نے ہمیں جکڑ دیا ہے۔ اطراف کے ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں کچھ لمحات درکار تھے ہم چونکہ مطالعے کی وجہ سے دورانِ پرواز دستی بیگ ہمراہ ہی رکھتے ہیں اس لیے اس میں سے کتاب ڈائری پین درآمد بھی کرنا ہوتا ہے۔ جب

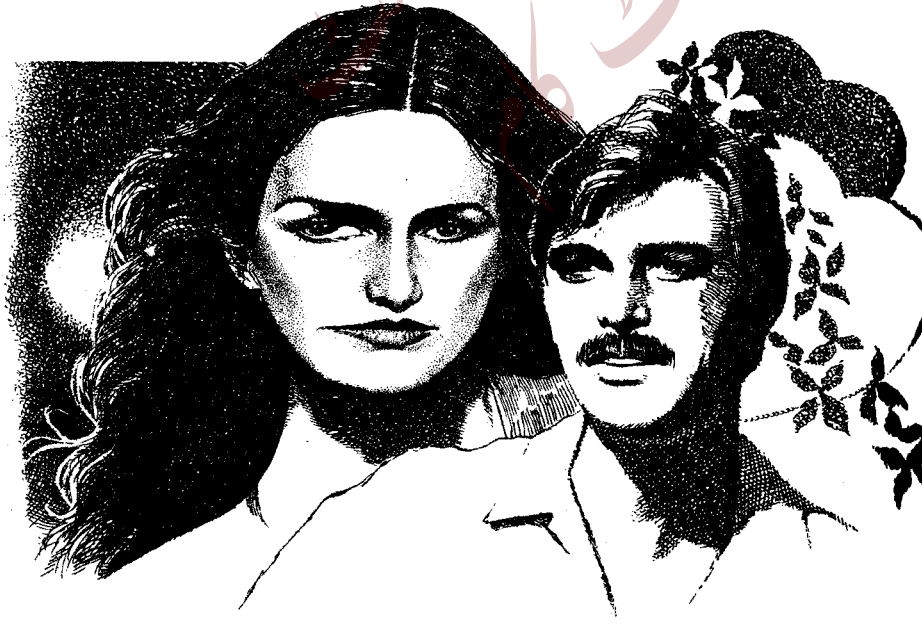

قدرے حواس بحال ہوئے تو طیارے کے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔ چاق و چوبند خوش رو اور خوش گلو، فضائی میزبان تتلیوں سی پورے جہاز میں اڑتی پھر رہی تھیں۔ کبھی کسی مسافر کے پاس کبھی دوسرے مسافر کی مدد کو لپکتی جھپکتی۔ خوب صورت و دل نواز ہونٹوں پر سجی مسکراہٹ (مصنوعی جوان کے پیشہ وارانہ تربیت کا حصہ ہے) ہر ایک سے خوش خلقی سے پیش آرہی تھیں۔ کبھی ہمیں ان کی بے بسی پر رحم آتا اور کبھی ان کی خوش قسمتی پر رشک کہ بلندیوں کو چھونے کے لیے پرعزم ہزاروں فٹ کی بلندی پر میزبانی کے فرائض بحسن وخوبی انجام دے رہی ہیں۔ ''نگر نگر پھرا مسافر'' کی جیتی جاگتی تصویر دنیا کو پر کھنے کے قدم قدم پر مواقع مل رہے ہیں لیکن شاید ان کو اس کی بھاری قیمت کی ادا کرنی پڑتی ہو گی۔ مصنوعی غازہ اور مسکارے سے آراستہ چہرہ، صراحی دار گردن جوڑے میں ان گنت پنوں، کلپر میں محصور، بلش اون کی چمک انہیں اور بھی طرح دار بنا رہی تھی۔ پلیز اور Thank you کا بے دریغ استعمال لبِ شیریں میں مٹھاس لیے یہ فضائی میزبان ہمیں ہمیشہ متاثر کرتی ہیں۔ بس اس کے لیے ایک فضائی سفر درکار ہے۔ اب طیارے میں قدرے خاموشی ہے لوگ نشستوں پر براجمان ہو چکے ہیں۔ اعلامیہ انگلش اور عربی میں جاری ہے۔ جب ہی ایک نوجوان رعنا کو ایئر ہوسٹس نے ہمارے برابر والی سیٹ پر لا بٹھایا۔ شاید یہ پہلے کسی غلط سیٹ پر بیٹھ گیا ہوگا۔ پھر ایک آوازِ دل پذیر ہماری توجہ کے آئینے میں بال ڈالتی ہے۔ ''ایکسکیوز می'' کہہ کر وہ قریبی نشست پر براجمان ہو گیا۔ ہم نے دزدیدہ نگاہوں سے جھانکا۔ اس سے لگا کہ کوٹ کے کالر پر لگی کلی جیسے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ اب ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر کے جیب سے ٹشو نکال کر پیشانی پر آئے موتیوں کو سمیٹ رہا تھا۔ میزبان پھر قریب آئی نوجوان سے قدرے جھک کر کچھ استفسار کیا اور اس نے جواب میں نفی میں سر ہلایا۔ اوہ یہ تو کوئی خاص بندہ ہے۔ سیدھا کسی محفل سے آیا ہے۔ ڈنر سوٹ، ٹائی، گلاب کی کلی بڑی پذیرائی ہو رہی ہے۔ اب فضائی عملہ چابکدستی سے سنہری بکس بند کر رہا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ ہمارے آس پاس مرد حضرات بلاوجہ ہی ایئر ہوسٹس کو زحمت دے رہے ہیں۔ پلیز بیلنکٹ، جوس پلیز، No Thanks اور نج اوہ سیون اپ، ٹی کافی اور یہ بے چاری بے بس مخلوق، یس سر، وائے ناٹ، مائی پلیژر، بھاگ بھاگ کر روبوٹ کی طرح حکم بجا لا رہی ہیں۔

اب طیارہ رن وے پر تیزی سے دوڑ رہا ہے۔ فضاؤں کو چیرتا بلند ہو گیا۔ ہم کیونکہ ونڈو پر تھے تو گھروندے سے گھر خیمہ زن نظر آئے پھر منظر بدلا سفید اور نیلے روئی کے گالے اڑتے پھریرے لیتے دوڑ رہے تھے، کبھی نیچے نیلگوں سمندر اور آسمان کی نیلی وسعتیں..... سبحان تیری قدرت۔ ''آسمان اور زمین کو انسانوں کے لیے مسخر کر دیا'' یوں تو قرآن نے نہیں کہہ دیا۔ بات دراصل کچھ یوں ہے کہ ہمارا ''پہلا تجربہ'' فضائی سفر ہے جس کی بڑی منتوں کے بعد اجازت ملی تھی بات ہی کچھ ایسی تھی کہ اماں انکار نہ کر سکیں۔ ہم ایک ایوارڈ کی تقریب اٹینڈ کر کے واپس دبئی آرہے ہیں۔ کچھ تو ایوارڈ پانے کی سرمستی اور کچھ وطن سے دوری کا ملا۔ یعنی ایک ملا جلا سا احساس جاگزیں تھا۔ بہت سے دوستوں کی محبتیں سمیٹ کر واپس لوٹ رہے تھے۔ اب ہم نے نوٹ بک نکالنا چاہی کہ تقریب پر تاثرات رقم کرنا ہے۔ ''اوہ نو'' یہ سب لوگ جانے اتنے بڑے ہینڈ بیگ سے اپنی مطلوبہ اشیاء کیسے برآمد کر لیتے ہیں۔ ہم تو گمشدہ چیزیں ڈھونڈتے ہی رہ جاتے ہیں۔ اف خدا! جانے نوٹ بک کس حصے میں روپوش ہوئی ہے۔ ہم نے سب کچھ الٹ پلٹ دیا۔ اسی جدوجہد میں ڈائری ہمارے قدموں میں جا پڑی اور جب ہم نے جھک کر اٹھانا چاہا تو ہمارے قریبی ساتھی نے مدد کی اور ہماری جانب ایک ہاتھ بڑھا، ہم نے تشکر آمیز نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک نوجوان تھا۔ خوبرو سا، دلکش نقوش، پڑھا لکھا، مہربان سا اس نے ہماری ڈائری کو الٹا پلٹا اور بہت محبت سے گویا ہوا، آپ کی گراں قدر انتہائی تھیں کائنات..... میں نے شکریہ کے ساتھ تھام لی۔

اب وہ بھی ایک کتاب نکال کر مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ ہم نے کن انکھیوں سے دیکھا اس کے زیرِ مطالعہ انگلش ناول تھی اوہ یہ تو ''کاملہ شمسی'' کی ''سالٹ اینڈ سیفرون'' پڑھ رہا ہے۔ آپ جانیں ہم احساسِ کمتری کی ماری قوم انگریزی پڑھنے اور بولنے والوں سے کتنا متاثر ہو جاتے ہیں۔ گو ہم نے ظاہر نہ کیا اور بڑے صبر کے ساتھ اپنی کتاب نکال کر مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔ شکر ہے فلائٹ بہت اسموتھ تھی۔ پرسکون ماحول میں اچانک ارتعاش سا پیدا ہوا۔

ہم نے گھبرا کر کتاب بند کر دی اور دل ہی دل میں دعائیں پڑھنے لگے۔ ایسی مگر یہ کیا۔ آپ لوگ یہ بات تو جانتے ہی ہیں کہ پاس بیٹھے شخص کی حرکات و سکنات آپ کی دسترس میں ہوتی ہیں یہ الگ بات کہ آپ ظاہر نہ کریں۔ یہ اس وقت کی ہلچل جب کہ لوگ ہیڈ فون لگائے فلم دیکھنے میں مصروف تھے۔ ماحول خواب آگیں تھا کچھ مسافر اونگھ رہے تھے۔ بڑی ناگوار لگی کہ اچانک ہماری نظر قریب بیٹھے ساتھی کے پیروں پر پڑی جو بڑی تیزی سے لرز رہا تھا۔ پینڈولم کی مانند پیر حرکت کر رہا تھا۔ اف ہم تو اس ارتعاش میں کتاب نہیں پڑھ سکتے یہ جانے کیسے نگاہیں جمائے پڑھ رہا ہے۔ ہم نے انتہائی کوفت کے عالم میں اپنی نگاہوں کے ارتکاز دوبارہ کتاب پر مذکور کرنا چاہا مگر الفاظ گڈمڈ ہو گئے۔ اس چابی سے چلنے والے کھلونے کی گردشِ دوراں نے ہمیں الجھن میں مبتلا کر دیا۔ اتنا مہذب اور شاندار جواں..... اور اتنی غیر مہذب حرکت۔ شاید یہ جہاز کے فلور کو ڈانس فلور تو نہیں سمجھ رہا ہے۔ مایوس ہو کر سامنے ڈائننگ بورڈ پر کتاب رکھ دی۔ وہ ڈیسک بھی لرزاں ہو گیا..... عجیب صورتِ حال تھی۔ ہم نے سوچا کچھ گڑبڑ ہے شاید اس کو ہماری مدد درکار ہے یا اس کو کوئی مسئلہ ہے۔ آخر ہم سے رہا نہ گیا۔ (وہ بھی تو مجھے حرفِ پریشاں سا لگے ہے)۔ کافی سوچ بچار کے بعد ہم نے کچھ کہنے کی ہمت کی۔ ''اوہ ینگ مین..... سب ٹھیک تو ہے نا All is well۔'' اس نے جواب میں بڑی مسکین صورت سے ہماری جانب دیکھا۔ ہمیں لگا کہ جیسے خفت سے اس کا رنگ سرخ پڑ گیا۔ بھولی صورت پر ترس آ گیا۔

ہم نے قدرے جھک کر اس کی جانب دیکھا۔ ہائیٹ فوبیا۔ جھجکتے ہوئے پوچھا۔ (دل میں سوچا اکثر لوگ لفٹ سے ڈر کر سیڑھیاں پھلانگتے ہیں) اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اوہ اچھا ہوائی سفر فرسٹ ٹائم؟'' ہم نے دوسرا سوال داغا۔

''اوہ نو۔'' اب کے چہرے پر اذیت کے جذبات نمایاں ہو گئے۔ ہم خجل سے ہو گئے۔

مگر پھر بھی ہم نے سفر کی مدد کی ٹھان لی۔ آخر ایم اے نفسیات کب کام آئے گی۔ تحلیلِ نفسی کے اندازہ اس مسافر سے کونسلنگ کر کے ہی کیا جا سکتا ہے۔ کیا یہ اضطرابی کیفیت ہمیشہ کسی سفر کی باعث ہی ہوتی ہے۔ اب ہم نے بڑے سنبھل کر سوال کیا۔ (دل میں سوچا کیا خبر محبوب کی دائی) ارتعاش بدستور برقرار ہم جو قیافہ شناسائی میں بڑا معتبر سمجھ رہے تھے بالکل ہی فیل ہوتے نظر آئے۔

اب وہ جوان کچھ پشیماں سا ٹھہر ٹھہر کر بات کرنے کے قابل ہوا۔ ''محترمہ یہ ہمیشہ نہیں ہوتا..... بس یوں ہی ایک وقتی کیفیت ہوتی ہے۔ بے چینی محسوس ہونے پر کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے غیر اختیاری طور پر.....''

''اوہ..... آئی نو۔'' ہم کو مذاق سوجھا اور آٹومیٹک چلتی مشین پر انگلی سے اشارہ کیا۔

''مطلب خود بخود کیا آپ بزرگوں کے اس مقولے پر کاربند ہیں کہ ''حرکت میں برکت'' ہے۔

اس کو ہمارا یہ تمسخر شاید ناگوار گزرا۔ اس نے حد درجہ لاپروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گردن دوسری طرف موڑ لی۔ جیسے وہ ہمیں نظر انداز کر رہا ہے۔ پیر اسی تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔

ہم بھی اس کیس سے مایوس ہو کر بیگ میں سامان رکھ کر سمیٹنے لگے۔ وہ اچانک مڑا اور ہماری ذات کے حوالے سے سوال کر دیا۔ ''آپ رائٹر ہیں؟'' ہم نے بھی فوراً جواب دیا۔

''جی جواب درست ہوا۔ مگر آپ تو انگریزی ادب کے دلدادہ ہیں۔'' ہم نے ہاتھ میں تھامی کتاب کی طرف اشارہ کیا۔

''اوہ یہ بات ہے۔ میں نے انگلش ادب میں ایم اے کیا ہے اور دوسرے بہت سے اہلِ ادب کی طرح اردو ادب کا شیدائی ہوں۔ اب آپ دو سو اور ہی کیوں جائیے پروین شاکر کو ہی دیکھئے ان کی طرح کی شاعری نہیں کر سکتا مگر..... ان جیسے ادب نواز لوگوں کو پڑھا اور سن تو سکتا ہوں۔'' اس نے ہلتے وجود کے ساتھ اپنی گفتگو جاری رکھی۔

اب ہماری بھی سماعتیں بیدار ہو گئی تھیں مگر یہ کیا جب گفتگو کا آغاز ہو گیا تو اب دیر ہو چکی تھی کیونکہ جہاز اب نیچے کی طرف جا رہا تھا یعنی یہ مختصر سا سفر اختتام پذیر ہونے کو ہے۔ جہاز کو اب لینڈ ہونے میں زیادہ دیر نہیں اور ہم یہ مسٹری ابھی تک حل نہ کر سکے۔ ہم نے جھنجلا کر کھڑکی سے دیکھا۔ نیلگوں پانی پر بہتے بجرے بجرے ہلکولے لے رہے تھے۔ لمحے میں طیارہ رن وے پر دوڑ رہا تھا۔ یعنی سفر ختم اور ساتھ

ہی ہمارا اضطراب شروع۔

''سنیے محترمہ اگر آپ کو سیٹ سے اٹھنے میں مشکل ہے تو ہم آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔'' اس نے بے خودی کے سے انداز میں ہماری طرف دیکھا۔ جانے اس خواب آگیا نگاہوں میں کیا بات تھی کہ ہم لرز کر رہ گئے۔ اب اس نے اپنا بیگ سنبھالا۔ وہ کچھ دیر خاموشی کی چادر اوڑھے جہاز کے دروازے کھلنے کا انتظار کرتا رہا۔ اب وہ نامعلوم مسافر جھک کر ہمیں وش کرتا ہے۔

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ میں رابطے کی کوشش کروں گا۔ شاید پھر کبھی زندگی کے سفر میں مل جائیں۔'' اور یہ کہہ کر بھیڑ میں گم ہو گیا۔

ہم نے اس کا نام پتا پوچھا بھی نہیں اور اس نے بتایا بھی نہیں۔ ہمارا جواب سنے بغیر لوگ لائن میں آگے بڑھنے لگے۔ اب ہمیں ہوش آیا کہ جلدی سے اپنا سامان اوپر سے اتارنے بڑھے کہ اس ہڑبونگ میں ہمارا ہینڈ کیری ہمارے سر پر آن پڑا۔ پیچھے آنے والے لوگ ہماری مدد کو لپکے پہلے ہمیں سیٹ پر بٹھایا گیا۔ اب فضائی عملہ بھی مدد کو لپکا۔ سر کا مساج کیا۔ سامان خود لے کر ہمیں دروازے تک رخصت کیا۔ اب ہم تو اپنی تکلیف بھول کر اجنبی مسافر کی تلاش میں تھے۔ امیگریشن لاؤنج سے لے کر بیلٹ تک وہ ہمیں نظر نہ آیا۔ جانے وہ کس اعصابی یا نفسیاتی بیماری کا شکار تھا۔ بھلا بتایئے خود بخود ارتعاش پیدا ہو جانا..... یہ انوکھا کیس تھا..... یہ خلش ہمیں دھیرے ایئرپورٹ سے باہر لے آئی۔ والدین کی محبت نے اپنے حصار میں لے لیا۔ احباب ایوارڈ کی خوشی میں ٹریٹ مانگ رہے تھے مگر ہمیں اس وقت کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔

ہم اپنے والدین کے ساتھ عرصہ تین سال سے دبئی میں مقیم ہیں۔ ابا ایک کمپنی میں کام کرتے ہیں اور ہم ایک اسکول میں ٹیچنگ کرتے ہیں۔ اماں ابا کا ادبی ذوق ہم میں بھی سرائیت کر گیا ہے سو ہلکی پھلکی کہانیاں ذوق کی تکمیل کے لیے لکھتے رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں بہترین افسانے پر ایوارڈ حاصل کیا تو ضد کر کے کراچی جانے کی اجازت ملی اور واپسی پر ایسے پراسرار مسافر سے جانکاری ہوئی۔ جانے اس اجنبی راہی کی آنکھوں میں کیا تھا کہ ہم کسی طرح بھی بھول نہیں پا رہے۔ ہمیں یاد آیا کہ نانی امی بتاتی تھیں کہ حضرت بہزاد لکھنوی جب مشاعرہ پڑھتے تھے جو جانے کیوں ان کا ایک ہاتھ تیزی سے حرکت کرنے لگتا تھا۔ نتیجتاً ڈاکٹر نے ان کے گلے میں ایک پٹکا سا لٹکا دیا تھا جس کی وجہ سے ہاتھ قابو میں رہتا۔ شاید اس طرح کا کوئی مرض یا پارکنس.....اوہ نہیں رعشہ..... وہ تو پورے جسم کو لرزاں رکھتا ہے۔ اُفوہ پھر یہ کیا ہے۔ ہمارے جاننے والوں میں ایک بزرگ خاتون تھیں جن کا منہ بروقت حرکت (جبڑا) کرتا رہتا تھا۔ وہ منہ میں سائٹ پر کاٹن (روئی) رکھتی تھیں کہ زبان مضروب نہ ہو۔ چلیں مان لیں اس وقت میڈیکل سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ اب تو ہر مرض کا علاج موجود ہے۔ اچھا پڑھا لکھا جوان علاج کیوں نہیں کرتا۔ جب ہم نے اپنی پریشانی کا اظہار امی سے کیا تو امی نے ایک منٹ میں مسئلہ حل کر دیا اور ہمارے سارے مفروضے دھرے رہ گئے۔

''اس کی یہ عادت ہو گی۔ بعض لوگ بے کاری میں اس طرح کی حرکتیں کرتے ہیں۔ کوئی انگلیاں موڑنے لگتا ہے، کوئی بال کی لٹ کو گھماتا رہتا ہے۔ بعض لوگ ناخن چبانے لگتے ہیں۔ اس کی بھی یہ عادت بد ہو گی اگر کوئی بڑا اس کو سمجھاتا تو شاید یہ عادت ختم ہو جاتی۔ اب تم پریشان ہونا چھوڑ دو۔''

امی تو آرام سے اپنی بات کہہ کر اپنے کاموں میں مصروف ہو گئیں مگر ہماری سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتی ہے جب بھی ہم رات کو تنہائی میں خواب گاہ میں ہوتے تو وہ دو حیراں اور بے بس آنکھیں ہمارا پیچھا کرتی۔ کبھی ہم اٹھ کر الماری کھولنے اپنی ڈائری نکال لیتے کہ مصروف ہو جائیں۔ احساس بھی ہوتا کہ ایک عام سا سفر اور چند گھنٹے کا ساتھی مسافر کیوں بار بار خیالوں میں آ دھمکتا ہے۔ کچھ لکھنا چاہیں تو وہ نگاہیں اپنے گھیرے میں لے لیں۔ اف ہمیں تو ٹائی ٹینک فلم یاد آنے لگی۔ بے زار ہو کر کچھ لکھنے کا ارادہ کیا اور اچانک ہی ڈائری سے ایک پرچہ نیچے آ پڑا۔

''محترمہ لائق احترام اسمارہ حزیں صاحبہ! میں آپ کا فین ہوں۔ ایک نادیدہ فین۔ مگر آپ کو اتنے قریب اچانک دیکھ کر میری جو کیفیت ہوئی وہ آپ نے دیکھی۔ اپنی محبوب شخصیت جس کی مجھے تلاش بھی ہو۔ ساتھ ساتھ دیکھوں تو مجھ پر گھبراہٹ میں ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ آپ سے معذرت میری وجہ سے آپ ڈسٹرب ہوئیں۔ یہ حسین سفر

لمری زندگی کا متاع عزیز ہے۔''

ہم نے جلدی سے ڈائری الٹ دی اور سرپوش دیکھا۔ اس پر بڑا بڑا جلی حروف میں لکھا تھا۔ اسارہ حزیں۔''

ہم نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ارے میرے خدا یہ نادانستگی میں کیا ہو گیا۔

دراصل ایوارڈ کی تقریب میں ہم سب رائٹر ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ جب ہم رخصت ہوئے تو اپنا بیگ سامان سمیٹ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ بے خیالی میں یا غلطی سے اسارہ کی ڈائری ہمارے ساتھ آ گئی اس اجنبی مسافر نے جب ہماری ڈائری اٹھائی تو نام دیکھ کر ہمیں اسارہ سمجھ بیٹھا۔ اسارہ ہمارے ملک کی نامور لکھاری ہیں۔ آج کل ٹی وی پر بہت پاپولر ہیں۔ یہ ایک باپردہ خاتون ہیں۔ اس لیے لوگ چہرہ شناس نہیں۔ ٹی وی کی دنیا کا ایک چمکتا تارہ ہے۔ لاتعداد افسانوں اور ان گنت ناولوں کی مایہ ناز خالق.....! جن کا نام ہی کامیابی کا ضامن ہے۔ ان کا نام دیکھ کر لوگ حلقہ کیے بیٹھ جاتے ہیں۔ ٹی وی کے گرد یہ ایک معزز اور پروقار خاتون ہیں اور ہم ایک عام سے لکھاری جو اپنے ذوق کی تسکین کی خاطر کچھ چھوٹی موٹی سی تحریر لکھ لیتے ہیں۔ اف یہ کیا ہو گیا۔ اب کیسے رابطہ ہو کہ ہم وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو ہم تو نورین عنبر ہیں۔

حیراں ہیں لب بستہ ہیں دل گیر ہیں غنچے۔ ہمارا ذہن حال سے نکل کر ماضی میں گھوم گیا۔ سردیوں کی دھوپ ڈھل رہی تھی۔ فضا میں خنکی در آئی تھی۔ ملگجے اندھیرے رواں تھے سائے لمبے ہو چکے تھے۔ اس اجنبی مسافر کی اضطرابی کیفیت..... جب ہی فون کی بجتی گھنٹی واپس حال میں لے آئی۔ ہمارے نیم غنودگی ذہن نے لگام دی۔ دوسری طرف ایک پہچان کچھ شناسا سی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

''محترمہ! جی آپ کون؟'' ہم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''آپ کا ہمسفر۔''

''جی..... آپ..... کون سوری رونگ نمبر..... ہم فون واپس.....''

''پلیز میری بات تو سن لیں۔ میں آپ کا بے چین ساتھی..... طیارے کا گمنام مسافر ہوں۔ ہم نے آپ کو پالیا نورین صاحبہ۔ اب ہم سے چھپ کے کہاں جائیں گی جناب۔ اسارہ صاحبہ سے میری بات ہو گئی ہے اور ساری غلط فہمی دور ہو گئی۔ انہوں نے آپ کا رابطہ نمبر دیا اور اپنی گمشدہ ڈائری کا بھی مطالبہ کیا۔ تو آپ ذرا اپنا گھر کا راستہ بتائیں گی۔ ہم حاضر ہو جاتے ہیں۔ آپ کے ساتھ بیتے پر کیف لمحات کی ساتھی۔ نورین آپ ہی حسینہ نازنین ہیں۔ اسارہ تو صرف ایک پسندیدہ فیورٹ رائٹر ہیں مگر جن کے ساتھ جیا جائے وہ صرف اور صرف آپ ہیں۔ میں گنگ سی ہاتھ میں ریسیور لیے کھڑی اس اچانک ظہور پذیر ہونے والی سچویشن کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اُدھر سے پھر ہمیں پکارا نورین آپ کچھ کہتی کیوں نہیں، میں ملنا چاہتا ہوں۔ آپ کی یہ ادائے بے نیازی کسی کی جان بھی لے سکتی ہے۔ بولیں پلیز لوکیشن بتائیں۔ دبئی کراچی کی طرح آبادی کا جنگل نہیں ہم ڈھونڈ لیں گے۔''

اب ہم سے رہا نہ گیا۔ ''پلیز محترم! آپ ہرگز ایسا نہیں کریں گے۔ اسارہ کے یہاں قیامت نہیں آئی مگر یہاں آ سکتی ہے۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب ہمارے پاس کچھ بچا نہیں۔ (ہونٹ خاموش رہے آنکھ نے بارش نہیں کی)۔

''ہیلو..... نورین..... آپ مجھے سن رہی ہیں۔'' بہت دل گرفتہ سی آواز نے دوبارہ رابطہ کیا۔

''وہ دراصل میں کسی کے نام سے منسوب ہوں۔ میرا نکاح ہو چکا ہے۔ امی نے کل ہی تو رخصتی کی تاریخ دی ہے سسرال والوں کو لیکن آپ اپنا علاج ضرور کرائیں آئندہ زندگی میں اس طرح کی چیز اس سے بھی بڑا نقصان کر سکتی ہے۔''

اور پھر فون بند ہو گیا یا لائن کٹ گئی۔

اے سادہ دل، سادہ رخ و سادہ جمال، کوئی اس طرح بھی محبت کرتا ہے اور ہم نے دل گرفتہ ہو کر فون کو کریڈل پر دھر دیا۔ ایک آنسو پلکوں پر لرزتا رہ گیا۔ راکھ میں چھپی چنگاری آنے والی کال نے فاسفورس کی طرح بھڑکنے پر آمادہ نظر آئی مگر دل حزیں نے ایسا کرنے سے روک دیا۔

اے مرے ہم نفس میرے گمنام ہمراہی! اپنی ٹائی نیٹک محبت کے ساتھ غرق آب ہو جا اور کبھی خیال اور کبھی خواب پر گزارا کر۔ یہ نہیں بتائیں گے دونوں میں سے کس کو کیا کرنا ہو گا۔ ہمیں..... یا تمہیں..... اور میں نے بھیگی آنکھوں کو وقت کے دریا میں بہا دیا!

☆ ☆ ☆

محبت اور فرض

بابر نایاب

اُس نوجوان کی یادگار کتھا، جس نے فرض اور محبت کو نبھا کر مثال قائم کردی

''شرمین میری بات سنو فون بند مت کرنا۔''

''تم سب مرد ایک جیسے ہوتے ہو۔'' دوسری طرف روتی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''پلیز اب میں تمہیں کیسے بتاؤں اُس لڑکی کے ساتھ بیٹھنا میری مجبوری تھی۔'' مجھے اپنی ہی آواز کھوکھلی محسوس ہو رہی تھی۔

''افسوس جو تم پر اعتماد کیا، تم نے میرے بھروسے کا خون کیا ہے۔ اب کبھی بھی مجھے دوبارہ فون مت کرنا آج سے میں اور تم ایک دوسرے کے لیے مر گئے ہو۔''

یہ آخری لفظ تھے دوسری طرف سے لائن منقطع ہوگئی۔

میں ریستوران میں بیٹھا سیل فون سے شرمین کی فوٹو نکال کر دیکھنے لگ گیا یہ غالباً شرمین کی کالج لائف کی تصویر تھی جس میں وہ بے حد دلکش نظر آرہی تھی شاید وہ اپنی کسی کلاس فیلو کی بات سن کر ہنسی تھی اور اُس کے خوبصورت مسکراتے ہوئے چہرے کی تصویر کو کیمرے کی آنکھ نے محفوظ کرلیا۔

شرمین کی دودھ جیسی سفید رنگت میں بناوٹ کا شبہ تک نہ تھا۔ شرمین کسی پری کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر سیل فون کو اپنی پاکٹ میں ڈالا۔ رات کافی ہو چکی تھی اور میری شفٹ کا ٹائم بھی ختم ہو چکا تھا۔ میں سیدھا منیجر کی طرف گیا اور رخصت ہونے کی اجازت طلب کی۔ منیجر مخدوم صاحب کیشیر سے آج ہونے والی بچت کے متعلق استفسار کر رہا تھا۔ منیجر نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''انور کل زرا جلدی آجانا کیونکہ جنید بھی چھٹی پر ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور ریستوران سے باہر نکل آیا، سرد ہوا کا ایک تیز جھونکا میرے جسم سے ٹکرایا تو میں نے جیکٹ کی زپ بند کرلی اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا اسٹاپ پر پہنچا۔ اتنی رات کو کسی بس کا آنا مشکل لگ رہا تھا میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سگریٹ کے کش لیتا اپنے دل کو بہلانے لگا۔ کہیں دور سے ایک موٹر بائک کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

جب موٹر بائک والا قریب آیا تو میں نے موقعہ غنیمت جان کر اُسے لفٹ کا اشارہ کیا۔ [illegible] لف تو قع موٹر بائک والے نے موٹر بائک روک لی میں [illegible] قریب جا کر کہا۔

''جناب ماڈل ٹاؤن کی طرف [illegible] جانا ہے اگر آپ وہیں جا رہے ہیں تو مجھے بھی ساتھ میں [illegible] جائیے۔'' موٹر بائک والے نے چہرے پر ہیلمٹ لیا [illegible] تھا اسی وجہ سے اُس کا

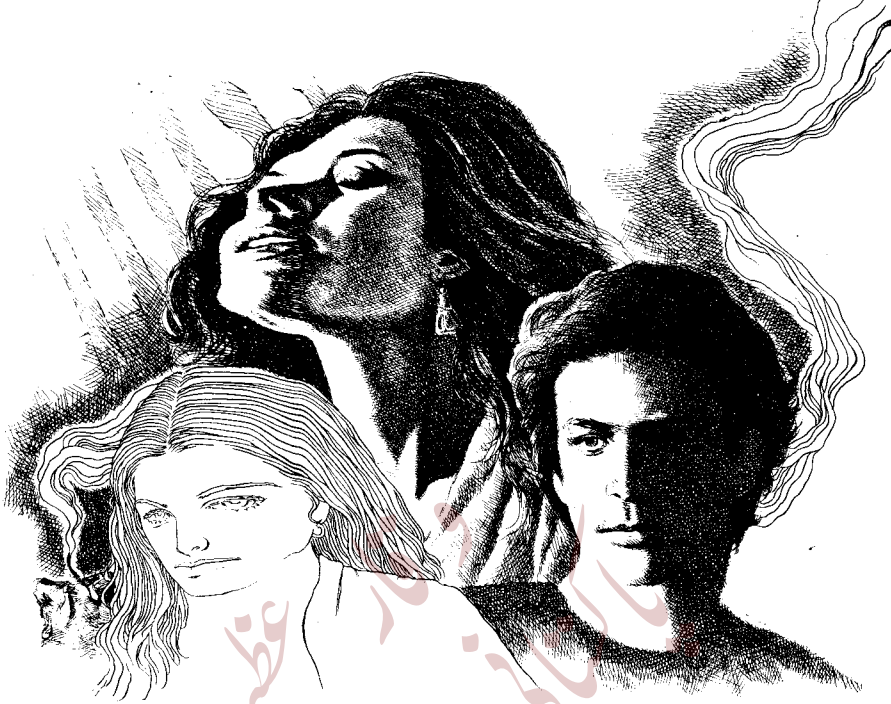

چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُس نے کہا بیٹھ جاؤ میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔'' میں نے تشکر بھری نظروں سے اُسے دیکھا اور اُس کے پیچھے بائک پر بیٹھ گیا۔ وہ درمیانی رفتار کے ساتھ بائک کو چلانے لگ گیا۔

''کیا کرتے ہو میاں۔'' اُس نے پوچھا۔

''بس جناب کیا کرنا ایک ریسٹورنٹ میں جاب کرتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا، کیا جاب کرتے ہو۔'' اُس نے دوبارہ پوچھا، میں نے ذرا ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

''میں ویٹر ہوں۔'' پھر دوسری طرف خاموشی چھا گئی رات کا سکوت بھی بڑھتا جا رہا تھا اچانک ایک نیم تاریک سڑک پر اُس نے بائک روک دی اور کہا۔

''اگر تم جھوٹ بول رہے ہو تو مجھے جھوٹ سننا پسند نہیں۔ کیونکہ مجھے نہیں لگتا کہ تم ایک ویٹر ہو۔'' میں اُس کی بات سن کر ایکدم خاموش ہو گیا۔

''دیکھو برخوردار میں نے ایک زندگی گزاری ہے یا تو تم بہت بڑے جھوٹے ہو یا بہت بڑے سچے ایک بات تو ہے۔'' اُس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ میں بائک سے اُتر گیا اور اُسے کہا۔

''جناب آپ کی مہربانی جو آپ نے مجھے یہاں تک لفٹ دی اور جہاں تک بات سچ یا جھوٹ کی ہے تو ضروری نہیں کہ میں آپ کو یقین دلاؤں کیونکہ آپ میرے لیے اجنبی ہیں۔'' یہ کہہ کر میں نے پیدل چلنا شروع کر دیا میں نے ابھی چند ہی قدموں کا فاصلہ طے کیا تھا کہ بائک والا میرے پیچھے آ گیا اور کہا۔

''چلو بیٹھ جاؤ یار اتنی رات کو کہاں بھٹکتے پھرو گے تم سے جو میں نے عہد کیا ہے تمہیں تمہاری منزل پر چھوڑنے کا وہ تو پورا کرنا پڑے گا۔'' میں چپ چاپ اُس کے پیچھے دوبارہ بیٹھ گیا اور بائک چل پڑی اسی دوران اُس نے کہا۔

''یار معاف کرنا مجھے کوئی حق نہیں اس طرح تمہارے جھوٹ اور سچ کو پرکھنا شروع کروں مگر بات کچھ یوں ہے کہ میں ایک پولیس والا ہوں اور ساری زندگی پولیس میں گزاری اور اب ڈی، ایس، پی کے رینک پر پہنچا ہوں۔ ہمارا کام ہی کچھ ایسا ہے کہ لوگوں پہ یقین بہت کم

کرتے ہیں اور شک زیادہ۔ بڑے عرصے بعد میرا دل کیا کہ بائک پر تھوڑا گھوموں پھروں تو آج اپنے بیٹے شہریار کی بائک اُٹھا کر مٹر گشت شروع کر دیا۔'' یہ کہہ کر وہ قہقہہ مار کر ہنسا، میں نے اندازہ لگایا کہ پولیس میں رہنے کے باوجود وہ بڑا زندہ دل تھا مجھے بھی اُس کی ہنسی میں شامل ہونا پڑا۔ اسی دوران میری منزل آ گئی اُس نے بائک روک دی اور سر سے ہیلمٹ اُتار دیا اُس کا چہرہ کافی بارُعب لگ رہا تھا گورا رنگ اور چہرے کی مناسبت سے باریک مونچھیں اور آنکھوں کا رنگ بہت سیاہ تھا اُس کی آنکھیں مجھے جانی پہچانی سی لگ رہی تھی شاید میں نے ان آنکھوں کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہو۔ کنپٹیوں پر سفید بال یعنی وہ ڈھلتی عمر کی طرف جا رہا تھا مگر جسمانی طور پر کافی مضبوط لگ رہا تھا، اُس نے اپنی سامنے والی جیب سے ایک کارڈ نکالا اور میرے ہاتھ میں دے کر کہا۔ ''برخوردار جب بھی میری ضرورت پڑے تو یاد کر لینا میں تمہارے لیے ایک پولیس والا نہیں بلکہ تمہارا انکل ہوں۔ مجھے تمہاری سچائی نے بہت متاثر کیا ہے۔ اچھا میاں خدا حافظ۔'' یہ کہہ کر وہ بائک سٹارٹ کر کے چلا گیا اور میں نے ایک نظر اُس کے کارڈ پر ڈالی جس پر لکھا ہوا تھا، ڈی ایس پی فراز خاں اور نیچے اُس کا ایڈریس اور کانٹیکٹ نمبر لکھا ہوا تھا میں نے کارڈ کو جیب میں ڈالا اور چلتا ہوا ایک اونچی سی بلڈنگ کے پاس پہنچ کر سیڑھیوں کے رستے چلتا تیسری منزل پر پہنچ گیا اور ایک کمرے کے قریب رک کر جیکٹ کی جیب سے کمرے کی چابی نکالی اور کمرے کے لاک کو کھول کر اندر داخل ہو گیا، لائٹ جلائی کمرا بے ترتیبی سے پڑا تھا کھانے پینے کی برتن ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ میں بوٹ اور کسے اُتار کر بیڈ پر نیم دراز ہو گیا اور ہولے سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

اماں کا چہرہ پھر میری آنکھوں کے سامنے آ گیا اماں کی نحیف سے آواز میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔

''پتر ماں کی زبان کی لاج رکھنا تیرے مامے کی دھی کا کوئی آسرا نہیں۔ اُسے بے آسرا نہ ہونے دینا۔'' اماں کے کپکپاتے ہاتھ میرے ہاتھ میں تھے، اماں پھر بولی۔

''تو شہر میں کام کرتا ہے نا کیا پتا تجھے گاؤں کی لڑکی پسند نہ آئے پر تیرے مامے نے بڑا اسہارا دیا تھا تیرے ابا کے گزر جانے کے بعد۔ اب تیرا ماما اس دنیا سے چلا گیا ہے تو اب اُس کی دھی کو ہمارے سوا کون سہارا دے گا۔ میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں وعدہ کر مجھ سے میرا بھروسہ تو نہیں توڑے گا۔''

''ہاں اماں تیرا پتر تیرا بھروسہ کیسے توڑ سکتا ہے اماں تو جو کہے گی۔'' ویسا ہی ہوگا میں نے تڑپ کر جواب دیا۔ اماں نے مجھے گلے لگا لیا اور پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی میں اُٹھ کر بیٹھ گیا اور خود میں ہی بڑبڑا رہا تھا میں نے زور سے ایک چیخ ماری ''اماں'' اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گیا اب کون ہے جو مجھے چپ کرائے گا۔ اماں نے تو اُس وقت ہی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کر لی تھیں جب آخری بار اُس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا وہ تو شاید وہ وعدہ لینے کے لیے ہی سانسیں لے رہی تھی۔ میں نے بیڈ سے نیچے اُتر کر پانی پیا۔

میری آنکھیں دُکھ رہی تھیں نا جانے میں کتنی دیر سے روتا رہا تھا، اماں سے جب بھی میری فون پر بات ہوتی تو وہ کہتی۔

''پتر مجھے تیرے پیسے نہیں چاہیے تو بس مجھ سے ملنے آ جایا کر تجھے دیکھ کر ہی تو میں جیتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اماں میرا دل تو کرتا ہے ہمیشہ ہمیشہ تیرے ساتھ رہوں پر تجھے تو پتا ہے وہاں گاؤں میں نہ ہماری زمین ہے نہ ہی کوئی کام ہے وہاں۔ میں تجھے اپنے ساتھ شہر رکھنا چاہتا ہوں پر تو مانتی ہی نہیں اب کیا رکھا ہے۔ وہاں کون ہے وہاں اماں جو تو یہاں نہیں آتی۔'' تب اماں خاموش ہو جاتی اور پھر کہتی۔

''انور پتر میرا سب کچھ یہاں ہے اب کون سی اتنی زندگی رہ گئی ہے جو وہاں شہر آ جاؤں سب ہی چلے گئے ہیں بس تیری اماں ہی رہ گئی ہے، میں تڑپ کر بولا۔

''اماں تو ایسی باتیں نہ کیا کر میں کام چھوڑ کر پکا پکا تیرے پاس آ جاتا ہوں۔'' تب اماں بولی۔

''نہ پتر نہ تو دل لگا کر کام کر پھر تیرا بیاہ بھی تو کرنا ہے۔''

اماں نے زندگی میں مجھ سے کچھ نہیں مانگا جاتے جاتے میرا دل ہی مانگ لیا۔ پر میرا دل کیا میری زندگی میری جان میرا خون سب اماں کا ہی تو ہے پر اب اماں نہیں ہے، یہ سوچ کر پھر مجھے رونا آ گیا۔ نہ جانے کب فجر کی اذان سنائی دی میرا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا

میں واش روم گیا چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے آنکھیں سرخ سرخ اور سوج چکی تھیں، چہرے پر ہلکی ہلکی شیو آ چکی تھی مجھے یاد آ رہا تھا کہ میں جب چھوٹا تھا تب اماں میری اُنگلی پکڑ کر چاچا خیر دین کی پرچون کی دکان پر جاتی پھر اُسے کہتی میرے پٹھان پتر کو چیز دے دو تب چاچا خیر دین مجھے ٹافیاں دیتا میں بہت خوش ہو جاتا تب وہ اماں کو کہتا، باجی فاطمہ تیرا انور پتر تو سچ مچ ہی پٹھان ہے۔ میٹرک تک مشکل سے پڑھا پھر گھر کی تنگدستی کو دیکھ کر شہر میں کام کرنے نکل کھڑا ہوا اتفاقاً وہاں میری میرے گاؤں کے ایک دوست سے ملاقات ہوگئی جس نے مجھے شہر کے ایک پوش ریسٹورنٹ میں ویٹر کی جاب دلوا دی۔

میں نے وضو کیا اور پھر فجر کی نماز ادا کرنے مسجد چلا گیا دعا کرتے وقت پھر اماں کی بڑی یاد آئی اور تب پھر میری آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے مجھ سے دعا نہیں مانگی گئی بمشکل اللہ پاک سے اپنی والدہ کی مغفرت کی دعا کی اور آمین کہا پھر مسجد سے باہر آ گیا۔ صبح کا اُجالا ہر سو پھیل چکا تھا میری زندگی ابھی تک اندھیری ہی تھی راستے میں ایک بیکری سے بریڈ لی اور کمرے میں واپس آ کر ہلکا پھلکا ناشتا کر کے ریسٹورنٹ کی طرف روانہ ہو گیا، ریسٹورنٹ پہنچ کر منیجر کو سلام کیا اور پھر واش روم جا کر ویٹر کا مخصوص ڈریس پہنا اور اپنے کام پر لگ گیا لوگ آ رہے تھے اور جا رہے تھے میں کھانا سرو کر رہا تھا کچھ لوگوں کو دیکھ کر میں سوچتا کیا لوگ واقعی اتنے خوش ہیں جتنے وہ نظر آ رہے ہیں کیا صرف پیسہ ہی خوشی دیتا ہے میرا دل بہت اُداس تھا۔ شام کو بریک ہوئی تو منیجر نے بلا لیا اور کہا۔

"انور جب تم دن میں کام کر رہے تھے ایک لڑکی یہاں آئی اور یہ پیکٹ دے گئی ہے۔" میں نے منیجر سے پیکٹ لے لیا منیجر ایک اچھا انسان تھا وہ مجھ سے میرے پرسنل معاملات کے متعلق نہیں پوچھتا تھا۔ میں پیکٹ لے کر ایک علیحدہ سے بنے روم میں آ گیا جو کہ صرف ریسٹورنٹ کے اسٹاف کے لیے مخصوص تھا وہاں آ کر پیکٹ کو کھولا، یہ شرمین کے ساتھ کھینچے ہوئے کچھ فوٹوز، ایک پرفیوم ایک چھوٹا سا تاج محل اور گولڈن کلر کا پین تھا جو میں نے شرمین کو گفٹ کیا تھا ساتھ میں ایک لیٹر تھا میں نے لیٹر کو کھول کر پڑھا جس پر لکھا ہوا تھا۔

انور! میں تمہیں بھولنا چاہتی ہوں اور تمہارے ساتھ جڑی ہر ایک چیز کو اپنی زندگی سے نکالنا چاہتی ہوں۔"

بس اتنا ہی لکھا تھا شرمین نے۔ میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور شرمین کا نمبر ڈائل کرنے لگ گیا مگر دوسری طرف سے پاور آف جا رہا تھا میرے پاس شرمین کا ایڈریس بھی نہیں تھا میں شرمین کو بتانا چاہتا تھا کہ میں زبیدہ کے ساتھ کیوں بیٹھا تھا کیوں میں نے شرمین سے اتنا عرصہ رابطہ نہیں کیا۔ کیوں میں نے اتنا عرصہ شرمین کی کوئی کال نہیں سنی کسی میسج کا کوئی ریپلائی نہیں کیا۔ یہ سارے سوالات کے جوابات میں اُسے بتانا چاہتا تھا مگر وہ شاید کچھ بھی نہیں سننا چاہتی تھی۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ اس وقت وہ کتنی تکلیف میں ہے مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ میں اُس سے زیادہ تکلیف میں ہوں۔

☆.....☆

یہ میری ویٹر کی جاب کے ابتدائی دن تھے جب شرمین اپنی کلاس فیلوز کے ساتھ ہمارے ریسٹورنٹ میں آئی تھی شرمین سب سے منفرد نظر آ رہی تھی وہ تھی ہی اتنی خوبصورت کہ کسی کی نظر بھی اُس پر ٹھہر سکتی تھی۔ اُس کا یوں بات بات پہ کھلکھلا کر ہنس پڑنا اور آنکھوں میں ایک عجیب سے چمک کا آ جانا گویا وہ حسن کے تمام تقاضوں پر پورا اُتر رہی تھی۔ میں نے شرمین کی ٹیبل پر جا کر مینو پوچھا تو شرمین نے مجھے دیکھا شاید وہ ایک ایسا لمحہ تھا جب میری اور اُس کی آنکھوں کا ایک عجیب سا ٹکراؤ ہوا، شرمین نے بڑے ہی خوبصورت انداز میں کہا، تم ویٹر ہو، میں نے جواب دیا، جی میم، اچھا کمال ہے۔ شرمین کے اس طرح کہتے ہوئے اُس کی ساری کلاس فیلوز نے مجھے دیکھنا شروع کر دیا۔ پھر شرمین گاہے بگاہے ریسٹورنٹ میں آتی رہی اور ہم دونوں کی نگاہیں بھی آپس میں ٹکراتی رہی۔

یہ ایک شام کی بات ہے جب ریسٹورنٹ میں بہت رش تھا میں بھاگ بھاگ کر کھانا سرو کر رہا تھا کہیں انجانے میں جگ کا پانی کسی خاتون کے پاؤں پر گر گیا پھر گویا اُس خاتون اور اُس کے میاں نے طوفان سر پر اُٹھا لیا اور میں سوری سوری کرتا گیا مگر انھوں نے شاید مجھے ذلیل کرنے کی قسم اُٹھا رکھی تھی مجھے اتنی باتیں سنائیں۔ اتنا بے عزت کیا مجھے اپنی اس تذلیل پر کوئی دکھ نہ تھا میں اپنا مقام جانتا تھا

اُس وقت منیجر موجود نہ تھا۔

اتنے میں ایک ٹیبل سے شرمین اُٹھ کر آئی اور اُس خاتون کو آڑے ہاتھوں لیا اور اُسے کہا، اگر غلطی سے پانی آپ پر گر گیا اور وہ بیچارہ معافی بھی مانگ رہا تھا تو آپ کو چاہیے اُسے معاف کر دیں پانی ہی گرا ہے کوئی تیزاب نہیں گر گیا اور خاتون اور اس کے میاں کی شرمین نے بولتی بند کرادی میں تشکر بھری نظروں سے شرمین کو دیکھنے لگا اور بعد میں اُسے شکریہ ادا بھی کیا، تب شرمین نے کہا، کوئی بات نہیں تم مجھے ایک اچھے انسان لگتے ہو اسی لیے میں نے ایسا کیا ۔شرمین کے ساتھ میری قربت بڑھتی گئی۔

ایک دفعہ تو شرمین نے زبردستی مجھے اپنے ساتھ لنچ کرنے پر مجبور کر دیا جو کہ ریسٹورنٹ کے اصولوں کی خلاف ورزی تھی کہ ایک ویٹر آنے والے کسٹمر کے ساتھ کھانا کھائے مگر منیجر نے مجھے اُس دن صرف وارننگ دی تب میں نے شرمین کو کہا کہ پلیز آیندہ کبھی مجھے کھانے پر فورس نہ کیجیے گا۔

تب شرمین چپ کر گئی پھر شرمین نے مجھ سے میرا نمبر لیا اور ایک دفعہ باہر کسی جگہ بلایا پھر شرمین کے ساتھ میری ملاقاتیں شروع ہو گئیں، شرمین سے میرا بڑا پاکیزہ سا تعلق بن گیا شرمین جتنی شوخ چنچل سی تھی اندر سے اُتنی ہی زیادہ حساس تھی۔ میری چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت محسوس کرتی مجھے تو کبھی ایسے لگتا تھا کہ شرمین میری حد سے زیادہ کیئر کر رہی ہے۔ وہ مجھے ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتی تھی، ایک دن ایک شام ہم پارک میں ٹہل رہے تھے میں نے گلابی کلر کی شرٹ اور بلیک جینز پہنی ہوئی تھی اور شرمین وائٹ سوٹ میں تھی تب شرمین بار بار مجھے دیکھ رہی تھی، میں نے کہا، مجھے ایسے کیوں دیکھ رہی ہو تب شرمین کھلکھلا کر اپنے مخصوص انداز میں ہنسی اور کہا، کون کہتا ہے تم ویٹر ہو، میں نے شرمین کو جواب دیا۔ شرمین کسی کی شکل وصورت دیکھ کر اُسے پرکھا نہیں جاتا، خوبصورت ہونے سے زندگی کے اور فکر معاش کے مسائل حل نہیں ہوتے۔ تب شرمین بڑے لاڈ سے مجھے کہتی، تمہاری عزت تو میرے دل میں ہے تمہاری سچائی تمہارا خلوص سب سے قیمتی ہے اور جو تمہاری قیمتی چیز میرے دل میں ہے اُس کی کوئی قیمت چُکا نہیں سکتا۔ میں شرمین کی بات سن کر ایکدم ٹہلتے ٹہلتے رک جاتا اور شرمین کو کہتا، شرمین میں ایک تھرڈ کلاس آدمی ہوں تم ایک پڑھی لکھی اچھے گھر کی لڑکی ہو ہم دونوں میں طبقات کا بہت فرق ہے۔

شرمین پھر مُسکراتے ہوئے کہتی، تم جانتے ہو میرے پاپا بہت اچھے ہیں انھوں نے صرف مجھے پیار نہیں دیا بلکہ اچھائی اور انسانیت کی قدر کرنے کی بھی تربیت دی ہے انسان کا خون ایک ہی ہے میں ان چیزوں کو کچھ نہیں سمجھتی بس تمہارا ساتھ چاہیے اور کچھ نہیں ۔شرمین مجھ پر اتنا بھروسہ مت کرو کہیں میں تمہارا بھروسہ توڑ نہ دوں، میرے اس طرح کہنے سے شرمین کی موٹی موٹی آنکھوں میں ایک پل میں آنسو آجاتے اور وہ کہتی، انور اب میری واپسی ممکن نہیں اب میں تمہارے ساتھ بہت دور آگئی ہوں اور میں تمہارے سوا کسی اور کی امانت نہیں بن سکتی۔ جب تم نہ ملے تو سمجھنا میرے لیے یہ دنیا اور اس کی زندگی بے کار ہے بے معنی ہے، تب میں شرمین کے گلابی ہونٹوں پر اُنگلی رکھ دیتا اور کہتا، جتنا تم مجھے چاہتی ہو اس سے بڑھ کر میں تمہیں چاہتا ہوں مگر کیا کروں میں نے زندگی میں صرف تلخ تجربات ہی دیکھے ہیں۔

تو ابھی تک تم نے اپنی اماں کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا، شرمین نے پوچھا، نہیں ابھی تک تو نہیں میں نے سوچا جب گاؤں جاؤں گا تب اماں سے آرام سے بیٹھ کر اُن کو بتاؤں گا، شرمین پوچھتی، تمہاری اماں مان جائیں گی، تب میں کہتا، شرمین جس نے خود بھوکا رہ کر مجھے نوالہ کھلایا ہو تو کیسے ممکن ہے وہ میرے دل کی مراد نہ سنے اب میں کل گاؤں جا رہا ہوں تم دعا کرنا، تب شرمین ایک دم بیٹھ گئی اور سر پر اچھی طرح دوپٹہ لے کر دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیئے اور اپنی آنکھیں بند کر لیں وہ کتنی معصوم سی گڑیا لگ رہی تھی پھر کچھ دیر بعد اُس نے آنکھیں کھولیں اور مجھے مُسکراتے ہوئے کہا، دیکھنا تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے۔"

یہ شرمین سے آخری ملاقات تھی جب گاؤں گیا تو اماں کی حالت بڑی نازک تھی بس وہ میرا انتظار کر رہی تھی مجھ سے وعدہ لے کر اس دنیا سے مُنہ موڑ گئی اماں کے گزر جانے کے بعد میں بہت تنہا ہو گیا تھا پھر اماں کا وعدہ نبھانے دوبارہ گاؤں آیا۔

سیدھا مامی کے گھر گیا مامی باہر صحن میں توے پر روٹیاں بنا رہی تھی مجھے دیکھ کھڑی ہو گئی اور گلے سے لگایا اور کہا، حوصلہ کر تیری اماں کو تجھ پر بڑا مان تھا وہ ہر دم تیری ہی تعریف

کرتی رہتی تھی مامی کے اس طرح کہنے پر میری آنکھیں بھیگ گئیں میرا دل کیا میں دھاڑیں مار مار کر روؤں مگر شاید پھر بھی غم ہلکا نہ ہو۔

پھر مامی مجھے کمرے میں لے گئی اور چارپائی پر بٹھایا ، مامی جو کبھی بڑی تندرست تھی اب وہ ویسی نہیں رہی اب بہت کمزور ہو گئی تھی ، میں نے ہچکچاتے ہوئے مامی کو کہا ، اماں نے جاتے جاتے مجھ سے ایک وعدہ لیا ہے یہ کہہ کر میں نے نظریں جھکا لیں ، مامی نے کہا ، پتر تو کتنی عظیم ماں کا عظیم بیٹا ہے جو اپنا وعدہ نبھانے آیا ہے مگر پتر تجھ پر کوئی دباؤ نہیں ہے ہم سادہ سے لوگ ہیں اور زبیدہ تو بہت ہی سادہ ہے تو سوچ سمجھ لے ، میں نے کہا ، مامی سوچ سمجھ کر ہی آیا ہوں مجھے نہیں لگتا کہ مجھے اب کچھ دیر کرنی چاہیے ، مامی نے کہا ، خدا تجھے سلامت رکھے پتر اگلے ماہ زبیدہ کا تجھ سے نکاح کر دیتے ہیں ۔ مامی نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا اور پھر میں شہر آ گیا میں نے اپنا نمبر بند کر لیا اور شرمین سے کوئی رابطہ نہ کیا اور اب کس منہ سے شرمین سے رابطہ کرتا اگلے ماہ تک میں شدید ذہنی اذیت میں رہا راتوں کو اُٹھ جاتا اماں میرے خواب میں آتی رہتی اور مجھے ہر لمحے یہی لگتا کہیں میں اماں کا وعدہ نبھائے بغیر اس دنیا سے نہ چلا جاؤں اگلے ماہ زبیدہ کے ساتھ سادگی کے ساتھ نکاح ہوا اور میں اُسے شہر لے آیا۔

ریسٹورنٹ کے منیجر کو میری شادی کا علم ہوا تو اُس نے مجھے بلایا اور کہا ، انور تم ہمیشہ یہاں لوگوں کو کھانا کھلاتے ہو کل تمہارا اور تمہاری مسز کا کھانا ہمارے ریسٹورنٹ کی طرف سے ہو گا ۔ میں نے واپس آ کر زبیدہ کو کہا کہ زبیدہ جس ریسٹورنٹ میں کام کرتا ہوں وہاں کل کے کھانے پر ہمیں منیجر کی طرف سے انوائٹ کیا گیا ہے ، زبیدہ نے کہا ۔ جیسے آپ کی مرضی آپ کہیں گے تو چ پڑیں گے۔

زبیدہ بہت سادہ تھی بس اُسے اپنے خاوند کی تابعداری کرنی آتی تھی وہ میری کسی بھی بات کا جواب نہ میں نہیں دیتی تھی ۔ میں زبیدہ کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا اور اُس سے باتیں کر رہا تھا کہ اچانک شرمین ریسٹورنٹ میں داخل ہوئی اُس نے سٹاف سے میرا پوچھا تو اُسے بتایا گیا کہ میں اپنی مسز کے ساتھ یہاں کھانا کھا رہا ہوں وہ سیدھا تیزی سے میری طرف آئی اور مجھے زبیدہ کے ساتھ دیکھ کر چکرا کہ رہ گئی میں اُس وقت اُس کے چہرے پر شدید تکلیف کے تاثرات دیکھ رہا تھا ۔ زبیدہ بھی گھبرا گئی کہ آخر ماجرا کیا ہے جو شرمین مجھے قہر بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے شرمین نے منہ سے کچھ نہیں بولا جتنی تیزی سے وہ آئی تھی اُتنی ہی تیزی سے واپس چلی گئی اُس کے جانے کے بعد میرا دل بہت بے چین ہو گیا میں پورا پانی کا جگ پی گیا پھر بھی میرے دل میں آگ لگی ہوئی تھی ۔ میں تصور کر رہا تھا کہ شرمین پر اس وقت کیا بیت رہی ہو گی۔

میں زبیدہ کے ساتھ واپس فلیٹ میں آ گیا میں سوچ رہا تھا کہ شاید زبیدہ مجھ سے شرمین کے بارے میں پوچھے گی مگر زبیدہ نے ایسا کوئی سوال نہ کیا میں زبیدہ کے چہرے کو بغور دیکھنے لگ گیا ، سانولی سی رنگت ، کالے گھنے لمبے بال اور تیکھی سی ناک اور ایک بڑی سی چادر جو ہمیشہ وہ اپنے اُوپر رکھتی تھی ۔ کیا دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں میں زبیدہ کو دیکھ کر سوچ رہا تھا پھر میں خود ہی زبیدہ سے مخاطب ہوا اور اُسے کہا۔

''زبیدہ۔'' تب زبیدہ نے چونک کر میری طرف دیکھا اور کہا۔

''جی۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں پتا ہے وہ لڑکی کون تھی۔'' اُس کی طرف سے جواب آیا۔

''نہیں مجھے نہیں پتا۔ میں نے تب کہا ، تم جاننا چاہو گی ۔ زبیدہ نے کہا ۔ آپ کی مرضی اگر بتا دیں تو ، میں نے کہا۔ وہ مجھ سے پیار کرتی ہے اور میں اُس سے پیار کرتا ہوں۔

میرے اس جواب سے زبیدہ نے چونک کر مجھے دیکھا اور سر جھکا لیا شاید وہ کوئی جواب نہیں دینا چاہتی تھی میں کمرے سے باہر نکل آیا اور سگریٹ کے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر لمبے لمبے کش لینے لگا اور ایسے ہی سڑک پر یونہی ادھر اُدھر گھومتا گھماتا آدھی رات کے قریب واپس کمرے میں آ گیا زبیدہ جاگ رہی تھی۔ میں نے زبیدہ کو دیکھ کر کہا۔

''تم سوئی نہیں ابھی تک۔'' زبیدہ نے کہا۔

''نہیں سوئی نیند نہیں آئی آپ کا انتظار کر رہی تھی۔'' میں نے پوچھا۔

''کیوں مجھ سے کچھ کہنا تھا۔'' اُس نے کہا۔

''نہیں تو ۔ آپ نے کچھ کھانا ہے تو بنا دوں۔'' میں

نے جواب دیا۔ ''ہاں ایک چائے کا کپ۔'' تب زبیدہ چائے بنانے لگ گئی تھوڑی ہی دیر میں زبیدہ چائے کا کپ ہاتھ میں لے کر آئی میں چائے لے کر پینے لگا پھر اُسے کہا۔

کل میں تمہیں تمہاری ماں کے گھر چھوڑ آؤں گا کچھ دن وہاں گزارو میں کچھ دن تنہا رہنا چاہتا ہوں۔'' زبیدہ نے کہا۔

''جی بہتر۔'' میں بیڈ پر لیٹ گیا اور آنکھیں موند لیں۔ اتنے میں اپنی پیشانی پر زبیدہ کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا وہ ہولے ہولے میرا سر دبا رہی تھی۔ میں سوچنے لگا اُسے کیسے پتا ہے کہ میرے سر میں درد ہے۔

☆.....☆

دوسرے دن میں صبح صبح ہی زبیدہ کو گاؤں چھوڑ آیا واپس شہر آ کر سوچنے لگا کہ ایک دفعہ شرمین سے ضرور ملوں اور اُسے سب کچھ بتاؤں وہ نہ جانے کتنی غلط فہمیاں اپنے دل میں لیے جل رہی ہے خیر میں روٹین کے مطابق ریسٹورنٹ میں کام کر رہا تھا کہ جنید میرے پاس آیا اور کہا کہ ریسپشن پر کوئی تمہارا پوچھ رہا ہے وہاں جاؤ میں ریسپشن پر گیا وہاں ایک دبلا پتلا نوعمر لڑکا کھڑا تھا جو مجھے بہت پریشان اور گھبرایا ہوا لگ رہا تھا، مجھے دیکھ کر کہا۔

''آپ انور بھائی ہیں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا، تب اُس نے کہا۔

''میں شہریار ہوں شرمین کا بھائی آپ جلدی سے میرے ساتھ چلیں آپی شرمین نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔ وہ اس وقت ہسپتال میں ایڈمٹ ہے اور انتہائی سیریس کنڈیشن میں ہے اور صرف آپ کا نام لے رہی ہے۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں جس کا نام لے رہی ہے اُسے جلدی لیکر آؤ۔''

یہ سن کر میرے دماغ میں آندھیاں چلنی شروع ہو گئیں میں منیجر کو بتائے بغیر جلدی سے شہریار کے ساتھ باہر نکلا اُس نے اپنی بائک سٹارٹ کی اور تھوڑی ہی دیر میں ایک پرائیویٹ ہسپتال میں شہریار کے ساتھ دوڑتا ہوا ایمرجنسی وارڈ تک آیا ایمرجنسی وارڈ کے باہر کچھ لوگ پریشانی میں بیٹھے تھے ایک آدمی سر جھکا کر بیٹھا تھا شہریاد نے جاتے ہی اُسے کہا۔ ڈیڈی میں انور بھائی کو ساتھ لے آیا ہوں آدمی نے سر اُٹھایا تو اُسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا اور شاید اُن کی بھی یہ ہی حالت تھی وہ ڈی، ایس، پی فراز خان تھے جنہوں نے ایک دفعہ مجھے لفٹ دی تھی، انہوں نے جلدی سے مجھے کہا۔ تم تو وہی ہو نا جو مجھے اُس رات ملے تھے۔ میں نے کہا۔ جی انکل۔ تب انھوں نے میرے آگے ہاتھ جوڑے اور کہا۔

''میں اپنی بچی کی زندگی کی تم سے بھیک مانگتا ہوں تم جو کہو گے میں وہ کروں گا ایک دفعہ میری بچی سے مل لو۔'' میں نے اُن کے ہاتھوں کو پکڑ کر کہا۔

''انکل خدارا مجھے شرمندہ نہ کریں یہ وقت ان باتوں کا نہیں آپ جلدی سے مجھے شرمین کے پاس لے چلیں۔''

وہ مجھے لیکر ایمرجنسی وارڈ روم میں گئے وہاں کچھ ڈاکٹرز موجود تھے ایک بڑی عمر کا ڈاکٹر فراز خان کے پاس آیا اور کہا۔

''ہم نے آپ کی بیٹی کا معدہ واش کر دیا ہے مگر وہ شدید ذہنی تکلیف میں ہے۔'' تب فراز خان نے جواب دیا۔

''میری بیٹی جس کا نام لے رہی ہے یہ ہے وہ لڑکا۔'' ڈاکٹر نے میری طرف دیکھا اور مجھے ایک طرف لے گیا اور کہا۔

''بیٹا تم جو کوئی بھی ہو یہ سمجھ لو یہ ایک زندگی کا سوال ہے اب سب کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے تم اس بچی کو کیسے ڈپریشن سے باہر نکالتے ہو۔ اور ہاں تم نے اس بچی کو صرف اُمید دینی ہے اور وہ اُمید ہی اسے اُس ڈپریشن سے باہر نکال سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''جی بہتر۔'' شرمین کو آکسیجن ماسک لگا ہوا تھا ڈاکٹر کے کہنے پر آکسیجن ماسک اُتار دیا گیا ڈاکٹر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر باہر چلا گیا اور فراز خان بھی ساتھ چلا گیا۔

شرمین کو اس حالت میں پہنچانے والا میں تھا۔ مجھے خود اپنے وجود سے گھن آ رہی تھی میں رو رہا تھا میرا دل بھی رو رہا تھا جو شرمین میری آنکھوں میں آنسو نہیں آنے دیتی تھی آج وہ میری وجہ سے اس حالت میں پہنچی تھی۔ میں شرمین کے پاس بیڈ پر پہنچا اور اُسے دیکھا۔ وہ بہت کمزور سی لگ رہی تھی اُس کی آنکھیں بند تھیں اور ایک ڈرپ اُسے لگی ہوئی تھی۔ میں بیٹھ گیا شرمین کی یہ حالت دیکھ کر میری روح تک تڑپ رہی

ں۔ میں نے شرمین کو پکارا۔ ''شرمین'' مگر خاموشی
ں پکارتا رہا پھر شرمین کی آنکھوں میں ہلکی سی جنبش
وع ہوگئی۔ شرمین کی آہستہ سے آواز آئی۔
''انور یہ تم ہو'' میں نے کہا۔
''ہاں شرمین میں ہوں تمہارا انور۔ کیوں خود کے ساتھ
ا کیا۔ کیوں شرمین کیوں۔ تب شرمین بولی۔
''تم مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے تمہیں میں نے کہا
نا کہ تمہارے بغیر میری زندگی بے کار ہے، بے معنی
ے۔'' میں نے جلدی سے جواب دیا۔
''نہیں شرمین میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں گیا تھا
ری جان میری زندگی۔ میں بہت مجبور تھا اتنا مجبور جتنا
ج تمہارا ڈیڈی فراز خان تمہارے لیے تمہاری زندگی
ے لیے مجبور ہے۔ میں نے تمہارے بھروسے کا خون نہیں
یا تم جو کہو گی ویسے ہی ہوگا۔'' تب شرمین کی تیز سانسیں
چھ مدھم ہوگئیں اور اُس نے ہولے سے آنکھیں
ھولیں، شرمین کی آنکھوں میں آنسو تھے جو اُس کے گلابی
ہالوں پر لڑھکنے لگے میں نے بے قراری سے جلدی سے
ن آنسوؤں کو اپنی ہتھیلی سے روکا اور کہا۔
''شرمین میں بھی تمہارے بغیر نہیں جی سکتا اب تمہیں
ں خود سے کبھی دور نہیں کروں گا میں تمہارے بھروسے۔
نہاری محبت کی قسم اُٹھا کر کہتا ہوں۔'' شرمین میری طرف
یکھ رہی تھی تب میں نے شرمین کو کہا۔
''مس شرمین کیا آپ ایک ویٹر سے شادی کرنا پسند
کریں گی جو ہے تو ویٹر مگر دکھنے میں ہیرو ہے۔'' میرے
س طرح کہنے پر شرمین کے لبوں پر وہی حسین مُسکان
آگئی جس نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔ یہ خوشی کے پل تھے
اتنے میں دروازہ کھلا اور ڈاکٹر آگیا شرمین کو یوں مسکراتا
دیکھ کر اُس نے مجھے تھپتھپایا اور فراز خان اُن کے ساتھ
شہریار اور ایک خاتون بھی جو شاید شرمین کی ماں تھی وہ بھی
اندر آگئے۔ شرمین کی بہتر حالت دیکھ کر سب کو چین آگیا
شرمین کی والدہ شرمین سے لپٹ گئی اور اپنی بیٹی کا سر
چومنے لگی۔ ڈاکٹر نے سب کو کہا۔
''اب یہاں کوئی نہیں روئے گا یہ شرمین کے لیے ٹھیک
نہیں۔''
فراز خان کے ساتھ میں باہر آگیا فراز خان مجھے
ہسپتال کی کینٹین میں لے گیا اور چائے منگوالی اور میری
طرف غور سے دیکھا اور کہا۔
''بیٹا ماں باپ کو اپنی اولاد سے بہت پیار ہوتا ہے میں
نے شرمین کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں دیکھے اگر شرمین کو
کچھ ہو جاتا تو سمجھو ہم سب مر جاتے۔ میں چاہے ایک
پولیس والا ہوں مگر میرا دل میری بچی کے لیے دھڑکتا ہے
اب تم مجھے سب کچھ سچ سچ بتاؤ اور میں جانتا ہوں تم ایک سچے
اور اچھے انسان ہو تم نے شاید یہ سب جان بوجھ کر نہیں کیا ہو
گا۔'' تب میں نے آنکھیں جھکالیں اور کہا۔
''انکل میں قصوروار تو ہوں مگر میری جگہ کوئی بھی زی
شعور ہوتا تو وہ یہی کرتا جو میں نے کیا ہے اور پھر میں نے
فراز خان کو اماں کے وعدے پھر زبیدہ سے شادی اور شرمین
کے ساتھ جو تعلق تھا وہ سب بتا دیا۔ فراز خان میری باتیں سن
کر خاموش ہوگیا پھر بولا۔
''اب تم نے کیا سوچا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
''میں وہی کروں گا جو شرمین کے لیے اُس کی زندگی
کے لیے بہتر ہوگا۔'' تب فراز خاں نے کہا۔
''کچھ بھی کرنے سے پہلے سوچ لینا ایک بوڑھے باپ
کو جو اپنی بیٹی کے بغیر نہیں جی سکتا اُس کی ماں کو جو بیٹی کی
موت کا صدمہ نہیں سہہ سکتی اور اس کے بھائی کو جو اپنی بہن کو
ٹوٹ کر پیار کرتا ہے۔'' میں نے فراز خاں کو کہا۔
''میرے لیے دعا کیجیے گا۔'' پھر میں اجازت لے کر
واپس آگیا مجھے بہت جلدی کچھ فیصلے کرنے تھے میں کمرے
سے سارا سامان لیکر سیدھا گاؤں روانہ ہوگیا۔

☆.....☆

زبیدہ مجھے دیکھ کر حیران ہوئی اور کہا۔
''آپ اتنی جلدی واپس آگئے مجھے لینے۔'' میں نے
زبیدہ کو کہا۔
''مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' زبیدہ
نے جواب دیا۔
''جی کریں۔'' میں نے کہا۔
''اس طرح نہیں تم اپنی ماں کو بھی بلا لاؤ تب زبیدہ
پریشان ہوگئی اور کہا۔
''اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو مجھے معاف کر
دیں۔'' میں نے زبیدہ کو کہا۔

''نہیں تم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی تم میری اماں کا انتخاب ہو اور میری اماں کا انتخاب غلط نہیں ہوسکتا خیر جاؤ اور مامی کو بلا لاؤ۔'' تب وہ اپنی امی کو ساتھ لے آئی، مامی نے مجھے دیکھ کر کہا۔

''پتر خیر تو ہے۔'' میں نے کہا۔

''جی خیریت ہے زندگی کا ایک فیصلہ لینے والا ہوں تو آپ سے بھی کچھ مشورہ کرنا ہے۔'' تب مامی نے کہا۔

''ہاں پتر ضرور بولو کیا بات ہے۔'' تب میں نے کہا۔

''مامی اگر ایک انسان مر رہا ہو تو کیا اُسے بچانا چاہیے۔' مامی نے کہا۔ ''ہاں پتر زندگی خدا کی طرف سے بہت بڑا تحفہ ہے۔ اگر تمہارے کچھ کرنے سے کسی کی زندگی بچ سکتی ہے تو اُسے ضرور بچاؤ۔'' تب میں نے مامی کو کہا۔

''میں زبیدہ سے شادی کرنے سے پہلے کسی اور سے محبت کرتا تھا.....'' اور پھر میں نے شرمین اور اُس کی موجودہ حالت کے بارے میں سب کچھ بتا دیا یہ سب باتیں سن کر مامی خاموش ہوگئی تب میں نے کہا۔

''آپ کیا کہتی ہیں۔'' مامی نے کہا۔

''پتر تو نیک پتر ہیں مگر میں تو وہی کہوں گی جس میں میری بیٹی کا بھلا ہوگا بہتر یہی ہے تم جو بھی کرو اپنی بیوی کی رضامندی سے کرو۔'' یہ کہہ کر مامی اُٹھ کر چلی گئی تب میں نے زبیدہ کو پکارا۔

''زبیدہ میرے پاس آ کر بیٹھو۔'' زبیدہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی اور میں نے زبیدہ کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''زبیدہ میری طرف دیکھو۔'' تب زبیدہ نے میری طرف دیکھا میں نے پہلی دفعہ زبیدہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ میں نے زبیدہ کو گلے لگا لیا اور زبیدہ میرے گلے لگ کر بہت زور زور سے روئی۔ میں نے زبیدہ کو دلاسہ دیا۔

''زبیدہ مت رو تمہارا رونا مجھے تکلیف دیتا ہے اگر تمہیں تکلیف ہوئی تو اماں کو تکلیف ہوگی، دیکھو زبیدہ میں تم پر ظلم نہیں کرنا چاہتا مگر یہاں سوال کسی کی زندگی کا ہے۔ اگر میں نے شرمین کو نہیں اپنایا تو وہ مر جائے گی اور اُس کا قاتل میں ہوں گا۔ چاہے مجھے اُس کے قتل کی سزا نہ ملے مگر میں رہوں گا ایک قاتل ہی۔ تو کیا تم ایک قاتل کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرلو گی۔'' تب زبیدہ نے میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔

''خدا نہ کرے میری خوشی آپ کی خوشی میں ہے بس مجھے کبھی خود سے دور نہ کرنا ورنہ میں بھی آپ کے بغیر نہیں جی پاؤں گی۔'' میں نے زبیدہ کو گلے سے لگا لیا اور مجھے اتنا سکون ملا جس کا کوئی اندازہ نہیں۔

☆.....☆

کچھ ہی دنوں بعد شرمین کے ساتھ بھی میرا سادگی کے ساتھ نکاح ہوا اور اُسے میں لے کر گاؤں آ گیا شرمین کو میں نے زبیدہ اور اماں سے لیے گئے وعدے کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا، شرمین نے شادی کی پہلی رات ہی مجھ سے کہا۔

''انور جس طرح میرا تم پر حق ہے اسی طرح زبیدہ کا بھی ہے اور میں تمہیں زبیدہ کی کبھی حق تلفی نہیں کرنے دوں گی۔'' میں نے کہا۔

''شرمین میں جانتا ہوں تم اتنی پاکیزہ سوچ کی مالکہ ہو اسی لیے تو تمہیں اپنایا ہے مجھے تم پر اور زبیدہ پر ساری زندگی فخر رہے گا جو میری تلخ زندگی میں شادمانی لیکر آئی ہو۔'' شرمین نے کہا۔

''تو اب کیا ہم نے شہر نہیں جانا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں شرمین میں نے اماں کے بغیر باہر بہت وقت گزارا ہے یہاں میری اماں کی یادیں ہیں اور یہ یادیں مجھے سکون دیتی ہیں یہاں ہر جگہ مجھے اماں دکھائی دیتی ہے یہاں مجھے اُداسی نہیں ہوتی۔'' تب شرمین نے کہا۔

''جیسا آپ چاہیں انور۔ میں نے تو اپنی زندگی آپ کے نام کر دی ہے۔'' دوسرے دن شرمین اور زبیدہ اکٹھے بیٹھے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں میں نے آسماں کی طرف دیکھا جو نیلا صاف شفاف لگ رہا تھا۔ میری زندگی کی اندھیری رات کٹ چکی تھی اور اب صاف شفاف نئی سحر آغاز ہو چکا تھا۔ میں خود میں بہت مطمئن تھا اماں سے کیا گیا وعدہ بھی نبھایا اور محبت کا بھروسہ بھی نہیں ٹوٹنے دیا۔

☆☆☆

ذرا سی بات

فردوس بانو

بیوی کے قاتل اُس نوجوان کا قصہ، جو آج پانچ بچوں کے ساتھ سسکتے ہوئے زندگی گزار رہا ہے

آج سویرے ہی کی خبر تھی کہ سیماب کا انتقال ہو گیا مگر کیسے؟ میرے ذہن میں یہ سوال گونجا کیونکہ ابھی کل ہی میں نے اسے دیکھا تھا۔ وہ بھلی چنگی اپنے دروازے میں کھڑی کسی بچے کو آواز دے رہی تھی۔ پھر میں اس کے ماضی میں کھونے لگی۔

سیماب کی والدہ بہت ہی غریب گھرانے سے

تعلق رکھتی تھیں۔ ان کو اپنی گلی کے ایک لڑکے سے محبت ہوگئی۔ ایک دن سیماب کی والدہ اپنا گھر چھوڑ کر اس لڑکے کے گھر آگئیں اور لڑکے کی ماں سے کہا۔

کہ میں اب گھر نہیں جاؤں گی۔ مجھے شادی اسی لڑکے سے کرنی ہے۔ ورنہ میں خودکشی کرلوں گی۔''

اس لڑکے کا نام ماجد تھا۔ ماجد بھی ہمارے محلے کا ایک شریف لڑکا تھا۔ ماجد کے گھر والے بھی بہت اچھے تھے اور سیماب کی والدہ کو انہوں نے قبول کرلیا اور اپنے محلے کے چند بزرگوں کو اپنے گھر میں بلوا کر اس سلسلے میں مشورہ کیا۔

انہوں نے لڑکی کو بہت پیار سے سمجھایا۔ زمانے کی اونچ نیچ سمجھائی کہ اس کا اثر اس کے والدین اور باقی بہن، بھائیوں پر کس طرح پڑے گا مگر وہ نہ مانی تو ایک بزرگ کو سیماب کے والد کے پاس بھیجا جس نے ساری صورت حال ان کے والد کو سمجھائی والد سمجھدار تھے۔ وہ ان بزرگ کے ساتھ ماجد کے گھر آئے اور سیماب کی والدہ اور ماجد بھائی کا نکاح پڑھا دیا گیا۔

ماجد بھائی یوں تو بہت اچھے تھے لیکن شادی کے کچھ عرصے بعد ہی انہوں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ ہر وقت گلی میں بیٹھ کر اپنے ہی دروازے پر تاش کھیل رہے ہوتے تھے۔ اس دوران ان کے ہاں یکے بعد دیگر دو خوب صورت بچوں نے جنم لیا۔

پہلی بیٹی کا نام انہوں نے کائنات رکھا اور دوسری کا نام سیماب۔ کائنات سانولی تھی لیکن سیماب انتہائی خوب صورت اور ذہین تھی۔ جب ان کی والدہ نے دیکھا کہ گھر میں پریشانی حد سے بڑھ گئی ہے تو انہوں نے اپنے ساس سسر کی اجازت سے اپنے ہی علاقے کی ایک فیکٹری میں کام کرنے کی اجازت حاصل کی اور فیکٹری جانے لگیں۔ اس طرح ان کے گھر کا خرچہ چلنے لگا۔ اس دوران ماجد کا کبھی کام لگتا کبھی نہیں۔

دونوں بچوں کے بعد اللہ نے ان کو تین مزید بیٹوں سے نوازا لیکن ماں کے گھر میں نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کی اچھی طرح تربیت نہ ہوسکی۔ سیماب کی والدہ نے وہیں فیکٹری میں ایک آدمی کو اپنا بھائی بنالیا اور اس آدمی کا ان کے گھر میں آنا جانا شروع ہوگیا۔ جس پر محلے کے لوگوں نے اعتراض بھی کیا لیکن سیماب کی والدہ اور ابو نے جواب دیا کہ جب ہمیں اور ہمارے گھر والوں کو اعتراض نہیں ہے تو کسی کو اعتراض کرنے کا کیا حق ہے۔''

زندگی کے دن ایسے ہی گزرتے رہے۔ دونوں بچیاں بڑی ہونے لگیں جب سیماب بارہ سال کی تھی تو اسے بھی ماں کی طرح اپنے ہی محلے کے ایک لڑکے سے محبت ہوگئی۔ اس لڑکے کا نام آصف تھا۔ آصف انتہائی شریف گھرانے کا لڑکا تھا۔ اس کے گھر میں ماں باپ کے علاوہ اس کے دس بہن بھائی اور بھی تھے۔ جس میں آصف کا نمبر چوتھا تھا۔ جب کہ آصف کی عمر تقریباً چودہ سال کی ہوگی۔

سیماب کا آصف کے گھر میں آنا جانا بہت بڑھ گیا تھا۔ دونوں بہنیں اپنے گھر کا کام ختم کرتیں اور آصف کے گھر میں بیٹھ جاتیں۔ آصف کی بہنیں بھی سیماب کی عمروں کی تھیں۔ اس لیے ان کی دوستی بہت بڑھ گئی۔ آپس میں بہت محبت سے رہتیں آصف کی والدہ سیماب اور اس کی بہنوں کا بہت خیال رکھتیں کہ بے چاری بچیوں کی والدہ تو گھر میں نہیں ہوتی ہیں اچھا ہے کہ ان کے گھر میں آجاتی ہیں۔

ویسے بھی آج کل کا ماحول صحیح نہیں ہے لیکن انہیں اندازہ ہی نہ ہوا کہ آصف اور سیماب ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں۔

جب سیماب کی والدہ کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے سیماب سے باز پرس کی۔ اس نے انتہائی ڈھٹائی سے اپنی ماں کو جواب دیا۔

''میں تو شادی صرف آصف سے ہی کروں گی۔''

وہ پھر آصف کے گھر گئیں اس کی امی سے ملیں کہ میری بیٹی آپ کے بیٹے سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ آپ سب لوگ میری بیٹی کو بہت پسند ہو اگر آصف سے سیماب کی شادی نہ ہوئی تو وہ زہر کھا کر مرجائے گی۔'' آصف کی والدہ ایک سمجھ دار خاتون

تھیں انہوں نے سیماب کی امی کو بٹھا کر بہت پیار و محبت سے سمجھایا۔

''آصف اس قابل نہیں ہے کہ میں اس کی شادی کردوں کیونکہ آصف سے بڑا ایک بھائی ہے اور دو بہنیں ہیں جو کہ شادی کے قابل ہیں۔ مجھے پہلے ان کی شادی کرنی ہے۔ ابھی آصف پڑھ رہا ہے۔ نوکری تو بہت دور کی بات ہے۔''

سیماب تک یہ خبر پہنچی تو وہ مایوسی کے عالم میں اپنے کمرے میں بند ہوگئی۔ کمرے میں ٹائی فون کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ جسے اس نے فوراً ہی پی لیا۔ اس کی ماں نے پہلے تو دروازہ کھلوانے کی کوشش کی پھر ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

انہوں نے باہر گلی میں شور مچادیا کہ سیماب نے زہر پی لیا ہے۔ وہ اپنا دروازہ نہیں کھول رہی ہے۔ خیر محلے کے لوگوں نے کسی طرح دروازہ کھول کر سیماب کو باہر نکالا تو وہ نیم بے ہوش تھی۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ فوراً ہی اسے قریبی اسپتال لے جایا گیا۔

جہاں ڈاکٹر نے بھی اس کے والدین سے پوچھا کہ سیماب نے کیوں ایسی حرکت کی ہے تو انہوں نے جواب دیا۔ ''گھریلو پریشانی کی وجہ سے اس نے ایسا کیا ہے۔''

دو دن اسپتال میں رہ کر سیماب گھر آگئی ڈاکٹروں نے اس کی جان تو بچائی لیکن سیماب کا دل ٹوٹ گیا اور وہ بہت زیادہ خاموش رہنے لگی۔ اس کا دل اب کسی بھی کام میں نہیں لگتا تھا۔ اس دوران اس کی امی نے اپنی بڑی بیٹی جو کہ ابھی صرف 15 سال کی تھی۔ اس کا نکاح اپنے بنے ہوئے بھائی جو کہ ان کے ساتھ فیکٹری میں کام کرتے تھے ان کے بیٹے عامر سے کردیا۔ بیٹی بھی اس رشتے سے بہت خوش تھی۔ سیماب کے گھر کے سامنے والے گھر میں کرایہ دار آگئے تھے۔ بہت اچھے لوگ تھے۔ اہل تشیع تھے جب کہ اور سیماب لوگ اہلسنت تھے۔

رفتہ رفتہ سیماب کا ان کے گھر میں جانا بڑھ گیا۔ پھر اسے وہاں ایک لڑکے حسن سے محبت ہوگئی۔ حسن ایک انتہائی خوب صورت لڑکا تھا۔ پڑھا لکھا زیادہ نہ تھا۔ عمر بھی کم تھی۔ نزدیک ہی کی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد حسن کا رشتہ لے کر اس کے والدین سیماب کے گھر آگئے اور کہا کہ سیماب اور حسن ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ اچھا ہے کہ ان کی شادی ہوجائے۔ سیماب کی والدہ اپنی بیٹی کو اچھی طرح سے جانتی تھیں۔

چنانچہ انہیں اس رشتے پر اعتراض نہ ہوا اور جلد ہی انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں کی رخصتی انتہائی سادگی سے کردی۔ یوں 15 سال کی عمر میں 24 سال کے لڑکے کے ساتھ سیماب کی شادی ہوگئی۔ شروع میں تو دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش تھے اس دوران اللہ نے انہیں دو بیٹیوں اور تین بیٹوں سے نوازا لیکن سیماب کی قسمت بھی اپنی ماں کی طرح نکلی۔ حسن کبھی سروس کرتا کبھی نہیں۔ رفتہ رفتہ دونوں کے درمیان بچوں اور گھر کے خرچے کی وجہ سے جھگڑا رہنے لگا۔

وہ اکثر ناراض ہوکر میکے آجاتی تھی۔ اس دوران حسن کو نشے کی لت لگ گئی۔ جس کی وجہ سے وہ سیماب کو بہت پریشان کرنے لگا۔ نوبت مار پیٹ تک آجاتی۔ اکثر سیماب کی والدہ اسے سمجھاتیں کہ اسے حسن کو چھوڑ دینا چاہیے لیکن وہ جواب میں کہتی کہ میں نے اپنی مرضی سے شادی کی ہے۔ پانچ بچوں کو لے کر میں کہاں جاؤں گی۔

آپ خود اس عمر میں فیکٹری میں کام کررہی ہیں۔ میرے بھائی بھی اس قابل نہیں ہیں کہ میں ان کے سہارے اتنا بڑا فیصلہ کرلوں۔ میں اپنے بچوں کی خاطر ہر حال میں نباہ کرنے کی کوشش کروں گی۔''

پھر سیماب نے فیکٹری میں جاب کرلی۔ اس دوران اس کی بڑی بیٹی اس قابل ہوگئی تھی کہ وہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو سنبھال سکے۔ سیماب اپنی پڑوسن کے ساتھ فیکٹری جاتی تھی۔ اس کے شوہر کا وہی حال تھا۔ نوبت گھر کے برتن اور دوسری چیزوں کو بیچ کر نشہ کرنے کی آگئی تھی۔ جس کی وجہ سے ان دونوں کے درمیان مزید اختلافات ہوگئے۔ روز روز

کے لڑائی جھگڑے کی وجہ سے بچے بھی پریشان رہنے لگے۔ گھر میں سیماب کے علاوہ اس کی ساس بھی تھیں۔ جو کہ کافی بیمار رہتیں اور اپنے بیٹے کو ہر وقت سمجھاتیں لیکن وہ کسی کی نہیں سنتا تھا۔

ایک دن سیماب کی بڑی بہن ان کے گھر رہنے آئی۔ سیماب، حسن اور کائنات گھر کے صحن میں بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے کہ سیماب نے اپنی بہن سے کہا۔

''میں اپنے حالات کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ حسن کام بالکل نہیں کرتے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ میں خودکشی کرلوں۔'' یہ سنتے ہی حسن زور زور سے چیخنے لگا۔ دونوں میں تکرار ہونے لگی۔ حسن نے اس کی بہن سے کہا۔

''دیکھنا میں اسے قتل کردوں گا۔'' دونوں کے درمیان لڑائی ہوتے دیکھ کر سیماب کی بہن نے کہا۔

''تم دونوں لڑتے رہو۔ میں اپنے گھر جارہی ہوں۔'' اور وہ سیماب کے گھر سے سیدھا اپنی امی کے گھر چلی گئی لیکن ان کی لڑائی کا ذکر اس نے امی سے نہیں کیا کہ وہ پریشان ہوجائیں گی۔

رات میں ماں بیٹی اپنی باتیں کرتے ہوئے سو گئیں۔ صبح اچانک انہیں فون آیا۔ سیماب کی امی نے فون اٹھایا کہ خدا خیر کرے اتنی صبح کس کا فون ہے۔ فون پر کوئی خاتون تھیں۔ جس نے بتایا کہ میں سیماب کی پڑوسن بات کر رہی ہوں۔ آپ جلدی سے سیماب کے گھر پہنچیں اور اپنے ساتھ پولیس لے کر آیئے گا۔ سیماب کو کچھ ہوگیا ہے۔''

یہ سنتے ہی سیماب کی والدہ کے تو ہوش اڑ گئے ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ جلدی سے انہوں نے اپنی بیٹی اور بیٹوں کو سوتے میں سے اٹھایا کہ سیماب کی پڑوسن کا فون آیا تھا۔ اتفاق سے اس دن صبح ہڑتال تھی۔ روڈ پر ٹریفک بالکل نہیں تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا بہرحال سیماب کی والدہ اور بہن بھائی کسی طرح اس کے گھر پہنچے اور ساتھ ہی انہوں نے تھانے میں بھی اطلاع کردی۔

ایک بھائی پولیس کو لے کر ان کے گھر پہنچا تو دیکھا۔ سیماب کے بچے بری طرح رو رہے ہیں۔

حسن کی والدہ نے بتایا کہ سیماب کا انتقال ہوگیا ہے۔ صبح جب ہم نے اسے اٹھایا تو وہ مری ہوئی تھی۔ حسن گھر پر نہیں تھا وہ قبرستان گیا ہوا تھا۔ اس نے سیماب کو دفنانے کی پوری تیاری کرلی تھی۔ سیماب کی والدہ تو وہاں پہنچنے کے ساتھ ہی بے ہوش ہوگئیں جیسے ہی حسن قبرستان سے آیا تو پولیس نے اسے پکڑ لیا اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھیج دیا۔ سیماب کی والدہ بچوں کو لے کر اپنے گھر آگئیں۔

گھر میں سب غم و غصے سے بے حال تھے۔ سیماب کی بڑی بہن رو رو کے ہلکان ہوئی جارہی تھی پھر اس نے اپنی امی اور بھائیوں کو بتایا کہ رات میں سیماب اور اس کے شوہر کے درمیان جھگڑا ہوا تھا اور حسن نے اس کے سامنے سیماب کو قتل کرنے کی دھمکی بھی دی تھی لیکن میں سمجھی کہ ان کے درمیان تو لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے میں نے مناسب نہیں سمجھا گھر میں بتانے کو کہ بلاوجہ امی اور بھائی سب پریشان ہوں گے مجھے کیا پتا تھا کہ حسن ایسا کرے گا تو میں ان کے گھر سے نہیں آتی۔

سب کے پوچھنے پر سیماب کی بڑی بیٹی نے بتایا کہ ہم سب بچے رات میں اپنی دادی کے پاس سوتے ہیں۔ صبح میں امی کو اٹھا کر ناشتا بنا کر دیتی ہوں لیکن جب میں امی کے کمرے میں گئی تو میں نے دیکھا کہ ابو تو کمرے میں نہیں ہیں باہر گئے ہیں اور کسی کو بتا کر نہیں گئے۔ میں نے امی کو کئی بار آواز دے کر اٹھانا چاہا کہ امی دیر ہو رہی ہے۔ آپ اٹھ جایئے لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں تو میں ان کے پاس گئی تو دیکھا ان کی گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی ہے۔ میں رونے لگی اور بھاگ کر دادی کو بتایا۔

پھر اس کے بعد میں پڑوس میں آنٹی کو بتانے گئی کہ امی نہیں اٹھ رہی ہیں۔ انہیں جا کر دیکھیں۔ جب پڑوسن آئیں اور انہوں نے سیماب کو دیکھا تو انہیں شک ہوا اور پوچھا کہ تمہارے ابو کہاں ہیں۔ بیٹی نے جواب دیا کہ آنٹی پتا نہیں صبح ہی بغیر بتائے کہیں چلے گئے ہیں۔ پڑوسن نے سیماب کی بیٹی سے اس کی نانی کا فون نمبر لیا اور ساتھ ہی محلے کے لوگوں کو اکٹھا کیا۔

سیماب کے پوسٹ مارٹم سے پتا چلا کہ سیماب کو اس کے شوہر نے گلا گھونٹ کر مارا ہے اور اسے مرے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے ہیں۔

جب پولیس نے سیماب کے شوہر سے باز پرس کی تو اس نے بتایا ہمارے درمیان رات میں جھگڑا ہوا تھا اور یہ جھگڑا سیماب کی بڑی بہن کے جانے کے بعد بھی وقفے وقفے سے ہوتا رہا۔ اس کے بعد کھانا کھا کر بستر پر بے خبر سو گئی لیکن میں جاگتا رہا۔ تھوڑی دیر کے لیے باہر دوستوں میں گیا اور نشہ کر کے واپس گھر آیا تو دیکھا سیماب سو رہی ہے لیکن مجھے اسے دیکھ کر بہت غصہ آ رہا تھا۔ سارا جھگڑا اس عورت کی وجہ سے ہے۔ گھر کا سکون ختم ہو گیا ہے۔

ہر وقت یہ عورت مجھے ٹینشن دیتی رہتی ہے اور یہ سب سوچ کر میرا خون کھولتا رہا اور ایک میرے دماغ میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ میں اس عورت کو ختم کر دوں نہ ہی یہ ہوگی اور نہ ہی جھگڑا ہوگا۔ پھر میں اٹھا اور جا کر سوئی ہوئی سیماب کا گلا اتنی زور سے گھونٹنے لگا کہ سیماب کی چیخ بھی نہیں نکل سکی۔ تھوڑی ہی دیر میں میں نے گلا گھونٹ کر اسے ہمیشہ کے لیے سلا دیا۔ اس کے بعد میں پریشان ہو گیا کہ میں اب کیا کروں۔ میں نے صبح ہونے کا انتظار کیا کہ میں صبح ہوتے ہی کسی کو بھی اطلاع دیے بغیر سیماب کو دفنا دوں گا۔ اس طرح کسی کو پتا نہیں چلے گا کہ سیماب کے ساتھ کیا ہوا ہے لیکن جب میں قبرستان سے انتظام کر کے واپس آیا تو آپ لوگوں نے مجھے پکڑ لیا۔''

بہرحال سیماب کو پوسٹ مارٹم کر کے اس کی امی کے گھر لایا گیا۔ سیماب کے بچے اور ان کی دادی اور سیماب کے سسرال کے کافی سارے لوگ اس کی تدفین میں موجود تھے۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ سبھی لوگ اس کی تعریف کر رہے تھے۔ سیماب کی ساس خود بہت رو رہی تھیں کہ سیماب نے ہر حال میں حسن کے ساتھ گزارا کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ سیماب کی ماں بہن اور بھائیوں سے معافی مانگ رہی تھیں۔ جب سیماب کی والدہ سے جو کہ خود غم سے نڈھال تھیں کسی نے پوچھا کہ بچوں کا کیا ہوگا؟ آپ انہیں رکھیں گی تو انہوں نے جواب دیا کہ نہیں میں ان بچوں کو نہیں رکھوں گی۔ یہ میری بیٹی کے قاتل کے بچے ہیں۔''

بچے رو رہے تھے۔ سسک رہے تھے لیکن کسی ماموں، خالہ، ممانیوں اور سب سے بڑھ کر ان کی نانی نے ان کو نہ ہی گلے سے لگایا اور نہ ہی ان کے سر پر ہاتھ رکھا۔ سیماب کا سب سے چھوٹا بیٹا ڈھائی سال کا تھا۔ جس کو اس کی بڑی بیٹی نے سنبھالا ہوا تھا۔ سیماب کی تدفین کے بعد اس کے بچوں کو دادی لے گئیں۔ سیماب کے چھوٹے بیٹے کو اس کی جٹھانی نے گود لے لیا۔ ایک بیٹے کو ایک اور رشتے دار نے گود لے لیا کیونکہ ان کے پاس اولاد نہیں تھیں۔ بیٹیاں بڑی تھی۔ انہیں دادی نے دارالعلوم میں بھیج دیا کہ میں بڑھاپے میں انہیں کہاں سنبھالوں گی۔

کیس چلتا رہا شروع میں سیماب کی والدہ اور بھائی پیشی میں جاتے رہے۔ سب کے سامنے سیماب کے بھائیوں نے بہت دعوے کیے تھے کہ ہم اپنی بہن کا بدلہ لیں گے لیکن وہ پیشیوں میں بار بار جا کر تھک گئے کیوں کہ ان کے پاس نہ سرمایہ تھا اور نہ اتنے وسائل کہ وہ اپنی بہن کا کیس لڑ سکیں۔ اس دوران حسن کا وکیل مسلسل سیماب کے گھر والوں سے رابطے میں رہا کہ حسن اپنے کیے پر نادم ہے۔ غصے میں اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ حسن کے چچا تایا بھی سیماب کے گھر والوں سے ملے کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا آپ سیماب کے بچوں کے بارے میں سوچیں کہ ان کے سر پر ماں کا سایہ بھی نہیں ہے اور باپ جیل میں ہے جس کی وجہ سے اس کے بچے بٹ گئے ہیں۔ سیماب کے گھر والوں نے بچوں کے بارے میں سوچا اور پیسوں کی مجبوری کی وجہ سے انہوں نے سیماب کے قاتل کو معاف کر دیا۔

آج حسن جیل کی سلاخوں سے باہر اپنے بچوں کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہا ہے اور بار بار اپنے کیے کی بچوں سے معافی بھی مانگتا ہے اور ان کا بھرپور خیال رکھ رہا ہے۔ اس طرح سے سیماب کے بچے اپنے گھر میں اپنی ماں سے محروم زندگی گزار رہے ہیں۔

☆☆☆

سزا مجھے ملی

آصفہ سکندر

فیوڈل سسٹم کا شکار ایک دوشیزہ کی آپ بیتی، جو آج بھی اپنوں کے کیے کی سزا بھگت رہی ہے

جس گھر میں، میں چھوٹی مالکن ہوا کرتی تھی۔ آج اس گھر میں نوکرانی کی حیثیت سے رہ رہی ہوں۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ کسی دور میں ہم وڈیرے تھے۔ ہمارا باپ یعنی رئیس سکندر، اس کا بھائی یعنی ہمارے چچا انور علی ہمارے دادا کے مرنے کے بعد ان کی 12 سوا ایکڑ زمینوں کے مالک بن گئے۔ ہم دو بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ سب سے بڑا ذوالفقار اس سے چھوٹا اعجاز۔ اس کے بعد آمنہ باجی اس کے بعد میں یعنی آصفہ۔

انور چچا کے بھی چار بچے تھے۔ سب سے بڑا عثمان اس کے بعد علی حسن۔ اس کے بعد ان کی بیٹی آسیہ اس کے بعد حیدر جو کہ مجھ سے دو سال بڑا تھا۔ ہماری امی کا نام ملوکاں اور نانی کا نام عظیمہ تھا۔ ہمارا گھر بہت بڑا اور حویلی نما تھا جس کے اردگرد ہاریوں کے گھر تھے۔ یہ گاؤں رئیس سکندر جو گوٹھ کہلاتا تھا۔ اس گوٹھ کے کچھ فاصلے پر انور چچا کا بہت بڑا حویلی نما گھر تھا۔ ہم سب کزنز ایک دوسرے سے بہت محبت سے پیش آتے تھے۔ وہ ہمارے گھر آتے اور کبھی ہم ان کے گھر آجاتے۔ یوں ہمارے والدین میں اور ہماری درمیان محبتوں اور چاہتوں کا سلسلہ کبھی کم نہ ہوا تھا۔

بابا سائیں نے ایک اسکول کھلوایا جس کے دو کمرے تھے اسکول تو تھا سرکاری لیکن اس کا خرچا بابا سائیں اور انور چچا برداشت کرتے اور اس اسکول اس میں گاؤں کے غریب ہاریوں کے بچوں کے ساتھ ساتھ ہم سب کزنز بھی تعلیم حاصل کرنے لگے۔

میں، آمنہ باجی، انور چچا کی بیٹی آسیہ ہماری نوکرانی جنت کی بیٹی زینت، کچھ ہماری رشتے داروں کی بیٹیاں جن میں گل بانو، سائرہ، کلثوم، امیراں، بختاور، گفرانہ، نظیراں اور اکمل ماموں کی بیٹی سکینہ الگ کمرے میں میل استاد کے ہاں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ہم ابھی چوتھی کلاس میں تھے کہ بابا سائیں کی کوششوں سے یہ اسکول مڈل تک ہوگیا۔ ہم تمام لڑکیاں آٹھویں کلاس تک پڑھ کر گھر بیٹھ گئیں اور لڑکوں میں ذوالفقار، عثمان نے شہر میں داخلہ لے لیا مگر وہ اسکول نہ گئے۔ ان کے دو سال بعد علی حسن اور اعجاز نے داخلہ لیا تو نویں میں آکر انہوں نے پڑھائی چھوڑ دی۔ جب کہ میں، آمنہ، آسیہ اور حیدر نے ایک ساتھ آٹھویں مکمل کی تو شہر جا کر داخلے کا مسئلہ بن گیا۔ آمنہ، آسیہ اور سکینہ نے یہ کہا کہ ہم مزید

نہیں پڑھیں گے جب کہ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ امی سے بات کی تو انہوں نے بابا سائیں سے بات کی۔ بابا سائیں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ لڑکیاں تعلیم حاصل کر کے کیا کریں گی۔ بابا سائیں کے انکار کے بعد میں خاموش ہو گئی۔

حیدر نے شہر داخلہ لے لیا اور ہاسٹل میں رہ کر خوب پڑھنے لگا۔ ہر ویک اینڈ پر وہ گاؤں آتا تو ہم سب اکٹھے ہو کر خوب ہلہ گلہ کرتے۔

اسی دوران ہماری زمینیں بیچنے کا سلسلہ شروع

ہو گیا۔ انور چچا نے بابا سائیں کو الیکشن لڑنے کا مشورہ دیا تو بابا نے انکار نہیں کیا۔ جب الیکشن قریب آئے تو رقم کا مسئلہ پیدا ہوا تو انہوں نے کچھ زمین بیچنے کا فیصلہ کیا اور دو سو ایکڑ زمین سستے داموں فروخت کر دی۔

ہمارے رشتے دار رئیس غلام قادر بھی الیکشن میں کھڑا ہوا۔ رئیس غلام قادر ہمارا رشتے دار تھا اور گوٹھ میں بہت بڑا زمیندار بھی۔ ہر وقت وہ بابا سائیں اور چچا سائیں پر نکتہ چینی کرتا تھا، انہیں نیچا دکھانے کی کوشش کرتا اس بار اس نے یہ کہہ کر سب کو حیران کر دیا کہ ''گاؤں والوں مجھے ووٹ دو، ایک ووٹ کے بدلے میں آپ کو پانچ سو روپے دوں گا۔'' یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ سب نے یہ ہی سوچا کہ یہ صحیح ہے۔ کیونکہ ووٹ لے کر یہ لوگ منہ پھیر لیتے ہیں یہ بات اچھی ہے کہ کچھ پیسے تو ملیں گے۔ بس تین چار گاؤں کے لوگوں نے کہا کہ ہم رئیس غلام قادر کو ووٹ دیں گے۔

جب یہ خبر ہمارے کمدار رمضان اور بخشو تک پہنچی تو وہ دونوں بابا سائیں کی اوطاق میں پہنچ گئے۔ رمضان اور بخشو دونوں کمدار تھے کیوں کہ زمین بہت زیادہ تھی اس لیے دو کمدار رکھنے پڑے۔ رمضان اور بخشو نہایت شیطان قسم کے لوگ تھے۔ مکاری کمینگی ان کی رگ رگ میں رچی بسی تھی۔ وہ دونوں آئے اور بابا سائیں اور چچا سائیں کو ساری بات بتائی اور کہنے لگے کہ ''سائیں ہم بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ وہ پانچ سو دیں گے تو ہم ہزار روپے دیں گے۔'' اور یوں کچھ اور زمین بیچ دی گئی۔

لوگ ووٹ دینے لگے اور ہزار روپے وصول

کرتے رہے اور یوں 12 سوا ایکڑ سے 6 سوا ایکڑ زمین رہ گئی۔

الیکشن جیتا گیا یا نہیں یہ الگ قصہ ہے۔

ادھر ذوالفقار، عثمان کی شاہ خرچیاں الگ اور علی حسن، اعجاز کی الگ۔ انہوں نے نہ تعلیم حاصل کی نہ زمینوں کی طرف توجہ دی۔ بس گاڑیوں میں گھومنا پیسہ اڑانا ان کا کام تھا۔

اسی دوران عظیمہ چچی ہمیں چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ ایک دن کے بخار اور سر درد سے وہ بے ہوش ہوئی تو گھر میں کوئی مرد نہ موجود ہونے کے وجہ سے چچی اسپتال دیر سے پہنچیں۔ چچا سائیں، بابا سائیں کی اوطاق میں تھے اور عثمان، علی حسن شہر کے رنگ رلیوں میں کھوئے ہوئے۔ گھر میں کوئی مرد موجود نہ تھا۔ صرف آسیہ موجود تھی، اسی نے ہمت کر کے ایک نوکر کو ہماری اوطاق میں بھیجا تو چچا سائیں گھر پہنچے۔ عظیمہ چچی کو بے ہوش ہوئے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ پھر جب اسپتال پہنچ کر ڈاکٹروں نے چیک کیا تو عظیمہ چچی دنیا سے منہ موڑ چکی تھیں۔

عظیمہ چچی کے موت کے بعد ہم ذرا سنبھلے تو امی کو ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ ہم نے انہیں اسپتال میں داخل کروایا اور وہاں ان کا کچھ عرصہ علاج ہوا لیکن امی کی طبیعت نہ سنبھل سکی اور وہ بھی ہمیں چھوڑ گئیں۔

ان دونوں واقعات نے ہماری زندگیوں کو بہت خاموش کر دیا تھا۔ ہم سب ہر وقت چپ رہتے۔ آسیہ بھی گم سم تھی۔ ہمارے گھر کے سب کام ماسی جنت کرتی تھی۔ کچھ عرصے سے اس کے ساتھ اس کی چہیتی بیٹی بھی کبھی کبھار آ جاتی تھی۔ وہ ہمارے اسکول کی دوست تھی تو اس کا آنا ہمیں اچھا لگتا۔ اب ایک دو مہینے سے تو روز زینت آنے لگی کیوں کہ ماسی جنت بیمار رہتی تھی تو کام کے لیے زینت آتی۔ زینت ہم سب کا خیال کرتی لیکن ذوالفقار بھائی کا کچھ زیادہ خیال کرتی تھی۔ اس بات پر میں اور آمنہ باجی حیران بھی تھے اور ایک دوسرے سے مسکرا کر کہتے۔ ''واہ زینت خوب خیال کر رہی ہے۔''

کچھ دنوں سے زینت کے ہار سنگھار میں اضافہ دیکھ کر ہم کچھ پریشان سے تھے کہ زینت کے رنگ برنگی چوڑیاں اور طرح طرح کے کپڑے پہننے کا کیا راز ہو سکتا ہے۔

☆.....☆

ایک دن صبح سے زینت کو چکر آ رہے تھے اور وہ الٹی بھی کر رہی تھی۔ ہم نے اسے کہا تھا کہ ''تم جا کر آرام کرو۔ آج ہم خود کام کر لیں گے۔'' امی نے ہمیں گھر کے سب کام کرنا سکھا دیئے تھے۔

ہم نہ سمجھ سکے چکر اور الٹیوں کے پیچھے کیا راز ہے۔ خیر میں اور آمنہ باجی کچن میں کھانا بنانے میں مصروف تھے۔ دروازے پر بیل ہوئی جا کر دیکھا تو انور چچا اور آسیہ کھڑے تھے۔ میرے سامنے انور چچا نے میرے گلے میں ایک ہاتھ ڈالا اور مجھے بابا کے کمرے کی طرف کھینچتے چلے گئے۔ انور چچا کھینچتے کھینچتے بابا کی طرف لے جا رہے اور مجھے اتنا بھی موقع نہ ملا کہ میں آسیہ کو سلام کروں اور آسیہ ہمارے پیچھے بابا کے کمرے کی طرف آ رہی تھی۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے اپنا کندھا چھڑایا۔ میں اور آسیہ گلے ملے۔ بابا نے آسیہ کو پیار کیا ہم سب بابا کے کمرے میں بیٹھ گئے۔ انور چچا کا موڈ بہت اچھا تھا شاید اس لیے کہ وہ ہماری پریشانیاں دور کرنا چاہ رہے تھے اور مصنوعی خوشی اپنے چہرے پر لائے ہوئے تھے۔

چچا نے بابا سائیں سے کہا کہ ''بھائی جان اس گھر کو اب خوشیوں کی ضرورت ہے اور ان بچوں کی شادی کرنی چاہیے۔''

اس بات نے بابا سائیں کے چہرے کو خوش گوار بنایا اور صلاح مشورے کے بعد ذوالفقار کے لیے ہمارے ماموں کی بیٹی سکینہ، عثمان کے لیے رئیس خان محمد کی بیٹی امیراں، علی حسن کے لیے آمنہ، اعجاز کے لیے آسیہ اور میرے لیے حیدر کا رشتہ ہو گیا۔

یوں ہم سب کے لیے یہ بات باعث خوشی ہوئی اور جلد ہی منگنی کے رسم اور پھر شادی کا فرض انجام دیئے جانے کا مشورہ ہوا۔ جب یہ بات سکینہ کو میں نے بتائی کہ جناب آپ کا خواب پورا ہونے لگا کہ ذوالفقار بھائی سے آپ کی شادی ہونے والی ہے تو سکینہ کی خوشی

کی انتہا نہ رہی۔ علی حسن اور آمنہ ایک دوسرے کو بچپن سے پسند کرتے تھے۔ وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ آسیہ اور اعجاز بھائی بھی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ میں اور حیدر بے انتہا خوش ہوئے اس لیے کہ ہم بھی بچپن سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔

حیدر ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کرنے والا تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ جناب کی منگنی آصفہ سے ہونے والی ہے تو وہ فوراً گھر آیا اور میرے لیے ڈھیروں تحفے لایا جس نے خوشیوں کو پر لگا دیے۔ میں خوشبوؤں میں اڑنی لگی کہ حیدر میرا ہے اور میں حیدر کی ہوں۔ ہر وقت دل ہی دل میں خوشی سے جھومتی رہتی۔

جب یہ بات ذوالفقار کو پتا چلی تو اس نے فوراً سکینہ سے شادی سے انکار یہ کہہ کر کر دیا کہ میں زینت سے شادی کروں گا۔ یہ بات ہم سب کے دلوں پر طوفان کی طرح گزری۔ وہ یہ بات بابا سائیں کے سامنے کہہ گیا تو بابا سائیں نے اسے زور سے تھپڑ مارا اور کہا کہ بے شرم تم نے ساری دنیا کو چھوڑ کر ایک نوکرانی کی بیٹی کو پسند کیا۔''

ذوالفقار غصے سے گھر سے نکل کر اوطاق کی طرف چلا گیا۔ میں اور باجی آمنہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے اور بابا سائیں اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ آمنہ باجی نے مجھ سے کہا کہ آصفہ تم بھائی کو دیکھو وہ غصے سے کہیں کچھ کر نہ بیٹھے۔ میں فوراً اس کے پیچھے گئی۔ ادا ذوالفقار اوطاق سے آرہے تھے اس کے ہاتھ میں کیڑے مار دوائی تھی۔ میں نے فوراً اسے جھپٹ لیا اور چیخنے لگی۔ میری آواز سن کر آمنہ بھی دوڑی چلی آئی۔ ہم دونوں چیختے ہوئے کہہ رہے تھے کہ بابا ادا زہر پی رہا ہے۔ بابا سائیں بھی دوڑے چلے آرہے تھے کہ راستے میں بابا اپنا دل پکڑ کر گرنے لگے، اسی دوران میں اور آمنہ نے ذوالفقار سے زہر کی بوتل چھین لی اور ہم تینوں بابا کو سہارا دینے لگے۔ ہم زاروقطار رو رہے تھے۔ ذوالفقار بھائی بھی رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

''بابا سائیں آپ اپنے آپ کو سنبھالیے مجھے کچھ نہیں ہوا۔'' ہم نے بابا سائیں کو کمرے کے طرف لے گئے۔ ڈاکٹر کو فون کیا۔ ڈاکٹر نے چیک کیا اور دوائیں لکھ دیں اور مکمل آرام اور خوش رہنے کو کہا۔

اگلے دن بابا سائیں نے چچا سائیں کو بلوایا اور باہمی مشورے سے یہ فیصلہ ہوا کہ ماسی جنت کو کچھ رقم دیں گے اور ماسی جنت خود انکار کر دے گی تو ادا ذوالفقار خاموش ہو جائے گا۔ ابھی چچا سائیں بابا سائیں کے کمرے میں موجود تھے تو ماسی جنت بلبلاتی ہوئی حویلی میں داخل ہوئی۔ آتے ہی مجھ سے پوچھنے لگی۔

''آصفہ بی بی کہاں ہے رئیس وڈا۔'' اس کے لہجے میں غصہ تھا۔

میں نے کہا۔ ''ماسی! بابا سائیں اپنے کمرے میں ہیں۔''

وہ فوراً کمرے کی طرف چل دی اور ادھر سے آمنہ آئی کہنے لگی۔ ''آصفہ کیا ہوا ہے ماسی کیوں آگ بگولا ہو رہی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''پتا نہیں، آتے ہی بابا سائیں کی طرف چلی گئی تھی۔''

آمنہ نے کہا۔ ''کہیں ذوالفقار، زینت کو بھگا کر نہ لے گیا ہو؟''

میں نے کہا۔ ''خاموش رہو، خدا خیر کرے۔''

ماسی جنت چیخ کر کہنے لگی۔ ''واہ سائیں واہ، آپ کے بیٹے نے میری بیٹی کے ساتھ کیا کیا۔ جب پرسوں میں اسے ڈاکٹر کے طرف لے گئی تو پتا چلا کہ میری بدنصیب بچی ماں بننے والی ہے۔ اس بات نے میرے وجود کو جلا کے رکھ دیا۔ گھر آکر مجھے پتا چلا کہ میرے بیٹی جس کے بچے کی ماں بننے والی ہے وہ سائیں ذوالفقار ہے۔ سائیں یہ کیا کیا ذوالفقار نے۔ اب اسے زینت سے شادی کرنا ہوگی۔'' ماسی جنت نے چلا چلا کر اپنی بات سنائی اور فیصلہ بھی صادر کر دیا۔

بابا سائیں اور انور چچا ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ انور چچا نے ماسی کو سمجھا کر چپ کروا دیا لیکن یہ بات پورے گاؤں کو اسی دن معلوم ہوگئی مجبوراً ان دونوں کی شادی ہوگئی اور سکینہ کے خواب ٹوٹ گئے۔

زینت ناز اور نخرے سے اس گھر کی مالکن اور بڑی

بہو بن گئی۔ کل تک وہ نوکرانی تھی ان کی شادی دھوم دھام سے ہوگئی۔ ایک سو ایکڑ زمین بیچ کر باقی زمین یعنی دوسو ایکڑ اعجاز اور علی حسن کی شادی پر بیچنے کا فیصلہ کیا گیا۔

ایک دن اکمل ماموں اور صابرہ ممانی، بابا سائیں سے شکایت کرنے آئے کہ آپ نے ہماری بیٹی کیوں نہیں لی۔ ذوالفقار کے لیے ایک نوکرانی کی بیٹی کیا اچھی تھی؟ سکینہ اور ادی ملوکاں نے کہا کہ سکینہ میری بہو بنے گی تو بابا سائیں نے کہا کہ ایک ذوالفقار نہیں تو عثمان بھی ہمارا بیٹا ہے۔ سکینہ کی شادی عثمان سے ہوگی تو عثمان اور سکینہ بھی دلہا دلہن بن گئے۔

ایک سو ایکڑ زمین ان کے شادی کی فضول رسموں کے لیے بک گئی۔ پھر دوسو ایکڑ اعجاز اور علی حسن کی شادی کے لیے بیچنے کی بات شروع ہوئی۔ اس بار ایک اور تبدیلی رونما ہوئی وہ زمینیں ہمارے ہاریوں نے خریدیں۔ ہاریوں نے اپنے مال مویشیاں، گائے بھینس، بھیڑ بکریاں اور گھر کا سامان بیچ کر وہ زمین خرید لی۔ کسی نے دس ایکڑ، کسی نے پندرہ کسی نے بیس، کسی نے آٹھ کسی نے پچیس ایکڑ سستے داموں خریدی۔

شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ پہلے اعجاز بھائی اور آسیہ کی شادی کا پروگرام بنا۔ جب ہم بارات لے کر وہاں پہنچے تو میں اِدھر اُدھر حیدر کو ڈھونڈنے لگی۔ یہ سوچ کر کہ جناب کا دیدار ہو جائے۔ میں نے کسی سے پوچھا کہ سکینہ کہاں ہے؟ تو مجھے کہا گیا کہ سکینہ اوپر ہے۔ میں تیزی سے اوپر پہنچی۔ سکینہ کا کمرا شاید اندر سے بند تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے سکینہ کی آواز آئی۔ ''کون؟''

''سکینہ میں آصفہ۔''

اس نے کہا۔ ''ایک منٹ ٹھہرنا میں کپڑے تبدیل کر رہی ہوں۔''

میں انتظار کرنے لگی۔ اچانک میرے کاندھے کو کسی نے تھپتھپایا۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا تو دنگ رہ گئی۔ میرے سامنے میرا خوابوں کا شہزادہ حیدر کھڑا تھا اور اس کے لبوں پر قیامت خیز مسکراہٹ تھی۔ میں شرما کر نیچے دیکھنے لگی۔

اس نے کہا۔ ''جناب شرمانا چھوڑ دیں ہم آپ کی خاطر آئے ہیں۔'' حیدر جو بلیک پینٹ اور اسکائی بلیو شرٹ میں بے حد اسمارٹ اور خوب صورت لگ رہا تھا۔ ہمارے ہاں سب مرد شلوار قمیض پہنتے تھے، صرف حیدر پینٹ شرٹ پہنتا تھا۔ جس میں وہ بہت خوب صورت لگتا تھا۔ حیدر خوب صورت تھا۔ رنگ اتنا گورا نہیں تو اتنا سانولا بھی نہیں۔ بہت متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ ناک نقش دلفریب اور حسین تھے۔ میں ہر وقت یہ سوچتی رہتی کہ شاید اللہ تعالیٰ نے میرے لیے حیدر کو اتنا خوب صورت بنایا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں حیدر کی دلفریب خوب صورتی کی دیوانی تھی۔ ہم ایک دوسرے کو بت بنے دیکھنے لگے تھے اچانک سکینہ نے دروازہ کھولا تو ہم بت سے انسان کے روپ میں آگئے۔ حیدر جلدی سے کہنے لگا کہ یہ تحفے آپ کے لیے۔ کپڑے اور چوڑیاں، جوتے۔ یہ آصفہ آپ کے لیے ہیں۔'' تو میں نے مسکرا کر قبول کر لیا۔

سکینہ نے کہا۔ ''جناب واہ کیا محبت ہے۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔''

حیدر نے کہا۔ ''ابھی کے ابھی یہ کپڑے تبدیل کر کے میرے لائے ہوئے کپڑے پہن لو۔''

میں انکار نہ کر سکی اور فوراً حیدر کے دیے ہوئے کپڑے، چوڑیاں جیولری پہن کر جب باہر آئی تو حیدر نے تعریفوں کے پھول بکھیر دیے۔ ویسے میں بھی کسی پری سے کم نہ تھی۔ گوری گوری، لمبے بالوں اور جھیل جیسی آنکھوں والی۔ سب ہماری جوڑی کو مثالی کہتے تھے۔

آسیہ دلہن بن کر ہمارے گھر آئی۔ کچھ دنوں بعد علی حسن اور آمنہ کی بھی شادی دھوم دھام سے ہوگئی۔ اس شادی پر میں نے اور حیدر نے خوب ہلہ گلہ کیا اور یوں آمنہ بھی پیا کے گھر چلی گئی۔ کچھ ہفتوں بعد ہماری شادی کی بات شروع ہوئی تو حیدر نے کہا کہ ''میں فی الحال شادی نہیں کروں گا جب تک میں ڈاکٹر نہ بن جاؤں۔''

یہ سن کر سب خاموش ہوگئے۔ حیدر کے ڈاکٹر

ہے کا انتظار کرنے لگے۔ اسی دوران ذوالفقار کے ہاں دو جڑواں بیٹے ہوئے۔ کچھ سال بعد ایک بیٹی ہوئی۔ آمنہ باجی کے ہاں پہلے بیٹی ہوئی۔ ذوالفقار کے جڑواں بیٹوں کے نام وسیم اور نعیم اور بیٹی کا نام امی کے نام پر ملوکاں رکھ دیا۔

سکینہ کے بھی تین بچے ہوئے۔ فواد، فرح اور فواد۔ آمنہ باجی کی بیٹی کا نام علی حسن کی امی چچی عظیمہ کا نام رکھ دیا گیا۔ اعجاز بھائی اور آسیہ کے ہاں بیٹا ہوا اس کا نام عامر رکھا گیا۔

اسی دوران بابا سائیں نے دل کی بیماری کا روگ پالیا۔ اس بیماری نے آخر کار بابا سائیں کو ہم سے چھین لیا اور بابا سائیں کا سایہ بھی ہمارے سر پر نہ رہا۔ بابا سائیں کے بعد چچا سائیں بھی دل کے مرض کا شکار ہونے لگے۔ وہ کمزور اور ہر وقت گھر میں آرام کرنے لگے۔ زینت بھابی کے ہاں ایک اور بیٹی نے جنم لیا۔ اس کا نام صائمہ رکھا گیا۔ ایک ماہ بعد آمنہ باجی کے ہاں پھر ایک بیٹی ہوئی۔ جس کا نام عذرا رکھا گیا۔ پھر سکینہ کو بھی اللہ نے ایک خوب صورت بیٹی فضہ عطا کی۔ اسی دوران میرے انتظار کا اختتام ہوا۔ خوشی کی اس خبر کہ حیدر نے ڈاکٹری کا امتحان پاس کرلیا ہے۔ میں نے اللہ کا شکر نوافل پڑھ کے ادا کیا کہ رب نے مجھے خوشی دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

ذوالفقار اور عثمان ہر وقت شہروں میں رہنے لگے۔ زینت ہر وقت شہر میں گھومتی رہتی تھی۔ فضول خرچیوں کا سلسلہ اور تیز ہوگیا۔ زمین بکتی گئی آخر کار دو سو ایکڑ زمین بچ گئی۔ ہمارے جتنے ہاری تھے انہوں نے زمین خریدی اور سستے داموں زمین ملنے سے سب زمیندار ہوگئے اور اسی دوران کمداروں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ دونوں کمداروں نے مل کر ہمارے گھر کے مردوں کو بھڑکانے کی کوششیں تیز کردیں اور آخر کار زمین کا بٹوارا ہوگیا اور دو سو ایکڑ دو حصے میں تقسیم ہوگئی۔ ایک سو ایکڑ ذوالفقار اور اعجاز کو ملے۔ ایک سو ایکڑ عثمان علی حسن اور حیدر کو ملا۔ کچھ پنچ والوں نے انہیں لڑوانے کی کوشش کی کہ فلاں زمین سیم زدہ ہے آپ تین بھائی ہیں وہ دو ہیں سو ایکڑ کم ہے۔ زیادہ زمینیں رئیس سکندر نے بیچی تھیں۔ پیسے بینک میں رکھوائے ہوں گے۔ یہ باتیں کمدار رمضان اور بخشو جھگڑے کے لیے اداعثمان والوں کو بھڑکاتا اور ذوالفقار والوں کے خلاف دونوں کمینے کمداروں نے آخر کار اداعثمان علی حسن کو جھگڑے کے لیے تیار کیا۔ وہ دونوں نے آٹھ ایکڑ زمین پر قبضہ کا دعویٰ ڈال دیا۔ یہ خبر ہمارا کمدار رمضان لایا۔ کمدار رمضان ہمارا کمدار تھا اور بخشو ان کا کمدار تھا۔ یہ کمینے ساتھ ملے ہوئے تھے اور جھگڑے پھیلانے میں ماہر تھے اور ظاہری طور وہ ایک دوسرے کے خلاف تھے۔ قبضے کا سن کے اداوالوں کو بہت غصہ آیا اور کچھ غصے کی آگ کو کمدار نے بھڑکا دیا یہ کہہ کر کہ سائیں وہ سیر ہیں تو ہم سوا سیر ہیں۔ ہم نے بھی ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں پہن رکھیں۔

ذوالفقار نے کہا۔ ''کمدار جاؤ انہیں پیغام دے آؤ کہ قبضے کی بات ختم کریں ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔'' رمضان نے بخشو کمدار کو بتایا کہ قبضہ ختم کریں ورنہ جھگڑے کے لیے تیار رہیں۔ یہ بات سن کر عثمان علی حسن کے دل و دماغ میں آگ لگ گئی۔ انہوں نے یہ کہہ بھیجا کمدار بخشو کو کہ انہیں کھلی چھٹی ہے۔

کوئی ہاری ان زمینوں پر کام کے لیے آئے گا وہ اپنا خود ذمے دار ہوگا۔ یہ بات جب اداوالوں نے سنی تو ہاریوں سے کہا گیا۔ آپ لوگ اپنا کام کریں یہ زمین ہماری ہے۔ وہ کچھ نہ کرسکیں گے۔ ایک دوسرے سے پیار کرنے والے کزنز کبھی ایک جان دو جسم کے مانند تھے۔ اب یہ کمدار شیطانوں کے کہنے پر جانی دشمن بنے تھے۔ میں دن رات دعائیں مانگ رہی تھی۔ ''یا اللہ اس دو خاندانوں پر رحم فرما۔ ہماری شادی کی بات کوئی نہ کرتا تھا۔ نفرتوں کی آگ میں سب کچھ بھول گئے تھے۔ حیدر نے کراچی میں ڈاکٹری کے لیے انٹرویو دیا تھا اور انتظار میں تھا کہ کب جوائننگ لیٹر ملے اور پھر شادی کروں اور یہاں گاؤں میں یہ حال تھا کہ سب کی نیندیں اڑی ہوئی تھیں اور تو اور زینت بھابی بھی ان کمداروں سے کم نہ تھی۔ ہر وقت ذوالفقار کے کان

بھرتی رہتی تھیں۔

اسی دوران چچا سائیں بھی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہم سب رسمی طور پر وہاں گئے۔ حیدر بھی آئے اور تین دن بعد چلے گئے۔

چچا کی موت کو پانچ دن گزر گئے تھے۔ ادا ذوالفقار نے اپنے کمدار سے کہا کہ جاؤ ہاریوں سے کہو کہ وہ اپنے کام پر جائیں۔ وہ کون ہوتے ہیں ہمیں روکنے والے۔ زمین کے جھگڑے کا چچا سائیں کو معلوم نہ تھا نہ ہی حیدر کو بتایا گیا اگر حیدر کو پتا چلتا تو وہ اس معاملے کا کچھ نہ کچھ حل ضرور نکالتا۔ ہمارے ہاری کرم بخش اور اس کا اکلوتا بیٹا امیر بخش ان مقبوضہ زمین پر کسان تھے۔ ادا سائیں کے کہنے پر امیر بخش شام 7 بجے فصل کو پانی لگانے گیا۔ پانی کا وارا (باری) رات کو تھا تو کمدار بخشو نے ان کا کارندے اسے جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ انہوں نے ادا عثمان علی حسن کو بتایا تو انہوں نے کہا کہ جا کے امیر بخش کی خوب دھلائی کر کے آؤ اور ادا عثمان ساتھ تھا اور کمدار کچھ کارندے کلہاڑیاں لے کر گئے وہاں تو دیکھا کہ امیر بخش پانی پر ہے۔ جا کے امیر بخش سے کہا کمدار نے آڑے چھوڑا اتھے کتنا روکا پھر بھی باز نہ آیا۔ امیر بخش انہیں دیکھ کر ڈر گیا کہنے لگا سائیں میں ہاری ہوں میرا کیا قصور تو کمدار نے کہا اڑے ہاری جا پتر اسے اپنے ہاتھ والی چھڑی سے مارنے لگا تو ادا عثمان نے کہا مارو کتے کو سب نے مارنا شروع کر دیا۔ کلہاڑی لگنے سے امیر بخش بے ہوش ہو گیا تھا۔ یہ رمضان کمینہ وہاں چھپا تھا۔ انہوں نے گھر والوں کو بتایا امیر بخش کو ان کے والدین روتے اسپتال لے گئے۔ سب لوگ جمع ہوئے تھے۔ رات کے اندھیرے میں بھی سب کہنے لگے کہ امیر بخش مر گیا۔ ادا ذوالفقار اور ادا اعجاز آئے اور کہنے لگے کہ انہوں نے ہمارے ہاری کو مارا۔ ہم انہیں نہیں چھوڑیں گے تو رمضان چچے نے کہا بالکل سائیں اینٹ کا جواب پتھر سے ہوگا۔

قصہ مختصر کمدار ادا ذوالفقار ادا اعجاز کچھ اور کارندے گئے عثمان اور علی حسن سے بدلہ لینے تو اوطاق میں سب لوگ جمع تھے اور شاید انہیں امیر بخش کو مارنے کا پچھتاوا تھا۔ جب ادا ذوالفقار والے گئے تو اوطاق کے دروازے پر ادا علی حسن کھڑا تھا۔ ذوالفقار نے اسے پہچان لیا اور کہنے لگا اڑے کیسے ہاریوں کو مارتے ہو تو ادا علی حسن نے کہا ادا ہم سے بہت بڑی غلطی ہوا اور اسی دوران اعجاز نے اس پر بندوق چلا دی یہ نہ سوچا کہ بہن کا سہاگ اجڑ جائے گا۔

علی حسن وہاں گر گئے یہ سب بھاگ گئے۔ فائرنگ کی آواز سن کر اوطاق سے عثمان بھاگتا آیا تو دیکھا علی حسن خون سے لالو لال ہے۔ اس کے ساتھ کمدار کچھ نوکر بھی آ گئے۔ ادا عثمان دہاڑیں مار کر رونے لگے تو اس کے رونے سے پہلے بندوق کی آواز سن کر گھر سے سکینہ اور آمنہ باجی بھاگتے ہوئے آئیں تو علی حسن کو دیکھ کر رونے لگیں سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔ پہلے امیر بخش پھر علی حسن کی موت نے سارے گاؤں میں قیامت برپا کر دی۔ ادا ذوالفقار نے ایک نوکر سے یہ کہہ دیا کہ جاؤ زینت کو اس کے بھائی کے پاس لے چلو۔ اس کی امی دور کسی گاؤں میں تھی۔ وہ نوکر آیا اور زینت چوری چھپے گھر سے نکل گئی۔ ہم کو پتا تک نہ چلا۔ وہ نوکر کے ساتھ راتوں رات بچوں سمیت پیدل نکل گئی۔ میں اور آسیہ بھابی ٹی وی دیکھ رہے تھے اور میرے اور حیدر کی شادی کے موضوع پر باتیں کر رہے۔

اچانک ایک نوکر نے یہ خبر ہمیں سنائی تو ہمارے سر پر بم کے پھٹنے سا دھماکا ہوا اور ہم رونے لگے نوکر نے کہا آپ وہاں نہیں جا سکتے سائیں اعجاز نے روکا ہے اور سائیں ذوالفقار یہاں سے چلے گئے ہیں کیوں کہ پولیس ان کے پیچھے ہے۔

آسیہ رو رہی تھی میں بھی آمنہ باجی کی بیوگی پر رو رہی تھی۔ میں آنسو پونچھتی ہوئی زینت کے کمرے کی طرف گئی اسے بتانے کے لیے زینت کو موجود نہ پا کر میں حیران ہوئی کہ زینت بھابی کہاں گئیں۔ ساری رات ہم نے روتے گزاری اذان ہوئی تو پولیس گھر میں داخل ہوئی۔ بابا سائیں جب زندہ تھے تو پولیس گھر تو کیا پورے گاؤں میں بھی نہیں آتی تھی۔ پولیس آئی اور گھر میں، میں اور آسیہ بھابی اور کچھ نوکر تھے۔ پولیس انسپکٹر سارے گھر کی تلاشی کے بعد مجھے اور آسیہ بھابی کو

ں سمیت تھانے لے گئی۔

حیدر بھی شہر سے آپہنچا تھا اور پولیس ذوالفقار اور
اعجاز کو ہر طرف ڈھونڈنے لگے۔ حیدر اور عثمان کو پتا چلا
کہ زینت نہیں بلکہ آسیہ اور آصفہ کو پولیس لے گئی ہے۔
سارا دن ہم تھانے میں بیٹھے رہے۔ آسیہ کے بچے
بہت رو رہے تھے۔ گرمی سے پورا دن گزرا۔ جب شام
ہونے لگی تو میں نے کیا دیکھا کہ حیدر اور دو پولیس
والے ہمارے پاس آنے لگے میں سمجھی کہ حیدر ہمیں
یہاں سے لے جائے گا کیوں کہ وہ پڑھا لکھا ہے۔ میرا
اندازہ غلط نکلا حیدر صرف اپنی بہن آسیہ کو لینے آیا تھا۔
میں نے آسیہ سے کہا آپی میں صرف تجھے لینے آیا
ہوں۔ یہ سن کر آسیہ نے کہا ادا آصفہ کو بھی لے جائیں تو
حیدر نے کہا۔ یہ آصفہ ان قاتلوں کی بہن ہے جنہوں
نے ہمارے بھائی کو قتل کیا۔ یہ سن کر مجھ پر غموں کے
پہاڑ ٹوٹ پڑے یہ حیدر نے کیا کہا۔ میں نے آسیہ سے
کہا کہ بھابی آپ جائیں شاید میں تنہا ہوں میرا کوئی
بھائی نہیں ہے۔ یہ سن کر حیدر خاموش ہوا اور کچھ نہ کہا
اور وہ چلے گئے۔

ادا ذوالفقار اور اعجاز ہمارے رشتے دار با اثر
بڈیرے کے پاس گئے۔ وہ وڈیرا پنچ میں آیا اور سب
معاملہ ختم کیا۔ فیصلہ قانون کے بجائے وہ خود کرنے
کے لیے تھانہ سے ہمیں لایا تھا۔ ادا ذوالفقار اور اعجاز
بھی واپس آئے انہوں نے تو معاف کیا لیکن ان کے
بیٹے کی سزا مجھے ملی۔ حیدر نے شادی سے انکار کیا یہ کہہ
کر کہ میں قاتلوں کی بہن سے شادی نہیں کروں گا۔
یہ سن کر میرے دل پر کیا گزری یہ بیان کرنے کے
لیے الفاظ نہیں تھے۔ ادا اعجاز اپنے بیوی بچوں سمیت
شہر والی حویلی میں رہنے لگا۔ ادا ذوالفقار گاؤں والی
حویلی میں رہنے لگا۔ علی حسن کے بچے اور بیوی آمنہ
چاچی ادا عثمان اور سکینہ کے ساتھ گاؤں والی حویلی میں
رہنے لگے اور حیدر شہر چلا گیا۔ وہ بڑے ہاسپٹل میں
سرجن تھا۔ ہمارے دونوں خاندانوں کے درمیان آنا
جانا خوشی غمی کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ اسی
دوران 50 ایکڑ زمین اور بیچی ادا والوں نے کیوں
کہ پولیس کا منہ بند کرنا تھا۔ سب اپنے اپنے ماحول
کی زندگی میں آہستہ آہستہ واپس آنے لگے اس
بڑے غم کا صبر سب کو آنے لگا۔ سب خوشی کی زندگی
گزارنے میں مگن رہے۔ فرق صرف اور صرف مجھے
پڑا۔ حیدر کی محبت نفرت میں بدل گئی۔ اس نے شادی
سے انکار کیا تو کسی نے اس سے کچھ نہ کہا کہ ایک لڑکی
کی زندگی برباد ہوگئی۔

میں ہر وقت روتی رہتی اور اپنی قسمت کو برا بھلا
کہتی تھی۔ غموں کے سمندر کے بیچ میں اکیلی تھی اور
اپنے ایک اور خبر نے میرے غموں کو اور زیادہ کیا وہ یہ تھا
کہ حیدر نے کراچی میں ایک اردو بولنے والے
خاندان سے شادی کرلی ہے اور اس لڑکی کا نام سائرہ
ہے وہ بہت خوش ہے۔

وقت گزرتا گیا اور میرے بالوں میں چاندی
چمکتے چمکتے پورا سر چاندی ہوگیا۔ اس حویلی کی
مالکن زینت بھابی ہوگئیں اور میں ان کے بچوں
کے خیال رکھنے اور گھر کے جھاڑو برتن مانجھنے والی
نوکرانی بن گئی۔ ادا ذوالفقار اور زینت ہر وقت
باہر ہی رہتے تھے۔ گھر کا سارا کام میں خود ہی کرتی
تھی۔ ان کے بچوں نے عدم توجہ نہ ملنے سے
اسکول چھوڑ دیا۔ چار پانچ جماعتیں پڑھ کر وسیم
اور نعیم ہر وقت کرکٹ کھیلتے رہتے۔ جب میں کچھ
کہتی تو زینت بھابی کہتی کہ پڑھ کر کیا کریں گے۔
میں بھی مالکن تھی تو آج نوکرانی ہوں۔ ہمارے
ہاری سب نے ہماری زمینیں خریدیں اور زمیندار
بن گئے۔ ایک دن ایسا ہوگا کہ ہماری تھوڑی سی
زمین بھی بک جائے گی تو اس کے بعد یہ وسیم نعیم
شاید ان ہاریوں کے ہاری بن جائیں گے جو کبھی
ہمارے ہاری تھے کیوں کہ وہ ان پڑھ تھے۔

زینت ہماری نوکرانی تھی میں چھوٹی مالکن تھی آج
زینت مالکن ہے اور میں نوکرانی ہوں سب کچھ ختم ہوگیا
تھا۔ کمداروں کی وجہ سے کچھ بھائیوں کی غلطی سے کسی
نے کچھ پایا کسی کچھ کھویا اس میں غلطی کس کی تھی کون
ظالم کون مظلوم برائی کا راستہ برا نکلا غلطیوں کی سزا کس
کو ملی غلطی کسی نے کی اور سزا مجھے ملی۔

☆☆☆

تری راہ تک رہی ہوں

فیصل ندیم بھٹی

اُس دوشیزہ کی داستان جو شر سے خیر نیکی کی طرف پلٹ آئی تھی مگر.....

میرا نام نورین ہے۔ تحصیل بھلوال سے ملحقہ ایک گاؤں میں رہائش پذیر ہوں۔ میرے والد صاحب کا شمار گاؤں کے بڑے زمینداروں میں ہوتا ہے۔ میرے والد صاحب کے حصے میں ایک مربع زمین آئی۔

میرے والد صاحب تین بھائی تھے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو مجھے گاؤں کے پرائمری اسکول میں داخل کرایا گیا اور قرآن پاک پڑھانے کے لیے امام مسجد کے پاس بھیجا گیا۔

میں بہن بھائیوں میں سب سے بڑی ہوں۔ میرے بعد میرے دو بھائی جمیل اور خلیل ہیں۔ میں بڑی ہونے کے ناتے والدین کی لاڈلی تھی۔ بچپن سے ہی میں جس چیز کی خواہش کرتی میرے والدین فوراً میری خواہش کو پورا کرتے تھے۔

میں نے گاؤں کے پرائمری اسکول سے پانچویں کا امتحان پاس کیا۔ قاری صاحب سے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کر لی۔

اب جب کہ ہمارے گاؤں میں صرف پرائمری اسکول تھا میرے والد صاحب کی خواہش تھی کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں تو انہوں نے مجھے قریبی گاؤں میں مڈل اسکول میں داخل کروا دیا۔ میں بھی گاؤں کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ اسکول جانے لگی۔

میری ساتھ جانے والے لڑکیوں سے دوستی ہو گئی جو کہ غریب لڑکیاں تھیں۔ مجھے غریب لڑکیوں سے دوستی اچھی لگتی تھی۔ کیونکہ غریبوں میں خلوص اور محبت ہوتی ہے اور ان میں غرور اور تکبر نہیں ہوتا۔ نازی بھی میری بچپن کی سہیلی ہے اور مڈل تک ہم دونوں نے اکٹھے ہی تعلیم حاصل کی۔ کیونکہ نازی کے گھر والے غریب تھے اور نازی کو اس سے آگے اسکول میں نہ پڑھا سکے۔

مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد مجھے بھلوال کے گرلز ہائی اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ جب میں نہم کلاس میں داخل ہوئی تو تب مجھے پتا چلا کہ مجھ میں کافی تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ کیونکہ میں ایک گوری چٹی خوب صورت مٹیار تھی۔ مجھے اسکول کی دوسری لڑکیاں کہتیں کہ ''نورین تم پر تو غضب

کی جوانی آئی ہے۔'' اور مجھے چھیڑا کرتیں کہ ''بہت خوش قسمت ہوگا جس سے تمہاری شادی ہو گی۔'' مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ شادی کے بارے میں سن کر میں چپ ہو جایا کرتی تھی۔

ہمارے گھر میں ایک ماسی رضیہ کام کرنے کے لیے آتی تھی۔ کبھی کبھار جب ماسی رضیہ کو دیر ہو جاتی تو اس کا بیٹا ارشد اپنی ماں کو لینے کے لیے ہمارے گھر آتا تھا۔ وہ بہت ہی سنجیدہ لڑکا تھا۔

جب وہ ہمارے گھر آتا تو میری امی اسے کوئی نہ کوئی کام کا کہہ دیتیں کہ جاؤ دکان سے سبزی لا کر دے دو یا کوئی اور کام گھر کا ہوتا کہ فلاں چیز اس جگہ رکھ دو وغیرہ۔

میں امی سے کہتی۔ ''ارشد کو کام کا نہ کہا کریں۔''

امی کہتیں۔ ''یہ غریب لوگ تو پیدا ہی امیروں کے کام کے لیے ہوئے ہیں۔''

ارشد کو اس کی ماں اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ارشد پڑھ لکھ کر کسی نوکری میں لگے گا تو خوش حالی کے دن آئیں گے۔

ارشد جب بھی ہمارے گھر آتا تو مجھے چھپی نظروں سے دیکھتا شاید اس لیے کہ میں غریبوں کی طرف داری کرتی تھی۔

مجھے بھی ارشد بہت اچھا لگتا تھا۔ پانچ وقت کا نمازی۔ گاؤں میں بزرگوں کی مدد کرنا اس کا شیوہ تھا۔ ارشد کے چہرے پر نورانیت تھی۔ شاید میں بھی اس کی شخصیت سے متاثر تھی۔

ایک دن جب ارشد ہمارے گھر آیا تو سخت گرمی تھی۔ سب گھر والے اپنے اپنے کمروں میں

سو رہے تھے۔ میں نہا کر باہر نکلی۔ گیلے بالوں کو سکھاتے ہوئے جا رہی تھی تو ارشد بھی گیٹ سے اندر آیا۔ اس نے مجھے سامان پکڑایا جو امی نے اسے دکان سے لانے کے لیے کہا تھا۔ ساتھ ہی ارشد نے مجھے ایک لپٹا ہوا کاغذ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ تھما دیا۔ میں خود حیران تھی کہ یہ کیا ہے؟

وہ دے کر چلا گیا اور میں بس اسے دیکھتی رہی۔

میں کمرے میں سامان رکھ کے اپنے بیڈ روم میں گئی تو میں نے وہ کاغذ نکال کر دیکھا جس پر لکھا تھا۔

السلام علیکم!

محترمہ نورین ملک صاحبہ آپ بہت خوب صورت ہیں اور مجھے آپ بہت اچھی لگتی ہیں۔ میں دن رات آپ کے ہی خیالوں میں کھویا رہتا ہوں۔ میں آپ سے بے انتہا پیار کرتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ میں آپ سے شادی کروں۔ اپنا خیال رکھنا۔ والسلام!

ارشد کے لکھے ہوئے الفاظ پڑھ کر میرے تن من میں آگ لگ گئی کہ اس غریب کمینے کی اتنی جرأت اپنے مالکوں کی بیٹی سے عشق لڑا رہا ہے۔ خیر میں نے گھر میں کسی کو یہ بات نہیں بتائی کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اگر میں یہ بات گھر میں بتا دوں تو میرے گھر والے ارشد کو قتل کروا دیں گے۔

کیونکہ امیروں کو ایک غریب شخص کو قتل کرانا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ بس میں بھی چپ ہو گئی لیکن ایک روز موقع پا کر میں نے ارشد کو بلایا اور اس کو خوب سنائیں کہ ارشد تیری اتنی جرأت کیسے ہوئی یہ سب کہنے کی۔ اس کا انجام تمہاری موت ہو سکتی تھی۔ کمینے گھٹیا انسان کسی کمی کی اولاد اور جو بکواس میرے منہ میں آیا بولتی رہی اور ارشد چپ سب کچھ سنتا رہا۔

اس واقعے کے بعد سے ارشد ہمارے گھر بہت ہی کم آتا تھا اگر کبھی آتا بھی تھا تو میری طرف دیکھتا بھی نہ تھا۔ مجھے ارشد سے شدید نفرت ہو گئی تھی میں نے کبھی اس کو منہ نہیں لگایا پھر اگلے سال میں نے میٹرک کا امتحان 85 فیصد نمبروں سے پاس کیا۔ میرے والد صاحب کی خواہش یہ تھی کہ میں میڈیکل کی تعلیم حاصل کروں۔ میری امی تو چاہتی تھی کہ میں آگے نہ پڑھوں۔ وہ کہتیں کہ لڑکیوں کو اتنی تعلیم کی کیا ضرورت ہے۔

لیکن آخر میرے والد صاحب نے مجھے راولپنڈی میڈیکل کالج میں انٹری ٹیسٹ کے لیے فارم بھجوا دیئے۔ پھر میں نے انٹری ٹیسٹ پاس کر لیا اور مجھے راولپنڈی میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔

اب میں بھلوال کے ایک گاؤں سے پاکستان کے بڑے شہر راولپنڈی میں آ گئی۔ وہاں کا ماحول بہت وسیع تھا۔ یہاں پر تو دنیا کے مختلف ممالک کے لوگ نظر آتے ہیں۔ شروع شروع میں جب میں میڈیکل کالج میں آئی تو یہاں پر مجھے عجیب لگا کیونکہ میری کوئی دوست نہ تھی اور شہر کا ماحول گاؤں کے ماحول سے یکسر مختلف تھا۔

کچھ دن بعد میری سحرش سے ملاقات ہوئی جو کہ اسلام آباد میں رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ سحرش سے میری دوستی گہری ہوتی گئی۔ میں تو کالج کے ساتھ ہاسٹل میں رہتی تھی۔ وہاں پر لباس مختلف تھا۔ سحرش مجھے کہنے لگی کہ ''نورین یہ تم کیسے ڈریس پہنتی ہو۔ یہ گاؤں نہیں ہے یہ شہر ہے۔''

پھر میں نے جینز اور شرٹ پہننا شروع کر دی اور فنکنگ والے، نت نئے ڈیزائنوں والے کپڑے بھی۔ میں نے بھی یہ محسوس کیا کہ گاؤں کی زندگی کیا زندگی ہے۔ اصل زندگی تو شہر کی ہے۔

سحرا کثر مجھے اپنے ساتھ باہر گھومنے کے لیے لے کر جایا کرتی تھی۔ ریسٹورنٹ پر جا کر مختلف انواع کے کھانے کھانا پارکوں میں جا کر گھومنا پھرنا میرا سحرش کے ساتھ معمول بن چکا تھا۔

تین ماہ کے بعد جب اپنے گاؤں واپس آئی تو

گھر میں میرا دل نہیں لگتا تھا کیونکہ میں شہر کے ماحول کی عادی ہو چکی تھی۔

ایک دن سحرش نے مجھے دعوت دی کہ اتوار کو اس کی دوست کی شادی ہے۔ اس میں ہم دونوں جائیں گے۔ میں نے شادی پر جانے کے لیے پینٹ شرٹ کا انتخاب کیا۔

اتوار کی صبح ہاسٹل سے وہ مجھے لینے آ گئی۔ جب میں باہر سحرش کے پاس آئی تو ساتھ ہی گاڑی کھڑی تھی۔ سحرش نے مجھے بتایا کہ یہ میرے دوست ناصر کی گاڑی ہے۔ ہم ناصر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ راستے میں ناصر سے میرا تعارف کروایا گیا۔ پھر ناصر نے گاڑی ایک ریسٹورنٹ پر کھڑی کی۔

ہم تینوں اتر کر اندر گئے وہاں پر ناصر نے آئس کریم کا آرڈر دیا۔ ایک گھنٹا وہاں ہم گپ شپ کرتے رہے۔ اس دوران میں نے محسوس کیا کہ ناصر کی نظریں میرے جسم کے اردگرد گھوم رہی تھی۔ پھر وہاں سے اٹھ کر ہم شادی کی تقریب میں جا پہنچے۔ وہاں پر سحرش نے مجھے اپنی کزنز سے ملوایا اور ہم نے خوب انجوائے کیا۔

رات کو سحرش اور ناصر مجھے ہاسٹل میں چھوڑ گئے۔ اکثر اوقات سحرش مجھے ایسے ہی پروگراموں میں لے جاتی جہاں پر ہم خوب انجوائے کرتے۔

ایک رات سحرش مجھے اپنے ساتھ ایک پارٹی میں لے گئی جہاں پر لڑکیاں ڈانس کر رہی تھیں مجھے بھی ڈانس کے لیے سحرش نے کہا۔ میں نے اس ماحول کو ڈانس کر کے خوب انجوائے کیا۔

میڈیکل کا ایک سال گزر گیا۔ وقت تو وقت ہے پر لگا کر اڑتا رہتا ہے۔ بہار کا موسم تھا سحرش مجھے اپنی ایک دوست کے گھر لے گئی۔ جب اندر گئی تو دیکھا کہ کافی لڑکیاں میک اپ کر کے بن سنور کے بیٹھی تھیں۔

مجھے بہت عجیب لگ رہا تھا میں نے سحرش سے کہا کہ "یہ تم مجھے کہاں لے کر آئی ہو؟"

سحرش نے کہا۔ "گھبراؤ نہیں پہلی نہیں ہوتا میری جان کچھ دیر بیٹھنے کے بعد شیشوں کے گلاسوں میں کولڈ ڈرنکس پیش کی گئی۔ جب میں نے پہلا گھونٹ پیا تو کڑواہٹ سی محسوس ہوئی۔

سحرش نے کہا۔ "نورین ہم بھی پی رہے ہیں آپ بھی پیو۔ یہ شراب کی محفل سجی ہے آج۔"

شراب پی کر مجھ پر عجیب سی مستی چھا گئی تھی۔ کچھ دیر بعد مجھے ہوش نہیں تھا اور ناصر میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے بھی شراب پی ہوئی تھی۔

جب صبح میں اٹھی تو مجھے پتا چلا کہ میری عزت ناصر کے ہاتھوں لٹ چکی ہے۔ میں بہت روئی کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ آخر کار میں بھی سحرش کے ساتھ رنگین ماحول کی عادی ہو گئی۔

سحرش کا باپ جو کہ بوڑھا تھا اس نے اپنی بیٹی سحرش کے ساتھ مل کر ایک کوٹھی کرائے پر لی ہوئی تھی۔ جہاں پر سحرش نئی نئی لڑکیوں سے دوستی کر کے انہیں گھیر کر کوٹھی پر لے آتی تھی تب مجھے پتا چلا کہ سحرش لڑکیوں کے ساتھ دوستی کرتی ہے پھر انہیں اس جال میں پھنسا کر کوٹھی پر لے آتی ہے جہاں پر مردوں کو نئی نئی لڑکیوں سے ماحول رنگین بنایا جاتا تھا۔

دوسرا سال ختم ہو گیا میں چار سے پانچ بار گھر آئی تھی جب واپس اسلام آباد جا رہی تھی تو میرے ساتھ والی سیٹ پر ایک عورت بیٹھی اسلامی لباس میں ملبوس وہ میرے بارے میں پوچھنے لگی پھر راستے میں میرا نام پوچھا اور اسلام کے بارے میں مجھ سے گفتگو کرنے لگی۔ سفر کا اختتام ہونے سے پہلے اس نے مجھے ایک کتاب کا تحفہ دیا۔

سیرت النبیؐ اور ازواج مطہراتؓ کی زندگی کے سنہرے ادوار درج تھے۔ رات کو جب میں بستر پر آئی تو میں نے کتاب کو پڑھنا شروع کر دیا۔ میں جیسے جیسے پڑھ رہی تھی میرے دل کی دنیا بدل رہی تھی۔ مجھے اپنے کیے ہوئے گناہوں پر ندامت ہو رہی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

گویا خوف خدا سے میرے وجود پر لرزہ طاری تھا۔ زندگی میں آج خوفِ خدا سے روئی تھی۔ وہ رات روتے روتے مجھے نیند آ گئی جب میری آنکھ کھلی تو فجر کی اذان میرے کانوں سے ٹکرائی۔

میں باتھ روم گئی غسل کیا اور پھر وضو کر کے جائے نماز بچھا کر فجر کی نماز پڑھنا شروع کی۔ نماز سے فارغ ہو کر قرآن پاک کی تلاوت کی پھر درود پاک کا ورد کرتی رہی پھر میں نے اسلامی کتابیں پڑھنا شروع کر دیں۔ میں نے سحرش سے رابطہ ختم کر دیا اور میڈیکل کی تعلیم کو خیر باد کہہ ڈالا۔ اب میں پانچ وقت کی نماز باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ اب میری زندگی کا حاصل اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات کو بجا لانا میری زندگی کا محور اور مقصد ہے۔

اب میری شادی میرے والدین اپنے بھانجے کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں لیکن میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی کیونکہ وہ ایک درجے کا کمینہ انسان ہے۔ شرابی زانی ہے۔

ہر وقت لڑکیوں کے ساتھ فلرٹ کرنا اس کا مشغلہ ہے۔ میں ہر وقت ذکر کر کے دعا مانگتی ہوں کہ مجھے نیک ساتھی زندگی کا عطا فرمائے۔

عید کے دن ماسی رضیہ ہمارے گھر عید مبارک کہنے آئی۔ مجھے احساس ہوا کہ غریبوں کے دل کتنے شفاف ہوتے ہیں جس کے گھر کا نمک کھاتے ہیں زندگی بھر وفاداری کرتے ہیں۔

میں نے ماسی رضیہ سے ارشد کے بارے میں پوچھا۔ تو ماسی رضیہ نے بتایا کہ ''ارشد ایف ایس سی کر کے آرمی میں بطور کیپٹن بھرتی ہو گیا ہے اور اب ماسی رضیہ نے لوگوں کے گھروں میں کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔

ماسی رضیہ نے بتایا کہ اب اللہ کا شکر ہے گھر بھی اپنا ہے اور روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ مجھے ارشد کی وہ بات بار بار یاد آ رہی تھی جو اس نے مجھے خط دیا تھا۔ میرے دل نے محسوس کیا کہ میں نے ارشد کے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔

کیونکہ غریبوں کے اندر بھی دل ہوتا ہے اور میں نے ارشد کا دل دکھایا تھا مجھے ارشد سے معافی مانگنی چاہیے۔ میں نے ماسی رضیہ سے ارشد کا موبائل نمبر لیا۔ ماسی رضیہ چلی گئی نہ جانے کب تک میں ارشد کے بارے میں سوچتی رہی۔

اگلے دن دوپہر کو میں نے ارشد کے نمبر پر کال کی ارشد کو بتایا کہ میں نورین بول رہی ہوں۔ ارشد نے کہا کہ میں مصروف ہوں بعد میں کال کرنا۔ میں بہت سوچتی رہی۔ آج میں بات کرنا چاہتی ہوں لیکن وہ مصروف ہے۔

رات کو میں نے ارشد کو میسج کیا پھر ارشد نے کال کی۔ ارشد کو کیپٹن بننے کی مبارک باد دی تو ارشد نے کہا کہ بس سب ماں کی دعا ہے۔

پھر میں نے ارشد کو بتایا کہ میرے گھر والے میری شادی میرے ابو کے بھانجے کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں لیکن میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ ارشد میرے الفاظ سن کر چونک گیا اور کہا۔

''نورین ملک صاحبہ! میں ایک غریب انسان ہوں بھلا آپ کا اور میرا اسٹیٹس نہیں ملتا لیکن آپ تو کہہ رہی ہیں کہ جب آپ کے گھر والوں کو اس بات کا پتا چلے گا تو ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔'' پھر ارشد نے اللہ حافظ کہہ کر کال کاٹ دی۔

آج میں تنہا بیٹھی سوچ رہی ہوں کہ اگر میں شادی کروں گی تو ارشد جیسے نیک انسان سے۔

تمام قارئین سے التماس ہے کہ میرے لیے دعا کریں کہ نیک اور شریف انسان کے ساتھ زندگی میں جیون ساتھی بن کر آ۔ آج میں ارشد کی راہ تک رہی ہوں مگر اب شاید اس کی میری ضرورت نہیں۔

☆☆

نویں سچ بیانی

دو دن کی زندگی

شاہد محمود مغل

اُس طمع پرست نوجوان کا عبرت نامہ، جو ہاسپٹل میں اپنے گنے چنے دن پورے کر رہا ہے

''یاسر بیٹا آخر ماہم سے شادی کے انکار کی وجہ کیا ہے؟ وہ بچپن سے تمہارے نام سے منسوب ہے ایک ساتھ پل کر جوان ہوئے ہو اور ایک دوسرے سے انسیت بھی رکھتے ہو۔ پھر شادی سے انکاری کیوں؟''

''بس ماما میں نے کہہ دیا ناں ماہم سے شادی نہیں کر سکتا۔ بس۔ ریزن نہیں بتا سکتا۔''

''یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔''

''جی ہاں۔''

''دیکھ بیٹا میں تم سے التجا کرتی ہوں۔تو ایسا نہ کر گھر سے جانے کا ارادہ چھوڑ کر باپ کے فیصلے پر سر جھکا دو۔تمہارے بغیر ہمارا کون ہے۔ایک تو ہی تو ہے۔ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا قرار،سہارا۔۔کی آنکھیں بھگ گئیں تولتے بولتے مگر یاسر کا چہرہ سپاٹ ہی رہا۔

عدیل اور عقیل دونوں سگے بھائی تھے ان کا تعلق تحصیل کامونکی کے ایک نواحی گاؤں سے تھا۔جہاں تھوڑی سی زمین تھی جس سے گھر احسن طریقے سے چلتا تھا۔عدیل بڑا اور عقیل چھوٹا تھا۔عدیل کی ایک ہی بیٹی تھی دبلہ عقیل کی اولاد میں ایک بیٹی کے ساتھ ایک بیٹا بھی شامل تھا۔عدیل اور عقیل ایک دوسرے کا سایہ بن کر رہتے تھے۔گاؤں میں ان کی مثال دی جاتی تھی۔

گاؤں کے واحد پرائمری سکول سے یاسر،امبر اور شانزے نے پرائمری پاس کر لی تو یاسر کو آگے پڑھنے کیلئے شہر کے اسکول میں بھیج کر دیا گیا۔مگر امبر اور شانزے کی تعلیم کا حد یہیں تک مقرر تھی کیونکہ سب جانتے ہیں کہ دیہاتوں میں عام طور پر لڑکیوں کو اسکول پڑھانا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا۔سو آگے پڑھنے کے بے انتہا شوق کے باوجود امبر اور شانزے کو پڑھایا نہ گیا اور وہ تعلیم کے شوق میں اندر ہی اندر کڑھتی رہتیں۔

یاسر شہر کے سکول میں پڑھنے لگا جبکہ شانزے اور امبر نے گھر داری میں اپنی اپنی ماں کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔

ہر دن کے بعد رات اور رات کے دن طلوع ہوتا رہا اور وقت گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا اور یاسر نے میٹرک کے بعد کالج میں ایڈمیشن لے لیا۔اسکول کی نسبت کالج کے اخراجات کہیں زیادہ ہوتے ہیں عدیل اتنا خرچا افورڈ تو نہیں کر سکتا تھا مگر اس نے یاسر کو مزید پڑھنے دیا کہ ہائی ایجوکیشن کے بعد بہت بڑا آفیسر بن جانے پر اس کی آخری زندگی آرام سے گزر جائے گی۔ایک تو وہ گاؤں کا معصوم سا لڑکا اور شہر اور پھر کالج کا ماحول۔اس کے باپ کی خام خیالی تھی کہ یاسر پر کالج کا ماحول اثر انداز نہیں ہوگا۔وہ جیسا ہے ویسا ہی شرافت کا نمونہ رہے گا۔کالج کے ابتدائی ماہ تو ٹھیک گزرے مگر چند مہینوں بعد وہ کالج کے ماحول میں رنگنے لگا۔

اس ماحول نے اس کو بدل دیا۔ماحول بدلا شوق بھی بدل گئی۔شاید یاسر بھی ہیں چاہتا تھا اب۔گزرتے وقت کی ضرورت تھی۔ٹپ ٹاپ سے رہتا۔اب گاؤں میں بھی کیبل جیسی موذی بیماری نے لوگوں کو دیمک کی طرح چاٹنا شروع کر دیا تھا۔شانزے بھی گھریلو امور کی فراغت کے بعد ٹی وی کے پسندیدہ چینل سٹار پلس پر رومانی۔

ساس بہو کے چلتر بازیاں۔دیورانی جھٹانی کی طنز و شنید بھی گفتگو۔جو وقت لائٹ آف میں ٹی وی بند ہو جانے ٹائم بچتا۔رومانی ناولز کا مطالعہ اس کے زیر نظر رہتا۔فرق صرف اتنا تھا کہ یاسر شہر میں کالج کے ماحول کے زیر اثر رہتا۔ویل ڈریس۔شاندار پرسنالٹی۔جبکہ امبر کالج اور دنیا کا ماحول ٹی وی ڈراموں میں اور ڈائجسٹوں میں پڑھ کر دیکھ لیتی تھی۔اس پر کسی چیز کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا وہ آج بھی دیہاتی کلچر کے مطابق پہنتی اوڑھتی اور بڑوں کی عزت کرتی تھی۔لیکن یاسر گاؤں کے ماحول سے بیزار تھا۔

شہر میں چند دوستوں نے مل کر ایک فلیٹ رینٹ پر لے لیا تھا۔جب اس نے وہ فلیٹ لیا تھا تب سے وہ ماں کے کئی بار فون کرنے پر گاؤں آتا۔ورنہ پہلے تو ہفتہ پندرہ دن میں چکر لگا ہی جاتا تھا۔کچھ وقت آگے سرکا تو اس کی دوستی اس کی کلاس فیلو لڑکی ثمرہ سے ہوگئی تو بس پھر وہ اس کا دیوانہ ہو کر رہ گیا۔

ثمرہ کا باپ دبئی میں جاب کرتا تھا اور ہر ماہ لاکھوں روپیہ ان ماں بیٹی کو بھیج دیتا۔جس سے ان کی عالیشان کوٹھی میں بہت سارے نوکر چاکر بھی ان سے افرڈ ہو رہے تھے یاسر نے ثمرہ کی محبت اور دولت کی چکا چوند کو دیکھتے ہوئے امبر کا خیال دل سے نکال دیا

ثمرہ کو اور زیادہ شدت سے چاہنے لگا۔
حتیٰ کہ چھٹی کے روز بھی ثمرہ اسے اپنے گھر بلا لیتی
رخوب مزے کے پکوان بنوا کر کھلاتی اور بہترین
مانی موویز دیکھی جاتی تھیں۔ادھر گاؤں میں ماں
ے ساتھ ساتھ باپ اور چچا بھی اس کا چہرہ دیکھنے کو
س جاتے۔امبر تو بے طرح اداس ہو جاتی کہ اس کا
ں کا جانی جو تھا اور دل میں رہنے والے تو سب سے
نل ہوتے ہیں نا۔اگر جو کبھی والدین کے اصرار پر
جاتا تو امبر کے ہاتھ کے بنے پکوان اور امی کے
یی گھر میں ڈوبے پراٹھے اس کی ڈائٹ خراب
رتے۔

لہٰذا وہ ایک دو نوالے لے کر چھوڑ دیا اور جلد
پسی کی راہ لیتا۔اس کچے مکان میں اب اس کا دل
میں لگتا تھا۔گاؤں کی سڑکوں پر پھیلے گندگی کے
ھیروں سے اس کو بدبو آتی۔سوچے سمجھے بغیر جب وہ
ن جذبات کا اظہار کرتا تو کبھی اس نے سوچا ہی نہ تھا
کہ اس کے والدین کے دل پر کیا گزرتی ہے۔جنہوں
نے جنم دیا پالا اور اب اتنے پیسے لگا کر پڑھا رہے تھے
۔یہ گھر جہاں اس کا بچپن گزرا یہ گھر اب اس کی شان
ہیں۔امبر یاسر کو اس طرح بدلتے ہوئے دیکھ کر خدا
کے آگے دعائیں مانگتی اس کے ساتھ کے حصول کے
لیے ایک مزار معصوم شاہ پر جا کر منت مانگتی اور دیا جلا
کر آتی ہر جمعرات کو کہ خدایا یاسر میرا ہے اس کو میرا ہی
کھنا۔آج یہ اس راستے پر چل رہا ہے کہیں ایسا نہ ہو یہ
کسی اور کا ہو جائے اور میں اس کی محبت کی دیوانی تھی
امن رہ جاؤں۔

میرے سوہنے رب تو اپنا خاص کرم مجھ پر فرما اور
یاسر میرا نصیب بنا دے جس دن یاسر نے گاؤں آنا
ہوتا وہ خود کو سنوارتی اور تائی امی کے گھر آ کر ان کا
کچن میں ہاتھ بٹاتی اور یاسر چند گھنٹے کے لیے آتا تو
اس کی جانب نظر بھر کے دیکھتا بھی نہ تھا یہ اس کے
جانے کے کتنے ہی دن تک ملول رہتی۔

پھر جب اس کو پتہ چلتا کہ یاسر آ رہا ہے تو اس کی
آنکھیں ایک نئی امید کے تحت پھر چمک اٹھتی تھیں اور
چہرہ بلش ہو جاتا کہ اس کا محبوب آ رہا ہے۔مگر وہ تو

کہرا

کہرا کہرا، چاروں اور ہے گھور اک کہرا
اوس کی شبنم تن پہ پڑے تو
گہرا سنہرا ہو یہ کہرا
اُڑتا پنچھی گردن تانے
جب جب بھی پرواز بھرے ہے
خوب ڈراوے ہے یہ کہرا
پنچھی اونچی گردن توڑے
اِک دم سے آ جاوے نیچے
گھاس فرش پہ جان یہ دے دے
کہرا کہرا گھور ہے کہرا
کتنا ظالم ہے یہ کہرا

شاعرہ: صائمہ عروج۔دوبئی

پورے کا پورا ثمرہ کی محبت کی گرفت میں تھا اب تو وہ
زیادہ وقت ثمرہ کے گھر گزارتا۔اس کی امی اس پر
بہت مہربان ہو رہی تھیں وہ اسے بازار سے نئے
ڈیزائن کے کپڑے دلواتی تھیں۔

نصرت آنٹی نے اس کو اتنے خوبصورت ڈریس
دلوائے کے اس کا کسرتی جسم ان ملبوسات سے سج گیا
اور وہ جوان خوبصورتی کا پیکر لگنے لگا۔شاپنگ کے
دوران مختلف ہوٹلوں سے مزے مزے کے کھانے
کھلاتی تھیں اور یاسر بہت عیش و آرام سے زندگی گزار
رہا تھا جس طرح کی زندگی کے اس نے خواب دیکھے
تھے۔

اپنے والدین کے گھر بچپن سے غربت نے
سارے شوق پس پشت ڈال رکھتے تھے۔وہ ثمرہ کے
ساتھ بہت خوش تھا۔مگر اس کو یہ بات کچھ الجھن ڈال
دیتی کہ ثمرہ سے زیادہ نصرت آنٹی اس پر مہربان کیوں
ہے؟

ایک دن اس کا راز بھی کھل گیا جب انہوں نے

یاسر کو برائی کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی تو یاسر بھڑک اٹھا۔

''میری محبت ثمرہ ہے اور آپ مجھے کس راستے پر لے جارہی ہیں۔''

''یہ جو لاکھوں روپے تم پر خرچ کرتی رہی یہ صرف اپنی ضرورت کیلئے کرتی تھی۔ یا میری بات مان لو یا پھر اپنے اوپر خرچ کیے پیسے واپس لوٹا دو۔'' یاسر بھلا ایک مفلس گھر کا لڑکا جس کی تعلیم کا خرچ اس کے والدین جانے کتنی مشکلوں سے پورا کر رہے تھے وہ کہاں سے لاتا اتنی بڑی رقم وہ نصرت آنٹی کے خوبصورتی سے بنے ہوئے جال میں پھنس گیا تھا ثمرہ سے اب دور ہوتا جارہا تھا اور نصرت آنٹی کے اتنا ہی قریب۔

ثمرہ یاسر کی بے رخی پر پریشان رہنے لگی یاسر خود بھی اندر سے ٹوٹ گیا تھا کہ وہ ثمرہ کی بجائے اس کی ماں کے ساتھ وقت گزار رہا ہے۔ گندگی کی عمیق گہرائیوں میں غرق ہو رہا ہے۔

یاسر کے قرب سے نصرت آنٹی اتنا خوش تھی کہ جیسے اس کی لاٹری نکل آئی ہو۔ انہوں نے ثمرہ اور یاسر کے ایک ساتھ باہر گھومنے پر پابندی بھی لگا دی تھی جبکہ خود یاسر کے ساتھ ہر وقت کہیں نہ کہیں جانے کا پروگرام بنا لیتی۔ ثمرہ اور یاسر پر سخت پابندی عائد تھی۔ ثمرہ اب دونوں کی شک کی نظر سے دیکھنے لگی۔ کبھی سوچتی یاسر اس کے ساتھ بے وفائی کا مرتکب ہو ہی نہیں سکتا وہ صرف اور صرف ثمرہ کا ہے اس طرح ایک سال گزر گیا ادھر یاسر کے چچا اور چچی ایک حادثے کا شکار ہو گئے اور زندگی کا چراغ گل کر بیٹھے۔ ماں بستر مرگ پر تھی۔ سارا گھر اپنا اجڑ گیا مگر یاسر کو اس کی کوئی پرواہ نہ تھی اس نے کبھی پلٹ کر گھر کی جانب دیکھا ہی نہیں تھا۔ جو قیامت ٹوٹی اس گھرانے پر اس کا سب سے زیادہ اثر امبر نے لیا۔

جس کے والدین چلے گئے اور صبر کے دو لفظ بولنے اس کا بچپن کا ساتھی یاسر بھی نہ آسکا گاؤں۔ تائی خود بھی شانزے کی محتاج تھی سارا گھر شانزے کے کاندھوں پر تھا۔ تایا ابو امبر کو اپنے گھر لے آئے جہاں وہ شانزے کے گلے لگ کے خوب روئی۔ والدین کے بچھڑنے کے ساتھ ساتھ یاسر کی بے وفائی کا دکھ بھی آنسو بن کے آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔

عدیل اور اس کی بیمار بیوی کے کندھوں پر دو جوان بیٹیوں کا بوجھ تھا اور انہوں نے ان کی شادی کیلئے رشتے دیکھنے شروع کر دیے رشتے آنے شروع ہو گئے تو امبر کا رشتہ تو جلد ہو گیا مگر شانزے کا نہ سکا۔ امبر کے سسرال والے شادی میں جلدی کرنے لگے تو عدیل نے سوچا شانزے کا ابھی ہو نہیں رہا تو جس کی بات طے ہے اس کو دہلیز پر بٹھا رکھنا کون سی عقل مندی ہے سو امبر کو بیاہ دیا۔ رخصتی کے وقت وہ بہت روئی۔ اپنے والدین کو یاد کر کے۔ حیثیت کے مطابق عدیل نے اس کو جہیز دے کر رخصت کر دیا۔

شومئی قسمت کہ امبر کو بہت محبت کرنے والا گھرانہ ملا ایک ساس اور دیور تھے جو اس کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے اور شوہر تو خلوص و محبت کا پرتو تھا۔ ثمرہ نے ماں سے ضد شروع کر دی کے میں یاسر سے شادی کروں گی۔ ماں سمجھاتی کہاں تم اور کہاں کم حیثیت یاسر۔ ہمارا جو مقام ہے اپنی سوسائٹی میں یاسر کو دیہاتی گھر کا لڑکا ہے ماں نے بہتیرا سمجھایا مگر وہ نہ مانی۔

ماں پریشان ہو گئی کہ بچپن سے ثمرہ جس بات کی ضد کر لیتی ہے وہ کر کے رہتی۔ ثمرہ کا جنوں ایک طرف۔ یاسر نے ثمرہ سے شادی سے انکار کر دیا کیونکہ نصرت آنٹی سے جنسی تعلقات کی بناء پر وہ اب ایڈز کا مریض بن گیا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ ثمرہ سے شادی کر کے وہ اس کی زندگی تباہ کرے۔

اس نے اپنے بازو پر گہرا کٹ لگا لیا جس سے بے انتہا خون بہہ جانے سے اسے فوری ہوسپٹل لے جایا گیا۔ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے وہ کئی گھنٹوں کی بے ہوشی کے بعد ڈاکٹروں کی کوشش سے ہوش میں آئی تو ماں کے گلے لگ کر بہت روئی۔ ثمرہ کے ہوسپٹل ایڈمٹ ہونے پر یاسر ہی اس کی دیکھ بھال کر رہا تھا ثمرہ نے پھر پوچھا کہ تم نے مجھ سے شادی سے انکار کیوں کیا۔ تو وہ ٹال مٹول کر گیا۔

ثمرہ صحت یاب ہوکر گھر آئی تو اس کی پھر وہی ضد تھی کہ یاسر سے شادی کروں گی۔

آخر کار نصرت آنٹی کو یہ زہر پینا پڑا اور یاسر کو راضی کرلیا ثمرہ سے شادی پر۔

امبر کی شادی کو ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ اس کے آنگن میں ننھا پھول علی کی صورت میں کھلا اور وہ کوشیوں کے ہنڈولوں میں جھول گئی۔

تایا جان اپنی فیملی کے ساتھ بہت سارے تحفے لے کر اس کے سسرال پہنچے۔ امبر کی خوشی دیدنی تھی وہ اپنے والدین کو یاد کر کے ملول تھی جب یہ سب پہنچے۔

ثمرہ کو یاسر مل گیا تو جیسے اسے دنیا جہاں کی خوشیاں مل گئیں۔ یاسر کے دل کی کلی کھل نہ سکی۔ کچھ دنوں بعد نصرت آنٹی نے دو ٹکٹ منگوا کر انہیں ہنی مون منانے کا آرڈر دیا وہ بے دام غلام کی طرح ان کی کوئی بات ٹال نہیں سکتا تھا۔ جب وہ ہنی مون منانے انگلینڈ گئے تو کافی حد تک یاسر کی طبیعت فریش ہوگئی۔ پاکستان واپسی پر اکثر وہ تینوں باہر کھانا کھانے جاتے ایک رات جب تینوں باہر سے کھانا کھا کر گھر آئے تو ثمرہ اور یاسر اپنے کمرے میں چلے گئے اور نصرت اپنے کمرے میں آگئی۔

آج پھر اس کے دماغ میں شیطان مسلط ہوگیا تھا۔ اس نے کال کر کے اسے بلایا اور یاسر کترا رہا تھا جب کہ وہ پاگل ہو رہی تھی۔ پھر اس نے اپنے بے چین وجود کو قرار دلا دیا یاسر خود کو بہت گناہ گار سمجھتا تھا۔ ابھی انگلینڈ گئے دو ہفتے ہی ہوئے تھے کہ آنٹی نصرت نے واپس بلا لیا تھا کہ وہ تنہا رہ گئی ہیں اور بچوں کے بغیر ان کا دل نہیں لگ رہا۔ جب وہ واپس آئے تو یاسر کے دل میں یہ خیال تھا کہ شاید اب نصرت آنٹی اپنی گندی حرکتوں سے باز آجائے گی اور اس کی جان چھوٹ جائے گی۔ لیکن آج رات پھر اس ناگن نے اس کو ڈس لیا تھا۔

ثمرہ اپنی آنکھوں میں یاسر کے حوالے سے خوبصورت رنگین خواب سجائے محو خواب تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ساتھ والے کمرے میں اس کی ماں اور سہاگ رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔

صبح اٹھی تو یاسر بستر پہ نہیں تھا اس کے موبائل پر رات تین بجے ماما کی کال تھی وہ سوچتی ہوئی ماں کے کمرے میں آگئی کہ پتہ نہیں ان کو یاسر سے کوئی کام تھا۔ وہ کمرے میں سو رہی تھیں اور یاسر باہر سے اندر داخل ہو رہا تھا اور بتا رہا تھا کہ صبح کی سیر کو دل کیا تو آج باہر سیر کیلئے چلا گیا۔

ناشتے کی میز پر ثمرہ نے پوچھا یاسر تمہارے موبائل پر امی کی کال تھی۔

ہاں وہ انہوں نے بلوایا تھا۔ کاروبار کے سلسلے میں بات کرنی تھی۔ اب کتنا فارغ رہوں''۔ اس کا چہرہ اس کے جھوٹ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ بڑی مشکل سے نصرت آنٹی اور یاسر نے بات کو سنبھالا۔ اب نصرت آنٹی بہت احتیاط کرنے لگی تھیں۔

مگر ان سے کنٹرول نہیں ہوتا تھا ہر تیسرے دن اس کو یاسر کی یاد ستاتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کی ماں بھی اللہ کو پیاری ہوگئی بیٹے کی شکل کو ترستی۔ باپ بھی بیٹے کی شکل کو ترستا فوت ہوگیا۔ امبر، شانزے کو اپنے دیور قاسم کے ساتھ بیاہ کر لے گئی وہ دونوں بہنیں بہت خوش تھیں ثمرہ کو جب ماں اور یاسر کے تعلقات کا علم ہوا تو اس نے طلاق لے کر گھر سے نکال دیا کچھ دنوں بعد نصرت آنٹی کو اٹیک ہوا اور وہ بھی اس دنیا سے چلی گئی۔ وہ اپنے پاپا کے ساتھ دوبئی چلی گئی۔ یاسر ہوسپٹل میں زیر علاج ہے۔

ثمرہ کی وجہ سے وہ کہلاتا تھا اب علاج کیلئے پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ لاوارث مریضوں میں کچھ علاج سے فرق پڑا تو گاؤں گیا اور اجڑی قبروں پر باپ چاچا کی قبروں پر پھوٹ پھوٹ کر رویا۔

اور پھر جب امبر شانزے کے گھر پہنچا تو ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق چند دن کی زندگی باقی تھی۔ امبر کا دل رک گیا یاسر آیا بھی تو کس حال میں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اور یاسر شانزے سے مل کر واپس زندگی کے بچے کھچے دن پورے کرنے کے لیے ہاسپٹل میں پڑا ہے۔

☆☆☆

ایس ایچ او

افشاں

ٹنڈو آدم کے اُس ایس ایچ او کی کہانی، جس کی بہادری اور بے باکی کے گن آج بھی گائے جاتے ہیں

1982-83ء میں ہم لوگ ٹنڈو آدم میں رہائش پذیر تھے۔ ہم تین بہنیں اور دو بھائی تھے۔ ہمارے ابو وکالت کرتے تھے اور امی بھی۔ ہم بہن بھائی اسکول اور کالج جاتے تھے۔ میں شادی کے بعد پنجاب آ گئی تھی۔

ان دنوں ہمارے شہر ٹنڈو آدم میں جرائم بہت زیادہ ہوتے تھے جس کا ذکر ہمارے ابو امی وغیرہ کرتے رہتے تھے۔ اخبارات میں ان حالات کا خبریں آتی رہتی تھیں۔ جب ہم اسکول اور کالج جاتے تھے جب بھی حالات صحیح نہیں تھے۔

پھر ہم نے محسوس کیا کہ شہر کے حالات میں تبدیلی آنے لگی ہے اور ہمارے ابو جو کورٹ اور تھانے جاتے رہتے تھے انہوں نے بتایا کہ نئے ایس ایچ او کے آنے اور سختی کرنے کی وجہ سے حالات درست ہو رہے ہیں۔

نئے ایس ایچ او جن کا نام ہمارے ابو نے مزار خان بتایا تھا، تعیناتی کے بعد کچھ تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

ہمارے محلے میں دو ہوٹل تھے جو رات دو ڈھائی بجے تک کھلے رہتے تھے اور ہوٹل میں تیز آواز میں گانے بجائے جاتے تھے جس سے اہل محلّہ کو پریشانی تھی۔ ہمارے ابو اور محلے والوں نے شکایت کی تو لیکن کچھ نہ ہوا کیونکہ وہ ہوٹل بااثر سیاسی شخصیت کے تھے۔ ان ہوٹلوں کی وجہ سے ہماری پڑھائی میں مشکلات پیدا ہو رہی تھیں۔

ایک رات اچانک لاؤڈ اسپیکر بند ہو گئے اور بالکل خاموشی ہو گئی۔ لائٹ بھی چل رہی تھی سمجھ میں نہ آیا کہ خاموشی کی کیا وجہ ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہمارے بھائی گھر آئے اور بتایا کہ نئے ایس ایچ او نے ہوٹل والوں کو سختی سے لاؤڈ اسپیکر استعمال کرنے سے منع کر دیا ہے اور وارننگ دی ہے۔

ہم اسٹوڈنٹ اور نماز عبادت کرنے والوں نے ایس ایچ او کو دعائیں کہ انہوں نے ہم لوگوں کو تکلیف سے نجات دلائی۔

کچھ دن بعد ابو اور بھائیوں نے بتایا کہ ایس ایچ او نے سارے شہر کے ہوٹل اور دکانیں رات گیارہ بجے بند کرنے کا حکم دیا ہے۔ اب رات دیر تک کھلی دکانیں اور ہوٹل گیارہ بجے بند ہو جاتے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ رات دیر دیر تک مرد حضرات اور نوجوان جو گھروں سے باہر رہتے تھے اب گیارہ بجے سے پہلے یا تو گھروں میں آ جاتے یا گھروں کے سامنے

چارپائیوں کرسیوں پر بیٹھ جاتے اور گھر والوں کو بھی ٹائم دینے لگے۔

اہم بات یہ تھی کہ ہم نے سالوں سے کبھی بھی پولیس کو اپنے محلے میں گشت کرتے نہیں دیکھا تھا بلکہ ہم راتوں کو شادی وغیرہ سے واپس آتے تو بھی کبھی ہم نے شہر میں پولیس نہیں دیکھی۔ لیکن اب اچانک رات دس گیارہ بجے ہمارے محلے میں پولیس والے گشت کرنے لگے تھے اور رات ایک دو بار ہمیں پولیس موبائل بھی ہمیں گلیوں میں گشت کرتی نظر آنے لگی۔ پولیس موبائل دیکھ کر ایک طرح کا تحفظ کا احساس ہونے لگا تھا۔

ابو نے بتایا کہ اس موبائل میں ایس ایچ او صاحب خود گشت کرتے ہیں۔ پہلے ہم لوگ گھر کا دروازہ سورج غروب ہونے کے بعد بند کر دیتے تھے۔ اب رات گیارہ بارہ بجے جب تک بھائی اور ابو گھر نہ آجاتے، کھلا رہتا تھا۔

ایک تبدیلی اور ہم نے دیکھی کہ ہم بہنیں اسکول اور کالج تانگے پر جاتی تھیں ہمارا تانگے والا ہمیشہ ون وے ٹریفک کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسکول لے جاتا تھا لیکن وہ اب اس خلاف ورزی کو چھوڑ کر لمبے راستے سے اسکول اور کالج لے کر جانے لگا اور ساتھ ہی سر پر ٹوپی اور قمیض کے بٹن جو ہمیشہ کھلے رکھتا تھا وہ بھی بند رکھنے لگا۔ ہم نے اس سے راستہ تبدیل کرنے کی وجہ معلوم کی تو اس نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر بتایا کہ ایس ایچ او جس گاڑی والے کو ون وے ٹریفک کی خلاف ورزی کرتے پکڑتا ہے اسے گاڑی، تانگے یا موٹر سائیکل سے اتار کر بیس پچیس بار کاٹ پکڑ کر روڈ پر اٹھک بیٹھک لگواتا ہے اور تمام تانگے والوں کو حکم دیا ہے کہ سر پر ٹوپی پہنا کرو اور جب سواری تانگے پر بیٹھے تو سگریٹ پینا منع ہے۔

ایک صبح ہم اسکول اور کالج کے لیے نکلے تو ہم نے شہر کی دیواروں پر اور گھروں کی دیواروں پر بڑے بڑے لال لفظوں میں لکھا دیکھا۔

"اپنے پھول جیسے بچوں اور نوجوانوں کو منشیات، جواء کی لعنت سے بچائیں، بچوں اور نوجوانوں کو کریمنل بنانے سے بچائیں۔ پولیس سے تعاون کریں۔ منشیات، جواء اور جرائم کے اڈوں کی نشاندہی کریں۔"

منجانب: ایس ایچ او نڈو آدم

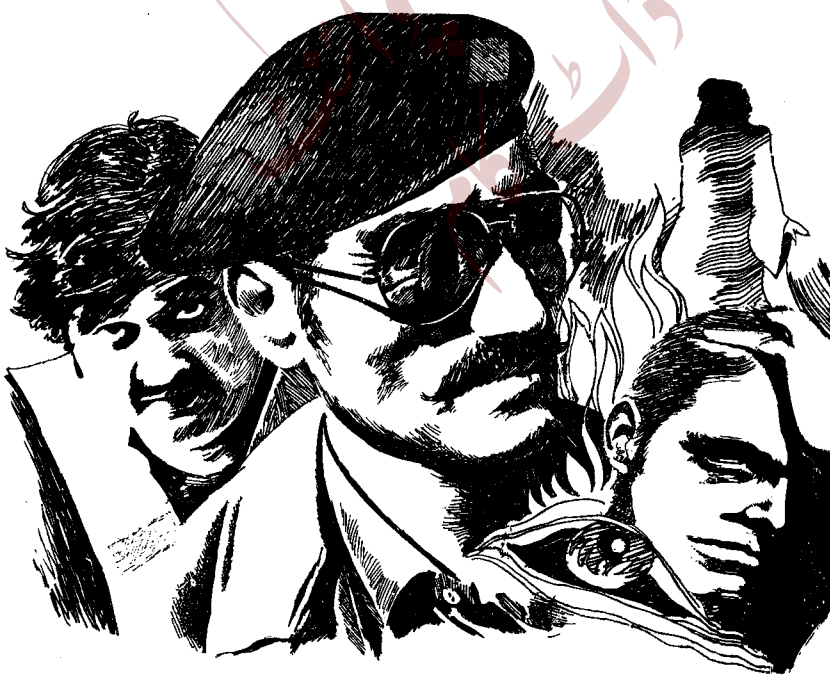

ہمارے بھائیوں نے بتایا کہ سارے شہر کی گلیوں میں اس طرح کے اشتہار لگائے گئے ہیں۔

اب ہمارے شہر میں چوری، لوٹ مار اور جھگڑے کی خبریں آنا بند ہو گئی تھیں۔ ہمارے گھر میں دو تین نیوز پیپر روز آتے تھے اور اس ایس ایچ او کی تعیناتی سے پہلے ہر دوسرے تیسرے دن چوری، لوٹ مار، قتل وغیرہ کی خبریں ہمارے شہر کی ہوتی تھیں لیکن اب ہمارے شہر میں کافی امن ہو گیا تھا۔

ایک دن ہمارے تانگے والے نے ہمیں شہر کے الیکٹرک پول کے ساتھ بندھے ہوئے ڈبے دکھائے۔ ان ڈبوں پر لکھا تھا۔

''قرآنی آیات کے اوراق اس میں ڈالیں۔ پاک ورق کو بے حرمتی سے بچائیں۔''

منجانب: ایس ایچ او

اب تو ہم سب لڑکیوں کو اس ایس ایچ او کو دیکھنے کا بڑا شوق ہوا۔ ہماری اور ہمارے بڑوں کے زندگی میں پہلے کبھی اس طرح کا پولیس افسر نہیں آیا تھا۔ ہم لڑکیوں نے اپنے تانگے والے سے کہا کہ وہ ہم کو ایس ایچ او کو دکھائے۔ تانگے والے نے بتایا۔ ''دن کو تو وہ خود ہم کو کم نظر آتا ہے۔ البتہ رات دس گیارہ بجے کے بعد اکثر اس کو موبائل پر یا پیدل گشت کرتے دیکھا جا سکتا ہے۔''

ایک بات اور آپ کو بتانا بھول گئے وہ یہ کہ اگر کبھی رات کو گیارہ بجے کے بعد ایس ایچ او کو کوئی گلی یا راستے میں نظر آتا تو اس کو روک کر سختی سے پوچھ گچھ کرتا۔ ایک دو بار ہماری گلی میں بھی اس ایس ایچ او کے بولنے کی آوازیں ہم نے خود سنیں۔ اور وہ فالتو گھومنے والوں کو وارننگ دیتا کہ وہ فالتو نہ گھومیں۔

اب اکثر ہمارے گھروں اور محلے کی عورتیں جب بچے ان کو تنگ کرتے یا کہنا نہ مانتے تو ان سے کہتیں کہ ٹھہرو ابھی ایس ایچ او مزار خان گزرے گا اس کے حوالے کرتی ہوں۔ تو بچے شرارت نہ کرتے۔

ہمارے بھائیوں نے بتایا کہ پولیس اسٹیشن کے سامنے جو لان بنا ہوا ہے اس لان میں اس ایس ایچ او نے چار لکڑی کے کیلیں گاڑھی ہوئی ہیں جب بھی وہ کسی منشیات فروش، چور، غنڈہ یا لٹیرے کو پکڑتا ہے تو ہر شام چار بجے اس کیلیوں کے ساتھ باندھ کر بید کی ڈنڈی سے اس کے پٹائی کرتا ہے اور وہ چلاتے ہیں اور توبہ توبہ کرتے کہ ہم آئندہ جرم نہیں کریں گے۔

ہمارے بھائی بتاتے تھے کہ شہر میں پہلے چند غنڈہ قسم کے لوگ گلے کے بٹن کھول کر شہر میں پھرتے تھے اور غریبوں کو تنگ کرتے تھے۔ ان سب کو ایس ایچ او نے مار لگائی تو اب وہ لوگ یا تو شہر میں نظر نہیں آتے اگر نظر بھی آئیں تو شریفوں والا حلیہ بنا کر نکلتے ہیں۔ جب ایس ایچ او اس قسم کے مجرموں کو مار لگاتے تھے تو اکثر شہر کے لوگ شام چار پانچ بجے پولیس اسٹیشن کے گرد آجاتے تھے اور اپنے بچوں کو بتاتے کہ برے کام کا برا انجام ہوتا ہے۔ شہر کے بڑے اور بچے اس مار سے نصیحت لیتے تھے۔

یہ سب کچھ ہمارے بھائی دیکھ کر آئے تھے اور ہمیں بتایا تھا کہ اکثر ابو بھی امی سے اور ہم سے ذکر کرتے تھے کہ سب سے پہلے تو ایس ایچ او نے اپنے اسٹاف میں گندی شہرت رکھنے والے اسٹاف کو تبدیل کر دیا پھر بھی اگر کوئی اسٹاف کا ممبر عوام کے ساتھ زیادتی کرتا تو اس کو ایس ایچ او اپنے تھانے کی لاک اپ میں بند کر دیتا۔

ہم لڑکیوں کے کالج اور اسکول کی جب چھٹی ہوتی تھی تو شہر کے چند اوباش لڑکے جو سب شہر کے بڑے آدمیوں کے بیٹے تھے وہ موٹر سائیکل پر ہمارے تانگوں کا پیچھا کرتے، فقرے کستے، چھیڑ خانی کرتے، تبھی ہم لڑکیوں نے کالج میں آپس میں مشورہ کر کے ایس ایچ او کو اپنی اس تکلیف کے سلسلے میں نامعلوم نام سے خط لکھ کر بتایا۔

تین دن بعد جب ہم چھٹی پر واپس گھر آرہے تھے تو ہم نے دیکھا کہ پولیس کے لوگ جو بغیر وردی کے تھے وہ ان سب لڑکوں کو ایک ایک کر کے پکڑ کر لے گئے۔

شام کو بھائیوں نے بتایا کہ آج شام ان سب کو تھانے کے لان میں کان پکڑوا کر بار بار اٹھک بیٹھک ایس ایچ او لگواتا رہا ان لڑکوں کے والد اور عزیز جو ان کو چھڑوانے آئے تھے ان کے سامنے بعد میں سب کو

آزاد کر دیا۔ آپ یقین کریں ہم نے پھر کبھی ان لڑکوں کو نہ دیکھا۔

لیکن ابو نے بتایا کہ ان لڑکوں کے والد اور جو عزیز تھے ان لوگوں نے اپنے لڑکوں کی سرے عام بے عزتی کا بدلا لینے کے لیے اس ایس ایچ او کی شکایت مجسٹریٹ کو کی اور اس کا ٹرانسفر کرانے کے لیے بڑی کوشش کی لیکن شہر کے معززین نے ٹرانسفر نہ ہونے دیا۔ شہر کے معزز اور شریف لوگوں کی ایس ایچ او بڑی عزت کرتا تھا۔

ہم سب لڑکیوں کو بڑا شوق تھا کہ اس ایس ایچ او کو دیکھیں جس کا اتنا چرچا رہتا تھا اور رعب اور خوف تھا۔ ہم نے اپنے تانگے والے سے کہہ رکھا تھا کہ ایس ایچ او نظر آئے تو ہمیں ضرور دکھانا۔

ایک دن جب ہمارے کالج کی چھٹی ہوئی تو ہم نے دیکھا کہ روڈ پر جگہ جگہ پولیس کھڑی ہے، ٹریفک پولیس بھی تھی۔ تانگے والے نے بتایا کہ آج کوئی وی آئی پی شہر سے گزر رہا ہے۔ پھر جب ہمارا تانگہ چوک پر آیا تو تانگے والے نے ہمیں بتایا کہ موبائل گاڑی کے پاس ایس ایچ او کھڑا ہے۔ ہم سب لڑکیوں نے جب اس کو دیکھا تو حیران رہ گئے کہ وہ دبلا پتلا آدمی تو بالکل کالج اسٹوڈنٹ لگ رہا ہے۔ نہ تو اس کی توند تھی اور نہ اس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ ہمارا تو خیال تھا کہ اتنے رعب و دبدبے والا کوئی خرانٹ قسم کا پولیس والا ہوگا پر یہ تو اسمارٹ تھا جس پر یونیفارم جچ رہا تھا۔ ہمارے حیران ہونے پر تانگے والے نے بتایا کہ جب یہ کسی کو پکڑ کر پٹائی کرتا ہے تو یہ جو آپ لوگوں کو ابھی اسمارٹ نظر آ رہا ہے اس وقت یہ آپ کو دس فٹ کا خونخوار لگے گا۔

پھر ایک رات ڈیڑھ دو بجے کے قریب ہمارے محلے کے پیچھے سے اچانک سخت فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم سب محلے والے جاگ گئے۔ ابو نے تھانے فون کیا تو بتایا گیا کہ ہمارے محلے کے پیچھے جو گنے کی فصل ہے اس میں ڈاکوؤں سے ایس ایچ او کا مقابلہ چل رہا ہے۔

دو ڈھائی گھنٹے بعد فائرنگ اور دھماکے بند ہوئے اور گلی میں پولیس موبائل اور پیدل پولیس والے تھانے کی طرف جانے لگے تو ابو اور بھائی گھر سے باہر گلی میں گئے اور پھر واپس آ کر بتایا کہ ایک نامی گرامی ڈاکو گینگ سے مقابلہ ہوا تھا جس میں ایک ڈاکو ہلاک اور دو پکڑے گئے ہیں۔ ایس ایچ او زخمی ہوا ہے۔

صبح تک ہم لوگ سو نہ سکے۔ ایس ایچ او کے لیے دعائیں کرتے رہے۔ ہمارے کالج اور اسکول میں بھی پورا وقت لیکچرارز، ٹیچر اور اسٹوڈنٹ اس مقابلے کی بات کرتے رہے۔ شہر پر ایک خوف کا عالم سا تھا۔

شام کو ابو نے آ کر بتایا کہ وہ خود مرنے والے ڈاکو کی لاش اور پکڑے گئے ڈاکو دیکھ کر آئے ہیں جن سے بھاری اسلحہ برآمد ہوا ہے اور کافی کیسوں میں پولیس کو کافی عرصے سے مطلوب تھے۔ شہر کے لوگ ایس ایچ او کو دیکھنے آتے اور دعائیں دیتے، زخم زیادہ گہرا نہ تھا۔

اور پھر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ایک دن ابو نے گھر آ کر بتایا کہ وہ آج ایس ایچ او کے ٹرانسفر کے الوداعی پارٹی میں شریک ہو کر آئے ہیں۔ اس کے ٹرانسفر کسی ایسے تھانے میں کر دیا گیا ہے جہاں جرائم بہت بڑھ گئے ہیں۔ شہر کے معززین نے بڑی کوشش کی کہ یہ ٹرانسفر نہ ہو مگر ان کے بڑے سینئر افسر نے کہا کہ ہمیں اس ایس ایچ او کی وہاں بہت ضرورت ہے۔ الوداعی پارٹی شہر کے ناظم اور شہریوں کی طرف سے دی گئی تھی۔

میرا منگیتر جو کبھی کبھی پنجاب سے ہمارے شہر آتا تھا وہ بھی اس ایس ایچ او کا چاہنے والا تھا اور ہر وقت اس کی باتیں کرتا تھا۔ وہ اس ایس ایچ او کے کارناموں کی خبریں اخبار میں سے تراش کر رکھتا تھا۔ ہماری شادی ہوگئی ہم پنجاب آ گئے ہماری بچی ہوگئی۔ میرا میاں اپنے بچوں کو اس پولیس افسر کی باتیں بتاتا تھا۔ اور اخبار کے تراشے دکھاتا تھا اور میری بڑے بیٹے کا نام اس ایس ایچ او مزار خان کے نام کی مناسبت سے رکھا اور وہ اسے پولیس افسر بنانا چاہتا تھا لیکن ایک ایکسیڈنٹ میں وہ فوت ہو گیا۔ پھر آج کے حالات دیکھ کر میں نے اپنے بیٹے کو پولیس میں نوکری نہ کرنے دی۔ اب پولیس نوکری پہلے جیسی نہیں ہے۔

☆☆☆

داسی

احمد سجاد بابر

برصغیر کی اُس عظیم ادیبہ کی داستانِ حیات، جو تاحیات اپنے دیوتا کی داسی رہی
پیار کا یہ دیا ہمیشہ روشن رہے گا

بہت کم انسانوں کو روح ملتی ہے۔ جسم سب کو ملتے ہیں۔ جسم گدھ ہے۔ اس سے بھی اوپر اٹھ جائے تو راجہ گدھ ہے مگر روح اشرف المخلوقات ہے۔ وہ اشرف المخلوقات میں سے تھیں۔

4 فروری 2017ء کو داسی اپنے آخری سفر پر روانہ ہوئیں اور یوں اشفاق احمد سے 13 سال کی جدائی بھی ختم ہوگئی مگر وہ داستان سرائے اجڑ گیا جس کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا، لاہور کے جنوب میں واقع قیامِ پاکستان سے قبل کی ماڈرن بستی ماڈل ٹاؤن کے ''داستان سرائے'' میں اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی یادیں بکھری ہوئی ہیں۔ ان دونوں کا تخلیقی سفر جیسے جیسے طے ہوتا گیا ''داستان سرائے'' کے نقوش اُبھرتے گئے۔ آج ''داستان سرائے'' ان دونوں کی شب و روز محنت اور یادوں کا امین تو ہے مگر یہاں قدم قدم پہ ادب کے عظیم قلمکاروں کی یادیں چکراتی پھرتی ہیں۔ بانو قدسیہ۔۔۔۔ راجہ گدھ کی خالق، بابا اشفاق احمد کی داسی، اس فانی دنیا سے رخصت ہو کر وائی جہان کو چل پڑیں، سننے والے مجسموں کی طرح بیٹھے رہ گئے، کیسی کیسی محفلیں یہاں جمیں، کیسے کیسے ہمالیہ صفت لوگ یہاں آتے رہے، مگر اب صرف گئے وقت کی دھول اڑتی ہے!!

بانو قدسیہ 28 نومبر 1928ء کو متحدہ پنجاب کے شہر فیروز پور میں پیدا ہوئیں۔ ان کا تعلق جاٹ خاندان کی چٹھہ شاخ سے ہے جس کے بیشتر ارکان کا تعلق کھیتی باڑی اور زمینداری کے پیشے سے تھا۔ والدہ نے ان کا نام قدسیہ بانو رکھا تھا لیکن وہ ادب میں بانو قدسیہ کے نام سے معروف ہوئیں۔ ان کا پہلا افسانہ اس نام سے چھپا تھا۔ ان کے والد کا نام بدر الزمان تھا، ایگری کلچرل (زراعت) کے شعبے میں بی ایس سی کی ڈگری لینے کے بعد انہوں نے سرکاری ملازمت اختیار کی اور متحدہ پنجاب کے ضلع حصار میں ڈائریکٹر کے عہدے تک پہنچ گئے۔ بدر الزمان کو گھڑ سواری کا شوق تھا اور وہ فٹ بال کے علاوہ ٹینس کے بھی عمدہ کھلاڑی تھے لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ قدسیہ بانو اوائل عمری کے چوتھے سال سے گزر رہی تھیں کہ 1932ء میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ پسماندگان میں ان کی والدہ مسز ذاکرہ چٹھہ (پ 1905) بڑا بھائی پرویز چٹھہ اور خود قدسیہ شامل تھیں۔ اس وقت ان کے بھائی کی عمر قریباً پانچ برس تھی۔

اپنے شوہر بدرالزمان کی وفات کے بعد مسز ذاکرہ چٹھہ نے جن کی عمر اس وقت قریباً 27 برس تھی' اپنی تعلیم مکمل کی اور انہیں ایک مدرسہ میں ہیڈ مسٹریس کی ملازمت مل گئی۔ اس دوران تین افراد پر مشتمل یہ خاندان ضلع کانگڑہ کے خوبصورت شہر دھرم شالہ میں منتقل ہو گیا جو انگریزوں کی ایک اہم فوجی چھاؤنی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس شہر کی دلکش یادیں بانو قدسیہ کے دل میں محفوظ ہیں اور وہ جب چاہتی ہیں ان یادوں کی بازیافت کر لیتی ہیں۔ اس کا ایک صوری نقش انہوں نے اپنے الفاظ میں یوں محفوظ کر رکھا ہے۔

''یہ 1937ء کا واقعہ ہے: ان دنوں دھرم شالہ کی کل آبادی پانچ ہزار تھی لیکن اس تھوڑے سے معمورہ کے لئے بجلی' پکی سڑکیں' سول ہسپتال' سینما گھر' لڑکے اور لڑکیوں کے لئے دسویں تک سکول بمعہ ایک عدد انگریز ہیڈ ماسٹر موجود تھا۔ ایک ایسا کلب مخلوط تھا اور اس میں کچھ آزاد خیال پڑھی لکھی اور امیر خواتین بھی برابر کی ممبر تھیں..... پانچ ہزار کی آبادی کے لئے تہذیبی طور پر تو حکومت نے بہت سی عنایات کر رکھی تھیں لیکن ان پہاڑی علاقوں کی شامیں پھر بھی اداس رہا کرتی تھیں..... پہاڑوں میں عموماً شام پڑتے ہی شہر سنسان ہونے لگتا ہے اور پہاڑی لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے پر پہاڑوں کو اندھیروں میں ڈوبتے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔''

دھرم شالہ کی اس تنہائی میں قدسیہ بانو کی سوچ ایک طرف خاموشی کے پہاڑ کو کاٹ رہی تھی تو دوسری طرف ان کے معصوم دل میں انوکھے سوالات بھی ابھار رہی تھی۔ ان سوالات کا اب تجزیہ کیا جائے تو انہیں ان کے کھلی آنکھوں کے ایسے خوابوں سے موسوم کیا جا سکتا ہے جن کی حقیقی تعبیریں مستقبل کے پردوں میں چھپی ہوئی تھیں۔ اس قسم کا ایک خواب قدسیہ بانو نے نو سال کی عمر میں دیکھا تھا:

''ایسی ہی ایک اداس گھرتی شام کو میری والدہ (مسز ذاکرہ چٹھہ) بھائی (پرویز چٹھہ) اور میں گھر لوٹ رہے تھے۔ صاف ستھری سڑک کے کنارے بانس کے جھنڈوں میں جگنو جگمگا رہے تھے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ بجلی کے بلب روشن تھے۔ سناٹا تھا۔ ایسی خاموشی جو صرف پہاڑوں پر ممکن ہے۔ چلتے چلتے میری نظر آسمان پر گئی۔ ایک ستارہ جو روشنی میں باقی ستاروں سے سوا تھا مجھے نظر آیا اور پہلی بار مجھے یوں لگا کہ میں جلاوطن ہوں اور مجھے اس ستارے میں لوٹ جانا ہے کیونکہ یہی میرا مسکن اور یہی میری منزل ہے۔ میں نے اپنی پڑھی لکھی ماں سے کہا

''میں اس چمکتے ستارے سے آئی ہوں اور وہیں میرا گھر ہے''

لیکن ماں نے معصومیت سے جواب دیا

''ہم سب اسی ستارے میں رہتے ہیں..... تم، میں اور پرویز..... یہاں آنے سے پہلے۔''

بچپن کے اس تجسس آمیز دور میں قدسیہ کے دل میں قسم قسم کے مہمل سوالات جنم لیتے رہتے اور وہ ان کا جواب وصول کرنے کے لئے اپنی ماں کے پاس ہی جاتی۔ ایک مرتبہ ان کی سہیلیوں نے کہا کہ تمہارا ابا گزر گیا ہے' تو قدسیہ نے امی سے سوال کیا گزر گیا' کیا ہوتا ہے۔ امی نے بڑے بھول پن سے کہا ''گزر گیا..... یعنی چلا گیا..... یہ دیکھو ایسے.....'' اور پھر وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور اس طرح ان کے نزدیک یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو گیا۔ ان کی والدہ 27 برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھیں' اس وقت تو شاید قدسیہ اس بات کو نہ پا سکیں کہ ان کی ماں بیوگی کے پہاڑ کو کس طرح کاٹ رہی تھیں لیکن لمبے عرصے کے بعد جب انہیں دیکھی ہوئی حقیقتوں' مشاہدوں اور تجربات کا تجزیہ کرنے کا سلیقہ آ گیا تو انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان کی ماں نے جوانی سے بڑھاپے تک کا سفر اپنا دل خود بہلا کر کاٹا تھا۔ انہیں اوکھے لوگوں کے ساتھ پھیکی' روکھی باتیں کرنے اور تشنہ جواب حاصل کرنے کی خواہش نہیں تھی۔ انہوں نے اپنی اولاد سے کبھی سوال نہیں کیا ''کہ تم لوگوں کے پاس میرے لئے کیا تھوڑا سا وقت بھی نہیں ہے۔؟''

اس کے برعکس بانو قدسیہ نے لکھا:

''وہ اس عمر میں بھی لطیفوں پر ہنس سکتی ہیں' سکریبل کھیل کر' گانے گاتے ہوئے' چھوٹے چھوٹے بچوں کو کہانیاں سنا کر ان کے لئے نظمیں لکھ کر مسرور ہو جاتی ہیں''

اپنے بچپن کے بارے میں بانو قدسیہ کہتی ہیں

''جب میں ساڑھے تین برس کی تھی تو میرے والد فوت ہو گئے تھے۔ تو میری والدہ نے مجھے سنگل ہینڈ ڈلی

(اکیلے) پالا۔ وہ اس وقت جالندھر میں ہیڈ مسٹریس تھیں۔ جب میں نے پڑھنا شروع کیا۔ اس سے پہلے کی تو یادداشتیں بھی موجود نہیں ہیں۔ لیکن جب میں نے تختی لکھنا سیکھی تو ہم جالندھر میں رہتے تھے۔ عمران خان کی خالہ تھیں جنہوں نے مجھے تختی لکھنا سکھایا۔ عمران خان کو تو آپ جانتے ہی ہیں (پاکستان کے مشہور کرکٹر اور اب سیاست دان) تو ان کی خالہ نے مجھے تختی لکھنا سکھایا، پڑھنا لکھنا سکھایا اور میرے نانا نے میری تربیت کی اور مجھے لکھنا پڑھنا سکھایا۔ اور ان کی ایک ہی ڈیمانڈ (تقاضا) ہوتی تھی: بیٹی شکستہ لکھو۔ مرد کی طرح لکھو عورتوں کی طرح گول گول نہ لکھو۔ تو آپ دیکھیں کہ میری اور اشفاق صاحب کی لکھائی میں اتنا کم فرق ہے کہ اگر میں اشفاق صاحب کا سکرپٹ دے دوں یا اپنا سکرپٹ دے دوں تو کوئی پہچان نہیں سکے گا۔''

سوال ابھارنے اور پھر جواب تلاش کرنے کی اس عادت نے ہی بانو قدسیہ کو افسانہ نگار بنا دیا۔ انہیں بچپن میں دھرم شالہ کا افسانوی ماحول میسر آ گیا تھا۔ اس ماحول نے ان کے فطری ذوق کی پرورش کی۔ گھر میں بہن بھائیوں اور عم زادوں کی کثرت نہیں تھی، تین افراد پر مشتمل ایک جواں سال بیوہ کا گھر جس میں ہر وقت خاموشی اور تنہائی رہتی۔ اردگرد پہاڑ تھے اور مناظر قدرت کا حسن تھا۔ گھر میں پینٹ باکس تھے اور کتابیں تھیں۔ پرویز چٹھہ پینٹنگ کی طرف مائل ہو گئے۔ قدسیہ کو کہانیاں بنانے کا شوق لاحق ہو گیا۔ بانو قدسیہ نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی قصبے ہی میں حاصل کی۔ دھرم شالا کے سکول میں جب وہ پانچویں جماعت میں تھیں تو ان کے اسکول میں ڈراما فیسٹیول کا انعقاد ہوا جس میں ہر کلاس کو اپنا اپنا ڈراما پرفارم کرنا تھا۔ بہت تلاش کے باوجود بھی کلاس کو تیس منٹ کا کوئی اسکرپٹ دستیاب نہ ہوا۔ چنانچہ ہم جولیوں اور ٹیچرز نے اس مقصد کے لیے بانو قدسیہ کی طرف دیکھا جن کی پڑھنے لکھنے کی عادت کلاس میں سب سے زیادہ تھی۔ ان سے درخواست کی گئی کہ تم ڈرامائی باتیں کرتی ہو لہٰذا یہ ڈراما تم ہی لکھ دو۔ بانو قدسیہ نے اس چیلنج کو قبول کیا اور بقول ان کے جتنی بھی اردو آتی تھی اس میں ڈراما لکھ دیا۔ یہ ان کی پہلی کاوش تھی۔ اس ڈرامے کو اسکول بھر میں فرسٹ پرائز کا حقدار ٹھہرایا گیا۔ اس حوصلہ افزائی کے بعد وہ دسویں جماعت تک افسانے اور ڈرامے ہی لکھتی رہیں۔

انگریزی زبان کی تعلیم نے ان کو انگریزی میں نظمیں لکھنے پر بھی مائل کیا اور کبھی کبھی انگریزی نظم خود بھی بن جاتی لیکن افسانہ نگاری پر پوری توجہ دینے کی وجہ سے انہوں نے انگریزی نظم نگاری کی مشق نہیں کی۔

بانو قدسیہ کا اپنا خیال ہے کہ ساتویں جماعت تک وہ کوئی ذہین طالبہ نہیں تھیں۔ اپنی اس ابتدائی عمر میں انہیں اپنے گھر پر کسی بزرگ مرد کی سرپرستی بھی حاصل نہیں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے باطن میں شدید احساس کمتری پیدا ہو گیا۔ ثانیاً ان میں ایک خوف بھی سرایت کر گیا۔ ممکن تھا کہ وہ داخلیت پسند اور معاشرے کو سہمی ہوئی' خوفزدہ نظروں سے دیکھنے والی لڑکی بن جاتیں لیکن خوش قسمتی سے اس برس میں ہی ان کی زندگی میں ایک انقلابی تبدیلی کا سبب پیدا ہو گیا۔

بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

''ساتویں جماعت میں میری ملاقات ایک ہندوستانی بزرگ سے ہوئی جن کی سرپرستی نے میرے اندر کی دنیا بدل دی۔ میں اپنے خول سے بتدریج باہر نکلتی گئی۔ میں اپنی نظروں میں بلند ہو گئی اور میرے اندر کسی قدر اعتماد پیدا ہو گیا۔ آٹھویں جماعت میں، میں کانگڑا والی میں اول آئی۔ دسویں میں بھی اول آئی۔''

دھرم شالا میں تعلیم کا انتظام صرف میٹرک تک تھا۔ چنانچہ بانو قدسیہ کو یہ پہاڑی شہر چھوڑ کر لاہور آنا پڑا۔ کوپر روڈ کالج سے ایف اے کرنے کے بعد انہوں نے کنیئرڈ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ رہائش کا انتظام ہوسٹل میں کیا۔ ایک چھوٹے سے دور افتادہ قصبہ نما شہر سے نکل کر ایک بڑے شہر کی زندگی اور ''لاہوری کلچر'' کو قریب سے دیکھنے کا انہیں پہلا موقع ملا۔ اس دوران بانو قدسیہ کا خاندان گورداس پور منتقل ہو چکا تھا۔ ان کی والدہ ڈسٹرکٹ انسپکٹریس آف سکول بن چکی تھیں۔ بانو قدسیہ بی اے کا امتحان دینے کے بعد اپنی والدہ کے پاس آ گئیں جو ایک سکھ کی حویلی میں کرایہ دار کی حیثیت میں رہتی تھیں۔ پھر اگست 1947ء آ گیا' آزاد ہندوستان میں

پاکستان معرض وجود میں آ گیا لیکن جب باؤنڈری کمیشن کا اعلان ہوا تو گورداس پور کو ہندوستان میں شامل کر دیا گیا تھا۔ آزادی کے دن کی کیفیت بانو قدسیہ کے الفاظ میں یوں ہے:

''دن گرم ہو گیا۔ رات ہونے سے پہلے بہت سے لوگ ہمارے آنگن میں جمع ہو گئے اور اس نے مہاجر کیمپ کی شکل اختیار کر لی۔ ان میں سے چند ایک کے سوا اکثر سے ہماری جان پہچان بھی نہیں تھی۔ چودہ اگست کا گرم آسمان ہمیں چوطرفہ گھیرے ہوئے تھا۔ وہی چھتی گلی جیسا راستہ' باورچی خانہ میں کام کرنے والی بنگالی مریم' بھینس کا دودھ دوہنے والا نذیر' نانک چندی اینٹوں والی پچھلی گلی' پچھواڑے کھلا گراؤنڈ' سب کچھ وہی تھا..... لیکن نہ جانے کون کھڑیا مٹی سے ہماری ڈیوڑھی پر نشان بنا گیا تھا۔ یہ نشان ایسا تھا جس نے ہندو سکھوں کے اس محلے میں ہمارے گھر کو بالکل الگ تھلگ کر دیا تھا۔ اس نشان کو خطرہ سمجھتے ہوئے ہم نے آہستہ آہستہ سامان باندھنا شروع کر دیا تھا۔ صبح تمنا کا جو ننھا سا بچہ منہ میں چوسنی لئے آرام سے سو رہا تھا' ایک ہچکی لے کر ہمیشہ کے لئے سو گیا۔ ہم نے کیوٹی کورا جیسے خوشبودار خواب، اس کی آرائش کے تمام چھوٹے چھوٹے فراک نما پلان' پروان چڑھانے کے ٹانک جیسے عزم' اس کے پالنے میں ڈالے اور پنگھوڑے کو لاشعور کے گودام میں ڈال دیا۔''

ان احساسات کے ساتھ بانو قدسیہ کے خاندان کے ساتھ ان کی نشان زدہ حویلی میں جمع ہونے والے لوگوں نے ہجرت کی اور پاکستان آ گئے۔ بانو قدسیہ کو ایک رضائی میں چھپا کر لایا گیا تھا۔ بانو قدسیہ کا بی اے کا نتیجہ لاہور آنے کے بعد نکلا اور وہ کامیاب قرار دی گئی تھیں۔ اب ان کی والدہ کی خواہش تھی کہ بانو کی شادی کر دی جائے۔ وہ مزید تعلیم کے حق میں نہیں تھیں اس لئے ڈیڑھ سال تک تعلیم کا سلسلہ منقطع رہا لیکن پھر ان کی والدہ کی ایک سہیلی نے ان کی معاونت کی اور انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ بی اے تک یہ ریاضی کی طالبہ تھیں اور ''فائدے'' کو عین سے لکھا کرتی تھیں۔ آٹھویں جماعت تک یہ بھی ''حبشی'' کو ''حشی'' پڑھتی تھیں' لیکن پھر خدا جانے ان کی غیرت نے کیسے کروٹ لی کہ لاگت بازی میں آ کر اردو زبان کا مطالعہ شروع کر دیا۔ بی اے کے بعد فتح محمد جالندھری صاحب کی اردو گرامر' گھر پڑھی۔ پھر مولوی قمر دین صاحب ریٹائرڈ نائب مدرس چوہٹہ مفتی باقر کی ٹیوشن رکھ کر املا درست کی اور ایم اے اردو میں داخلہ لے لیا۔

اپنی داستان کے ورق الٹتے ہوئے بانو قدسیہ کہتی ہیں۔

''بی اے کے بعد ایم اے میں جب آئی تو میں ایک ناول لکھ رہی تھی۔ کہانیاں لکھ رہی تھی لیکن کوئی سورس نہیں تھا کہ میں انہیں کہاں بھجواؤں کیا کروں، کس طرح کروں؟ ایم اے میں جب پہلے سال میں ہم داخل ہوئے تو، جیسے کہ میں آپ کو پہلے بتایا ہے کہ ہمارے پروفیسر سرداری لعل صاحب نے کہا تھا کہ تم ایم اے میتھ میں کر لو، تو آدھے راستے میں، میں یہ ارادہ کر کے گئی تھی کہ میں اپنے پروفیسر کی بات مانوں گی لیکن جب میں وہاں پہنچی تو یک دم ارادہ بدل دیا، مجھے پتہ چلا کہ پہلا سیشن اردو کا شروع ہو گیا ہے۔ مجھے باہر لوگوں سے پتہ چلا کہ یہاں ایم اردو کی بھی تیاری ہو گئی ہے، بی اے میں میں نے میتھ اور اکنامکس پڑھے تھے، اردو کا سنا تو سوچا کہ میرے لکھنے میں یہ چیز کام آئے گی۔ میں کچھ اردو سیکھ لوں گی۔ پڑھنا بھی مجھے نہیں آتا تھا کیونکہ میں نے کانونٹ سے تعلیم حاصل کی تھی تو کانونٹ ہی، اور پھر کنیرڈ کالج، تو آپ کو پتہ ہے کہ کنیرڈ کالج کیا اردو سکھائے گا تو پھر میں نے وہاں پرنسپل پروفیسر سراج، جو انگریزی کے پروفیسر تھے، ان سے کہا کہ جی میں اردو میں ایم اے کرنا چاہتی ہوں۔ غالباً اڑتالیس کی بات ہے۔ تو انہوں نے مجھ سے کہا: بیٹا تمہاری کوئی اردو کی بیک گراؤنڈ ہے پڑھنے لکھنے کی؟ تو میں ان سے کہا جی میں صرف ایک ہی کتاب پڑھی ہے، پنڈت رتن ناتھ سرشار کی، اور وہ ہے 'فسانہ آزاد'۔ تو انہوں نے کہا کہ تمہیں اتنی ہی اردو آتی ہے؟ تو میں نے کہا کہ جی میں اسی پر ہی کام کروں گی۔ میں تھیسس بھی اسی پر لکھوں گی اور کام بھی اسی پر کروں گی۔ آپ مجھے اجازت دے دیجیے۔ پھر میں فیل ہو گئی تو آپ مجھے ففتھ ائر میں نکال دیجیے گا۔ تو انہوں نے کہا ''چلو، تمہیں داخلہ دیتے ہیں''۔ تو ہم پانچ چھ سٹوڈنٹ تھے۔''

یوں تعلیمی منزل کی طرف سفر شروع ہو گیا۔

☆.....☆

جس دن بانو قدسیہ گورنمنٹ کالج میں معلومات حاصل کرنے گئیں، ایک گورے چٹے پٹھان لڑکے نے احترام سے راستہ دیا، یہ اشفاق احمد خان تھا، ان کا کلاس فیلو، آنے والے دنوں میں اس نوجوان نے بانو قدسیہ کی بہت رہنمائی کی، بانو اپنی کلاس کی سب سے کم عمر لڑکی تھی، عمر کوئی انیس بیس سال کے لگ بھگ ہو گی، اس کی اردو لکھائی بہت ناقص تھی، ایک دن اس نے اپنے رجسٹر میں ''ہمدردی'' کو ''ھمد ردی'' لکھا تو اشفاق احمد نے اپنی کاپی پر درست لکھ کر اسے دکھایا اور پوچھا کہ کیا میں نے یہ لفظ ٹھیک لکھا ہے، اس طرح بانو کی اصلاح بھی ہو گئی اور اس کی عزت نفس بھی مجروح نہ ہوئی، اسی طرح ایک بار وہ لائبریری سے اردو کی کتب لئے نکل رہی تھی جو اسے امتحانات کی تیاری کے لئے درکار تھیں، اشفاق احمد بھی اپنی کتب اٹھائے نکل رہے تھے، اس نے سلام دعا کے بغیر اسے کہا کہ اپنی کتابیں دکھائے، کتابیں دیکھ کر اس نے کہا کہ کیا ہم اپنی کتابوں کا تبادلہ کر سکتے ہیں، جب بانو قدسیہ اشفاق کی منتخب کردہ کتب اٹھا کر گھر آئی تو اس پر انکشاف ہوا کہ اشفاق کی کتب کا انتخاب زیادہ بہتر تھا، اس طرح اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اشفاق احمد کے لئے عزت کے جذبات بھی کہ جس نے غیر محسوس طریقے سے اس کی اصلاح کی۔

اس دور کے بارے میں بانو قدسیہ نے لکھا ہے:

''گورنمنٹ کالج میں ان دنوں ایک فضا تھی' استاد اچھے تھے اور کھلے دل والے تھے' سازش اور سیاست سے پاک موسم میں بڑا مزا آیا۔ اشفاق صاحب سے وہیں ملاقات ہوئی۔ وہ صاحب جمال اور صاحب کمال آدمی تھے' اسی لئے مجھے محبوب ہوئے۔ بات کرنے کا سلیقہ شروع سے ان میں تھا' استادوں کو لمبی بات میں پھنسا لیتے تھے۔''

بانو قدسیہ مزید لکھتی ہیں کہ

''ہم پانچ چھ سٹوڈنٹ تھے۔ تو آپ یقین کریں کہ جب میں نے ففتھ ائر پاس کیا، تو اشفاق صاحب جو ایک کتاب کے مصنف تھے اس وقت بھی، وہ سیکنڈ آئے اور میں فرسٹ آ گئی۔ جس سے اشفاق صاحب کو پرخاش چڑھی۔ انہوں نے کہا یہ ہوتی کون ہے، میں صاحب کتاب ہوں اور یہ فرسٹ آ گئی اور میں سیکنڈ آ گیا تو پھر انہوں نے مجھ میں دلچسپی لینا شروع کی۔ پھر ان کو پتہ چلا کہ یہ بھی لکھتی ہے۔ تو انہوں نے میری مدد کی اور پھر انہوں نے میرا پہلا افسانہ 'ادب لطیف' میں چھاپا جس کا نام تھا' 'واماندگی شوق'۔۔۔۔ کتنی بڑی بات ہے۔ وہ صاحب کتاب تھے۔ ان کی 'ایک محبت سو افسانے' چھپ چکی تھی ان دنوں۔ پانچویں سال میں، (ایم اے کا پہلا سال) پروفیسر بدکتے تھے ان سے۔ ہمیں اتنے بڑے بڑے لوگوں نے پڑھایا ہے، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نے پڑھایا ہے۔ آفتاب احمد نے پڑھایا ہے۔ ڈاکٹر عنایت اللہ نے پڑھایا ہے۔ غلام محی الدین اسد نے پڑھایا ہے۔ یہ بڑے نام ہیں۔ یہ تاریخی نام ہیں۔ وہ سب کہتے تھے کہ اشفاق احمد جیسا آدمی، ان پر دبدبہ تھا، وہ ان سے مشورہ کیا کرتے تھے''

اشفاق احمد چپکے چپکے بانو قدسیہ کو پسند کرنے لگا، مگر وہ اس وجہ سے خاموش تھا کہ وہ پٹھان خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو خاندان سے باہر شادی کے حق میں نہ تھے۔

اس حوالے سے ممتاز مفتی لکھتے ہیں:

''ماں باپ اور بھائیوں نے اشفاق احمد کو اپنی مرضی کی شادی کرنے کا حق نہیں دیا تھا۔ انہیں بانو قدسیہ کے خلاف کوئی شکایت نہیں تھی۔ جھگڑا اس بات پر تھا کہ خان خاندان میں جاٹ کی آمیزش قابل قبول نہ تھی۔ اشفاق کے والد صاحب چونکہ ویٹرنری ڈاکٹر تھے اس لئے وہ بریڈ کے شدت سے قائل تھے۔''

اشفاق احمد روم چلے گئے مگر وہاں سے قدسیہ اور اس کی والدہ کو خط لکھتے رہتے تھے، پھر ایک دن اس نے اپنے خاندان کو راضی کر لیا اور اس کا بڑا بھائی رشتہ لے کر آ گیا، بانو کی والدہ اشفاق احمد کو پسند کرتی تھیں، وہ مان گئیں اور یوں 1956 میں یہ شادی ہو گئی۔ منگنی والے دن بانو قدسیہ نے جو لباس پہنا اس کی قمیض ذرا پھٹی ہوئی تھی، سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا کہ اسے ٹانکا لگانے کا وقت بھی نہ ملا، منگنی کے بعد اشفاق احمد نے اسے اپنی چیک بک دی۔

''میں انگوٹھی نہیں لا سکا، اکاونٹ میں نو سو روپے ہیں، یہ تم رکھ لو''

اور بانو قدسیہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

اس شادی کے بارے میں بانو قدسیہ نے اپنے خاندان کا تاثر ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''ہمارا خاندان بہت ''ریزرو'' قسم کا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد ہمارے گھر کو اداسیوں نے گھیر لیا تھا۔ ہمارے گھر میں عام لوگوں کی آمد و رفت کم تھی اور تنہائی کا ہر طرف راج تھا۔ میری والدہ ''سیلف میڈ'' خاتون تھیں اور عملی معاملات پر ان کی نظر گہری تھی۔ اشفاق احمد کے والدین نے اگرچہ شادی کی اجازت دے دی مگر یہ مجبوری کی رضامندی تھی البتہ میری والدہ اشفاق احمد کو پسند کرتی تھیں۔ ہماری شادی میں صرف چار افراد نے شرکت کی تھی۔ (شادی کے بعد) بہرحال ہم نے علیحدہ گھر لے لیا۔''

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس شادی میں ممتاز مفتی اور احمد بشیر (بشریٰ انصاری کے والد) ڈنڈے اٹھا کر پہرہ دیتے رہے کہ اشفاق احمد کے رشتے داروں کی طرف سے حملے کا خطرہ تھا۔

خاندانی اصولوں کو ٹھکرا کر جاٹ لڑکی سے شادی کر لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشفاق احمد کے رشتے داروں نے ان سے قطع تعلق کر لیا اور شادی کے بعد ان کی روایتی معاونت سے بھی ہاتھ کھینچ لیا تاہم اشفاق اور بانو نے جو ایک دوسرے کی روح میں ضم ہو چکے تھے اس سماجی مخالفت کی پروا نہ کی اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو کام میں لانے کا فیصلہ کر لیا۔ ممتاز مفتی نے اس نازک دور کی قلاش اور سفاک حقیقت کو یوں پیش کیا ہے:

''ان دنوں اشفاق ابھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوا تھا۔ آمدنی کی کوئی صورت نہ تھی۔ میاں بیوی کے ہاتھ میں سکرپٹ رائٹنگ کے سوا کوئی ہنر نہیں تھا لیکن ان دنوں سکرپٹ کی مانگ نہیں تھی۔ بہرحال اشفاق نے پنسل کان پر اٹھائی، ہاتھ میں کاغذ کی سلپیں پکڑیں اور پھیری لگانے لگا ''سکرپٹ لکھوا لو..... سکرپٹ لکھوا لو۔'' گھر میں قدسیہ بانو کو اپنے پلو سے کھولا، اسے پنسل کاغذ دے کر میز پر بٹھا دیا کہ کوئی آرڈر مل جائے تو لکھنے کا کام فی الفور کر دے۔ جب اشفاق فلم بنانے لگا تو بانو کو پھر سے میدان میں اترنا پڑا۔ وہ چھتری لگا کر سٹوڈیو جا پہنچی اور وہاں ڈائریکٹر، پروڈیوسر اشفاق احمد کی اسسٹنٹ کی حیثیت میں کام کرنے لگی۔''

اشفاق احمد نے ماڈل ٹاؤن لاہور میں مکان قرض لے کر بنوایا تھا۔ ممتاز مفتی نے انہیں مشورہ دیا کہ قرض اتارنے کے لئے مکان کرائے پر دے دو، جب وہ نہ مانے اور ترنت جواب دیا کہ 'مکان میں نے کرائے پر چڑھانے کے لئے نہیں بنوایا' خود رہنے کے لئے بنوایا ہے' تو قرض اتارنے کی بات بانو قدسیہ کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے پنسل ہاتھ میں لی' کاغذ کی سلپیں سامنے رکھیں اور میز پر بیٹھ کر سکرپٹ لکھنے لگیں' نتیجتاً نہ صرف قرض ادا ہو گیا بلکہ بقول ممتاز مفتی:

''صرف مکان ہی نہیں گھر میں جتنا ساز و سامان ہے سب سکرپٹوں سے بنا ہے۔ یہ صوفہ تین سکرپٹوں سے خریدا تھا۔ یہ ٹیپ ریکارڈر بارہ سکرپٹوں کا ہے۔ ان سکرپٹوں میں اکیلا اشفاق ہی نہیں بانو بھی برابر کی شریک ہے۔''

خان صاحب کے گھر والوں نے برسوں بعد میں آنا جانا شروع کیا تو بانو آپا کو تنقید کا نشانہ اٹھتے بیٹھتے بناتی رہتے۔

''اوہو بانو تمھارے گھر میں بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے بس صرف یہ دو موڑھے ہی ہیں اوہو۔۔۔''

لیکن خان صاحب بانو آپا کا حوصلہ بڑھاتے اور کام کی طرف توجہ دلاتے رہتے۔

احمد عقیل روبی لکھتے ہیں کہ

''ممکن ہے بانو آپا کا اشفاق احمد صاحب سے اس دنیا کے ملن سے بھی پہلے ملن ہو چکا ہو۔ آسمانوں پر..... اور جب اللہ تعالیٰ ارواح تشکیل کر رہے تھے تو یہ دونوں روحیں، دنیا میں بھیجے جانے سے پہلے اللہ میاں سے گزارش کر چکی ہوں کہ انہیں دنیا میں بھی ایک دوسرے کا ہمدم بنا کر بھیجا جائے کیونکہ بانو قدسیہ نے بھی اسی مٹی سے جنم لیا ہے جہاں کی مٹی سے اشفاق احمد بنے ہیں۔ فرق صرف برسوں کا ہے۔ بانو آپا 28 نومبر 1928ء کو فیروز پور مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئیں اور اشفاق احمد ان سے کوئی تین برس پہلے (اس سرزمین پر)

22 اگست 1925 کو پیدا ہوئے۔''

انور سدید مرحوم لکھتے ہیں کہ

''تاریخ پیدائش کے اعتبار سے بانو قدسیہ مجھ سے چھ دن بڑی ہیں۔ میں نے انہیں جب بھی دیکھا وہ مجھے اشفاق احمد کے سائے میں سمٹی ہوئی نظر آئیں' وہ مشرقی مزاج کی ایسی خاتون ہیں جو روشن خیال اور جدیدیت پسند ہونے کے باوجود دوپٹے کو سرکنے نہیں دیتیں۔ مہاتما بدھ کے مجسمے کی طرح اطمینان اور شانتی ان کے چہرے پر بکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ مہاتما بدھ کا مجسمہ بول نہیں سکتا لیکن بانو قدسیہ جب بولتی ہیں تو یوں لگتا ہے کہ انہوں نے دنیا سے خیر اور نیکی کے جو تجربے حاصل کئے ہیں اب انہیں بڑی دریا دلی سے تقسیم کر رہی ہیں۔ ''داستاں سرائے'' میں بھی ممتاز مفتی آجائے تو اس گھر کی رونقوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بانو قدسیہ ممتاز مفتی کے عقیدت مندوں کی خدمت میں مصروف ہو جاتیں۔ خود مفتی صاحب کا ذکر یوں کرتیں جیسے ان کے پیر ہوں۔ اتنی بڑی ادیبہ ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی اپنی انا کو سر اٹھانے کا موقع نہیں دیا۔ اشفاق احمد ساتھ ہوں تو وہ چپ کی سمادھی میں گم ہو جاتی ہیں۔ محفل میں صرف اشفاق احمد بولتے ہیں' وہ گوش ہوش سے سنتی اور ان کی تائید میں سر ہلاتی ہیں۔ چلنے لگیں تو اشفاق احمد سے دو قدم پیچھے رہتی ہیں۔ بانو قدسیہ فطری طور پر وضعدار گھریلو خاتون ہیں اور اپنے اس منصب پر بے حد مطمئن نظر آتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ کسی این جی او کی صدر تو کیا رکن بھی نہیں لیکن اس قسم کا کوئی ارادہ انہیں تقریر کرنے یا افسانہ سنانے کی دعوت دے تو اچھے اور قابل عمل مشورے دینے سے گریز نہیں کرتیں۔ یہ الگ بات ہے کہ این جی او چلانے والی کوئی خاتون اپنی مصلحتوں اور مالی مفادات کے تحفظ کے تحت ان کے مشوروں پر عمل نہیں کرتیں کیونکہ دنیاوی خسارے کا سودا کسی این جی او خاتون کو قبول نہیں۔ اس کے برعکس بانو قدسیہ نے خسارے کے ہر سودے کو نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے اس شعر کے مصداق ہمیشہ قبول کیا ہے:

زیاں ہے عشق میں یہ جانتے ہیں ہم
لیکن معاملہ ہی کیا ہوا گر زیاں کے لئے

جب بانو قدسیہ کالج میں پڑھتی تھیں، اشفاق صاحب کے ساتھ، تو اسے روز کہا کرتے تھے کہ ادیب بننا ہے تو نام میں ادبیت ضرور ہونی چاہیے، میں نے اپنے نام کے ساتھ سے 'خان' ہٹا دیا ہے تم اپنے نام کے ساتھ سے، تب میں قدسیہ بانو چوہدری تھی، تو انہوں نے کہا کہ میں بھی اپنا خان ہٹاتا ہوں تم بھی ذات ہٹاؤ، میں تمہارا نام بانو قدسیہ کرتا ہوں۔ تو یہ نام شفاق احمد نے انہیں دیا۔ اشفاق احمد کا اپنی زندگی میں کیا کردار تھا، اس بارے میں وہ کہتی ہیں

''اشفاق صاحب ایسے شوہر تھے جنہوں نے ہمیشہ مجھے support کیا۔ مجھے نئی سوچ، نئی پہچان دی، انہوں نے خود مجھ سے پہلے یہ سوچا کہ یہ صرف رولی ہی نہ پکاتی رہے اس میں جو جوہر ہے وہ سب کے سامنے باہر آنا چاہیے تو اس طرح سے وہ میرے شوہر بھی ہوئے' میرے استاد بھی ہوئے' میرے باپ بھی ہوئے۔'' میں ان کو مانتی تھی، ان کو سب سے زیادہ اپنی زندگی میں اہمیت دیتی تھی تو مجھ پر ان کا رنگ نظر آنا فطری سی بات ہے۔ میرا یقین ہے جو انسان ماننے والا ہوتا ہے وہ مضبوط ہوتا ہے اور جو نہ ماننے والا ہوتا ہے وہ کمزور ہوتا ہے۔''

اپنے لکھنے کے حوالے سے بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ میں نے کسی سے اصلاح نہیں لی اور نہ کبھی کچھ پوچھا تا وقتیکہ میری شادی نہیں ہوگئی۔ اس کے بعد اشفاق احمد صاحب میرے بڑے معاون و مددگار بلکہ استاد ہوئے۔ انھوں نے مجھ سے کہا اگر تمہیں لکھنا ہے تو ایسا لکھو کہ کبھی مجھ سے دو قدم آگے رہو اور کبھی دو قدم پیچھے تاکہ مقابلہ پورا ہو۔ اس کا مجھے بڑا فائدہ ہوا۔ اشفاق صاحب نے ہمت بھی دلائی اور حوصلہ افزائی بھی کی اور حوصلہ شکنی بھی کی۔ میری کئی باتوں پر خوش بھی ہوئے۔ آخر تک ان کا رویہ استاد کا ہی رہا۔ میں انھیں شوہر کے ساتھ ساتھ اپنا استاد بھی سمجھتی رہی ہوں۔

اپنی پہلی تحریر کے حوالے سے کہتی ہیں کہ یہ شادی سے پہلے کی بات تھی جب ایک مرتبہ انہوں نے اشفاق احمد سے کہا:

''آپ کی تو کتاب شائع ہوگئی براہ کرم کسی ایسے پرچے کا نام بتائیں جو میرا افسانہ چھاپ دے۔''

اشفاق احمد نے ان سے افسانہ لیا اور ''ادب لطیف'' میں ''واماندگی شوق'' کے عنوان سے چھپوا دیا۔ اس افسانے کی اشاعت پر انہیں ضرور خوشی حاصل ہوئی ہوگی کیونکہ یہ ان کی پہلی تخلیق تھی جو اردو کے ایک ممتاز ادبی ماہنامے میں شائع ہوئی تاہم طویل عرصے کے بعد ان کا انٹرویو لیا تو ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا:

''واماندگی شوق'' کو تو غالباً کسی نے نہیں پڑھا۔ میں اتنی معروف ادیبہ تو نہ تھی کہ قابل ذکر لوگ میری طرف نظر کرتے۔ بہرحال دو تین افسانوں کے بعد افسانہ ''روشنیوں کا شہر'' چھپا تو امجد حسین کا خط ملا اور جو میرے پاس محفوظ ہے۔ انہوں نے لکھا کہ آپ اچھے افسانے لکھ رہی ہیں اور ''روشنیوں کا شہر'' تو بے مثال ہے۔ آپ اسی طرح لکھتی رہیں۔ مجھے عجیب طرح کی خوشی ہوئی کیونکہ امجد حسین جانے پہچانے لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ اس کے بعد پے در پے خطوط آنے لگے۔''

بانو قدسیہ کی ادبی زندگی میں اشفاق احمد سے ان کی ملاقات بہت اہمیت کی حامل ہے۔ انہوں نے اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کیا کہ ''انہوں نے میرا افسانہ لیا اور پھر میرا افسانہ چھپ گیا'' بلکہ ہمیشہ اعتراف کیا کہ ''اگر اشفاق احمد نہ ملتے تو میں بانو قدسیہ نہ ہوتی۔ کسی عام ڈائجسٹ کی معمولی افسانہ نگار لڑکی ہوتی۔ ان ملاقاتوں میں ہی اشفاق احمد نے بانو قدسیہ کے تخلیقی اعتماد کو یہ کہہ کر پختہ کر دیا کہ

''نہ کسی ادیب سے ڈرنا اور نہ کسی تحریر سے ڈرنا۔''

ریڈیو اور ٹی وی پر بانو قدسیہ اور اشفاق احمد نصف صدی سے زائد عرصے تک حرف وصورت کے اپنے رنگ دکھاتے رہے۔ ٹی وی پر بانو قدسیہ کی پہلی ڈراما سیریل ''سدھراں'' تھی جب کہ اشفاق احمد کی پہلی سیریز ''ٹاہلی تھلے'' تھی۔ بانو قدسیہ کا پنجابی میں لکھنے کا تجربہ ریڈیو کے زمانے میں ہی ہوا۔ ریڈیو پر انھوں نے 1965 تک لکھا پھر ٹی وی نے انھیں بے حد مصروف کر دیا۔ بانو قدسیہ نے ٹی وی کے لیے کئی سیریل اور طویل ڈرامے تحریر کیے جن میں 'دھوپ جلی'، 'خانہ بدوش'، 'کلو' اور 'پیا نام کا دیا' جیسے ڈرامے شامل ہیں۔ اس لکھاری جوڑے کے لکھے ہوئے ان گنت افسانوں، ڈراموں، ٹی وی سیریل اور سیریز کی مشترکہ کاوش سے ان کا گھر تعمیر ہوا۔ بقول بانو قدسیہ کے ''شادی کے بعد مفلسی نے ہم دونوں میاں بیوی کو لکھنا پڑھنا سکھا دیا تھا۔ اشفاق احمد نے ایک فلم ''دھوپ سائے'' بھی بنائی تھی جو باکس آفس پر فلاپ ہوگئی تھی اور ایک ہفتے بعد سینما سے اُتر گئی تھی۔ ''دھوپ سائے'' کی کہانی بانو قدسیہ نے لکھی تھی۔ ڈائریکشن کے علاوہ اس فلم کا اسکرین پلے اشفاق احمد نے لکھا تھا۔

اردو میں تجرباتی نوعیت کا ایک ننھا سا خوبصورت رسالہ ''داستان گو'' 1957ء میں اشفاق احمد نے جاری کیا تو اس پر بانو قدسیہ کا نام بطور شریک مدیر نہیں چھپتا تھا لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ جب اس رسالے کے لئے مطلوبہ معیار کی تخلیقات نہ ملتیں تو اس کی ضخامت پوری کرنے کے لئے بہت سے مضامین خود لکھتیں جو فرضی ناموں سے شائع ہوتے تھے اور بعض اوقات تو سارا رسالہ انہیں بھرنا پڑتا تھا۔ اشفاق احمد ہفت روزہ ''لیل ونہار'' کے مدیر مقرر ہوگئے تو ''داستان گو'' کی ادارت بانو قدسیہ کو تفویض کر دی گئی۔ اس رسالے کے لئے انہوں نے متنوع اقسام کے مضامین لکھے مثلاً شکاریات کے حوالے سے انہوں نے ''میر شکاری'' کے فرضی نام سے مضامین لکھے' ایک پائے کا مضمون انہوں نے شہد کی مکھیوں اور ایک ''چیتے'' پر لکھا۔ ان کے ناولٹ ''ایک دن'' اور ''پروا'' اور ناول ''موم کی کلیاں'' بھی ''داستان گو'' میں چھپے تھے۔ معروف افسانہ نگار جمیلہ ہاشمی کا ناول ''تلاش بہاراں'' بھی بانو قدسیہ نے ''داستان گو'' میں شائع کیا تھا۔ اس رسالے نے افضل سیار' شرون کمار ورما اور ریزی کو بھی متعارف کرایا اور غلام علی چودھری کو مسلسل افسانے لکھنے پر مائل کیا۔ ''داستان گو'' کی خصوصی عطا یہ ہے کہ اس نے افسانہ نگار بانو قدسیہ کو زندگی کے وسیع تر زاویوں پر نظر دوڑانے اور معاشرتی اور سماجی مسائل کو گہرائی سے دیکھنے کی تربیت دی اور ان کے باطن سے اس وسیع النظر فنکار کو ابھارا جو ''راجہ گدھ'' جیسا ناول لکھ سکتا ہے۔ ''داستان گو'' بالآخر سرمائے کی کمی اور ادیبوں کے عدم تعاون کی وجہ سے 1969ء میں بند کر دیا گیا۔

☆.....☆

بانو قدسیہ نے اشفاق احمد کی فرمانبرداری پوجا کی حد

تک کی، وہ اشفاق احمد کے سائے میں چھپ کر رہنے میں ہی طمانیت محسوس کرتی تھیں، قراۃ العین حیدر کی وفات پر بی بی سی کے نمائندے نے ان سے ان کے تاثرات دریافت کئے تو انہوں نے کہا کہ مجھے تو اشفاق احمد کا پتہ ہے، ان کے بارے میں پوچھ لو جو پوچھنا ہے اور پھر اشفاق احمد کی باتیں کرنا شروع کر دیں، اپنے شوہر کی رضا ہی ان کا مذہب تھا، بقول ممتاز مفتی

''ان کی کیفیت یہ تھی اگر ایک دن اشفاق کھانا کھاتے ہوئے کہے کہ کھانے کا مزہ تو تب آتا تھا جب اماں مٹی کی ہانڈی میں پکاتی تھیں۔ اگلے روز قدسی کے باورچی خانے میں مٹی کی ہنڈیا چولہے پر دھری ہوگی۔ اگر اشفاق احمد قدسی کی موجودگی میں برسبیل تذکرہ آپ سے کہے کہ اس گھر میں تو سانپ کے انبار لگے ہوئے ہیں میرا تو دم رکنے لگا ہے تو اگلے دن گھر میں چٹائیاں بچھی ہوں گی اور پیڑھیاں دھری ہوں گی۔ اگر کسی روز لاؤڈ تھنکنگ کرتے ہوئے اشفاق کہے بھئی چینی کھانوں کی کیا بات ہے تو چند دنوں میں کھانے کی میز پر چینی کھانے یوں ہوں گے جیسے ہانگ کانگ کے کسی ریستوران کا میز ہو۔ گھر میں تین مظلوم رہتے ہیں۔ بانو، قدسی اور اشفاق احمد۔ بانو کو قدسی جینے نہیں دیتی، قدسی کو اشفاق جینے نہیں دیتا، اشفاق احمد کو خود اشفاق احمد جینے نہیں دیتا۔''

بانو قدسیہ کے بارے میں ممتاز مفتی مزید لکھتے ہیں

''اشفاق احمد نے ایک خاتون سے عشق کیا۔ کئی سال وہ اس عشق میں گھلتا رہا۔ عشق کامیاب ہوا۔ خاتون بیوی بن کے گھر آئیں تو محبوبہ نہیں عاشق نکلیں۔ ورنہ اشفاق احمد کے جملہ کس بل نکل جاتے۔ محبوب طبیعت وہ ازلی طور پر تھا بیوی کی آمد کے بعد بالکل دیوتا بن گیا۔ کانٹا اشفاق کو چبھے تو درد بانو کو ہوتا ہے۔ ہتھ چکی اشفاق چلاتا ہے آبلے بانو کے ہاتھوں میں پڑتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے ایک پکی دانشور نے پتی بھگتی میں اپنا سب کچھ تیاگ رکھا ہے''

پروفیسر احمد عقیل روبی نے ان دونوں کی کامیاب زندگی کو دیکھا تو بانو قدسیہ کو اشفاق احمد کی داسی قرار دیا۔ انہیں ایسی باورچن شمار کیا جو پہلے انہیں کھلاتی ہے پھر خود کھاتی ہے۔ پہلے انہیں سلاتی ہے، پھر خود سوتی ہے کیونکہ داسی اور باورچن کا یہی دھرم ہے اور اسی میں ان کی مکتی ہے۔

بارہا لوگوں نے اشفاق احمد کو بانو آپا کی آمد پر ایسے کھڑے ہوتے دیکھا جیسے اچانک کسی بڑے آدمی کے آنے پر آپ ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف بانو آپا کو تقریب کے اختتام پر دروازے کے پاس کھڑے دیکھا کہ خان صاحب جو دوستوں کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہیں وہ دروازے سے گزریں تو وہ بھی ان کے پیچھے دروازے سے گزریں۔

بانو قدسیہ اپنے اور اشفاق احمد کے بندھن کے بارے میں کہتی ہیں

''مجھ سے لکھوانے والا اوپر اللہ اور نیچے اشفاق تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کو آگے بڑھنے کا راستہ دیا۔ اشفاق صاحب نے مجھے ہمیشہ خود سے آگے چلنے کا موقع دیا۔ میں نے ان سے کبھی جھگڑا کیا ہی نہیں۔ انہیں مجھ سے محبت تھی، اور مجھے عقیدت تھی۔ یہ عقیدت اور یہ رویہ خود اشفاق صاحب کے سلوک اور رویے نے میرے اندر بھر دیا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ مجھے عزت اور احترام دیا میں نے ان کے احترام کا احترام کیا وہ بہت اچھے رائٹر تھے لیکن اس سے بھی اچھے شوہر تھے۔ ہمارا 50 سال کا ساتھ تھا۔ میں نے ان کی خاموشی سے بھی بہت کچھ سیکھا۔ ہم آپس میں بہت زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے، اشفاق صاحب ہوتے تو آپ کو بتاتے کہ میں نے زندگی میں ایک بار بھی ان سے لڑائی نہیں کی۔ مجھے جھگڑا کرنا آتا ہی نہیں تھا۔ اس لئے ان کی مان لیتی تھی۔''

شاید آپ کبھی مظفر آباد گئے ہوں گے جہاں دریائے نیلم اور دریائے جہلم کا سنگم ہوتا ہے۔ ایک طرف سے دریائے جہلم آتا ہے۔ گدلا' مٹیالا' شوریدہ سر..... دوسری طرف سے نیلم آتا ہے' نیلا' شفاف' پرسکون ..... پھر دونوں مل جاتے ہیں اور مل کر کوئی ایک فرلانگ تک ایک طرف نیلے شفاف اور دوسری طرف گہرے مٹیالے پانی کے دھارے ساتھ ساتھ' پہلو بہ پہلو بہتے رہتے ہیں۔ اسی طرح بانو قدسیہ میں ساتھ ساتھ' پہلو بہ پہلو' شخصیت کے دو دھارے بہہ رہے ہیں۔ ایک نیلا شفاف ذہن کا دھارا' دوسرا گدلا مٹیالا جذبات کا

ارا..... ایک بانو..... دوسرا قدسیہ۔ادب اور
دگی کے یہ دو دھارے الگ الگ بہتے ہیں لیکن ''پتی
کت'' کے سنگم پر یہ دونوں دھارے مل جاتے ہیں۔
یائے نیلم اور جہلم کے سنگم کا کوئی نام نہیں ہے لیکن بانو
قدسیہ کے سنگم کا نام اشفاق احمد خان ہے جو بانو اور
سیہ دونوں کا شوہر ہے۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ

''جب تک کوئی بیٹی اپنی ماں کی محبت میں گرفتار رہتی
ہے، وہ شوہر پرست نہیں بن سکتی۔ ماں سے بندھی وہ
یکے کی وفاداریوں پر نازاں رہتی ہے اور پتی بھگتی وہ الاؤ
ہے جس میں تمام رشتے ناتے جلا دینے پڑتے ہیں۔ پچھلی
بتیں، نظریے اور بانو قدسیہ نے اس مرحلے پر خود اپنی
ال پیش کی:

''میں نے ماں کی محبت کا آنچل کاٹ کر پتی
مرے کا سفر شروع کیا۔ کبھی کبھی اس گناہ پر احساس جرم
ی ہوتا ہے۔ سوچتی ہوں عملی زندگی میں ایک عام بیٹی
نا کردار بھی ادا نہ کرسکی۔ یہ کمزوری ہے اور بہت بڑی
کمزوری لیکن فیصلہ تو اسی دن ہوگیا تھا جب میں نے اپنی
رضی کی شادی کی تھی۔ دو راستوں پر کوئی کیسے اور کب
ک چل سکتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ماں کی سرداری بھی
ائم رہے..... مائیکہ کا تن تنا کروفر بھی سلامت رہے
ر شوہر کا وقار بھی قائم ہو جائے۔''

اپنے عشق اور شوہر سے ٹوٹ کر محبت کرنے کے
رے میں بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ

''میرے والد فوت ہو چکے تھے۔ تو ایک طرح کی
مردگی ان گھروں میں ضرور ہوتی ہے جن میں والد نہ
ں۔ آپ کو میں بتاتی ہوں خاص طور پر لڑکیوں میں یہ کمی
وئی پوری نہیں کرسکتا۔ میرا جو اشفاق صاحب سے شغف
ہے یا میں جو کہتی ہیں کہ میں ان کی مریدی میں ہوں، ان کی
بت میں مبتلا ہوں۔ تو یہ وجہ ہے کہ اشفاق صاحب نے
مرے والد کی جگہ لی۔ انہوں نے میری ویسے ہی پرورش کی
یسے کوئی والد کرسکتا تھا، میں اس رابطے کو بھولنے کی کوشش
ں لگی رہتی ہوں، جو میرا اشفاق صاحب سے تھا۔ اس
ارے کو میں تلاش نہیں کرنا چاہتی۔ بچپن میں میرا باپ مجھ
ے چھنا، اب دوبارہ چھن گیا ہے۔ اب میں اس رنج سے
اور اس غم سے عہدہ برآں ہونے کی کوشش میں لگی رہتی ہوں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ عام چیزوں میں، عام باتوں میں دلچسپی لوں۔ شاید مجھے بھول جائے کہ میں کہاں تھی اور کہاں آگئی۔''

کشور ناہید کہتی ہیں کہ میں جب بھی بانو کو کہتی کہ کوئی فیصلہ خود بھی کرلیا کرو تو وہ ایک ہی جواب دیتی، دوٹوک انداز میں ''سوہنیا، یہ نہیں ہوسکتا''

اشفاق احمد کا کوئی آپریشن ہوا، بس ایک نئی قیامت آگئی، بانو نے نہ گھر دیکھا، نہ بچوں کو، بس خان صاحب کے پاس پائینتی پہ بیٹھی دعائیں پڑھتی رہتی تھیں۔

یہ تھیں بانو قدسیہ جو اعلیٰ پائے کی ادیبہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شوہر پرست بیوی بھی تھیں، جو ان کی اولین ترجیح تھا!!

☆.....☆

بانو قدسیہ کا ذکر راجہ گدھ کے بغیر مکمل ہے، یہ ناول 1981 میں شائع ہوا تھا، ایک ایسا ناول جس نے لاثانی شہرت پائی، جس کا چرچا ہر اس جگہ ہوا جہاں جہاں اردو لکھی پڑھی جاتی ہے، دنیا کی دیگر زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے، جس کے اندر انسانی سرشت کی گتھیاں سلجھائی گئیں، جو حلال اور حرام کا فلسفہ بیان کرتا ہے، بانو قدسیہ نے جذبات اور اقدار کے بحران کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے اور اسلامی اخلاقیات سے عدم وابستگی کو اس انتشار کا سبب اور مراجعت کو ''طریقہ نجات'' بتایا ہے۔ جس کے بیس سے زیادہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور ہر سال نیا ایڈیشن منظر عام پر آتا ہے، جو سترہ اٹھارہ سال سے سی ایس ایس کے امتحان میں لگا ہوا ہے، ہندوستان اور پاکستان کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے، جسے ہر نسل نے اشتیاق سے پڑھا۔ یہ ناول کیسے لکھا گیا، اس کے متعلق کیسے خیال آیا، بانو قدسیہ خود اس کہانی کو بیان کرتی ہیں۔

''یہ ایک بہت لمبی کہانی ہے۔ بات یہ ہے کہ 1980ء میں امریکہ اور پاکستان کے درمیان ایک ایکسچینج پروگرام شروع ہوا۔ اس پروگرام میں یہاں سے کچھ ادیب امریکہ جاتے تھے اور ان کو وہاں امریکہ کے مختلف خاندانوں کے ساتھ ان کے گھروں میں ٹھہرایا جاتا

تھا۔اور وہاں کے لوگوں کو کہا جاتا تھا کہ ان کو مرعوب کریں کہ امریکن کلچر کتنا خوبصورت ہے اور پاکستانی کلچر تو کچھ بھی نہیں ہے اس کلچر کے سامنے۔اشفاق صاحب بھی اس پروگرام کے تحت امریکہ گئے اور امریکیوں کے اخلاق و کلچر سے کافی متاثر ہو کر آئے تھے۔جب وہ وہاں سے آئے تو جواب میں ایکسچینج پروگرام کے تحت ہی ان کے لوگ ہمارے ہاں بھی آتے رہے۔ پاکستان میں جب امریکہ سے لوگ آیا کرتے تھے تو مسئلہ یہ تھا کہ یہاں پر ایسے کوئی گھر نہیں تھے، جو پوری طرح پاکستانی کلچر کو بیان کر سکیں۔لیکن ہماری پوری کوشش ہوتی تھی کہ اپنے کلچر کے بارے میں انہیں کافی کچھ بتا سکیں اور متاثر کر سکیں۔اسی طرح وہ ہمارے مذہب کے بارے میں بھی جاننے کی کوشش کرتے تھے۔اسی پروگرام کے تحت ہمارے ہاں ایک لڑکا آیا، جس کے گھر اشفاق صاحب امریکہ جاتے رہتے تھے۔اس کی ماں کا نام ماریہ ہیزل تھا، وہ بوڑھی خاتون تھی وہ تو نہ آسکی لیکن اس نے اپنا بیٹا باب ہیزل بھیج دیا۔ وہ ہمارے ہاں جس کمرے میں ٹھہرا اس کا نام 'کاسنی کمرہ' ہے۔'کاسنی کمرہ' وہ کمرہ ہے جس میں قدرت اللہ شہاب رہا کرتے تھے۔ اس کمرے کی ہر چیز میں کاسنی رنگ نمایاں تھا، کمرے میں قالین' پردے' پلنگ پوش سبھی کاسنی ہے اسی لیے اس کمرے کو 'کاسنی کمرہ' کہتے ہیں۔ یہ کمرہ شہاب صاحب کی پسند کے مطابق بنایا گیا تھا۔اور اسی کاسنی کمرے میں ہی باب ہیزل کو ٹھہرایا گیا۔ہم سب ناشتا ساتھ کرتے تھے۔ناشتا کرنے کے بعد میں ڈرائنگ روم میں یہاں آ کر ان کے پاس کھڑی ہو جاتی اور باہر دیکھنے لگتی تھی۔ باب ہیزل اکثر میرے پاس آ کھڑا ہوتا۔وہ کہتا! ہم امریکن ہر کام میں بہت آگے ہیں اور ہمارا مذہب مسیحیت محبت اور امن کا درس دیتا ہے۔تو پھر اسلام سب سے بہتر اور مختلف کیسے ہوا؟۔ میں اسے کہتی کہ اسلام کہتا ہے کہ اللہ ایک ہے۔تو وہ مجھے کہتا کہ کیا عیسائی کہتے ہیں کہ خدا دو ہیں، یا پھر یہودی کچھ یوں کہتے ہیں کہ اللہ دو ہیں؟۔ میں چپ ہو جاتی بڑی پریشان ہو جاتی۔تو دوسرے دن وہ پھر آ جاتا پھر کہتا کہ بتائیے کہ اسلام میں کون سی ایسی چیز ہے انسانوں کے لیے، جو کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے۔؟ اور یہ آخری مذہب بنا ہے تو اس کے پیچھے کیا خاص وجہ ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز بناتی ہے۔ میں جب بھی اس سوال کا جواب دیتی، بڑا نالائق اور فضول سا ہوتا۔میرے پاس کوئی ایسا جواب نہیں تھا جو اسے لاجواب کر سکتا اور مجھے مطمئن۔ایسے ہی دنوں میں ایک دن میں یہ سامنے والے لان کی طرف منہ کر کے کھڑی تھی۔اس لان میں ایک درخت لگا ہوا تھا جس کا نام ''سندری کا درخت'' تھا۔سندری کا درخت وہ درخت ہے جس کی لکڑی سے سارنگی بنتی ہے۔ میں ''سندری'' کو دیکھتے ہوئے اپنی سوچوں میں گم تھی کہ باب ہیزل آ گیا اور آتے ہی مجھے زچ کرنے لگا۔اس نے مجھ سے وہی سوال دہرایا کہ اسلام کیسے بہتر ہے دوسرے مذاہب سے؟... تو آپ یقین کریں کہ اس سندری کے درخت میں سارنگی بجنے لگ گئی اور آواز آنے لگی کہ رزقِ حرام' رزقِ حرام... مجھے نہیں پتا یہ آواز کیسے آئی لیکن میں نے اسے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ اسلام کہتا ہے کہ رزق حرام نہ کھاؤ... ورنہ تمہاری اولاد اور تمہاری آنے والی نسلیں پاگل اور دیوانی ہو جائیں گی۔تو جیسے ہی یہ جواب میں نے اسے دیا تو وہ مجھے حیرانگی سے دیکھنے لگا... تھوڑی دیر بعد بولا، ٹھہریں بانو آپا! میں ابھی آتا ہوں۔میں وہیں کھڑی رہی، اب میں مطمئن تھی، میں اس کو وہ جواب دے چکی تھی، جس کی تلاش میں، میں خود بھی تھی۔ وہ پندرہ منٹ بعد واپس آیا اور آ کر کہنے لگا! مبارک ہو بانو آپا میں مسلمان ہو گیا ہوں۔باب نے اپنا اسلامی نام احمد رکھا۔ یہ رزقِ حرام کا پہلا معجزہ دیکھا میں نے۔۔۔اس کے بعد میں نے راجہ گدھ شروع کیا، آپ یقین کریں کہ وہ ناول میں نے اوپر ہی بیٹھ کر ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ پر مہینہ ڈیڑھ مہینہ میں ختم کیا۔اور پھر وہ چھپ کے آپ لوگوں کے سامنے آ گیا، اسے بہت پزیرائی بھی ملی۔لیکن میں اسے ناول نہیں ایک معجزہ سمجھتی ہوں''

آپا بانو قدسیہ نے 27 کے لگ بھگ ناول، کہانیوں کے مجموعے، ٹی وی اور ریڈیو کے لیے متعدد ڈرامے لکھے۔آپ کی ادبی خدمات پر 2003ء میں حکومت پاکستان کی جانب سے ستارہ امتیاز اور 2010ء میں ہلال امتیاز سے نوازا گیا۔ ٹی وی

ڈراموں پر بھی آپ نے متعدد ایوارڈ حاصل کیے۔ مرحومہ ادبی حلقوں میں آپا بانو قدسیہ کے نام سے معروف تھیں۔ مرحومہ کے ناولوں اور افسانوی مجموعوں میں بازگشت، ناقابل ذکر، امربیل، دستہ بستہ، آدھی بات، سایان وجود، توجہ کی طالب، شہر بیمثال، دوسرا قدم، آتش زیرپا، چہار چمن، اور کچھ نہیں، ایک دن، آسے پاسے، پیا نام کا دیا، لگن اپنی اپنی شامل ہیں۔ ان کے مقبول ڈراموں میں آدھی بات، کلو، امربیل، دھوپ جلی، خانہ بدوش، پیا نام کا دیا شامل ہیں۔ مرحومہ کی پہلی ڈرامہ سیریز ''سدھراں'' تھی۔ ان کے پلے ''آدھی بات'' کو کلاسیکی ڈراموں میں شمار کیا جاتا ہے۔

☆.....☆

بانو قدسیہ کی مدھر آواز جادوئی طلسم کے ساتھ کمرے میں گونج رہی تھی۔

دیکھ بچے..... تعریف انسان کو کھا جاتی ہے... اس پر کان مت دھر..... آگے بڑھ جا... تعریف کرنے والے تجھے گھیر لیں گے.... راہ میں روک لیں گے.... آگے جا نہیں سکے گی تو.... اور جو بھی لکھ ماں بن کے لکھ... ادیب کا عورت ہونا بڑی نعمت ہے..... کرداروں کی ماں بن کے لکھ.... قاتل کے کردار کو بھی ماں بن کر لکھ اور مقتول کے کردار کو بھی ماں بن کے لکھ.... تجھ پہ آپ ہی معاملات کھلتے چلے جائیں گے.... کہ قاتل کیسے قاتل بنتا ہے اور مقتول کیوں مقتول بنتا ہے..... تصویر کے دونوں رُخ دیکھا کر اور جو تصویر لکھ اس کے دونوں رُخ نگاہ میں رکھ کر لکھ، کرداروں کو بھی ایسے انصاف کی ضرورت ہوتی ہے بچے..... اور وہ انصاف صرف ماں کر سکتی ہے''

بانو قدسیہ نے 2015 میں عالمی اردو کانفرنس کے ایک سیشن میں شرکت کی، پتہ چلا کہ وہ اس سیشن کی صدارت کر رہی ہیں مگر پہنچیں سیشن کے اختتام پر، وہیل چیئر پر دو مددگار عورتوں کے ساتھ، اصغر ندیم نے وہیل چیئر سمیت انہیں اسٹیج پر بلوالیا۔ انہوں نے اسی پر بیٹھے بیٹھے صدارتی تقریر کی۔

''دلوں کو کشادہ کرو..... محبت کرو..... خواہشات کو رشتوں پر ترجیح نہ دو..... یہ رشتے بڑی قربانیوں کے ساتھ بنتے ہیں.... انہیں ضائع مت کرو..... مجھے دیکھو... اشفاق احمد کے بعد میں بالکل تنہا ہوں!... اللہ سب بچیوں کو اشفاق احمد جیسا زندگی کا ساتھی دے..... ویسی محبت دے جیسی مجھے اشفاق احمد سے ملی.... بس یہی کہنا ہے مجھے''

لکھنے کے حوالے سے بانو قدسیہ صاحبہ کہتی ہیں کہ

''میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ کیا کسی پھول کو معلوم ہوا ہے کہ وہ کھلتا کیوں ہے، کسی پھل کو پتہ چلا ہے کہ وہ کیوں پکتا ہے، اور کیوں اس میں مٹھاس پیدا ہوتی ہے، تخلیقی کاموں کا جس بندے کو علم ہو گیا کہ وہ کیوں لکھتا ہے تو میرے خیال میں وہ مشقت سے لکھتا ہے اور اس کا نام ہسٹری میں آنہیں سکتا۔ کہانی وارد ہو جاتی ہے۔ اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کیسے آتی ہے۔ وہ چلتے چلتے وارد ہو جاتی ہے۔ وہ خود ہی پکڑی جاتی ہے۔ خود ہی ذہن اسے پکڑ لیتا ہے اور خود ہی اس پر کام کرنے لگ جاتا ہے۔ جس طرح غزل نازل ہوتی ہے، آمد سے بھی زیادہ، میں کہتی ہوں نازل ہوتی ہے، تو پتہ تو نہیں ہوتا کہ کیسے شعر اتریں گے اور کیسے بن جائیں گے۔ بن جاتی ہے تو بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ تو پوری غزل ہی ہو گئی''

ایک روز اشفاق احمد نے کہا تھا

''قدسیہ نور بابا کی بات میرے دل میں کھب گئی ہے۔ فرماتے ہیں، کوئی چیز خریدو تو پہلے اسے حلال کر لو۔ پھر استعمال کرو''

بانو قدسیہ نے پوچھا ''وہ کیسے؟''

اشفاق احمد نے جواب دیا

''قمیض خریدو تو ساتھ کم از کم ایک قمیض اللہ کے نام پر دینے کے لئے ضرور خریدو، اسکول میں اپنے بچے کی فیس ادا کرو تو ساتھ ہی کسی حاجت مند بچے کی فیس بھی ادا کرو۔ اسی طرح وہ خرچ جو تم اپنی ذات پر کرتے ہو حلال ہو جائے گا''

اگلے روز اشفاق احمد دفتر سے لوٹے تو کیا دیکھتے ہیں کہ اجنبی لڑکا گھر میں بیٹھا ہے۔ بیگم سے پوچھا

''یہ کون ہے''

بانو قدسیہ بولی

''ہمارے تین بیٹے مدرسے میں پڑھتے ہیں، ان کے اخراجات حلال کرنے کے لئے میں نے ایک حاجت مند بچہ گھر رکھ لیا ہے۔ ہم اسے تعلیم دلوائیں گے، ان کی پرورش کریں گے۔''

آج بھی اشفاق کے گھر میں ایک نہیں تین لڑکے پرورش پا رہے ہیں اور باقاعدہ سکول میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

نوجوان لڑکیوں کے لئے بانو اکثر ایک بات کہتی تھیں۔

''دیکھیں جو انسان اپنی معاشی یا معاشرتی مسائل کا ذکر کرتے ہیں وہ عموماً حکم نہ ماننے والے لوگ ہوتے ہیں، جب مرد خدا کا حکم نہیں مانتا ہے تو وہ مسائل میں گھر جاتا ہے۔ جب عورت اپنے مرد کا حکم نہیں مانتی تو وہ مشکلات کا شکار ہو جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا عورتیں اکثر اپنے شوہروں سے لڑتی جھگڑتی رہتی ہیں، اگر وہ ان کو مجازی خدا سمجھ لیں تو سارے مسائل ہی حل ہو جائیں، اور لڑکیوں کو بھی یہی طرز عمل رکھنا چاہیئے، جتنا لڑنا ہے شادی سے پہلے ماں باپ سے لڑ لیں کہ میں نے اس سے شادی نہیں کرنی کسی اور سے کرنی ہے۔ لیکن شادی ہو جانے کے بعد لڑائی کرنا ٹھیک نہیں، شوہر مجازی خدا ہوتا ہے اس کی بات رد کرنا ٹھیک نہیں۔''

جن دو روحوں کا ملن اس دنیا کے ملن سے بھی پہلے آسمانوں پر ہو چکا تھا' انہیں 7 ستمبر 2004ء کو لاہور کی دھرتی پر الگ کر دیا گیا۔ اس روز اشفاق احمد کی روح کسی اور جہان کو پرواز کر گئی۔ بانو قدسیہ اکیلی کونج کی طرح اس زمین پر کرلاتی رہ گئیں۔ میرا اندازہ ہے کہ اس روح فرسا مرحلے پر ان کی معاونت اس عقیدے نے کی ہوگی کہ ''زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے'' اور ''جو انسان اس دنیا میں آیا ہے' اس نے اس دنیا سے جانا بھی ہے۔'' بانو قدسیہ اور اشفاق احمد نے 1956ء میں ازدواجی زندگی شروع کی تھی تو ان کے عزیز و اقربا ان سے ناراض تھے۔ اشفاق احمد بانو قدسیہ کو وراثت میں تین بیٹے اور تین بہوئیں دے گئے' ان کا آنگن پوتے اور پوتیوں سے بھرا ہوا تھا جو انہیں یقین دلا رہا تھا کہ

''دادی اماں' تم اکیلی نہیں ہو۔ کونجوں کی ڈار تمہارے ساتھ ہے اور ہماری مہار تمہارے ساتھ ہے۔''

بانو قدسیہ نے مستقبل کی طرف پر امید نظروں سے دیکھا اور اپنے پوتے پوتیوں کو آغوش میں لے لیا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ بانو قدسیہ شاید اب افسانے نہ لکھ سکیں' شاید کہانیاں تخلیق نہ کر سکیں' اشفاق احمد کے غم فراق میں شاید دنیا تیاگ دیں لیکن انہوں نے اپنا قلمی سفر جاری رکھا۔ آخری دنوں میں یہ منظر بھی لوگوں نے دیکھا کہ بانو قدسیہ کی خدمتگار ملازمہ ہر وقت ان کے سر پر دوپٹہ ہی ٹھیک کرتی رہتی تھی کیونکہ یہ بانو قدسیہ کی ہدایت تھی، یہ وہ توازن تھا جو مذہب اور کام کے درمیان قائم رکھا ہوا تھا۔

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کو اللہ تعالیٰ نے تین بیٹوں سے نوازا، انیق احمد خان امریکہ میں ہوتے ہیں، انیق احمد خان بزنس مین ہیں جبکہ اثیر احمد خان بینکر ہیں۔ بانو قدسیہ گھر میں نماز چھپ کر پڑھتی تھیں، ان کے بچوں کو بیس سال تک تو پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ نماز پڑھتی ہیں، انہوں نے نماز کے لئے الگ کمرہ مختص کیا ہوا تھا، رات کو اکثر تہجد کی نماز پڑھتیں تو فجر کا وقت ہونے کو ہوتا تھا، بچے انہیں کہتے کہ امی آپ نے نماز نہیں پڑھی تو وہ یہی جواب دیتیں کہ میں نے ابھی پڑھنی ہے، وہ کبھی نئے کپڑے نہیں پہنتی تھیں، ہمیشہ پرانے کپڑے استعمال کئے، وہ ایک ذہین و فطین خاتون تھیں مگر انہیں باہر کی دنیا کا پتہ نہیں تھا، انہیں شاید یہ بھی خبر نہ کہ لبرٹی کہاں ہے مگر اپنے فیلڈ کی وہ ماہر تھیں، انہوں نے کبھی اپنے بیٹوں کو کچھ نہیں کہا مگر بیٹوں کے ساتھ ان کی کلیئر انڈرسٹینڈنگ تھی کہ میری گستاخی چاہے جتنی کر لو مگر باپ کی گستاخی کی تو میں برداشت نہیں کروں گی۔ اشفاق احمد اکثر گھر پر مہمانوں کو لے آتے تھے، ان کا فون آتا کہ میرے ساتھ پانچ چھے مہمان ہوں گے مگر جب بھی آتے تو دس پندرہ مہمان ہمراہ ہوتے مگر کبھی کھانا کم نہیں پڑا، ہر جمعرات کو اشفاق احمد کی قبر پر جانا اور فاتحہ پڑھنا ان کا معمول تھا، بیٹوں کو خواہش کی کہ میری قبر خان صاحب کے قدموں میں بنوانا، ایک بیٹے نے کہا کہ امی یہ ماڈل ٹاؤن کا قبرستان ہے، یہاں تو اگلے دن جگہ نہیں ملتی۔

لیکن پھر دنیا نے دیکھا کہ داسی کو اپنے دیوتا کے قدموں میں جگہ ملی اور یہی داسی کی دعا تھی!!

☆☆☆

PakistaniPoint.com
Waqar Azeem

ایک کردار، دو کہانیاں
"زندگی میرے لیے گنبدِ بے در ٹھہری" کی تصویر
دو عبرت سامانیاں، آمنہ تحریر میں

الماس

سید ملازم حسین شیرازی

اُس امیدوں بھرے دل کی کہانی، جس میں آرزوؤں کے مہکتے گلابوں کو راکھ کر دیا گیا

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں کراچی میں Law کرنے کے بعد اپرنٹس شپ کر رہا تھا۔ عباسی صاحب میرے سینئر تھے۔ نہایت قابل وکیل تھے۔ ان کا تعلق کشمیر سے تھا۔ وکالت کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی شناخت بھی تھی۔ کراچی میں الیکشن کے دوران جب Convessing کے لیے جاتے تو مجھے اپنے ساتھ لے جاتے۔ میں بھی تقاریر وغیرہ میں ان کا ساتھ دیتا تھا۔

ایک دن میں سیشن کورٹ میں کسی کیس کے سلسلے میں ان کے ساتھ تھا۔ وہ تو اندر عدالت میں موجود تھے اور میں سیڑھیوں کے ساتھ کچھ کاغذات الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ ناگہاں نظر پڑی تو ایک نوجوان خوب صورت لڑکی لیڈیز پولیس کی کسٹڈی میں تیز تیز قدم اٹھاتی آ رہی تھی۔ دراز قد، گورا رنگ، نہایت مناسب خدوخال، جینز جیکٹ اور ان سے میچ کرتے جوگرز پہنے تھی۔ آنکھوں پر بلیک چشمے تھے۔ وہاں عدالت میں موجود وکلاء، مؤکلین کی نظریں اسی پر جمی تھیں۔ وہ میرے پاس آ کر رک گئیں اور کسی دوسرے وکیل کا معلوم کیا۔ میں ان کو جانتا تھا بتایا کہ ہائی کورٹ گئے ہیں اور واپسی شاید یہاں نہ ہو۔ دراصل اس خاتون سے شراب کی بوتلیں پکڑی گئی تھیں اور وہ اس سلسلے میں ضمانت کرانا چاہتی تھی۔ میں نے انہیں کہا۔ "ذرا توقف کریں میں کوشش کرتا ہوں۔" عدالت میں اندر جا کر عباسی صاحب سے ان کے بارے میں بات کی۔ وکالت نامہ لیا اور ان خاتون کے دستخط کرائے۔ انہوں نے اپنا نام الماس بتایا اور ایڈریس نیپئر روڈ کا تھا۔ چونکہ ان کا کیس قابل ضمانت تھا ان کی ضمانت منظور ہو گئی۔ الماس نے میرا شکریہ ادا کیا اور پرس سے پیسے نکالنے لگی۔ میں نے نہ جانے کن جذبات کے تحت فیس لینے سے انکار کر دیا۔

وہ بہت حیران تھی، اتنے میں منشی نے آواز لگائی کہ "عباسی صاحب بلا رہے ہیں۔" میں انہیں وہیں چھوڑتا ہوا اندر عدالت میں چلا گیا۔ وہاں قتل کے کیس کے سلسلے میں لمبی چوڑی جرح اور بحث تھی۔ ہم اختتام تک وہیں رہے۔

وہ خاتون الماس چلی گئی تھی۔ نہ جانے کون تھی۔ کہاں سے آئی، کہاں چلی گئی۔ نیپئر روڈ بہت بڑا علاقہ ہے کہاں تک تلاش ہوتی اور شاید مجھے اس کی ضرورت

بھی نہیں تھی۔ شرم وحیا کی وجہ سے اس سے ایڈریس بھی نہیں لیا اور نہ کوئی مزید بات ہوئی۔

چھ ماہ بعد نیپئر روڈ سے گزر رہا تھا۔ دراصل پرانے حاجی کیمپ میں میرے بھائی کی چھوٹی سی گارمنٹ فیکٹری تھی۔ وہاں ہفتے دس دن میں جانا ہوتا تھا۔ میں خود جناح کورٹس ہاسٹل رہتا تھا۔ جناح کورٹس سے پاکستان چوک، ڈینسو ہال پھر نیپئر روڈ آگے پرانا حاجی کیمپ۔

وہ سردیوں کی ایک بھیگی شام تھی۔ موسم بہت شاندار تھا۔ ٹھنڈی میٹھی ہوائیں چل رہی تھیں۔ جو دل کو بہت لبھا رہی تھیں۔ ان دنوں نیپئر روڈ (بازارِ گناہ) بہت آباد تھا۔ ہر طرف ناچ گانے اور گھنگھروؤں کی آوازیں آتی تھیں۔ شام ہوتے ہی زندگی اٹکھیلیاں لیتی ان روشنیوں میں گم ہو جاتی۔ لوگ عیاشی کرنے اور اپنا غم غلط کرنے شباب وشراب کی محفلوں کا جزو بن جاتے۔

میں خراماں خراماں رواں تھا کہ الماس دکھائی دی۔ وہی شباب، وہی جوانی۔ ایک شراب کی دکان سے نکلی۔ اس کے ہاتھوں میں شراب کی بوتل تھی۔ اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ پہچان گئی۔ میرا ہاتھ پکڑ کر برابر میں اوپر جاتی سیڑھیوں پر چلنے لگی۔ میری شرم محسوس ہو رہی تھی ایسی حالت میں کوئی واقف کار دیکھ نہ لے۔ سیڑھیاں چل کر اوپر پہنچے تو دو کمروں کا فلیٹ تھا۔ ایک کمرے میں لے گئی۔ وہ کشادہ کمرہ تھا۔ ایرانی قالین سے آراستہ گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ اس پر سفید چاندنی ڈالی تھی۔ تین چار آدمی بیٹھے تھے جن کے آگے طبلے، ہارمونیم پیانو وغیرہ تھے۔ وہ گاہکوں کے انتظار میں تھے۔ الماس ایک طوائف ناچنے والی، دوسروں کا دل لبھانا اس کا پیشہ تھا۔ انہیں الماس نے بتایا۔ اس وقت میرے مہمان آئے ہیں (میرا تعارف کر کے) دو تین گھنٹوں بعد محفل لگے گی۔ مجھے بیٹھنے کا کہا پھر مخاطب ہوئی

''آپ نے اپنا نام نہیں بتایا تھا؟''
''آپ نے پوچھا کب تھا؟''
''اچھا اب پوچھ لیتی ہوں۔''
''میرا نام حسین شاہ ہے۔''
''خوب اس دن آپ نے میری ضمانت کرائی تھی اور پھر غائب ہو گئے، فیس بھی نہ لی تھی اور.....''
''اس کی ضرورت نہ تھی۔ معمولی کیس تھا قابلِ ضمانت تھا ہو گئی۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
''آپ کا تعلق کراچی سے نہیں ہے غالباً؟'' الماس نے پوچھا۔
''میں صوبہ سرحد سے تعلق رکھتا ہوں اور پچھلے کئی سال سے نہیں کراچی میں مقیم ہوں۔'' میں نے اسے بتایا۔
''اس دنیا میں کوئی شخص بغیر غرض، طمع، لالچ کسی سے تعلق نہیں رکھتا۔ آپ نے اجنبی ہوتے ہوئے فیس لیے بغیر میری ضمانت کرائی۔ میرے کام آئے۔'' الماس نے کہا۔
''میں شاید آپ کو پولیس کسٹڈی میں دیکھ نہ سکتا تھا۔'' میں نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ ''آپ یہاں اس جگہ اس.....!''
''یہ حسن بازار ہے (جہاں بے حیائی کو حسن کہتے ہیں) یہ ایک منڈی ہے جہاں عصمتوں اور عزتوں کے سودے ہوتے ہیں۔ یہاں ناز و انداز کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ میں اس بازار کی پیداوار ہوں، ناچنا گانا میرا پیشہ ہے۔'' الماس نے میری بات کاٹتے ہوئے بتایا۔
''آپ یہاں اکیلی رہتی ہیں؟ آپ کے والدین؟'' میں نے پوچھا۔
الماس نے گلاس میں شراب ڈالی، پانی ملایا، ہونٹوں سے لگاتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ''آپ کے لیے بناؤں؟''
''نہیں شکریہ۔ میں اس سے محروم ہوں۔'' میں نے معذرت کی۔
''شکور۔'' الماس نے اپنے ملازم کو آواز دی۔
ایک نوجوان لڑکا پندرہ سولہ سال کا حاضر ہوا۔ اس نے اسے چائے وغیرہ لانے کو کہا اور پھر کہنے لگی۔
''باپ کا پتا نہیں۔ ایک رات کے قصے کہانی نے میری ماں کو میرا تحفہ دیا اور پھر دنیا کی بھیڑ اور بھول بھلیوں میں غائب ہو گیا۔
ماں کہتی تھی وہ ایک شریف انسان تھا لیکن اس کی شرافت ایک رات تک محدود تھی اور پھر چلتا بنا۔ کچھ سال پہلے ماں بھی مر گئی اور میں یہاں طبلوں کی تھاپ اور گھنگروؤں کی جھنکار میں روزانہ اپنے ارمانوں کا خون کرتی ہوں۔''
''کیا آپ کو اس سے گھن نہیں آتی۔ خوب صورت ہیں۔ اچھی شخصیت کی حامل ہیں۔''
''آپ کو سمجھ نہیں آئے گی ملاقاتیں رہیں تو سمجھ جائیں گے۔''
چائے بسکٹ وغیرہ کھا کے میں تھوڑی دیر بیٹھ کر اس پیمان کے ساتھ کہ کبھی کبھی آؤں گا۔ میں ان کے کوٹھے سے نکل آیا۔
وہ کیا تھی؟ اس کا کردار کیا تھا اس کا پیشہ کیا تھا۔ یہ سب اپنی جگہ لیکن اس کی اپنائیت، خلوص کو نظر انداز نہ کر سکتا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ کبھی کبھی چکر لگاؤں گا۔
میں ان دنوں کراچی میں اکیلا رہتا تھا۔ وکالت پڑھائی میرا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اس کے علاوہ دیگر سرگرمیوں میں میری دلچسپی کم تھی۔
یوں میری الماس سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ہمارے اٹھنے بیٹھنے میں ایک فاصلہ رہتا تھا کوئی غلط سوچ، غلط بات غلط حرکت غلط قدم نہ تو میں کر سکتا تھا اور نہ ہی الماس کی ایسی کوئی سوچ تھی۔ ہم اچھے اور مخلص دوستوں کی طرح ایک دوسرے کے دکھ درد، خوشیاں شیئر زکرتے۔

☆.....☆

وہ ایک سرد شام تھی۔ آسمان پر کالی کالی گھٹائیں چھائی تھیں۔ مغرب سے چلتی ٹھنڈی میٹھی ہوائیں چہروں کو سلا رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔
آج میں خود دل گرفتہ تھا۔ ایسا حسین موسم اکثر مجھے اداس کر دیتا تھا۔ تنہائیاں، اپنوں سے دوریاں، یہ

ملے، سرد شامیں، بھیگے موسم کی برستی ہلکی ہلکی پھوار
موں میں نمی لاتی۔

جس وقت میں الماس کے پاس پہنچا تو آج وہ
ت ڈھا رہی تھی۔ باتھ روم سے نکل کر گیلے بال
ا رہی تھی۔ بھینی بھینی خوشبوئیں ماحول کو معطر کر رہی
یں۔ بہت خوب صورت کالی ساری زیب تن کی
ی تھی۔ ایسا نظر آ رہا تھا جیسے کالے کالے بادلوں میں
ہویں کا چاند چمک رہا ہو۔ دعا سلام ہوئی۔ وہ
یڈ پر رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں پہلی مرتبہ اس کے
ھ پہلو بہ پہلو بیٹھ گیا۔ وہ میری آنکھوں کی بے تابی
چشم دیکھ رہی تھی۔ کوئی بات کی تو میں نے بے خودی
عالم میں اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے
ام سے میرا ہاتھ ایک طرف کر دیا۔ میں حیران ہوا۔
ارہ میں نے جب اس کے کندھے کو چھوا تو وہ اٹھ
ڑی ہوئی اور اس کا لب و لہجہ بدل گیا۔ میرے
وں کو سختی سے ہٹایا اور کہنے لگی۔ ''کیا کرتے ہو؟''

میں نے کوئی غلط حرکت یا غلط نیت سے ایسا ہرگز
ں کیا تھا۔ میرا ارادہ میری حرکت میری پیش قدمی
ا صرف میرا پیار تھا۔ خلوص نیک نیتی تھی لیکن اس
ٹ اور جھڑک نے مجھے از حد رنجیدہ و شرمندہ
دیا۔ اس کے تیور بتا رہے تھے جیسے میں نے کوئی
م کیا ہو۔ میری حالت نہایت دگرگوں تھی۔ میں
چ رہا تھا کہ کہیں میں غیر ارادی طور پر بڑی غلطی یا
ہی کا مرتکب تو نہیں ہوا۔ میں غصے کی حالت میں
ور اس سے مخاطب ہوا۔

''الماس مجھ سے ایسی کیا غلطی ہوئی کہ غصے میں
رے تیور ہی بدل گئے اور مجھے ایسے ڈانٹ دیا
میں نے کوئی غیر اخلاقی اور تہذیب سے گری
ت کی ہو۔''

''ہاں تم نے.....'' الماس نے بولنا چاہا۔

''میں..... کیا میں نے.....'' بات کاٹتے ہوئے۔

''ذرا خاموش رہو مجھے بات کرنے دو۔ میں اپنی
مکمل کر لوں تو پھر جو کہنا ہو کہہ لینا۔''

''الماس میں جس جگہ بیٹھا ہوں یہ کوٹھا ہے جس
ف سے مخاطب ہوں اور طوائف ہے، ناچنے والی،
جہاں تم رہتی ہو اسے بازار گناہ کہتے ہیں۔ سونا گاچھی،
ہیروں کی منڈی، جو تماش بینوں اور دلالوں کی جائے
پناہ ہے۔ تمہارے اس کوٹھے پر بدچلن، بدقماش،
آوارہ، مکروہ چہرے والے بدشکل بولی دینے آتے
ہیں۔ وہ پیسہ پھینکتے ہیں تو تمہارے پاؤں میں حرکت
آتی ہے۔ گھنگھروؤں کی جھنکار میں تمہارا جسم تھرکتا
ہے۔ پیسوں کو دیکھ کر تمہاری آنکھوں میں چمک اور
ہونٹوں پر مسکراہٹ آتی ہے۔ تم اپنی عزت، غیرت کو
خود اپنے ہاتھوں قتل کرتی ہو۔ انہیں خوش کرنے کے
لیے انہی کے اشاروں پر ناچتی ہو۔ وہ اپنے گندے اور
پلید ہاتھوں سے تمہارے جسم سے کھیلتے ہیں۔ تمہیں
نوچتے ہیں۔ وہاں تو تم احتجاج نہیں کرتیں۔ وہاں
تمہیں اپنی عزت کا پاس نہیں ہوتا۔ تمہارے چہرے پر
غصے کے آثار پیدا نہیں ہوتے۔ اور میں..... میں نے
ایک مخلص دوست کی حیثیت سے اپنائیت سے تمہارے
ہاتھوں، بازوؤں کو چھوا تو غصے سے تمہارا رنگ ہی بدل
گیا۔ ان سات مہینوں پر محیط میرے خلوص کو شک کی
نظر کر دیا۔ کیوں آخر کیوں؟''

میں سخت غصے کے عالم میں تھا۔ میری دانست میں
اس نے میری عزت نفس کو مجروح کیا تھا۔ مجھے خود اپنی
نظروں سے گرایا تھا۔

وہ بڑے غور سے میری باتیں سن رہی تھی اور عجیب
نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس
کی نظروں میں کوئی سوچ ابھری ہے جسے ہم اپنائیت،
چاہت سمجھ سکتے ہیں۔

مجھے خاموش دیکھ کر اس نے اپنا ہاتھ بڑے آرام
سے میرے ہاتھ پر رکھا۔ اٹھ کر میرے پاس آ بیٹھی۔
میرے چہرے کو سامنے رکھ کر کہنے لگی۔

''غصے میں بہت پیارے لگتے ہیں۔ آج پتا چلا
تمہیں بولنا بھی آتا ہے حسین صاحب تم نے جو کہا
صحیح ہے میں واقعی طوائف ہوں۔ میں اس بازار میں
قابلِ فروخت کوئی شے ہوں۔ واقعی آوارہ، بدچلن،
عیاش میرے پاس آتے ہیں۔ اپنی بیویوں کو،
ماں باپ کو، بچوں کو دھوکا دے کر حرام سے کمائی ہوئی
دولت کو اڑانے، اپنے دل کو خوش کرنے، صرف

اپنے لیے آتے ہیں۔ انہیں شراب کے ساتھ شباب چاہیے ہوتی ہے۔ اس کی طلب میں میرے قدموں سے لپٹ جاتے ہیں۔ شرافت کی سفید چادر اوڑھے گناہ کے ان کوٹھوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ وہ صرف اپنے لیے آتے ہیں۔ میرے لیے نہیں آتے لیکن حسین صاحب اس بھری دنیا میں اس گندے اور بدبودار بازار میں۔ ایک تم ہی ہو جو صرف میرے لیے آتے ہو۔ تمہارے آنے میں کوئی غرض، کوئی مقصد غلط نہیں، لیکن اگر تم بھی انہی کی طرح میرے جسم و جان کی طلب میں کوئی قدم اٹھاؤ تو پھر تم میں اور ان میں کیا فرق رہ جائے گا۔

میں سوچتی تھی کہ میں کتنی خوش نصیب ہوں کہ کوئی تو ہے جو صرف اور صرف میری ذات کے لیے، میری خوشیوں کے لیے آتا ہے لیکن اگر تمہارے خیالات بدل گئے تمہاری سوچیں جذبات میں بہہ گئیں، تمہاری آنکھوں میں معصومیت کی جگہ ہوس نے لے لی، تو تم اور ان میں کیا فرق ہے۔ کیا میں احتجاج نہ کروں، اپنی بدنصیبی کا ماتم نہ کروں۔ بتاؤ کیا میں غلط ہوں۔''

مجھے خود سمجھ نہ آ رہی تھی کہ میں اسے کیا کہوں، کیا میں غلط تھا۔ کیا اس کی سوچ صحیح ہے۔ میں کچھ مزید کہے سنے بغیر سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ اس کی سوچ اس کی حد تک درست تھی۔ ایک طوائف، ناچنے والی، محبت و خلوص کی طلب گار تھی۔ طوائف ضرور تھی لیکن ایک عورت بھی تھی۔ اس کے سینے میں دل تھا۔ دھڑکنیں تھیں، ارمان تھے۔

پھر میں کبھی اس کے کوٹھے پر نہ گیا۔ وہ راستے، وہ گزرگاہیں میں نے چھوڑ دی تھیں۔

زندگی رواں دواں رہی، وقت کا پہیہ چلتا رہا۔

تین سال بعد ایک دن صدر میں الماس کا نوکر شکور مجھے ملا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔ سلام کیا۔ میں نے خیریت دریافت کی۔ الماس کا پوچھا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ میں اسے سینٹرل کافی ہاؤس لے گیا۔ وہ ابھی تک رونے کی کیفیت میں تھا۔ میں خود حیران و پریشان تھا۔ اسے کیا ہوا کہ وہ سرعام رو رہا تھا۔

''آئیں صاحب میں آپ کو الماس کے پاس لے چلتا ہوں۔'' شکور نے مجھ سے کہا۔

میں بھی حقیقتاً اس سے ملنا چاہتا تھا۔ کبھی ہم بھی ایک دوسرے سے آشنا تھے۔ دل ہی دل میں ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ میں نے اسے گاڑی میں بٹھایا۔ وہ مجھے نیلم کالونی ڈیفنس سوسائٹی لے گیا۔ مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے ایک مکان کے آگے رکے۔ پہلے خود اندر گیا۔ تھوڑی دیر بعد آ کر مجھے لے گیا۔ مکان وسیع تھا، تین عدد کمرے تھے۔ کھلا صحن تھا۔ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ دیکھا ایک کونے میں بستر پر الماس لیٹی تھی۔ یہ سب کیسے..... کیوں؟ میں سکتے کے عالم میں تھا۔ ایک حسین و شاداب، جوانی سے بھرپور خوب صورت عورت اور آج.....! نہایت کمزور، نحیف، بیمار، ہڈیوں کا ڈھانچا، زرد رنگ، آنکھیں (کل واقعی چشم آہو تھیں) اندر کو دھنسی ہوئی۔ بڑے غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے سہارا دے کر بٹھایا۔ وہ بڑی چاہت سے مجھے تکے جا رہی تھی اور پھر وفور محبت اور وارفتگی کے ساتھ میرے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ میں نے اسے رونے دیا۔ آرام سے اسے الگ کیا۔

''الماس! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں کہاں ہواؤں میں اڑتی پھرتی الماس، زندگی سے بھرپور جوانی۔ دولت، شہرت سب کچھ اور آج۔ یہ ویران و سنسان مکان، یہ خاموشی، یہ سناٹا، یہ بیماری کیوں الماس کیا ہوا؟''

میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔ شکور کو اشارہ کیا کہ چائے وغیرہ لائے اور میرے اصرار پر کہنے لگی۔

''حسین صاحب! تم آتے تھے میں خوش ہوتی تھی پھر تم نے آنا چھوڑ دیا۔ میں روزانہ سرشام تمہاری راہ تکتی رہتی لیکن تم نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ تم نہ آئے اور پھر ایک دن سردار رند آ گیا۔ اپر سندھ سے تعلق تھا۔ بہت بڑے سردار سائیں کا بیٹا تھا۔

خوب صورت، پڑھا لکھا اچھا انسان تھا۔ وہ مجھے دل سے چاہتا تھا۔ وہ ان عیاش لوگوں کی طرح نہ تھا کہ رات گئی بات گئی۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں بھی اب دوسروں کے ہاتھوں کھلونا بنتے بنتے تھک گئی تھی۔ میری بھی خواہش تھی کہ شادی ہو۔ خوب صورت خاوند ہو، ایک اچھا پریوار ہو۔ میرے بچے ہوں میں انہیں تعلیم دلاؤں اچھا انسان بناؤں۔ میں بھی راضی ہوگئی۔ وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ مولوی صاحب کو لے آیا تھا۔ ڈیفنس میں اس کی کوٹھی تھی۔ وہیں لے گیا۔ نکاح ہوا۔ میں اس کی بیوی بن گئی۔ میں نے تمام نقدی زیورات، کوٹھا، پلاٹس سب اپنے استادوں کو اور بے آسرا، بے وسیلہ بزرگ اور بوڑھی باتیوں کو جو کوٹھوں کے کونے کھدروں میں زندگی گھسیٹ رہی تھیں، بانٹ دیا۔ مجھے اب ان چیزوں کی ضرورت نہ تھی۔ میں تو اپنی نئی دنیا بسانے جا رہی تھی۔ ماضی کی کسی چیز سے تعلق نہ رکھنا چاہتی تھی پھر اس کوٹھی میں چند دن رہے۔ پھر وہ مجھے میرے اصرار پر گاؤں لے گیا۔ جہاں اس کے والدین، پہلی بیوی کے ساتھ رہتے تھے۔ بڑا خوب صورت، شاداب ہرا بھرا گاؤں تھا۔ وسیع و عریض ہزاروں ایکڑوں پر مشتمل سرسبز زمینیں تھیں۔ ہر قسم کے میوہ جات کے باغات تھے۔ صبح کی حسین کرنیں جب ان درختوں، لہلہاتے کھیتوں پر پڑتیں تو بے ساختگی سے اللہ پاک کی وحدانیت کے آگے سر جھکتے۔ یہ گاؤں کی خوب صورتی میرے حسین خوابوں کی تعبیر تھی۔ بیوی ایک بڑی حویلی میں رہتی تھی۔ اس نے اور اس کے ماں باپ نے بڑے آؤ بھگت کی۔ میں بہت خوش تھی۔ نازاں تھی۔ اپنے اوپر رشک آتا تھا۔

پھر نہ جانے انہیں کیسے پتا چلا کہ میرا ماضی اندھیروں میں لپٹا ہے۔ میں ایک طوائف ہوں۔ میں اب ان کی نفرت بھری نظروں کا شکار تھی۔ گالی گلوچ، مار پٹائی طعنے میرا مقدر تھیں۔ کوٹھی کے ایک کونے میں پھینک دی گئی۔ رند چند دن تو میرے حق میں بولتا رہا لیکن کب تک۔ جب اس کے باپ نے جائیداد سے عاق کرنے کا کہا۔ بیوی اور اس کے ماں باپ نے دباؤ ڈالا۔ شرافت کے دعویدار بنے۔ ان کے بے داغ سفید کپڑوں پر میں ایک بدنما داغ تھی۔ ایک طوائف اور گندے گٹر کی پیداوار تھی۔ پھر ایک دن مجھے طلاق دے دی گئی اور سرراہ چھوڑ دی گئی۔ کیا کرتی کہاں جاتی، کوٹھے پر میرا اب کیا رہ گیا تھا وہاں میرے ارمانوں کی راکھ دفن تھی۔ میں بھی نہ جانا چاہتی تھی پھر شکور کو لے کر اسی مکان میں آ گئی۔ شکور تب سے میرے ساتھ رہتا ہے۔''

یہ سب جان کر میں بہت دکھی ہوا۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں بہت دل گرفتہ تھا۔ الماس فکر نہ کرو۔ یہ دنیا ہے۔ ہنسو تو دنیا ساتھ دیتی ہے روؤ تو کوئی ساتھ نہیں ہوتا۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔ میں تمہارا علاج کراؤں گا۔ میں بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو دکھاؤں گا۔ تم جو چاہو گی میں کروں گا، میں اپنی زندگی.....''

الماس نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''نہیں حسین صاحب تمہارا شکریہ۔ یہ میرے لیے کافی ہے کہ تم میرے کل بھی دوست تھے اور آج بھی زندگی کے آخری لمحات کی ان گھڑیوں میں ساتھ ہو۔ ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔ مجھے کینسر ہے اور آخری اسٹیج پر ہے۔ کسی وقت بھی سانس کی ڈوری ٹوٹ جائے گی اور یہ دنیا چھوڑ دوں گی۔''

یہ جان کر میں اور بھی دکھی ہوا۔ کیسی بدنصیب عورت تھی۔ جیسے بھی تھی اس کی آرزوئیں، تمنائیں، خواب سب راکھ کا ڈھیر بن گئیں۔ مقدر اور نصیب کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔

اور پھر ایک دن الماس مر گئی۔ وہ دنیا چھوڑ گئی اور حقیقتاً دنیا نے بھی اسے چھوڑ دیا تھا۔

نیلم کالونی کی ایک گلی سے جنازہ اٹھا۔ جنازے میں میرے علاوہ شکور اور دو چار محلے دار تھے۔ اسے ڈیفنس سوسائٹی فیز V کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ شکور اپنے گاؤں چلا گیا۔

اور میں آج بھی کبھی کبھی خوب صورت اور مہکتے ہوئے پھول لے کر الماس کی قبر پر چڑھانے اور فاتحہ پڑھنے جاتا ہوں۔

☆☆☆

واپسی

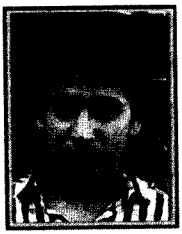

سید وجاہت علی

یادوں میں کھوئی، حال سے برسرِ پیکار اُس دوشیزہ کا قصۂ الم جس کی واپسی اپنے رب تک ہوگئی تھی

وہ ایک طوائف تھی اور یہ مشکل تھا کہ لوگ اسے حقارت سے نہ دیکھتے۔ خود وہ بھی اپنے آپ سے نفرت کرتی تھی۔

اسے علم نہیں تھا کہ وہ کون تھی اور کہاں پیدا ہوئی تھی؟ اس کے حافظے میں کوٹھے کے سوا دوسری اور تصویریں نہ تھیں۔ ہاں ایک چھوٹی سی تصویر اس کی یادداشت میں کبھی ابھرا کرتی تھی' ایک عورت ایک مرد' وہ خود اور ایک خوبصورت سا گھر' اسے علم نہیں تھا کہ یہ تصویر کبھی کیوں اس کے پردۂ ذہن پر اجاگر ہو جاتی ہے؟ کیا یہ اس کے بچپن کا کوئی نقش ہے؟ کیا اس کو کہیں اور سے اٹھا کر اس غلیظ ترین جگہ لے آیا گیا تھا جہاں روز اس کی عزت پامال ہوتی تھی' یا پھر وہ یہیں ان کنجروں میں پیدا ہوئی تھی؟

وہ طوائف تھی لیکن یہ پیشہ اس سے اختیار کروایا گیا تھا۔ اس نے کبھی خوشی سے اپنا جسم فروخت نہیں کیا تھا بل کہ وہ اب تک اس گھناؤنے ترین کاروبار کی عادی نہیں ہوئی تھی اور وہاں کوئی نہیں تھا جو اس کے درد کو سمجھ سکتا۔ جب بھی کوئی بھیڑیا اس کے جسم کو نوچتا کھسوٹتا تھا' اسے ویسی ہی تکلیف ہوتی تھی جیسی پہلی دفعہ اپنی عزت کے کھو جانے پر ہوئی تھی۔ اس کی شاید ہی کوئی رات ایسی گزری' جب اس کے کمرے میں اس کی سسکیوں کی بازگشت نہ گونجی ہو۔ بھی نائکہ ریشم یا دوسری طوائفیں اس کی آہیں سن لیتی تھیں تو اس پر ہنسا کرتی تھیں اور اس کی خواہش ہوتی کہ وہ کوئی خنجر ہی اپنے داغ داغ بدن میں اتار لے۔

اس پر کبھی کسی نے ترس نہیں کھایا تھا اور یہ ممکن بھی نہ تھا۔ اس کوچے میں آنے والے انسانیت، رحم دلی اور ہمدردی کا ایک ایک رواں اپنے جسم سے اتار کر آتے تھے۔

وہ اس کی زندگی کا سب سے تکلیف دہ دن تھا جب پہلی دفعہ اس کی عزت تار تار کی گئی تھی۔ کنجروں نے اپنی بدترین رسم کے مطابق کوٹھے میں ایک بڑی دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ کاغذ کے حقیر ٹکڑوں کے لیے عصمتیں فروخت کرنے والے وہ لوگ اس دن بہت خوش تھے۔

اس کے کمرے میں ایک جاگیر دار کو بھیجا گیا تھا جو پینتالیس سال کا رہا ہوگا اور نیلم کی عمر اس وقت سولہ برس کی تھی۔ وہ کلی بری طرح مسلی گئی اور جاگیر دار نے اس کے عیوض ان لوگوں پر بے تحاشا نوٹ لٹائے تھے۔ نیلم شروع سے اس کوٹھے میں ہی رہی تھی اور عزت کا احساس یہاں ایک غیر مانوس اور مضحکہ خیز چیز تھی لیکن اس کے باوجود اسے اول روز سے اپنی عصمت کا خیال رہا تھا اور اسے کھو دینا اس کے لیے بہت اذیت ناک تھا لیکن سولہ

ن کی عمر میں آتے ہی، جب کہ اس کی مسیں بھیگنا شروع
ی تھیں، اسے اس دکھ سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

پھر یہ معمول بن گیا تھا۔ کوٹھے کی تمام لڑکیوں پر نظر
کھنے والی نائکہ ریشم جو خود کو میڈم کہلواتی تھی، اور کوٹھا
انے والا بارود خان بہت ظالم تھا۔ ریشم بارود خان کی
سبت کچھ نرم مزاج تھی اور کوٹھے کی لڑکیوں کا خیال بھی
کھا کرتی تھی لیکن جہاں کوئی لڑکی کسی کو انکار کرتی، وہ
ارود خان کی طرح جلاد بن جاتی تھی۔ انکار کرنے والی
ڑکی کو سزا دی جاتی۔ پہلے دن اس کا کھانا پینا بند کیا جاتا
ور اگر لڑکی انکار پر قائم رہتی تو دوسرے دن سے اس پر
جسمانی تشدد کی ابتدا ہو جاتی تھی۔

بارود خان کے بااثر لوگوں سے تعلقات تھے۔ وہ
اپنا کوٹھا آزادی سے چلاتا تھا۔ لڑکیاں بے بس تھیں۔ ان
کے دل میں اگر وہاں سے فرار ہونے کی خواہش سر
ابھارتی تھی تو وہ اسے کچل دینے پر مجبور تھیں۔ سالوں
پہلے ایک لڑکی نے ایسا قدم اٹھایا تھا لیکن وہ پکڑی گئی تھی
اور پھر قتل سے قبل اس پر جو تشدد ہوا تھا، اس سے سب
کانپ اٹھے تھے۔

اس غلیظ ٹھکانے سے نجات کی اس کے علاوہ کوئی
صورت نہیں تھی کہ کوئی گاہک کسی لڑکی کو خرید لے لیکن بارود
خان جیسا لالچی اور سفاک شخص کسی لڑکی کی نجات کی اتنی
سستی قیمت تو نہیں رکھ سکتا تھا کہ ہر کوئی آسانی سے خرید
لے۔ ایسا ایک دفعہ ہی ہوا تھا۔ ایک لڑکی کو ایک آدمی ہمیشہ
کے لیے اپنے ساتھ لے گیا تھا اور خان نے اس کے بدلے
میں ایک کروڑ روپے لیے تھے۔ اس لڑکی کے ساتھ بعد میں
کیا معاملہ رہا؟ وہ بیچ دی گئی یا اس کو آزاد کر دیا گیا؟ یا اس
آدمی نے اس لڑکی کو اپنے گھر جا بسایا؟ کسی کو معلوم نہ تھا لیکن
جب وہ کوٹھے سے جا رہی تھی تو ہر لڑکی نے اسے رشک اور
بھیگی آنکھوں سے دیکھا تھا اور نیلم کے دل میں تو بار بار کسک
اٹھتی رہی تھی کہ اس کی جگہ وہ ہوتی۔

وہ لٹتی رہی۔ اس کا نازک جسم روز پامال ہوتا رہا۔

☆.....☆

اس علاقے سے کچھ ہی دور ایک مسجد تھی۔ اس مسجد
سے کچھ لوگ دعوت دینے کے لیے گھر گھر جایا کرتے تھے

۔کوئی انھیں جھڑک دیتا' کوئی ان کی بات سن لیتا۔

ان میں ایک شخص ایسا بھی تھا جس کی باتوں میں بڑی تاثیر تھی۔ وہ لڑکپن سے اس کام میں لگ گیا تھا اور اب وہ جوانی کی دہلیز بھی عبور کر رہا تھا۔ لوگ اسے مولانا صاحب کہہ کر بلاتے تھے۔ ان لوگوں نے ارادہ کیا کہ اس کوچے میں بھی گشت کیا جائے' چناں چہ وہ لوگ گشت کرتے کرتے اس کوٹھے تک آ گئے جو نیلم کا قید خانہ تھا۔

اس وقت بارود خان بھی موجود تھا۔ اس نے مولانا صاحب اور ان کے ساتھیوں کو جھڑک کر بھگا دیا۔ وہ سیدھے سادے لوگ تھے۔ خاموشی سے واپس ہو لیے۔

آج وہ پھر آئے تھے اور اتفاقاً بارود خان کوٹھے میں نہیں تھا۔ وہ کسی سے ملنے باہر گیا ہوا تھا۔

مولانا صاحب نے ایک بچے کے ذریعے سے نائکہ کو پیغام بھجوایا کہ محض پانچ منٹ کے لیے وہ اور لڑکیاں ان کی بات سن لیں۔ ریشم نے پہلے تو خفگی ظاہر کی لیکن پھر اس نے سوچا۔

''صرف پانچ منٹ ہی کی تو بات ہے؟ اگر سن لی جائے تو کیا حرج ہے؟''

ریشم نے ان کو اجازت دے دی۔ اس نے پیغام لانے والے لڑکے کو انھیں اندر بلانے کی تاکید کی۔

مولانا اور ان کے تین ساتھی جھجکی جھجکی نظروں کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی اس طرح نیچی نظروں کے ساتھ اس جگہ آیا تھا ورنہ اس سے قبل لوگ بے باک اور ہوس زدہ آنکھوں کے ساتھ آتے رہے تھے۔ مولانا کی گھنی داڑھی ان پر بہت خوب صورت معلوم ہو رہی تھی۔ ان کے چہرے پر بڑی کشش تھی۔ ریشم نے ان کو صحن میں بلا لیا تھا۔

''میری بیٹیوں... میں تمھارا زیادہ وقت نہیں لوں گا...'' انھوں نے نظریں ملائے بغیر کہا تھا اور نیلم اور اس کی ساتھی لڑکیوں کے حواسوں پر دھماکے ہوئے تھے۔ وہ ساکت رہ گئی تھیں۔ آج تک کسی نے انھیں بیٹی نہیں کہا تھا۔ وہ حیرانی سے اس شخص کو تکنے لگیں جس کی آواز میں انھیں بڑی کشش محسوس ہوئی تھی۔

''اللہ نے اس کائنات کو عدم سے وجود بخشا۔'' مولانا صاحب کہنے لگے تھے۔ ''سورج نہیں تھا۔ اس نے بغیر سورج کے سورج کو پیدا کیا۔ چاند نہیں تھا' اس نے بغیر چاند کے چاند کو پیدا کیا۔ زمین نہیں تھی' اس نے بغیر زمین کے زمین کو پیدا کیا۔ وہ بڑا زبردست ہے۔ اس کی مثال تو کیا؟ اس کی مثال کی مانند بھی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ اپنی ذات میں تن تنہا ہے۔ اپنی صفات میں تن تنہا ہے۔ اپنے ارادوں میں تن تنہا ہے۔ اپنے کاموں میں تن تنہا ہے۔ وہ اتنا دور ہے کہ کوئی خیال اس تک نہیں پہنچ سکتا اور اتنا نزدیک ہے کہ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ ہر ایک شے پر اس کی حکومت' اس کا اقتدار ہے۔ وہ اپنے بندوں پر قادر ہے۔ سب اس کے محتاج ہیں اور وہ سب تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

دن اسی کے حکم سے وجود میں آتا ہے اور رات اسی کے حکم سے اپنے پر پھیلاتی ہے۔ وہ ہر ابتدا سے پاک ہے۔ وہ ہر انتہا سے پاک ہے۔

میری بیٹیوں... اسی اللہ نے مجھے تمھیں اور ہم سب کو تخلیق کیا۔ وہ دیکھتا ہے کہ کون اس کے حکم پر چلتا ہے اور کون نافرمانی کی تنگ و تاریک پگ ڈنڈیوں پر گامزن ہوتا ہے؟ وہ چاہے تو ہم میں سے کوئی اس کی نافرمانی نہ کر سکے۔ وہ چاہے تو ہم کچھ سوچ بھی نہ سکیں لیکن اس نے اپنی حکمت سے ہمیں ارادے کا اختیار دیا ہے۔ جو اس کی فرماں برداری کرے گا' اس سے وہ خوش ہوگا اور اسے کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی اور خوشیاں عطا کرے گا۔ جو اس سے سرکشی کرے گا' اس شخص کے لیے رسوائی ہے' تکلیف ہے اور ایسی زندگی ہے جہاں وہ نہ جی سکیں گے' نہ مر سکیں گے۔

اس کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ وہ صرف نیکو کاروں کا ہی نہیں ہے بل کہ وہ گناہ گاروں کا بھی رب ہے۔ وہ خوش ہوتا ہے جب کوئی اس کی طرف پلٹ پڑتا ہے۔ وہ اس گناہ گار کا استقبال کرتا ہے۔ کوئی گناہوں میں غرق غرق بھی اس کے دربار میں آنے کی خواہش کرے تو وہ یہ نہیں کہتا کہ 'تم نے تو اتنے گناہ کیے ہیں؟ میں تمھیں معاف نہیں کروں گا۔'

وہ بہت بڑا بادشاہ ہے۔ اس کی سلطنت لامحدود ہے۔ اس کی قدرت لامحدود ہے۔ پھر بھی وہ گناہ گاروں کو مہلت دیتا ہے اور جب وہ توبہ کر لیتے ہیں تو انھیں اپنے پسندیدہ بندوں میں شامل کر لیتا ہے۔ اس کی رحمت بھی لامحدود

ے۔ میری بیٹیو... کبھی اس کے دربار میں بھی تو آ کر
ھو۔ تمہیں محبت ملے گی۔ ہمارا جسم اس کی ملکیت ہے۔
پنے جسم کا اس کی مرضی کے خلاف استعمال نہ کرو۔ اس کی
اعت کے دائرے میں آ جاؤ۔ بس پھر تھوڑا انتظار کرو۔ وہ
ہاری آنکھیں بند ہوتے ہی تمہیں وہ سب کچھ دے دے
جس کی تم نے خواہش کی ہوگی اور تمہیں وہ بھی دے گا جو
ہارے گمان میں بھی نہ ہوگا۔

دیکھو .. اس کی سلطنت کتنی بڑی ہے۔ اس کی
ررت کتنی بڑی ہے۔ پھر بھی وہ تم سے محبت رکھتا ہے۔ تم
ی تو اس سے محبت کرو...''

مولانا صاحب کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ نیلم نے ان کی
نکھوں میں دیکھا۔ اسے آنسو چمکتے نظر آئے تھے۔

ایک لڑکی نم آنکھوں اور روتی ہوئی آواز کے ساتھ بولی۔

''اس کی محبت تو ہمارے دل میں ازل سے ہے۔''

''تو پھر اس کی فرماں برداری کے حلقے میں بھی
جاؤ۔ وہ خوش ہوگا۔'' مولانا نے التجائیہ انداز میں
جواب دیا تھا۔

نیلم کی سوچوں میں ارتعاش ہونے لگا تھا۔ اس کی
بڑی بڑی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ اس نے کپکپاتے
بوں سے سوال کیا۔

''لیکن ہمارا رواں رواں گندگی سے لتھڑا ہوا ہے۔
ہمارے جسم کے ہر ہر حصے کو لاتعداد افراد دیکھ اور چھو چکے
ہیں۔ کیا وہ ہمیں قبول کرلے گا؟ کیا وہ ہمارے گناہوں کو
معاف کردے گا؟؟؟''

''وہ صرف قبول نہیں کرے گا' وہ صرف معاف نہیں
کرے گا بل کہ تمہارے تمام گناہوں کو نیکیوں میں بدل
دے گا۔ صرف ایک دفعہ سچے دل سے توبہ کرلے میری
بیٹی۔ یہ لباس جو تو نے پہنا ہوا ہے' اسے اب کبھی نہ اتارنا'
اپنے سر کو آنچل سے اب محروم نہ کرنا...''

مولانا صاحب لوگ تو ہمارے لباس اتارنے آتے
ہیں۔ آپ پہلے آدمی ہیں جو ہمارے سر ڈھکنے آئے
ہیں...'' نائکہ نے حیرت سے کہا تھا۔ وہ بھی ان کی
باتوں سے متاثر ہوگئی تھی۔

''دنیا کی ہر عورت کی عزت یکساں قیمتی ہے۔''
مولانا نے اپنی بھیگتی آنکھوں کو اپنے رومال سے صاف
کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''تمہاری عزتیں بھی اتنی ہی قیمتی
ہیں جتنی دوسری کسی بھی عورت کی۔ کیا تم انسان نہیں ہو؟
کیا تم اللہ کی بندیاں نہیں ہو؟ تم میرے وطن کا سب سے
مظلوم طبقہ ہو۔ لوگ تمہیں نوچتے کھسوٹتے ہیں اور حقیر
سمجھتے ہیں حالاں کہ حقیر تو وہ خود ہیں۔ جو رات کے
وقت بھیڑیے سے زیادہ خوں خوار ہو جاتے ہیں۔ بس
میں کیا کہوں؟ میں تمھارا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ تم نے
میری بات سنی۔ میں نے صرف پانچ منٹ مانگے تھے
لیکن زیادہ وقت لے لیا۔''

''آپ گھنٹوں بھی بولتے رہیں گے تو ہم سننے میں
اکتاہٹ محسوس نہیں کریں گے ...'' نیلم نے اداس لہجے
میں کہا۔ نائکہ نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔ مولانا صاحب
کے الفاظوں سے متاثر ہونے کے باوجود وہ انھیں مزید
نہیں سننا چاہتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ نیلم کی فرمائش پر مولانا
کچھ دیر مزید نہ رک جائیں۔ اسے خوف تھا کہ کوئی لڑکی
اس پیشے کو ترک کرنے کی نہ ٹھان لے۔ وہ سوچ رہی تھی
کہ اگر بارود خان کو پتا چل گیا تو وہ اس پر سیخ پا ہوگا۔

''لیکن بیٹی میں اپنی بات سے پھرنا نہیں چاہتا۔
میں نے یہ پیغام بھجوایا تھا کہ زیادہ وقت نہیں لوں گا۔
اللہ تمہاری مدد کرے۔'' مولانا نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا
اور سلام کر کے مڑ گئے۔ ان کے تینوں ساتھیوں نے بھی
ان کی تقلید کی۔

نیلم نے بہت چاہا کہ انھیں روک لے لیکن چاہنے
کے باوجود وہ ایسا نہ کرسکی۔

پھر ساری لڑکیاں اپنے کمروں میں چلی گئیں۔ کچھ
دیر وہ وہیں بیٹھی رہی۔ اس کی سوچیں بہت دور پرواز کر
رہی تھیں۔

''کاش ... میں یہ گھناؤنا کام چھوڑ سکتی...'' اس
نے حسرت سے سوچا تھا۔

''تو تمہیں کیا چیز مانع ہے؟ تم ایک دفعہ فیصلہ کرلو۔
اس پر ڈٹ جاؤ۔ پھر جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔'' ایک دوسرا
خیال کہیں گہرائیوں سے ابھرا تھا۔

''لیکن مایا نے بھی ایسے ہی کیا تھا؟ اس کو کتنا تڑپا
تڑپا کر مارا تھا اور بارود خان کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکا تھا
کیوں کہ وہ سارے بڑے افسروں کو رشوت کھلاتا ہے۔

نوٹوں کی رشوت بھی اور سفید جسموں کی رشوت بھی...''
وہ لرز کر رہ گئی۔

مگر .. اللہ کو ناپسند ہے کہ میں اپنے جسم پر کسی کو ہاتھ لگانے دوں۔'' ان ہی گہرائیوں سے سوچ کی لہر اٹھی تھی۔ ''ٹھیک ہے جو ہوگا' دیکھا جائے گا لیکن میں اب اپنے اللہ کا حکم نہیں توڑوں گی۔''

اس نے پختہ عہد کرلیا تھا' اور اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اپنے کمرے کی طرف جارہی تھی۔ کوئی سکون کی لہر تھی جو اس کے وجود پر چھانے لگی تھی۔ وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کررہی تھی۔

لیکن پھر رات آ گئی۔ بھیڑیے بھی آ گئے۔ ایک بھیڑیا اس کے کمرے میں بھی آنا چاہتا تھا لیکن اس نے تانگہ کو کہلا بھیجا کہ آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ یہ ہی ایک حیلہ تھا جس کے سبب وہ تنہا اپنے کمرے میں سو سکتی تھی ورنہ وہاں کوئی عذر قابل قبول نہ تھا۔ یہ بہانہ بھی اس لیے تسلیم نہیں کیا جاتا تھا کہ کوٹھا چلانے والے بارود خان کو لڑکیوں کے آرام کی فکر تھی بل کہ اسے اور ریشم کو یہ خدشہ لاحق ہوجاتا تھا کہ خراب طبیعت کے باوجود زبردستی کرنے کی صورت میں طبیعت مزید نہ بگڑ جائے اور انھیں پیسہ کمانے والی اس لڑکی سے ہاتھ دھونے پڑ جائیں۔

اس رات اس کو اچھی نیند آئی تھی لیکن ساتھ ساتھ فکر بھی تھی کہ یہ بہانہ کب تک چل سکے گا؟

☆.....☆

اگلے دن دوپہر میں وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ نیلی کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ کیا ہوگیا تھا تمہیں؟''

''کچھ نہیں ... کچھ کسل مندی تھی۔ حرارت محسوس ہورہی تھی...'' اس نے نیلی سے نظریں نہیں ملائی تھیں۔

''لیکن میڈم کے تاثرات تمہارے متعلق اچھے نہیں تھے ...'' نیلی نے اسے بتایا۔ ''کہہ رہی تھی کہ نیلم ڈرامے کر رہی ہے۔ وہ اس مولوی کی باتوں میں آ گئی ہے... اگر اس نے یہ ناٹک بند نہ کیا تو میں اسے سیدھا کردوں گی...''

''ہاں اگر ایسا ہی ہے تو...'' نیلم خشک لہجے میں بولی۔ ''اگر میں مولانا صاحب کی باتوں میں آ گئی ہوں تو ... اگر میں یہ دھندا نہ کرنا چاہوں تو...''

''بارود خان بہت سفاک ہے...'' نیلی خوف زدہ لہجے میں بولی۔

''ہوگا ... مجھے اب کسی کی پروا نہیں ہے...'' اس نے سر جھٹکا تھا۔

نیلی چند لمحوں کے لیے اسے ساکت ہو کر دیکھتی رہی۔ پھر سرد آہ بھر کر بولی۔

''کاش مجھ میں بھی تم جیسا حوصلہ پیدا ہوجائے۔ تمہیں پتا ہے' دوسرے شہروں میں کچھ کوٹھے ایسے بھی ہیں جہاں کوئی طوائف پیشہ نہ کرنا چاہے تو اسے مجبور نہیں کیا جاتا لیکن اس سے یہ سوال ضرور کیا جاتا ہے کہ تم جسم فروخت کرنا چھوڑ دوں گی تو کھاؤ گی کہاں سے؟''

''کاش ہم کسی ایسے ہی کوٹھے میں پیدا ہوئی ہوتیں...'' نیلم نے حسرت سے کہا۔ نیلی نے اس سے کہیں زیادہ حسرت سے سر ہلا کر اس کی تائید کی۔ پھر وہ نیلم کے کمرے کی کھڑکی سے باہر خلاؤں میں تکتے ہوئے بولی۔

''مولانا صاحب کی باتوں نے میرے اندر ہل چل پیدا کردی ہے۔ اس سے پہلے تو ہمیں اس گندگی کا احساس ہی نہ تھا...''

''اور میں سوچتی ہوں کہ ہم سا گناہ گار کوئی نہ ہوگا...'' نیلم نے بھی کھوئے کھوئے لہجے میں کہا تھا۔

پھر اگلے دو دن بھی اس نے خرابی طبیعت کا بہانہ کیا تھا لیکن یہ بہانہ مزید نہ چل سکا۔ ریشم اس کے کمرے میں گھس آئی۔ نیلم نے بھی بالآخر دوٹوک جواب دیا تھا اور ریشم اس پر چڑھ دوڑی تھی۔

وہ اسے زدوکوب کرتی رہی لیکن نیلم انکار [illegible] ٹ گئی تھی۔

تھک ہار کر ریشم نے بارود خان کو اطلاع دے دی۔ بارود خان نے آتے ہی اسے پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے نیلم سے گفت و شنید ہی نہیں کی تھی [illegible] اس کو اندازہ تھا کہ یہ کام ریشم نے کرلیا ہوگا [illegible] اس کو تب ہی بلاتی تھی' جب کسی لڑکی سے بات [illegible] کام ہوجاتی تھی۔ پھر بارود خان مزید گفت گو کو [illegible] بازیاں سمجھتا تھا۔ وہ آتے ہی بربریت پر اتر آتا [illegible] بھی وہ ایسا ہی کررہا تھا۔ وہ نیلم کو مارتا رہا۔ جب [illegible] گیا تو اس نے نیلم کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ اس [illegible] میں بند کر

دیا اور دروازے پر تالا ڈال دیا تھا۔ نیلم چیختی چلاتی رہ گئی۔

☆.....☆

کئی دن تک وہ اسی حالت میں رہی۔ اسے کچھ بھی کھانے پینے کو نہیں دیا گیا۔ بارود خان آتا اور کچھ کہے بغیر اسے مار پیٹ کر چلا جاتا۔ دوسری لڑکیاں اس ظلم پر تڑپ کر رہ گئیں لیکن وہ سب بے بس تھیں یا انھوں نے ہمت ہی نہ کی کہ احتجاجاً ہی وہ بھی نیلم کی طرح انکار کر دیتیں اور ڈٹ جاتیں۔ ان کو یہ خیال تو آیا ہوگا لیکن اس خیال کو عمل میں ڈھالنے کا حوصلہ انھوں نے نہیں کیا تھا۔

جب تک ہمت رہی، نیلم برداشت کرتی رہی تھی اور جب حوصلوں کی دیوار ڈھے گئی تو اس نے دوبارہ جسم فروشی پر آمادگی ظاہر کر دی۔

پھر ایک رات اس کے کمرے میں گاہک بھیج دیا گیا۔

''تو میں دوبارہ اس دلدل میں اتر رہی ہوں ...''

نائکہ نے اسے شام میں تیار ہونے کی کہا تھا تو بے دلی سے اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''کتنا خوب صورت چہرہ ہے، کتنا خوب صورت جسم ہے...'' اس نے اپنے سراپے پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔ ''لیکن صرف پامال ہونے کے لیے...''

''کاش میں خوب صورت ہی نہ ہوتی... تو شاید یہ درندے مجھے چھوڑ دیتے...''

''یا اللہ ... مجھے توبہ شکنی پر معاف کر دے...'' اس نے آنکھیں بند کر کے کہا تھا۔ ''تو جانتا ہے کہ میں نے کوشش تو کی تھی...''

اس کی آنکھوں سے آنسو نکلے اور اس کے رخساروں پر بہتے چلے گئے۔

پھر رات کا اندھیرا آ گیا۔

اس کا گاہک کمرے میں آ گیا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اس شخص کی طرف ایک نظر دیکھا تھا اور پھر اپنے پیروں کو دیکھنے لگی تھی۔ اس کی نگاہوں میں اداسی تھی، کرب تھا۔ وہ اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گیا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر اس کے نزدیک ہونے لگا۔ اس نے اس کے شانوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ وہ اس کی شرٹ اس کے شانوں پر سے کھسکا رہا تھا۔ نیلم کے منہ سے سسکی نکل پڑی۔

''کک.....کیا ہوا؟؟'' وہ اس کی سسکی سن کر بوکھلا گیا تھا۔ اس نے حیرانی سے نیلم کے جھکے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔ نیلم نے اپنا چہرہ اٹھایا۔ اس کی آنکھیں اشک بار ہو رہی تھیں۔

''تم رو کیوں رہی ہو؟؟'' اس نے ششدر ہو کر سوال کیا۔ وہ زیادہ عمر کا نہ تھا۔ شاید تیس پینتیس سال اس کی عمر رہی ہوگی۔ خاصا خوب رو بھی تھا۔

''میں جسم فروشی نہیں کرنا چاہتی لیکن ان لوگوں نے زبردستی مجھے برہنگی اور بے آبروئی پر مجبور کیا ہے۔'' اس نے شکستہ لہجے میں کہا۔

گاہک ہکا بکا رہ گیا۔ وہ کچھ لمحوں تک کچھ بول ہی نہ سکا۔ چند ثانیوں بعد اس نے پوچھا۔

''اگر تم یہ کام نہیں کرنا چاہتیں تو یہ جگہ چھوڑ کیوں نہیں دیتی ہو؟؟''

''اگر میرے بس میں ہوتا تو میں یہاں بیٹھ کر آنسو نہ بہا رہی ہوتی۔ اس کوٹھے کو چلانے والا بارود خان بہت ظالم ہے۔ اس کے بڑے لوگوں سے تعلقات ہیں۔ کوئی لڑکی یہاں سے فرار نہیں ہو سکتی اور بارود خان کسی کو قتل بھی کر دے تو پولیس اس کو کبھی گرفتار نہیں کرے گی۔''

گاہک پھر سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بار بار نیلم کی طرف دیکھتا۔ نیلم بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔ وہ اسے منع نہیں کر سکتی تھی کہ وہ اسے ہاتھ نہ لگائے کیوں کہ اس نے بارود خان کو رقم ادا کی تھی اور نیلم کے انکار کی صورت میں اس کے ساتھ وہ بہیمانہ سلوک ہی ہوتا جو چند دن قبل ہوا تھا۔

وہ شخص بھی شاید گومگو کی کیفیت میں تھا۔ اسے نیلم پر دست رس تھی۔ وہ اس کے سفید جسم کو جیسے چاہتا، استعمال کر سکتا تھا لیکن اس لڑکی کے آنسو، جو طوائف تھی لیکن طوائف بن کر رہنا اور طوائف بن کر مرنا نہیں چاہتی تھی، رکاوٹ بن رہے تھے۔ شاید اس شخص کے دل سے نکل جانے والا ایمان دوبارہ لوٹ کر آ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ وہ کافی دیر تذبذب میں رہا۔

اس نے کئی بار نیلم کے چہرے کی طرف دیکھا تھا اور اس کی آنکھوں میں اتر آنے والے آنسوؤں سے اس نے نظریں چرانے کی کوشش کی تھی۔ نیلم نے اس سے التجا نہیں کی تھی کہ وہ.....لیکن اس کے خوب صورت چہرے پر پھیلی بے بسی میں التماس ہی تھا۔

وہ کش مکش میں رہا۔ شاید وہ اپنی سفلی جذبات سے لڑ رہا تھا۔ آخر کار اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں بہت گناہ گار ہوں۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے زندگی میں کوئی نیکی کی ہو لیکن میں آج ملنے والا موقع ضائع کر کے نقصان اٹھانے والوں میں سے نہیں ہونا چاہتا۔ میں تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ اگر تم نے توبہ کر لی ہے تو میں بھی توبہ کرتا ہوں۔ لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ اگر آج رات تم محفوظ ہو جاتی ہو تو کیا کل کسی کو اپنے کمرے میں آنے سے روک سکو گی؟؟''

''میں تمہاری شکر گزار ہوں۔ تمھارا سوال بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ مگر تم نے اتنی ہمت کی ہے' میرے ساتھ نیکی کی ہے تو کیا تم میرا تھوڑا سا ساتھ مزید دے سکو گے؟ میں جب بھی اپنے لیے مغفرت کی دعا کروں گی تو تمہارے لیے بھی دعا کیا کروں گی؟؟''

اس کے لہجے میں اب بھی التجا تھی۔ اس توبہ کرنے والے گاہک نے بے تابی سے پوچھا۔

''کہو... میں تمھارا ساتھ دوں گا...''

نیلم چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔

''میں یہاں سے فرار ہونا چاہتی ہوں۔'' اس نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا تھا۔ ''سب لوگ ابھی سیاہ کاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ بارود خان اور نائکہ بھی نشے میں دھت اپنے کمروں میں ہوں گے۔ میں اپنے کمرے کی پچھلی کھڑکی سے نیچے اتر جاتی ہوں۔ تم یہاں بے ہوش بن کر لیٹ جاؤ۔ صبح جب وہ لوگ میرے متعلق پوچھیں تو انھیں کہہ دینا کہ 'نیلم نے مجھے رات میں بہانے سے کوئی نشہ آور چیز کھلا دی تھی۔ میں بے ہوش ہو گیا تھا اور اب تمہارے اٹھانے پر ہوش میں آیا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں فرار ہو گئی؟' اس طرح تم پر الزام نہیں آئے گا۔ شاید تم پر یہ لوگ ویسے بھی شبہ نہ کریں گے۔''

اس نے چند سیکنڈز غور کے بعد کہا۔

''ٹھیک ہے۔ اچھی ترکیب ہے۔ تم جاؤ۔ میں انھیں دیکھ لوں گا لیکن تم اتنی اونچائی سے کیسے اترو گی؟؟''

''زیادہ اونچائی نہیں ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں اتر ہی جاؤں گی کسی نہ کسی طرح...''

وہ کھڑکی کی طرف بڑھنے لگی لیکن پھر وہ یکا یک مڑی اور الماری کی طرف آئی۔ وہ اپنے کپڑے نکال کر ان کی رسی بنانے لگی۔

''تم اس رسی کو پکڑو۔ میں نیچے اتر جاؤں تو کپڑے اسی طرح تہ کر کے الماری میں رکھ دینا تاکہ یہ لوگ تم پر شک نہ کریں۔'' نیلم نے رسی کا ایک سرا اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

پھر کچھ لمحے بعد وہ عقبی کھڑکی سے نیچے اتر رہی تھی۔

''میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔'' نیلم نے نیچے اترنے کے لیے کھڑکی میں داخل ہونے سے قبل رندھی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ ''تم واقعی مرد ہو۔ تم نے اپنے نفس کو شکست دی ہے۔ تم نے توبہ میں میرا ساتھ دیا ہے۔ میرے ساتھ نیکی کی ہے۔ میں تمہارے لیے دعا کیا کروں گی۔''

ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں اور وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن وہ کہہ نہیں پایا تھا۔ نیلم کھڑکی عبور کر چکی تھی۔ وہ بس اسے نیچے اترتا دیکھتا رہ گیا۔

نیلم نیچے اتر کر تیزی سے پچھلی گلی میں دبے پاؤں دوڑتی گئی لیکن اس نے ابھی گلی عبور نہ کی تھی کہ بارود خان کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

''رک جا نیلم ورنہ میں تجھے مار ڈالوں گا۔''

وہ گھبرا گئی لیکن اس کے قدم نہیں رکے تھے۔

''مجھے نہیں رکنا...'' اپنے قدموں کی رفتار تیز کرتے ہوئے اس نے اپنے خود سے کہا تھا۔ ''میں اس غلیظ جگہ پر دوبارہ نہیں جاؤں گی۔''

پھر وہی ذلت نہیں ایسا نہیں ہو گا... قدموں سے زیادہ اس کی سوچیں تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔

''میرا جسم میری ملکیت نہیں ہے... اللہ نے مجھے بنایا ہے تو یہ اس کا حق ہے کہ اس کے حکم کے مطابق ہی جسم کو استعمال کیا جائے۔ میں اب اپنے اللہ کا کوئی حکم نہیں توڑ سکتی۔''

وہ نہیں ٹھہری اور دوڑتی رہی۔

بارود خان نے اب اسے وارننگ نہیں دی۔ اس کے ہاتھ میں سائلینسر لگا ریوالور تھا۔ ریوالور پر سائلینسر نہیں بھی لگا ہوتا تو بھی اسے فکر نہیں ہوتی۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ پیسے دے کر چھوٹ جائے گا۔ کتنے ہی قاتل قتل

رنے کے بعد بھی دھڑلے سے گھوم رہے ہوتے ہیں۔
بھی گرفت میں نہیں آتا' آجاتا تو چھوٹ بھی جاتا۔اس
نے فائر کر دیا۔آواز پیدا کیے بغیر گولی نکلی اور اس کی پشت
ں گھستی چلی گئی۔اسے جھٹکا لگا۔درد کی تیز لہر اس کے
جود میں سرایت کر گئی۔اس نے پھر بھی دوڑنے کی کوشش
لیکن دوسرے فائر میں بھی بہت زیادہ وقفہ نہ تھا۔یہ
ولی اس کے کندھے پر لگی اور وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ
لی۔نیچے گر پڑی تھی۔
'وہ صرف نیکوں کاروں کا ہی نہیں ہے بل کہ وہ گناہ
اروں کا بھی رب ہے۔وہ خوش ہوتا ہے جب کوئی اس
ی طرف پلٹ پڑتا ہے۔' گہرائیوں سے سوچ ابھری۔
اس کا سر زمین سے بہت زور سے ٹکرایا تھا۔اس کو
سب کچھ گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔اس کی پشت اور
کندھے کے ساتھ اس کا سر بھی خون آلود ہو رہا تھا۔
رود خان اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا اور نہ جانے
ریشم کو بھی کیسے خبر ہو گئی تھی۔وہ کہیں سے نکل آئی اور یہ
منظر دیکھ کر ان کی طرف دوڑ پڑی۔
''یہ تُو نے کیا کیا خان...؟؟'' اس نے پھٹی پھٹی
آنکھوں سے نیلم کو تکتے ہوئے کہا۔
''جو بھی بغاوت کرے گا' اس کا یہ ہی انجام ہو گا...''
ارود خان غرایا۔''میں یہ کوٹھا اس لیے نہیں چلا رہا کہ ایک
کے بعد ایک لڑکیاں یہاں سے فرار ہوتی رہیں گی۔''
پھر اس نے ایک اور گولی چلائی تھی۔نائکہ اس کا
ہاتھ روکنے کے لیے تیزی سے آگے بڑھی لیکن گولی
ریوالور کا بطن چھوڑ چکی تھی۔یہ گولی نیلم کے دل میں
پیوست ہوئی۔اسے جھٹکا لگا۔
''کیا وہ ہمیں قبول کر لے گا؟ کیا وہ ہمارے
گناہوں کو معاف کر دے گا؟؟'' اس نے اپنی اکھڑتی
ہوئی سانس کے ساتھ سوچا۔اس کی آنکھیں بند ہوتی جا
رہی تھیں۔اس کی سانس اٹک رہی تھی۔بے شمار مناظر
اس کی آنکھوں کے سامنے ابھر کر معدوم ہو گئے۔
''وہ صرف قبول نہیں کرے گا' وہ صرف معاف نہیں
کرے گا بل کہ تمہارے تمام گناہوں کو نیکیوں میں بدل
دے گا...'' مولانا کا جملہ اس کی سماعت میں گونجا جیسے
انھوں نے سرگوشی سی کی ہو۔اس کے لبوں پر ہلکا سا تبسم
ابھرا۔وہ بہت تکلیف میں تھی۔اس کے جسم میں تین
گولیاں اتر چکی تھیں اور اس کے بچ جانے کے امکانات
مٹتے جا رہے تھے۔سب کچھ دھندلا رہا تھا۔
''اس کی محبت تو ہمارے دل میں ازل سے ہے۔''
تو پھر اس کی فرماں برداری کے حلقے میں بھی آ جاؤ۔''
''میرے آقا میں تیری فرماں برداری کے حلقے میں
آ گئی ...تُو مجھے قبول کر لے...'' اس نے اکھڑتی ہوئی
سانسوں کے درمیان میں سوچا اور دھند تیزی سے بڑھنے لگی۔
''تمہیں وہ سب ملے گا جو تم چاہتی ہو...'' مولانا
کے جملے کی بازگشت پھر ہوئی تھی۔
''یا رب! مجھے تیری رضا چاہیے کیا تو اس دامن تار
تار بندی سے راضی ہو جائے گا...؟؟''
اس کی ایک سانس سے دوسری سانس کے درمیان
میں وقفہ بڑھ گیا تھا۔پھر اندھیرے اس کے وجود پر پھیلنے
لگے۔اس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔اس کے جسم
سے خون تیزی سے نکل رہا تھا۔یہ اس لڑکی کا لہو تھا جس
نے سچی توبہ کی تھی۔ریشم حیرت اور دکھ سے اسے دیکھ رہی
تھی۔ہارود خان کے چہرے پر اب تک درندگی اور بے
حسی پھیلی ہوئی تھی۔وہ اس لہولہان دم توڑتی نیلم کو اس
طرح دیکھ رہا تھا جیسے اس نے کوئی ایسا کارنامہ انجام دیا
ہو جو آج تک کوئی نہ دے سکا ہو۔
نیلم اب ہچکیاں لے رہی تھی۔موت کا غرغرہ بولنے
لگا تھا لیکن وہ اس غرغرے سے قبل ہی توبہ کر چکی تھی۔
پھر اس نے کلمہ پڑھا اور آہستہ آہستہ ساکت ہوتی
گئی۔اس کے چہرے پر سکون پھیلتا گیا۔ریشم نے بہت
حیرت سے اسے دیکھا۔اسے اس سکون پر رشک آ رہا تھا
جو نیلم کے چہرے پر چھایا ہوا تھا۔
''یہ اس لڑکی کا خون ہے جس نے سچی توبہ کی ہے...
'' ریشم نے ساکت نگاہوں کے ساتھ کہا۔''تو نے اچھا
نہیں کیا خان ...دیکھ ...اس کے چہرے پر کتنا سکون
ہے ... اور تو اب ساری زندگی بے سکون رہے گا۔
کاش یہ سکون مجھے نصیب ہو سکے...''
پھر ریشم اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑے زمین پر
بیٹھتی چلی گئی۔

☆☆☆

باغباں نے ہی چمن پھونک دیا

فرزانہ نگہت

اُس نوجوان کا قصۂ عبرت، جس کی ماں نے تین بار اُس کا گھر اجاڑا اور پھر اُسے پاگل خانے کا باسی بنا دیا

''فیضان پاگل ہو گیا ہے۔''

''فیضان پاگل خانے میں داخل ہو گیا ہے۔''

ان خبروں نے خاندان بھر میں بھونچال سا برپا کر دیا۔ جن لوگوں کو حالات کا علم تھا وہ تو زیادہ حیرت زدہ نہ ہوئے لیکن حالات سے ناواقف لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ حیرانی و پریشانی، رنج و صدمہ، خوف و دہشت، الجھن، مخمصوں نے اپنی اپنی جگہ سب کو عجیب و غریب کیفیات سے دوچار کر دیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ واقفانِ حال اس موقع پر یوں تبصرہ کر رہے تھے۔

''یہ تو ہونا ہی تھا، ماں کی دھونس و جبر نے یہی گل کھلانا تھا۔''

''معلوم ہوتا ہے یہ بے جی کی بددعائیں لگی ہیں۔''

فیضان کے والد چچا ظہیر ابا جان کے پھوپی زاد بھائی تھے۔ اس ناتے سے وہ ہمارے چچا ہوتے تھے۔ وہ ایک بڑے سرکاری افسر تھے۔ ان کے والد کی کافی زرعی زمینیں اور جائیداد تھی جو ان کے انتقال کے بعد تین بہنوں اور دو بھائیوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ چچا ظہیر کو جو حصہ ملا تھا اس سے وہ خاصے خوش حال اور فارغ البال ہو گئے تھے۔ وہ بڑی پروقار اور شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی شادی خاندان سے باہر ہوئی تھی۔ ان کی بیوی آنٹی شمیم بے حد حسین و جمیل اور پروقار خاتون تھیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بڑے رکھ رکھاؤ والی تھیں۔ چچا ظہیر ان سے بے حد محبت کرتے تھے اور ان کے غلامِ بے دام بنے رہتے تھے۔ بالفاظ دیگر وہ خوب زن مرید تھے۔ اپنی بوڑھی ماں کی بجائے جوان کے پاس ہی رہتی تھیں۔ بیوی ہی کی سنتے اور اسی کے طرف دار بنے رہتے تھے۔

چچا ظہیر کی بوڑھی ماں خاندان بھر میں سب سے عمر رسیدہ بزرگ خاتون تھیں۔ جو ہر جگہ ''بے جی'' کہلاتی تھیں۔ بے حد نیک اور پرہیزگار، بے حد عمدہ اخلاق والی، ہر کسی کو دعائیں دینے والی خاتون تھیں، جن کی سب بے حد عزت و احترام کرتے تھے اور ان کی خدمت میں حاضری دینا باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ ان

کا اپنا گھر گجرات میں تھا۔ وہاں ان کی دو بیوہ بیٹیاں اپنے شادی شدہ بیٹوں کے ساتھ رہتی تھیں لیکن بے جی ان کے پاس رہنے کی بجائے چچا ظہیر کے پاس اس لیے رہتی تھیں کہ اپنی اولاد میں سب سے چھوٹے ہونے کے سبب وہ ان کے بے حد لاڈلے اور پیارے تھے جب کہ ان کے بڑے بیٹے چچا توقیر بھی لاہور میں رہتے تھے۔ وہ ان کے ہاں ایک دو دن رہنے چلی جاتی تھیں لیکن مستقلاً وہ چچا ظہیر کے ہاں ہی رہا کرتی تھیں۔

چچا ظہیر کی بیوی آنٹی شمیم مزاج کی خاصی تیز اور معمولی معمولی باتوں پر لڑائی جھگڑا کھڑا کرنے کی شوقین واقع ہوئی تھیں۔ انہیں شروع دن ہی سے بے جی کا اپنے گھر رہنا گراں گزر رہا تھا۔ بے جی بوجہ بڑھاپے اور بیماری ان کی خدمت کی محتاج تھیں۔ اور وہ یہ فریضہ انتہائی ناگوار انداز میں انجام دیتی تھیں۔ ان کے لیے پرہیزی خوراک تیار کرنا، ان کی دوائیوں کا خیال رکھنا، ان کی خبر گیری سب ان پر بے حد گراں گزرتا تھا۔ وہ ہر دم منہ پھلائے رکھتیں۔ بڑبڑاتی رہتیں، دبی زبان میں چچا ظہیر کو انہیں بڑے بھائی کے گھر یا گجرات چھوڑ آنے کو کہتیں لیکن چچا ظہیر کو بے جی سے بے حد محبت تھی یا لوگوں کی زبانوں کا ڈر، وہ انہیں ٹالتے رہتے۔

اسی طرح وقت گزرتا گیا۔ چچا ظہیر کے ہاں ایک بیٹی نے جنم لیا۔ بے جی نے بیماری کے باوجود نوکرانیوں کے ہوتے ہوئے بھی اپنی بہو کی بے حد خدمت کی اور اس کا ہر ممکن خیال رکھا لیکن یہ آنٹی شمیم

کی فطرت کی کجی تھی کہ انہوں نے ان کی بزرگی، محبت، خدمت گزاری کا کوئی لحاظ نہ کیا اور ان سے پہلے جیسا رویہ ہی روا رکھا بلکہ انہوں نے اب ان سے گستاخانہ پیش آنا اور زبان درازی بھی کرنی شروع کردی اور چچا ظہیر کو الٹی میٹم دینا شروع کردیا کہ وہ انہیں گجرات یا بھائی توقیر کے ہاں چھوڑ آئیں ان سے اب ان کی خدمتیں نہیں ہوتیں۔

چچا ظہیر بیوی کے غلام بے دام ہی تھے۔ انہوں نے بوڑھی ماں کے آنسوؤں کا کوئی لحاظ نہ کیا اور انہیں سامان سمیت چچا توقیر کے ہاں چھوڑ آئے۔ جن کی بیوی ہر کسی کے آگے تو اپنی ساس کی بے حد تعریفیں کرتی تھیں لیکن انہیں ایک دن بھی اپنے گھر میں رکھنے کی روادار نہ تھیں۔ حالانکہ بے جی ان پر کوئی بوجھ وغیرہ نہ بنتی تھیں کیونکہ چچا توقیر ایک بڑی منافع بخش فیکٹری کے مالک اور بڑے امیر کبیر آدمی تھے۔

ضعیف و ناتواں، دکھی و غمزدہ بے جی صرف تین دن ہی چچا توقیر کے ہاں رہ پائیں کیونکہ چوتھے دن ان کی بیگم نے انہیں سامان سمیت موٹر میں گجرات بیٹیوں کے پاس بھجوا دیا۔ چچا ظہیر کی طرح چچا توقیر بھی بیوی کے غلام بے دام اور ان سے دب کر رہنے والے تھے۔ انہوں نے اس پر کوئی احتجاج نہ کیا نہ ایک لفظ بولے۔ یوں بے جی دونوں بیٹوں سے مایوس اپنی بیٹیوں کے پاس چلی گئیں۔

☆.....☆

بے جی سے چھٹکارا پا کر آنٹی شمیم نے اب خوب پر پُرزے نکالنے شروع کیے۔ انہوں نے اب ہر جگہ آنا جانا اور اپنے حلقۂ احباب کو وسعت دینا شروع کردیا۔ اے دن کی دعوتیں پارٹیاں ان کا معمول بن گئیں۔ اس دوران ان کے ہاں دوسری بیٹی کی پیدائش ہوئی لیکن ان کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ ان کے ٹھاٹ باٹ میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ بے حد امیرانہ طرزِ رہائش کے ساتھ انہوں نے چمچماتی نئی کار بھی خرید لی جو اس زمانے میں بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔

دو سال مزید گزر گئے۔ چچا ظہیر کے ہاں ایک نہایت خوب صورت اور صحت مند بیٹے نے جنم لیا۔ اس کی پیدائش پر بے حد خوشیاں منائی گئیں اور دھوم دھام سے عقیقہ وغیرہ کیا گیا۔ اس بیٹے کا نام فیضان رکھا گیا۔ اب بڑے ناز و نعم سے اس کی پرورش و پرداخت شروع ہوئی۔ بے جی اس وقت بیمار اور بستر پر پڑی تھیں اس لیے باوجود انتہائی خواہش کے پوتے کی پیدائش پر منائی جانے والی خوشیوں میں شریک ہونے لاہور نہ جاسکیں۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ بیٹا اور بہو پوتے کو انہیں دکھانے ان کے پاس لائیں پوری نہ ہوسکی اور وہ جلدی آغوشِ لحد میں جا سوئیں۔

چچا ظہیر اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں اور بیٹے کی تعلیم پر خاص توجہ دی۔ ان کی بیٹیوں نے ایم اے تک تعلیم حاصل کی جس کے بعد اچھے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ گھروں میں ان کی شادیاں کردی گئیں۔ فیضان نے کامرس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ایک بینک میں اچھے عہدے پر فائز ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی آنٹی شمیم کو اس کی شادی کی فکر نے ستانا شروع کردیا۔ یہیں سے اصل کہانی شروع ہوتی ہے۔

فیضان چونکہ بے حد وجیہہ اور شاندار پرسنالٹی کا مالک تھا۔ کماتا بھی بہت اچھا تھا۔ اس لیے آنٹی شمیم چاہتی تھیں کہ اس کی شادی کسی ایسی لڑکی سے ہو جو خوب صورت ہونے کے ساتھ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور فیشن پرست بھی ہو۔ خاندان میں ان کے اس معیار پر پوری اترنے والی کوئی لڑکی موجود نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے خاندان کے باہر نظریں دوڑانی شروع کردیں اور بالآخر ایک ایسی لڑکی تلاش کر ہی لی جو ایک بے حد امیر کبیر گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ ایم بی اے تھی۔ حسین بھی تھی، آزاد خیال اور فیشن پرست بھی۔ وہ ایک کاروباری ادارے میں اچھے عہدے پر فائز تھی۔

آنٹی شمیم اور چچا ظہیر کو یہ رشتہ بے حد پسند آیا۔ ادھر اس لڑکی فریدہ کے گھر والوں کو بھی

فیضان کا رشتہ پسند آیا۔ چنانچہ دھوم دھام سے منگنی کے بعد بڑی دھوم دھام شادی ہوئی جس پر سب نے خوب رشک کیا۔

☆.....☆

سب کا خیال تھا کہ اب فیضان کا گھر بس گیا ہے۔ وہ اور اس کی بیوی اب اکٹھے سفرِ حیات کا آغاز کریں گے، ہر شادی شدہ جوڑے کی طرح ان کی زندگی بھی اس طرح گزرے گی ان کے بچے ہوں گے، ذمہ داریاں ہوں گی، مستقبل کی فکریں اور خواب ہوں گے لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہوسکا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ فیضان کا شمار ایسے بیٹوں میں ہوتا تھا جو اپنی ماؤں کے چنگل میں اس بری طرح پھنسے ہوتے ہیں کہ ان کے پاس اپنی کوئی قوتِ فیصلہ کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ جنہوں نے اپنے آپ کو کلی طور پر اپنی ماؤں کی سپردگی میں رکھا ہوتا ہے کہ وہ ان کے ذاتی معاملات کے بارے میں اپنی مرضی چلائیں، فیصلے کریں اور وہ انہیں بلا چوں و چرا مانتے چلے جائیں۔ چنانچہ اب یہ ہوا کہ فیضان اور اس کی بیوی کا گھومنا پھرنا، سیر و تفریح، میل ملاپ، شاپنگ و خریداری سب آنٹی شمیم کی مرضی کے تابع ہوگیا۔ ان کی مرضی سے انحراف کی ہمت نہ کبھی چچا ظہیر میں پیدا ہوئی تھی نہ فیضان میں۔ یوں بے چاری فریدہ گویا گھٹن میں مبتلا ہو گئی۔ وہ خود اچھا کماتی تھی۔ اپنے پیسے اپنے اوپر خرچ کرنے کا حق رکھتی تھی لیکن آنٹی شمیم نے اس پر بھی پابندی لگادی کہ وہ ان کی مرضی کے بغیر اپنے پیسے کہیں خرچ نہ کرے کچھ لینا خریدنا ہو تو ان سے پوچھ لیا کرے۔

ایسی پابندیاں عام انسان کے لیے بھی ناقابلِ برداشت ہوا کرتی ہیں۔ پھر یہ فریدہ تھی جو نسبتاً آزاد خیال، آزادی پسند، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کھلے ماحول کی پروردہ تھی۔ اس نے فیضان سے اس کی ماں کے رویے کی شکایتیں کرنی شروع کردیں۔ آنٹی شمیم سے بھی وہ احتجاج کرنے لگی۔ یوں گھر میں آئے روز نااتفاقیاں جنم لینے لگیں جو باقاعدہ لڑائی جھگڑے کی صورت اختیار کرگئیں۔

☆.....☆

پھر ایک دن خاندان والوں نے خبر سنی کہ فیضان نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی! اس لیے کہ وہ پاگل ہوگئی تھی۔

یہ خبر خاندان والوں کے حواس مختل کرنے کے لیے کافی تھی۔ انہوں نے چچا ظہیر سے فون پر رابطہ کرتے ہوئے اس خبر کی تصدیق چاہی تو انہوں نے اس کی تصدیق ضرور کی لیکن مزید کچھ بتانے سے انکار کردیا۔ اس کے بعد انہوں نے اور آنٹی شمیم نے فون اٹھانا ہی بند کردیا۔ بلکہ خاندان والوں سے ملنا جلنا بھی چھوڑ دیا۔

فیضان کی یہ شادی بمشکل چھ ماہ ہی برقرار رہی تھی۔

اب آنٹی شمیم کو فیضان کے لیے نئی بیوی کی تلاش ہوئی۔ وہ انہیں خاندان میں ہی مل گئی۔ وہ ہماری والدہ کی خالہ زاد بہن خالہ فضیلت کی بیٹی شاہینہ تھی جو خوبصورت بھی تھی اور سلیقہ مند بھی۔ وہ بی اے تک تعلیم یافتہ اور امورِ خانہ داری میں خوب طاق تھی۔ لوگوں کو شاید فیضان کے ساتھ اس کی شادی پر رشک آتا لیکن اس کی پہلی بیوی کی پراسرار سی طلاق نے سب کو چونکایا ہوا تھا۔ انہیں یہ معاملہ کچھ عجیب سا معلوم ہو رہا تھا۔

خیال تھا کہ فیضان کی پہلی بیوی کے برعکس جو غیر خاندان کی تھی۔ آنٹی شمیم اس کی اس نئی بیوی کا لحاظ و خیال کریں گے جو اپنے ہی خاندان کی بیٹی تھی لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ شاہینہ کے ساتھ بھی آنٹی شمیم کی روش وہی رہی جو فیضان کی پہلی بیوی کے ساتھ تھی اور فیضان تو اپنی ماں کے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلی تھا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ آئے دن کے جھگڑوں سے گھر کی فضا مکدر رہنے لگی۔ ساس بہو کے ان جھگڑوں میں چچا ظہیر ہمیشہ اپنی بیوی کی طرف داری کیا کرتے تھے۔ ایک دن دونوں خواتین کے

درمیان جو زنانے کا جھگڑا ہوا تو چچا ظہیر نے چراغ پا ہو کر پیپسی کی شیشے کی بوتل اٹھا کر اس زور سے شاہینہ کے سر پر رسید کی کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ اس کی چیخ پکار پر ہمسائے دوڑے ہوئے آئے۔ انہوں نے یہ صورت حال دیکھ کر پولیس کو اطلاع کر دی جس پر پولیس والے آ کر چچا ظہیر کو قاتلانہ حملے کے الزام میں پکڑ کر لے گئے۔ کچھ ہمدردوں نے شاہینہ کو اسپتال پہنچا دیا جہاں اس کے سر میں کئی ٹانکے آئے تھے۔

خالہ فضیلت اور ان کے شوہر بھی اس حادثے کی خبر سن کر وہاں آن پہنچے اور شاہینہ کو اپنے گھر لے گئے۔

اب چچا ظہیر پر قاتلانہ حملے کے الزام میں مقدمہ چلنے لگا جو طول کھینچتا گیا۔ انہیں بچانے کے لیے ان کے بڑے بھائی چچا توقیر نے چوٹی کے وکلاء کی خدمات حاصل کیں اور انہیں عدالت سے باعزت بری کروا لیا۔ پھر کچھ عرصے بعد سنا گیا کہ فیضان کی طرف سے شاہینہ کو طلاق نامہ بھجوا دیا گیا ہے۔

اس خبر نے خاندان بھر میں شدید غم و غصہ کی لہر دوڑا دی۔ کیونکہ شاہینہ خاندان کی بیٹی اور سب کی دیکھی بھالی تھی۔ خالہ فضیلت اور ان کے شوہر خاندان میں بے حد نیک نام اور بڑی عزت و قدر رکھتے تھے۔ سب نے جی بھر کے چچا ظہیر اور آنٹی شمیم کی مذمت کی اور ان سے میل جول بند کر دیا۔ وہ بھی سب سے الگ تھلگ ہو گئے۔ اپنے بہن بھائیوں سے بھی ان کے تعلقات میں بال آ گیا تھا لیکن تعلقات برقرار تھے۔

☆.....☆

کچھ عرصہ گزر گیا۔ اس حادثے کی گرد بیٹھنے لگی۔ لوگوں نے بھی چچا ظہیر کے خاندان کا مقاطعہ ختم کر کے ان سے میل جول شروع کر دیا۔ وہ لوگ بھی خاندانی تقریبات میں شریک ہونے لگے۔ فیضان بھی اکثر تقریبات میں دکھائی دے جاتا تھا۔ اسے دیکھ کر لوگوں کو دکھ ہی محسوس ہوتا تھا۔ وہ کچھ خاموش اور بجھا بجھا سا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی زندہ دلی، شگفتہ مزاجی ہر دم چاک و چوبند رہنے کی عادت سب ختم ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ باتیں کرتے کرتے کھو سا جاتا۔ کچھ سوچنے لگتا۔ اکثر اوقات اکیلے بیٹھے بیٹھے خود کلامی شروع کر دیتا اور غائب دماغ سا دکھائی دیتا۔

☆.....☆

ایک بار پھر سنا گیا کہ فیضان کی شادی ہو رہی ہے۔ اس خبر نے خاندان میں سب کو حیران و پریشان سا کر دیا۔ کیونکہ سب کا خیال تھا کہ دو بیویوں کی طلاقوں کے بعد شاید کوئی اسے اپنی بیٹی دینا نہ پسند کرے گا کیونکہ اس کی حیثیت اب بے حد مشکوک ہو چکی تھی۔

معلوم ہوا کہ وہ کوئی باہر کے لوگ تھے۔ جو چچا ظہیر کی کالونی میں نئے آ کر آباد ہوئے تھے۔ وہ کاروباری لوگ تھے۔ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی جو نہایت خوب صورت اور ایک کالج میں پروفیسر تھی، اس کے ساتھ فیضان کا رشتہ طے ہوا تھا۔ وہ لوگ فیضان کے حالات سے واقف نہیں تھے اسی لیے اس رشتے پر رضامند ہو گئے تھے۔

بہرکیف یہ شادی بھی خاصی دھوم دھام سے ہوئی۔ خاندان والوں نے مارے بندھے محض رشتہ داری کا لحاظ کرتے ہوئے اس میں شرکت کی۔ اس موقع پر خاندان کے بزرگوں نے چچا ظہیر اور ان کی بیگم کو سمجھایا کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنی بیوی کے ساتھ اپنی زندگی خود مختارانہ طور پر گزارنے دیں۔ اس کا گھر بسنے دیں۔ اس میں کوئی مداخلت نہ کریں۔

فیضان کی اس شادی کو جب کافی عرصہ گزر گیا اور اس کی طرف سے کوئی خبر نہ اڑی تو خاندان والوں نے اطمینان کی سانس لی کہ چلو بالآخر یہ شادی بچ ہی گئی۔ شاید چچا ظہیر اور ان کی بیگم نے بالآخر عقل کے ناخن لے ہی لیے تھے۔

لیکن افسوس یہ شادی بھی دیرپا ثابت نہ ہو سکی۔ آنٹی شمیم کی حاکمانہ طبیعت اور بیٹے بہو پر اپنی مرضی

ٹونسنے اور ان کے ہر معاملے میں دخل دینے کی عادت نے گھر میں لڑائی جھگڑوں کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ ان جھگڑوں نے یہاں تک نوبت پہنچا دی کہ فیضان کی بیوی آئے دن روتی دھوتی میکے جا کر بیٹھنے لگی۔ اس کے ماں باپ نے چچا ظہیر اور آنٹی شمیم سے افہام و تفہیم کے ذریعے معاملات سلجھانے کی بے حد کوشش کی لیکن حالات بگڑتے ہی چلے گئے۔ آنٹی شمیم اب فیضان کی اس بیوی سے بھی چھٹکارا پانے کا سوچنے لگیں۔ یوں یہ شادی بھی بالآخر ختم ہوگئی۔ فیضان کی اس بیوی کو بھی طلاق ہوگئی۔

اس خبر نے خاندان بھر کو سکتے میں مبتلا کر دیا۔ ہر طرف سے لعنتوں ملامتوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ سب نے چچا ظہیر اور آنٹی شمیم سے تعلقات ختم کر لیے۔ چچا توقیر نے بھی ان کی اس حرکت کی بے حد مذمت کی اور ان سے میل ملاپ بند کر دیا۔

شنید تھی کہ فیضان کو اپنی اس بیوی سے بے حد محبت تھی۔ وہ خوب صورت بھی تھی خوب سیرت سلیقہ شعار اور خدمت گزار بھی۔ اس سے شادی کے بعد وہ امید لگا بیٹھا تھا کہ اس کی ماں اپنی اس بہو کی ضرور قدر کرے گی اور اس کی تمام زندگی اس کی رفاقت میں اچھی گزر جائے گی لیکن اس کی یہ امید پوری نہ ہو سکی اور اس کی یہ شادی بھی اس کی ماں کی کج فطرتی کی بھینٹ چڑھ گئی۔

☆.....☆

فیضان کے دل کی دنیا اجڑ گئی۔ زندگی برباد ہو گئی۔ ماں کے کہنے پر اس نے اپنی بیوی کو طلاق تو ضرور دے دی لیکن وہ اس کا صدمہ نہ سہہ سکا۔ یہ دکھ کہ اس کی ماں اس کی ازدواجی مسرتوں کی قاتل تھی اس کی جان کا روگ بن گیا۔ اس پر پہلے طویل خاموشی کے حملے ہونے لگے۔ پھر اس نے بے معنی اور بے ربط باتیں کرنی شروع کر دیں۔ وہ تقریباً تمام رات گھر سے باہر سڑکوں پر پھرتے ہوئے اونچی آواز میں خود کلامی کرنے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا دماغ کام کرنا چھوڑنے لگا اس کے ساتھ ہی اس کی ملازمت بھی جاتی رہی۔ وہ اب کسی کو نہ پہچان پاتا تھا۔ اسے اپنا نام بھی بھول گیا۔ جو کوئی اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا تو جواباً وہ اونچے اونچے قہقہے لگانے لگتا۔

اب تو چچا ظہیر اور آنٹی شمیم کے بھی ہاتھ پیر پھولے۔ انہیں اب کہیں جا کر ہوش آیا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ کیسا ظلم کر بیٹھے تھے۔ انہوں نے تین مرتبہ اس کی شادی کی تھی اور ایک بار بھی اس کا گھر نہ بسنے دیا تھا۔ اس کے تمام ارمان، مستقبل کی زندگی کے سنہرے خواب، حسین امیدیں، سب خاک میں ملاتے رہے تھے۔ وہ حد درجہ سعادت مند اور فرمانبردار بیٹا ان کے ہر ظلم پر خاموش رہا تھا۔ اس کا دکھ اپنے دل میں پالتا رہا تھا۔ حالات کا جبر اور دباؤ خاموشی سے سہتا رہا تھا اور بالآخر حوصلہ ہار گیا تھا۔ انہوں نے پہلے تو فیضان کے بارے میں کڑی رازداری برتنے کی کوشش کی اور چپکے چپکے اس کا علاج معالجہ کروانا شروع کر دیا لیکن جب اس کی حالت سنبھلنے کی بجائے بگڑتی ہی چلی گئی تو انہیں چار و ناچار اسے پاگل خانے داخل کروانا پڑا۔

☆.....☆

اب اس واقعے کو چھ سال گزر چکے ہیں۔ فیضان کی ذہنی حالت ویسی ہی ہے جیسا کہ پہلے تھی۔ شاید اس کی تمام عمر مینٹل اسپتال میں ہی تمام ہو جائے گی۔ چچا ظہیر اور آنٹی شمیم وقت سے پہلے ہی بوڑھے ہو چکے ہیں، اکلوتے بیٹے کا غم اوپر سے ضمیر کی خلش انہیں ہر دم بے چین رکھتے ہیں۔ ایک بے جی پر ڈھایا ہوا ظلم دوسرے بیٹے کے گھر اجاڑنے کے احساسِ جرم اور گناہ نے زندگی ان کے لیے مستقل اذیت و آزار بنا رکھی ہے۔ ستم یہ ہے کہ کسی کو بھی حتیٰ کہ ان کی اپنی بیٹیوں تک کو بھی ان سے ہمدردی نہیں۔ وہ کھلی زبان سے انہیں اپنے پیارے بھائی کی خوشیوں کے قاتل کہتی ہیں۔ فیضان کی سابق بیویاں اپنے دوسرے شوہروں بچوں کے ساتھ اپنے گھروں میں خوش ہیں اور فیضان؟ کاش اس پر اتنا ظلم نہ ہوتا!

☆☆☆

سفرنامہ

برف کے شہر

قمر علی عباسی

پاکستان کی برف پوش وادیوں کی سیر کرا تا ایک منفرد سفرنامہ قمر علی عباسی کے قلم کا جادو

آخری حصہ

چین سے ریشم

ہم عمان کے شہر مسقط پہنچے ایک جاننے والے کھانے پر لے گئے۔ یہ ہندوستانی ریسٹورنٹ تھا جہاں پر ٹیبل کے ساتھ بڑی بڑی تصویریں لگی تھیں فلمی ستاروں کی۔ آپ پسند کی ہیروئن کی تصویر والی ٹیبل پر بیٹھ سکتے تھے۔ ایک حیرت انگیز بات یہ تھی کہ کھانوں کے نام بھی اسی مناسبت سے تھے۔

سشمیتا سین سموسے
کرینہ کپور گول گپے
کاجول کشکس
من من سین گلاب جامن
کرشمہ فالودہ
سونالی قلفی
اور ارملا پان مدراسی

ہم نے ہیروئنز کے نام کی ہر ڈش منگوائی اور لطف لے کر کھایا لیکن گلگت سے ہنزہ جاتے ہوئے جب غلام حسین نے بتایا کہ ہم سلک روڈ سے گزر رہے ہیں تو اس نام نے چونکا دیا۔ ریشمی نرم و نازک کپڑے کا سخت پختہ سڑک سے کیا واسطہ ہمیں بتایا گیا زمانہ قدیم میں چین میں دنیا کی بہترین سلک بنائی جاتی تھی جو دنیا بھر میں بھیجی جاتی تھی حالانکہ اس راستے سے اور بھی بہت سی چیزیں آئی تھیں لیکن اس زمانے میں بھی چین کو یہ سوجھ بوجھ تھی کہ اپنی مصنوعات کی شہرت کچھ اس طرح کرے کہ اپنی پوری سڑک کا نام ہی سلک روڈ رکھ دے۔

چین میں ہین دورِ حکومت میں اس سڑک کو بنایا گیا اس کی تعمیر کا زمانہ دو سو چھیاسٹھ قبل مسیح سے دو سو بیس تک ہے اتنے ہی عرصے ہین خاندان کی حکومت رہی اس کا مطلب ہے کہ وہ دوسرے کاموں کے بجائے صرف سڑکوں پر ہی توجہ دیتے رہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خود سڑک پر آ گئے اور لوگوں نے اس سڑک کی تکمیل سے دو سال پہلے ہی غالباً انہیں ''سلک'' کر دیا کہ جاؤ نکل لو۔

ایک زمانے میں بادشاہ زیادہ تر سڑکوں پر توجہ دیتے تھے۔ تیسری صدی قبل مسیح میں چندر گپت موریا کی ہندوستان پر حکومت تھی ان لوگوں نے بھی ٹیکسلا سے پاٹلی پتر تک جواب پٹنہ کہلاتا ہے۔ ایک لمبی سڑک بنائی۔

میں تجارت کے علاوہ دوسرے علاقوں سے میل جول
ی رکھنا پڑتا تھا۔ چندر گپت موریا کے پاس ایک بڑی
ج تھی جو سڑک کی دیکھ بھال بھی کرتی تھی اس وقت اس
ں لمبائی پانچ سو میل تھی بعد کو اس میں توسیع ہوئی آج
ل ہم اسے گرینڈ ٹرک روڈ کہتے ہیں جو کابل سے
ناگام تک جاتی ہے۔

سلک روڈ ایک طرف مشرق وسطیٰ کے لوگوں کو ملاتی
ی تو دوسری طرف پھیلی ہوئی افریقا تک چلی جاتی تھی
ں کی لمبائی چار ہزار میل تھی۔ اس سڑک نے تہذیب و
دن اور ترقی میں بڑی مدد کی، اس راستے سے ہندوستان
سے بدھ مذہب گیا۔ وہاں سے جو کچھ آیا اس میں ''کالی
وت'' بھی تھی۔ یہ چوہوں کے ذریعے پھیلا طاعون تھا
س نے چین سے سفر کیا اور ہر طرف پھیل گیا ایک
ندازے کے مطابق اس سے پچھتر ملین سے لے کر دو سو
ین لوگوں کی جان گئی لیکن اس میں کسی کا کیا قصور؟ دنیا
ں انسانی آبادی سے زیادہ زیر زمین چوہے رہتے ہیں
ور سوائے ماریشس کے دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں جہاں
یہ پائے نہ جاتے ہوں۔ اس المیے کے باوجود بھی سلک
روڈ استعمال ہوتا رہا۔

آج بھی ہنزہ کی وادی میں ایک سلک روڈ ٹاؤن
ہے جہاں اشیاء کے بدلے اشیاء لی جاتی ہیں۔ اس ٹاؤن
کے لوگوں کی عمریں ماشاء اللہ خوب دراز ہیں شاید روپے
پیسے کے لین دین نہ ہونے کی وجہ سے وہ بہت سی
پریشانیوں سے دور رہتے ہیں اور لمبی عمریں پاتے ہیں۔

جب پاک چین دوستی میں شاہراہ قراقرم بنایا گیا تو
سلک روڈ کا حصہ بھی اس میں شامل ہو گیا لیکن تاریخ اپنی
جگہ، جغرافیہ کتنا ہی تبدیل ہو جائے تاریخ کے صفحات اپنا
ماضی نہیں بدلتے۔

ذکر کچھ سیاحوں کا

سلک روڈ نے جہاں ایک ملک سے دوسرے ملک
اشیاء بھیجنے میں مدد کی وہاں سیاحوں کو بھی راستہ دکھایا۔
سلک کے علاوہ کی نامی گرامی بدھ مذہب کے پیروکار اس
راستے سے گلگت آئے اور پھر اپنی منزل تک پہنچے۔ اس
کے علاوہ کچھ اور سیاح بھی اس علاقے سے گزرے اور
شاہراہ قراقرم کے راستے گلگت پہنچے۔ کچھ جو مشہور ہوئے
ان میں چین، اٹلی اور پاکستان کے سیاح شامل ہیں۔

1۔ فیکس ان۔ یہ چائنا کا بدھ منک تھا جو تین سو
سینتیس عیسی میں پیدا ہوا اور چار سو چوبیس تک دنیا میں
رہا۔ اسے گوتم بدھ اور ان کے مذہب سے گہرا لگاؤ تھا۔
اس محبت میں وہ چین سے پیدل چل نکلا ممکن ہے راستے
میں کسی نہ کسی نے گھوڑے گدھے پر کچھ فاصلے تک سفر کرا
دیا ہو۔ فیکس ان نے ہندوستان اور نیپال کا سفر کیا۔ یہ گوتم
بدھ کی جائے پیدائش لومبائی نیپال بھی گیا اسے گوتم بدھ
کے اقوال اور تعلیمات کی تلاش تھی اس نے بے شمار مندر
دیکھے جہاں جہاں اسے گوتم بدھ کا کوئی نشان، اس کے
دور کی کوئی لکھائی یا کوئی خاص چیز نظر آئی وہ مطالعہ اور
مشاہدہ کرتا رہا زندگی کا ایک بڑا حصہ اسی میں گزارا وہ
ایک عرصے تک سری لنکا میں رہا پھر واپسی کے لیے ایک
جہاز میں سوار ہوا۔ بدقسمتی سے شدید طوفان آیا اور جہاز
بھٹک کر جاوا جا پہنچا۔ فیکس ان پانچ مہینے تک اس جگہ رہا
پھر دوبارہ جہاز میں سوار ہوا لیکن عجیب بات ہوئی پھر
طوفان آ گیا نہ جانے فیکس ان کو دیکھ کر سمندر کیوں غصے
میں آ جاتا تھا۔ اس بار طوفان نے جہاز کو کنگ گاڈ داؤ پہنچا
دیا یہ اتفاقاً چائنا کا ہی حصہ تھا وہ کسی طرح اپنے گھر پہنچا
اور باقی وقت جو کچھ اسے سری لنکا، نیپال اور ہندوستان
سے ملا تھا اس کی ترتیب اور ترجمے میں گزارا پھر ایک بار
دوبارہ سلک روڈ سے ہندوستان کے علاقے پاٹلی پتر آیا
اپنی کتاب میں اس نے سلک روڈ کا ذکر بھی کیا واپس
چین پہنچا اور پھر چین کی نیند سو گیا۔

2۔ زان زنگ: چائنا میں 602ء میں پیدا ہوا تھا
اور 664ء میں دنیا سے چلا گیا۔ وہ بچپن سے مذہب کی
طرف راغب تھا۔ تیرہ سال کا ہوا تو بدھ مذہب کے
سادھوؤں میں شامل ہو گیا اسے بدھ مذہب سے گہرا لگاؤ
تھا اس نے تقریباً پورے چین کا سفر کیا۔ وہ مذہبی کتابوں
کی تلاش میں رہتا اس نے فیکس ان کے سفر کے بارے
میں پڑھا تھا اور اسے بے حد پسند کرتا تھا ایک وقت وہ بھی
آیا کہ وہ بدھ مذہب کا منک بن گیا اور ہندوستان جانے
کا فیصلہ کیا اس لیے سنسکرت زبان سیکھی، زان زنگ
ستائیس سال کا تھا تو اسے خواب میں نظر آیا کہ ہندوستان

کا سفر کرو اور اس نے اس خواب کو پورا کرنے کے لیے ہندوستان جانے کا منصوبہ بنالیا اور اسی سال چل دیا۔ وہ بڑا خوش نصیب انسان تھا خواب کو پورا کرنے نکلا۔ ہم روز خواب دیکھتے ہیں اور کبھی انہیں پورا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ زان زنگ سلک روڈ سے ہندوستان جاتے ہوئے بے شمار بدھ منکوں سے ملا۔ وہ افغانستان گیا جہاں گوتم بدھ کے مندر اور بت تھے اس نے ہندوستان، سری لنکا کے تمام اہم مندر اور بدھ مقامات دیکھے اس نے پہلی بار ہندو اور جین مذہب والوں سے بھی ملاقاتیں کیں۔ زان زنگ ایک طویل عرصے بعد واپس لوٹا اور جو کتاب اس نے تحریر کی وہ وسطی ایشیاء اور ہندوستان کے اس زمانے کے حالات کی ابتدائی سند سمجھی جاتی ہے۔ وہ 1956ء تک تائی جن کے مندر میں دفن تھا اس کے بعد دلائی لامہ نے اس کی باقیات نکال کر ہندوستان کو دے دیں جو پٹنہ میوزیم میں رکھی ہیں۔ چنگڈو والے دعویٰ کرتے ہیں کہ زن کی باقیات ان کے پاس ہیں۔

1942ء میں جاپان کی امپیریل آرمی کے سپاہی اس کی باقیات جاپان لے گئے اور اب وہ نارا جاپان میں موجود ہیں۔

زان زنگ کی باقیات پر ہندوستان سے زیدہ سری لنکا کا حق ہے ہوسکتا ہے کسی زمانے میں جس طرح گوتم بدھ کا دانت سری لنکا پہنچا دیا گیا تھا۔ اسی طرح زان زنگ کی باقیات بھی سری لنکا پہنچ جائیں۔

3۔ مارکو پولو: ہمیں مارکو پولو سے شکایت ہے۔ ظالم سفر پر نکلا تو وادی ہنزہ سے ہوتا ہوا چین چلا گیا اور اب اس علاقے میں بھیڑ اس کے نام سے مشہور ہے حالانکہ بیشتر علاقوں میں ہم نے سیاحت کی لیکن کسی نے ہمارے نام سے کچھ منسوب نہیں کیا۔ ایک بار اٹلی جانا ہوا تو وینس میں مارکو پولو کے گھر پہنچے یہ پوچھنے کہ وہ کیا ترکیب ہے جس سے اس نے اپنے نام پر پلتستان کی ایک بھیڑ کی نسل مشہور کروائی اور اٹلی کے ایئرپورٹ کو بھی اپنا نام دیا لیکن وہ ساڑھے چھ سو سال پہلے گھبرا کر دنیا سے نکل لیا تھا ہمیں کیا جواب دیتا۔

مارکو پولو وینس میں پندرہ ستمبر 1254ء میں پیدا ہوا اور نو جنوری 1324ء کو سفر آخرت پر نکل گیا۔ اس نے وسطی ایشیا اور چین کا سفر کیا تھا اور منگولیا میں چنگیز خان کے پوتے کبلائی خان سے ملا تھا بس یہیں وہ ہم سے بڑھ گیا۔ چنگیز خن کے رعب کی وجہ سے غالباً ایک بھیڑ کی نسل اور ہوائی اڈہ اس کے نام سے منسوب ہے اس نے چار ہزار میل کا سفر کیا اور کیوں کہ اس زمانے میں ہوائی جہاز کی سہولت نہیں تھی اس لیے یہ خاصا مشکل کام تھا۔

مارکو پولو برسہا برس تک سفر کرتا رہا۔ لوگوں سے ملتا رہا مقامات دیکھتا رہا۔ ایک بار لوٹ آیا تو اٹلی مصروف جنگ تھا اس لیے مارکو پولو کو قید کر کے جیل میں ڈال دیا وہاں اس نے اپنی کال کوٹھڑی کے ساتھی کو سفر کی روداد لکھوائی جس میں اس نے افغانستان اور پلتستان میں ایک بھیڑ کا ذکر کیا جسے بعد میں مارکو پولو کا نام دیا گیا اور آج بھی اسی نام سے وہ برفانی وادیوں میں پائی جاتی ہے دور دراز سے لوگ اس کا شکار کرنے آتے ہیں اور جان جوکھم میں ڈال کر مارکو پولو کو مار گراتے ہیں۔ ہم اسکردو گلگت اور ہنزہ کی وادی میں گئے ایک ایک جگہ دیکھی مقامات کی تعریف کی لوگوں سے محبت سے ملے لیکن افسوس ہمارے نام پر کسی نے کوئی دکان تک نہیں کھولی۔ مارکو پولو نے اتنے ملک نہیں دیکھے جتنے ہم نے سیاحت کے دوران دیکھے ہیں نہ جانے دنیا والوں کو کیا ہوا کسی نے ہمارے نام سے کچھ منسوب نہیں کیا اور تو اور شکایت تو اپنے آبائی شہر حیدرآباد سے ہے وہ کم سے کم وہاں کے ہوائی اڈے کو ہمارا نام دے دیتے ہم کب اعتراض کرتے۔

4۔ مستنصر حسین تارڑ: پاکستان کا یہ نامور سیاح جسے ہم جدید سفرنامہ نگاری کا باوا آدم مانتے ہیں پاکستان کے پہاڑی علاقوں میں کافی گیا ہے۔ اسکردو گلگت کا کونا کونا دیکھا ہے جگہ جگہ کا ذکر ہے افسوس ان کے نام پر بھی کچھ نہیں رکھا گیا۔ ہم یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا نام ذرا مشکل ہے مگر ہمارا تو آسان ہے۔ خیر اپنوں سے کیا شکایت۔

5۔ رضا علی عابدی: بی بی سی لندن والے رضا علی عابدی نے کئی عمدہ سفرنامے لکھے کتب خانوں پر، گرینڈ ٹرنک روڈ پر اور ایک دریائے سندھ پر، وہ لداخ سے اسکردو اور پھر دریا کے کنارے کنارے چیلاس کے علاقے سے پاکستان آگئے۔ نہ گلگت گئے نہ ہنزہ کی وادی میں قدم رکھا اس لیے انہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی کہ ان

ے نام پر کوئی چوراہا، سڑک یا گلی نہیں رکھی گئی۔
ہمیں بھی کوئی شکایت نہیں نام ونمود کب پسند کرتے
ں جو کچھ کیا وہ خاموشی سے کیا اور نیکی کی طرح کنوئیں میں
ال دیا۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ رصغیر کے لوگ عموماً
سی کو زندگی میں کچھ نہیں دیتے اور بعض کو بعد میں بھی یاد
میں کرتے یہ سب کچھ ہمارا دستور اور روایت ہے۔

چین گلگت ساتھ ساتھ

دنیا کے ہر علاقے میں ایک لفظ ضرور سنائی دیتا ہے۔
شاپنگ'' ہمیں اس میں کبھی دلچسپی نہیں رہی بازاروں،
کانوں سے گزرے اور ہاتھ خالی رہے۔ کہا جاسکتا ہے
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں
گلگت میں اکرم خان زبردستی بازار لے گئے۔
''آپ یہاں آئے ہیں کچھ تو اپنے ساتھ لے
جائیں۔''
ہم کیا بتاتے اس وادی پہاڑ اور فضا سے ایسی یادیں
لے کر جارہے ہیں جو ہمیشہ جھلملاتی رہیں گی، گلگت کے
بازار میں ایک طرف مسجد دیکھی انتہائی حسین، خوب
صورت، دیدہ زیب ہم نے کہا اس کے سامنے کھڑے ہو
کر ایک تصویر ضرور بنوائیں گے۔ اکرم خان نے کہا پہلے
کچھ خرید لیں اس بازار میں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہر
دکان کا افتتاح اکرم خان بلتی نے کیا تھا۔ زیادہ تر ان کے
جاننے والے تھے اور ہر ایک کا اصرار تھا قہوہ ضرور پئیں۔
چند گھونٹ ہی سہی پینا ضروری تھا۔
بازار میں زیادہ تر اشیاء چین کی تھیں جن میں بیماریوں
سے نجات، صحت اور عمر میں اضافے کے لیے کئی دوائیں
تھیں۔ ایک دکان پر ہر بیماری کی دوا موجود تھی اور دکاندار کا
اصرار تھا خرید لیں۔ اصلی ہیں اور فائدہ پہنچاتی ہیں۔ ہم نے
بتایا جن بیماریوں کی دوائیں یہاں رکھی ہیں اللہ کا شکر ہے
ان میں سے کوئی ہمیں نہیں۔ دکاندار کا اصرار تھا خرید لیں
اپنے کسی دوست رشتے دار کو دے دیجیے گا۔
اکرم خان نے سرگوشی کی۔ ''بھائی بیماری کا کیا
بھروسا دوا ایک دوائیں خرید لیں۔''
ہم نے کہا۔ ''ایک بار تو یہاں سے خرید لیں گے مگر
دوبارہ کیسے ملیں گی؟''
اکرم خان نے کہا۔ ''ہم بھیجیں گے جتنی چاہیے ملیں
گی۔''
ایک بار تو شک ہوا دواؤں کی قیمت میں ان کا بھی
کمیشن ہے۔ دکاندار نے زبردستی ایک بوتل تھما دی جس
کے بارے میں بتایا گیا اسے روز استعمال کرنے سے عمر
دس سال بڑھ جاتی ہے۔ بوتل میں کالے رنگ کا محلول تھا
اور لیبل پر سب کچھ چینی زبان میں لکھا تھا۔ ہم جتنا منع
کرتے وہ اتنا ہی اصرار کرتا سمجھ میں نہیں آیا وہ ہماری
زندگی میں دس سال کیوں بڑھانا چاہتا ہے۔ ہم نے اس
سے پوچھا۔ ''تمہاری کیا عمر ہے؟''
وہ سوچنے لگا۔ شاید اسے علم ہی نہیں تھا۔ اکرم خان
نے ہنس کر کہا۔ ''ان کی عمر کم از کم ستر سال ہوگی۔''
ہم نے اس محلول کی تین شیشیاں سامنے رکھ کر کہا۔
''یہ اسی، نوے اور یہ سو، اب تم انہیں ہماری طرف سے
استعمال کرو۔''
اسے سمجھایا کہ اصل بات یہ ہے کہ جو عمر اللہ نے لکھ
دی ہے وہ ہی ہے۔ کافی ہے۔ اسے گھٹانے بڑھانے کا
اختیار ہمیں نہیں۔ دکاندار ہار گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا ان
دواؤں کی موجودگی میں چین میں نہ کوئی بیمار ہوتا ہے نہ
کوئی مرتا ہے پھر خیال آیا ان کے عظیم راہ نما ماؤزے
تنگ کیسے مر گئے؟ ہم نے سوچا انہیں چین کی ان دواؤں
تک رسائی حاصل نہیں ہوگی کیا خبر چین سے تمام دوائیں
گلگت آجاتی ہوں گی اور وہاں کے مقامی لوگ اس
سہولت سے محروم رہتے ہوں گے۔
دکاندار کو مایوس چھوڑ کر ایک اور دکان میں گئے یہ
ہماری پسند کی تھی جس میں ہر طرف ڈھیروں خشک میوہ
جات تھے دکاندار خوش ہوگیا اور ہمیں بادام، اخروٹ،
چلغوزے اور خوبانی دکھانے لگا۔ اس نے ایک اخروٹ
دکھایا اور کہا گیا۔ ''یہ کاغذی ہے۔''
ہم نے یہ نام سنا تھا اور جب بھی کاغذی اخروٹ
خریدا تھوڑی سے بہت سی چوٹ کے بعد یہ ٹوٹا لیکن
دکاندار نے دو اخروٹ مٹھی میں لے کر دبائے مٹھی کھولی تو
وہ ٹوٹے ہوئے تھے۔ ہم سمجھ گئے کہ یا تو یہ شعبدہ بازی ہو
گی یا اخروٹ پہلے سے ہی ٹوٹے ہوں گے۔
دکاندار نے ایک اخروٹ ہمیں دیا اور کہا اسے مٹھی

میں رکھ کر زور سے دبایئے ہم نے ایسا ہی کیا اور اخروٹ ٹوٹ گیا پھر ہم نے اخروٹ کے ڈھیر سے ایک اخروٹ اٹھا کر مٹھی میں دبا کر توڑا۔ یہ واقعی کاغذی تھے اور ان کا ذائقہ بھی اچھا تھا۔ دکاندار نے بتایا یہ صرف گلگت کے علاقے میں ہوتے ہیں اور کہیں نہیں ملیں گے۔ ہم نے قیمت پوچھی وہ بھی مناسب تھی اور وہ گن کر ملتے تھے۔ ہم نے کہا۔ ''بیس پیس دے دو۔''

دکاندار نے کہا۔ ''صاحب گلگت سے اتنے کم اخروٹ لے کر جانا اچھا نہیں لگتا کم سے کم سو تو لیں۔''

جب تک ہم منع کرتے وہ تھیلا بھر چکا تھا۔ ہم نے وہاں چلغوزہ دیکھا جو سائز میں بہت بڑا تھا۔ اکرم خان نے بتایا یہ چیلاس میں پیدا ہوتا ہے مقامی طور سے ہی فروخت ہوتا ہے اس کی کوالٹی اور مزہ بے حد اچھا ہے۔ ہم نے کھا کر دیکھا اور پسند کیا بس یہی بات دکاندار کو بھا گئی فوراً ایک تھیلا بھر کر تول دیے۔ دکان میں بادام، کشمش کے علاوہ سوکھی خوبانیاں بھی تھیں اور اتنے قسم کی تھیں کہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی لیکن اس خوف سے انہیں ہاتھ نہیں لگایا کہ مبادا انہیں بھی خریدنا پڑے گا۔ ہم دکان سے نکلنا چاہتے تھے اور دکاندار روکنا چاہتا تھا اکرم خان نے ڈرائیور سے کہا۔

''اخروٹ اور چلغوزے کے تھیلے گاڑی میں دیکھ دو۔''

یہاں سے نکل کر اکرم خان ہمیں ایک بڑے اسٹور میں لے گئے یہ چائنا کراکری ہاؤس تھا۔ جہاں ہر قسم کے ٹی سیٹ، ڈنر، کافی اور فروٹ سیٹ موجود تھے انتہائی نفیس خوب صورت۔ چینی تو برتن بنانے میں ماہر ہے حیرت یہ تھی کہ قیمتیں ناقابل یقین حد تک کم تھیں۔ یہاں کئی چیزوں کو خریدنے کا جی چاہا لیکن یہ بھاری تھیں اور واپسی کا سفر دشوار گزار کیوں کہ خبر یہ ملی تھی کہ آنے والے کئی دنوں تک موسم کی خرابی کی وجہ سے ہوائی سروس معطل رہے گی اور واپسی کے لیے بس سے جانا ہوگا جو ایک طویل سفر ہوگا۔ راستے میں مشکلات، نہ جانے کہاں راستہ بند، کہاں لینڈ سلائیڈنگ ہو جائے۔ اس لیے کچھ نہ خریدنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس دن چائنا کراکری اسٹور والے نے ہمارے دکان میں داخل ہوتے ہی قسم کھائی تھی کہ کچھ نہ کچھ ضرور فروخت کرے گا اس نے چھیانوے پیسز کا ڈنر سیٹ دکھایا اور اس کی جو قیمت بتائی اس پر ہم نے یقین نہیں کیا وہ صرف سات سو پچاس روپے تھی۔ ہم نے پوچھا۔

''تمام پیسز کی قیمت؟'' اس نے کہا۔

جی۔'' تب ہمارا ارادہ ڈگمگانے لگا۔ ہم نے پوچھا۔

''اسے کیسے پیک کرو گے۔ ہمیں اسلام آباد لے جانا ہے۔''

وہ بولا۔ ''صاحب یہ تو صرف دکھانے والا ہے، ڈنر سیٹ تو چائنا کا پیک ہوا ڈبہ رکھا ہے وہ دیں گے۔''

''اگر اس میں کوئی برتن ٹوٹا ہوا ہو؟'' ہم نے بچنے کی آخری کوشش کی۔

''صاحب اسلام آباد سے اطلاع کر دیں ہم پوری قیمت واپس کر دیں گے۔''

ہم خاموش ہو گئے۔

اکرم خان بولے۔ ''خرید لیں، سستا ہے، کون سا آپ کو اٹھانا ہے۔''

''لیکن اگر راستے میں لینڈ سلائیڈنگ ہو گئی؟''

''وہ ہم آپ کے روانہ ہونے سے پہلے ہی آرمی والوں سے پوچھ لیں گے۔''

''اور بدقسمتی سے سفر کے دوران ہو گئی تو؟''

لینڈ سلائیڈنگ میں سڑک جب ٹوٹ جاتی ہے تو دونوں طرف گاڑیاں رک جاتی ہیں۔ آرمی والے ایک عارضی پل بنا دیتے ہیں لوگوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ کم سے کم سامان لے کر دوسری طرف جائیں ایسے میں بھاری سامان مصیبت بن اتا ہے۔ ہم نے اسی خیال کے تحت پوچھا تھا۔ اکرم خان ہنسنے لگے۔ ''ارے بھئی اسے گاڑی چھوڑ دینا وہ واپس گلگت آ جائے گا۔''

ڈنر سیٹ اتنا خوبصورت تھا اور قیمت اتنی کم کہ ہم نے ہر طرح کا خطرہ مول لے لیا اور ڈرائیور اسے لے کر گاڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب ہم واپس آ رہے تھے تو چین اور گلگت ہمارے ساتھ ساتھ تھا۔

زندگی چلتی رہتی ہے

گلگت کی وہ صبح روشن تھی سورج بہت دنوں کے بعد پوری آب و تاب سے نکلا تھا۔ ہم ہوٹل کے دروازے پر

کھڑے تھے۔ دونوں بیرے جو کئی دن سے ہمارے لیے گرم چائے لذیذ ناشتہ اور مزے دار کھانا لا رہے تھے اداس کھڑے تھے۔ ہمیں کم از کم یہی محسوس ہوا۔ اتنے میں ہوٹل کے مالک آ گئے انہوں نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ ''کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کیجیے گا۔''

''غلطی تو ہوئی ہے۔ ہمارا اتنا خیال رکھا کہ یہ ہوٹل اور یہاں کا سب کچھ یاد رہے گا۔'' ہم نے جواب دیا۔

ساڑھے دس بجے تھے ایک کوچ دروازے پر آ کر رکی دونوں بیروں نے ہمارا سامان کوچ کے اوپر رکھا۔ اکرم خان بلتی نے گلے لگا کر کہا۔ ''میں نے آج صبح بھی چیک کیا ہے راستہ بالکل صاف ہے۔ آپ خیریت سے انشاء اللہ اسلام آباد پہنچ جائیں گے۔''

غلام حسین گلے لگ گئے۔ عبدالسلام نے الوداع کہی۔

ہم نے دونوں بیروں سے ہاتھ ملایا اور کوچ میں سوار ہو گئے۔ ہمارے لیے خصوصی انتظام یہ تھا کہ ڈرائیور کے پاس سیٹ مخصوص تھی اور باقی مسافر پیچھے بیٹھے تھے۔ ہم نے کوچ کا دروازہ بند کیا۔ ہوٹل کے دروازے پر کھڑے لوگوں نے ہاتھ اٹھا کر خدا حافظ کہا۔ ذرا دیر میں وہ سب پیچھے رہ گئے۔

زندگی کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ وہ چلتی رہتی ہے۔ لمحے بھر کو رکتی نہیں اور قدرت نے اس پورے نظام میں کوئی ایسا بٹن نہیں رکھا جسے دبا کر اپنی پسند کا پچھلا منظر دیکھ سکیں۔

کوچ گلگت سے باہر نکل رہی تھی ایک روشن دن ہر طرف پھیلا تھا دونوں طرف سبزہ تھا درخت تھے اور بائیں طرف پہاڑوں کا سلسلہ جو روایتی سفید برف کا لباس اوڑھے ہوئے تھے۔

ہم سوچنے لگے گلگت میں اپنی زندگی کے چند خوشگوار دن چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ نہ جانے وقت واپسی کی اجازت دے یا آگے لے جائے۔

ہم اگلی نشست پر تھے۔ اس لیے سامنے کا منظر پورا اور خوب صورت نظر آ رہا تھا۔ اچانک ایک لکڑی کا پل آ گیا اور دائیں طرف ایک گہری کھائی۔ ہماری چھٹی حس نے کہا کہ اگلی نشست پر بیٹھ کر اچھا نہیں کیا کیوں کہ ہر اونچائی اور کھائی صاف نظر آئے گی۔ بہتر تھا اگر پچھلی سیٹ پر ہوتے کوئی ایسا منظر تو نہ دیکھتے کہ دل دہل جاتا۔ ہم نے ڈرائیور سے کہا۔

''کسی طرح تم اپنی پچھلی سیٹ پر جگہ دلوا دو۔''

وہ بولا۔ ''صاحب ہمیں تو یہ حکم ملا ہے کہ آپ کو آگے بٹھایا جائے۔''

''ہم کمزور دل کے انسان ہیں، گہری کھائی، تنگ راستے، اونچے پہاڑ نہیں دیکھ سکتے اس لیے پیچھے بٹھا دو۔''

وہ گاڑی چلاتا رہا۔ سوچتا رہا، پھر اس نے ایک جگہ سائیڈ میں گاڑی روک دی اور پیچھے بیٹھے شخص کو آگے آنے کا کہا۔ وہ شاید آنا نہیں چاہتا تھا لیکن پھر ڈرائیور کے زور دینے پر آ گیا ہم اس کی نشست پر جا بیٹھے۔ دائیں طرف بڑی کھڑکی تھی اور بائیں طرف ایک پتلا راستہ دوسری نشستیں اور دروازہ۔

زندگی میں ہم نے جو اتفاقاً صحیح فیصلے کیے ان میں سے ایک اس دن پیچھے بیٹھنے کا تھا کیوں کہ ہم آنے والے بہت سے خوف سے بچے رہے۔

شاہراہِ قراقرم پر انگریزی کا سفر

ہم شاہراہ قراقرم پر سفر کر رہے تھے یہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ کہلاتا ہے کیوں کہ بعض جگہ یہ سڑک 15,397 میٹر تک اونچی ہے اس کا اندازہ سفر کے دوران ہوا شاہراہ قراقرم آٹھ سو میل لمبی ہے، پاکستان اور چین نے 1966ء سے اس کی تعمیر شروع کی اور 1979ء میں مکمل ہوئی۔ یہ پاکستان میں حسن ابدال اور چین میں کاشغر تک جاتی ہے۔ اسے تعمیر کرنے میں چین کا تعاون حاصل رہا۔ یہ شاہراہ دوستی بھی کہلاتی ہے اس میں سلک روڈ اور پاکستان میں گرینڈ ٹرنک روڈ بھی شامل ہیں۔ دشوار گزار پہاڑ، موسم کی خرابی اوپر سے پتھروں کا گرنا اور زمین کے بیٹھ جانے کی وجہ سے آٹھ سو دس پاکستانی اور دو سو چائنیز اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

سڑک بل کھاتی پہاڑوں پر چڑھتی وادیوں میں اترتی اور پلوں سے گزرتی انسانی ہمت اور عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے جو ڈرائیور اس سڑک پر گاڑی چلاتے ہیں ہمیں ان کی ہمت پر رشک آتا ہے یہ جان جوکھم کا کام ہے۔ گلگت سے گزرتے پہاڑ نظر آتے ہیں جن میں سب سے اونچا نانگا پربت ہے۔

اس وادی میں تین پہاڑی سلسلے ہمالیہ، قراقرم اور ہندوکش ہیں جو اسی شاہراہ پر آکر ملتے ہیں۔ دریائے گلگت، دریائے اسکردو، دریائے سندھ میں آکر مل جاتے ہیں۔

سہ پہر سے ذرا پہلے ہی ہم چیلاس پہنچے کوچ ایک بازار کے سرے پر رک گئی کہا گیا یہاں ایک گھنٹے رکیں گے کھانا اور خریداری کر سکتے ہیں۔ دریائے سندھ جو اسکردو سے گلگت جاتے ہوئے راستے میں گم ہو گیا تھا دراصل چیلاس آ گیا تھا۔

ہم نے اس شہر کا نام گلگت میں چلغوزے کے حوالے سے سنا تھا لیکن حیرت تھی کہ چیلاس کی کسی دکان پر چلغوزہ نہیں تھا شاید سب کا سب گلگت بھیج دیتے ہوں وہاں کئی قسم کے پھل نظر آئے۔ کینو بڑے سائز کے تھے اور بے حد میٹھے اس کی وجہ غالباً چنڈ تھی جس سے ان کا ذائقہ اور اچھا ہو جاتا ہے۔

کئی ہوٹل تھے دو چار دکانیں مقامی اشیاء کی تھیں اور یہاں بھی چین کی بنی مصنوعات بڑی تعداد نظر آ رہی تھیں۔ اس علاقے کے لوگوں کو ایک فائدہ ضرور ہوا تھا۔ شاہراہ قراقرم سے چین کا سامان با آسانی آنے لگا تھا۔ سردی بہت زیادہ تھی اس لیے بہت سے مسافر کوچ میں جلدی آ بیٹھے اور ایک گھنٹے سے پہلے سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔

شاہراہ قراقرم پر سیدھے ہاتھ پر دریا بہنے لگا اور سڑک اوپر چڑھنے لگی۔ ہم نے کھڑکی سے دیکھا۔ پہاڑ پر سڑک نظر آئی ہم سوچنے لگے اتنے اونچے پہاڑ پر کون جاتا ہو گا لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ ہماری کوچ کو اسی پہاڑ کی سڑک پر جانا تھا، کوچ جب بے حد اونچائی پر پہنچی تو ہم نے سوچا پاکستانی تو منصوبے بناتے رہتے ہیں بھلا چائنا والوں کو کیا ہوا کہ اتنے اونچے پہاڑ پر سڑک بنالی پھر خیال آیا کہ اگر انہوں نے بنا ہی دی تھی تو ہمیں کیا ہوا تھا کہ گلگت آئے اور اب اس سڑک سے واپس جا رہے ہیں۔

پہاڑوں پر چڑھتے اترتے کبھی کبھی یہ خیال آتا کہ ہمیں ان لوگوں کی تعداد معلوم نہیں جو دوران سفر بس اور کوچ گرنے سے جاں بحق ہوتے ہیں کیا خبر آج ہمارا بھی ان گمنام لوگوں میں شمار ہو جائے۔

لکڑی کا ایک پل آیا کوچ اس پر چڑھی تو پل اس زور زور سے ہلنے لگا کہ بس اب گرا مگر وہ شاید ان جھٹکوں کا عادی تھا۔ پل سے اترتے ہی ذرا سے فاصلے پر ایک فوجی نے کوچ کو روک لیا اور ڈرائیور کو ڈانٹا کہ تم اتنی تیز رفتاری سے گاڑی کیوں چلا رہے ہو۔

ڈرائیور کیا کہتا چپ رہا۔

فوجی نے تنبیہہ کر کے چھوڑ دیا۔

ڈرائیور بہت زیادہ رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا۔ ہم نے پیچھے سے کہا۔ ''بھائی ذرا آہستہ چلاؤ۔''

ڈرائیور بولا۔ ''صاحب ساری سڑک چڑھائی پر ہے اس سے کم رفتار چلانے سے گاڑی آگے نہیں جائے گی۔''

ایک گاؤں آیا۔ دو طرف دکانیں اسے دیکھ کر دل کو بڑی ڈھارس ہوئی۔ ہم پہاڑ پر نہیں زمین پر تھے۔ اچانک سامنے دکان کی پشت پر بنے مکان پر ہماری نظر چلی گئی۔ مکان کے آگے دور تک پھیلا گھاس کا میدان تھا جس کے تین طرف دو دو فٹ اونچی لکڑی کی باڑھ تھی اور اس کے بعد گہری وادی اور دل دہلانے والا منظر یہ تھا کہ اس میدان کے کنارے پر دو چھوٹے بچے کھیل رہے تھے۔ ہمارا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اگر یہ بچے..... اس کے آگے نہ سوچا گیا۔ یہ معصوم بچے نہیں کیا معلوم کہ چند فٹ کے فاصلے پر ایسی گہرائی ہے جو ناپی نہیں جا سکتی بچے کھیلتے ہوئے باڑھ تک جاتے پھر لوٹ آتے۔ ہم نے آنکھ بند کر لیں۔ کوچ گاؤں چھوڑ کر نیچے اترنے لگی لیکن ایک عرصے تک ہمیں وہ دو بچے باڑھ کے پاس کھیلتے نظر آئے۔

کوچ پہاڑ پر چڑھنے لگی اور جب نیچے اتری تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ سورج ڈوب گیا تھا۔ گلگت سے راولپنڈی تک کا سفر پندرہ گھنٹے کا ہے۔

پہاڑ پر روشنی دیر تک رہتی ہے اس لیے اونچائی پر گئے تو روشنی نظر آئی ہمارے ڈرائیور نے پچھلے گاؤں سے پشتو گانوں کا ایک کیسٹ خریدا تھا اور اس کے گانے سن رہا تھا اچانک کیسٹ اٹک گیا اس نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے ایک ہاتھ سے کیسٹ باہر نکالنے کی کوشش کی لیکن ٹیپ اندر الجھ گیا تھا۔ ڈرائیور نے آہستہ آہستہ کمال ہوشیاری سے اسے باہر نکال لیا۔ ایسے میں یہ بھی ہوا کہ چند لمحوں کے لیے اس نے دوسرا ہاتھ بھی اسٹیئرنگ سے ہٹا لیا۔ ہم یہ سب دیکھ

ہے تھے اور پھر یوں محسوس ہوا کہ ہمارا سانس رک گیا ہے۔ س بل کھاتی پہاڑی سے نیچے اترتی سڑک پر ڈرائیور بغیر سٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے گاڑی چلا رہا تھا۔ ٹیپ باہر نکل کر الجھ گیا تھا اور ڈرائیور اسے اپنی چھوٹی انگلی (چھنگلی) سے سیدھا کر کے دوبارہ کیسٹ پر چڑھا رہا تھا۔ ہمیں یوں محسوس ہو رہا تھا اب کوچ دائیں طرف بہت نیچے بہتے دریائے سندھ میں گرے گی پہلے پتھروں سے ٹکرائے گی پھر پانی میں گرے گی تنا سوچ کر پھر دیکھتے تو ڈرائیور ابھی تک ٹیپ چڑھاتا نظر آیا۔ ہم نے گھبرا کر کہا۔

''لا ڈ میاں ہم یہ کام کر دیں۔''

''بس صاحب ہو گیا۔''

یہ کہہ کر کیسٹ اس نے ریکارڈر میں لگا دیا اور پھر جو پشتو کا گانا بجا وہ ہمیں دنیا کی ہر موسیقی سے زیادہ اچھا لگا کیوں کہ اس وقت ڈرائیور کے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھے۔

ہم سکون سے بیٹھ گئے۔ آہستہ آہستہ پھر اندھیرا چھانے لگا اور اچانک گانے کی آواز بند ہو گئی۔ ایک بار پھر ڈرائیور نے کیسٹ ریکارڈر سے نکالا پھر ہماری جان نکل گئی لیکن اس بار زیادہ ٹیپ باہر نہیں نکلا تھا۔ اس لیے اس نے جلد ہی دوبارہ ٹھیک کر دیا۔ پشتو کے گانے فضا میں ابھرنے لگے لیکن اس خوف کے ساتھ کہ نہ جانے کب بند ہو جائیں۔

ہم نے دعا کی اے اللہ تو بڑا کارساز ہے۔ ہزاروں فٹ کی بلندی پر اس ٹیپ کو چلتے رہنے دینا۔ اچانک ایک معجزہ ہوا ڈرائیور نے کیسٹ خود بند کر دیا شاید دور کہیں سے عشاء کی اذان کی آواز آ رہی تھی۔ دور کوئی اندھیرا گاؤں تھا جہاں اللہ کی کبریائی کا نور پھیل رہا تھا۔

کوچ تیزی سے جا رہی تھی اکثر ایسا ہوا کہ ہمیں محسوس ہوا کہ سڑک بہت چوڑی ہے لیکن دراصل وہ اندھیرا تھا سڑک تو اتنی ہی تھی۔ پھر ایک گاؤں آ گیا جہاں روشنی نہیں تھی۔ دو تین دکانیں تھیں، لالٹینیں روشن تھیں ذرا دیر کو کوچ رکی لیکن سردی بہت تھی کوئی اتر کر گیا نہ ڈرائیور نے باہر نکلنے کی کوشش کی۔

کوچ روانہ ہو گئی نہ جانے پہاڑ تھا یا وادی تھی کہ کوچ اندھیرے میں رک گئی پوچھنے پر معلوم ہوا سیدھے طرف ٹائر میں ہوا کم ہو گئی ہے۔ ٹائر بدلنا ہے۔ یہ عجیب مرحلہ تھا کئی لوگ اترے لیکن سردی کی وجہ سے واپس آ گئے۔

ڈرائیور نے ڈگی سے ٹائر نکالا اور ٹارچ کی روشنی میں بدلنے لگا۔ ٹارچ ایک مسافر روشن کیے ہوئے تھا۔

جب ہم گلگت سے چلے تھے تو اکرم خان نے کچھ پراٹھے اور شامی کباب راستے میں کھانے کے لیے ساتھ کر دیئے تھے۔ اس وقت بھوک محسوس ہوئی اور ہم نے سوچا اس موقع پر کھا لیے جائیں۔ پلاسٹک کا ایک تھیلا کھولا اور ہمیں بس کی روشنی میں محسوس ہوا کہ اس میں سے بھاپ نکل رہی ہے۔ ایسا کیسے ممکن تھا لیکن شاید سردی کی شدت نے ایسا کیا اس وقت کباب پراٹھے نے جو لطف دیا۔ وہ بے حد ذائقے دار تھا۔ تھوڑی دیر میں ٹائر بدل دیا گیا اور سفر دوبارہ شروع ہوا۔ ایک عرصے کے بعد روشنیاں نظر آئیں۔ یہ بشام تھا اس علاقے میں ایک بڑا شہر جہاں دکانیں کھلی تھیں روشنیاں تھیں۔ کوچ رکی لوگ نظر آئے تو ایک نئی توانائی محسوس کی۔ بشام کے بعد ہم جلد ہی اس علاقے میں پہنچ جائیں گے جہاں پہاڑ نہیں وادیاں نہیں۔ میدان ہیں۔

بشام کی دکانوں میں ایسا محسوس ہوتا تھا چین نے سارا سامان بھیج دیا ہے۔ ہر طرف انہی کی اشیاء ہیں۔ سرحد، پنجاب بلتستان ہر جگہ کی چیزیں اور خریداروں کی موجودگی، زندگی سے بھرا پرا شہر۔

کوچ روانہ ہوئی اندھیری سڑک دائیں بائیں اونچے نیچے پہاڑ اور پھر ہم مانسہرہ پہنچ گئے۔ ایک ہوٹل کے سامنے کوچ رک گئی یہاں ڈرائیور نے اعلان کیا۔

''کھانا کھا لیں پھر چلیں گے۔''

ہم ہوٹل میں جا بیٹھے اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ ''اے رب ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ کبھی اس خطرناک سڑک پر سفر نہیں کریں گے۔ اے اللہ تو نے ہمیں حفاظت سے پہنچا کر نئی زندگی دی ہے۔ کوشش کریں گے آئندہ ایسے علاقے کے سفر پر جائیں جہاں ایسی خطرناک سڑک نہ ہو۔ ڈرائیور کوچ تیز نہ چلاتا ہو، اس کا کیسٹ بار بار نہ اٹکتا ہو اور ٹائر کی ہوا نہ نکلے۔ بے شک تو دعائیں سننے اور قبول کرنے والا ہے۔''

☆ختم شد☆

سفر وسیلۂ ظفر..... مگر اس سفر میں بھلا کون منزل تک پہنچا!
کون راہزن ہوا اور کون رہبر، حضرت انسان کے نئے نئے قصے

لاری اڈا

خوش بخت

ممتاز احمد

اُس ڈرائیور کا قصۂ خاص، جسے لاری اڈے سے ایک دن کا بچہ مل گیا تھا
اور پھر جیسے اس کی خوش بختی ہی جاگ گئی

سب بچوں کی طرح میرا بچپن بھی کھیلتے کودتے اور شرارتیں کرتے گزرا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ دوسرے بچے کھیل کود کے ساتھ پڑھائی بھی کرتے جب کہ میں صرف کھیل کود ہی کرتا تھا۔ ہم تین بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ ابا کی شہر کی مصروف اور پررونق چوک میں دکان تھی جہاں وہ سیزن کے مطابق دہی بھلے، فروٹ چاٹ اور مختلف شربت بیچتے تھے۔ دکان بہت اچھی چل رہی تھی جس سے گھر میں کسی قسم کی کوئی تنگی نہ تھی اور گزر بسر اچھی ہو رہی تھی۔ آسودگی تھی روزانہ کھلا جیب خرچ ملتا تھا۔ سب سے بڑا بھائی جس کی عمر اس وقت چودہ یا پندرہ سال تھی وہ پڑھائی میں نہ چل سکا تو ابا نے اسے اپنے ساتھ کام پر لگا لیا تھا۔ ہمارا سرکاری اسکول لاری اڈے کے بالکل ساتھ تھا جس کی وجہ سے میرا زیادہ وقت لاری اڈے میں گزرتا۔ مجھے لاری اڈے کی رونق بہت اچھی لگتی تھی جہاں بسوں ویگنوں کی آمدورفت رہتی۔ مختلف آوازوں کے ہارن بجتے مرد عورتیں گھومتے پھرتے نظر آتے۔ کثیر تعداد رکشہ والوں کی گھومتی پھرتی نظر آتی۔ مختلف دکانیں، ہوٹل، سرائے، کھانے پینے کی چیزیں فروخت کرنے والے ٹھیلے۔ گنڈیریاں، پھل فروٹ شربت، قلفیاں، آئس کریم، سموسے، پکوڑے، ڈرائی فروٹ وغیرہ بیچنے والوں کے ٹھیلے گردش کرتے نظر آتے۔

چونکہ کھلا جیب خرچ ملتا تھا تو یہی وجہ تھی کہ ہر کھانے پینے والی چیز کے ذائقے سے بخوبی واقف تھا۔ ہمارے اسکول کے استاد قمر صاحب جو اکثر لیٹ آتے اور چھٹیاں بھی بہت کرنے کے ساتھ کھانے پینے کے بہت شوقین تھے۔ میں انہیں لاری اڈے سے خریدی گئی چٹ پٹی چیزیں کھلایا کرتا تھا۔ وہ اکثر اپنے ذاتی کام بھی مجھ سے کرواتے جن میں بازار سے سگریٹ منگوانا، اپنی سائیکل صاف کروانا یا سودا سلف گھر بھجوانا وغیرہ۔ یہ سارے کام وہ میری پڑھائی میں عدم دلچسپی کی بنا پر کرواتے تھے۔ ان کاموں کے بدلے میں وہ مجھے ہر سال پاس کر دیتے اور میں اگلی کلاس میں چلا جاتا۔

آٹھویں جماعت تک تو یہ سلسلہ چلتا رہا مگر مسئلہ اس وقت بنا جب میں کلاس نہم 9th میں پہنچا۔ میں انتہائی نالائق، نکما اور کورا طالب علم ثابت ہوا تھا۔ نئے استاد کی جھڑکیاں اور مار کھاتے نقل لگا کر میں دسویں کلاس میں

پہنچ گیا۔ جب میٹرک کا سالانہ بورڈ کے امتحان کے داخلہ فارم بھیجنے کا وقت آیا تو میری نالائقی کو دیکھتے ہوئے میرا داخلہ نہیں بھیجا جارہا تھا تو یہاں بھی قمر صاحب میرے کام آئے اور کسی نہ کسی طرح دے دلا اور مل ملا کر میرا داخلہ بھجوا دیا۔ جیسے ہی میٹرک کا امتحان ختم ہوا میں نے سکھ کا سانس لیا۔

اب تو میرا صبح سے شام تک کا وقت لاری اڈے میں گزرتا جہاں میرا ملنا ملانا ڈرائیوروں، کنڈیکٹروں، ہیلپروں اور ورکشاپس کے کاریگروں مستریوں کے ساتھ ہوتا۔ اسی دوران میری دوستی ایک بس ڈرائیور گل محمد سے ہوگئی جسے عرف عام میں استاد گلو کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس وقت میری عمر صرف سولہ سال تھی جب کہ استاد گلو کی عمر اٹھائیس سال تھی۔ وہ ایک بڑی بس کا ڈرائیور تھا۔ وہ روزانہ صبح نو بجے لاہور جانے کے لیے لاری اڈے سے بس لے کر نکلتا تھا وہ روزانہ مجھے اپنے ساتھ بس میں بٹھا لیتا اس طرح میری مفت کی سیر ہو جاتی۔ لاہور تک کے تمام شہروں، قصبوں اور ہر اسٹاپ سے بخوبی آگاہ ہو گیا۔ کئی بار کنڈیکٹر ٹکٹ کاٹنے اور کرایہ وصول کرنے میں مصروف ہوتا تو میں بس میں سواریاں اتارتا سوار کرواتا۔ کنڈیکٹر کے ساتھ مل کر سواریوں کا سامان چھت پر رکھوانا اور اتروانا۔ اسی طرح اگر بس کا ٹائر

پنکچر ہو جاتا تو میں رضا کارانہ طور پر ٹائر تبدیل کرنے میں مدد بھی کر دیتا۔

رفتہ رفتہ استاد گلو نے مجھے بھی ڈرائیونگ سکھا دی۔ اس زمانے میں میٹرک کا رزلٹ چار ماہ بعد آتا تھا تو میٹرک کا رزلٹ آنے تک میں جہاں کئی شہر گھوم پھر چکا تھا وہیں پر ڈرائیور بھی بن چکا تھا۔ گاڑی کے ٹائر بدلنے سے لے کر انجن کے تمام پارٹس، سسٹم، ریڈی ایٹر، انجن آئل کی تبدیلی وغیرہ کے تمام سسٹم اور فنکشن سمجھ چکا تھا۔ استاد گلو کی دیکھا دیکھی سگریٹ پینے بھی شروع کر دیئے۔

چار ماہ کے بعد جب میٹرک کا رزلٹ آیا تو میں ہر مضمون میں زیرو نمبروں کے ساتھ بری طرح فیل ہو گیا۔ جب اماں ابا کو میرے رزلٹ کا پتا چلا تو انہوں نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ مجھے خوب لتاڑا لعن طعن کی تو میں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے دو ٹوک لفظوں میں بتا دیا کہ پڑھائی میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ میرا پڑھائی میں دل نہیں لگتا۔ مقصد تو زندگی میں پیسہ کمانا ہے تو وہ میں کما لوں گا۔ اماں ابا بضد تھے کہ تیاری کر کے دوبارہ امتحان دوں چونکہ مجھے اپنے آپ کا بخوبی پتا تھا میں پانچ سال بھی تیاری کرتا رہتا تو کبھی بھی میٹرک کا امتحان پاس نہیں کر سکتا تھا۔

کافی بحث اور میری باتوں کے بعد ابا نے کہا۔ ''اگر پڑھائی نہیں کرنی تو ان کے ساتھ دکان پر کام کروں۔'' مگر میں رضامند نہ ہوا بالآخر انہوں نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔ میں پڑھائی کے جھنجھٹ سے آزاد ہو گیا۔

اب میری منزل لاری اڈہ تھی جہاں میں نے باقاعدہ جانا شروع کر دیا۔ وہاں میں نے چار سال مختلف نوعیت کے کام کیے جن میں کنڈیکٹر، ہیلپر، مستری، مکینک اور ڈرائیوری شامل تھی مگر مجھے جو کام سب سے اچھا لگا وہ ڈرائیور کا تھا۔

جب میری عمر اٹھارہ سال ہوئی تو شناختی کارڈ بنوا لیا۔ بعد ازاں استاد گلو نے مجھے پکا ڈرائیونگ لائسنس بھی بنوا دیا۔ میں چونکہ استاد گلو کا شاگرد تھا تو اس کے حوالے سے پہلے چھوٹی گاڑیوں کی ڈرائیونگ کرتا رہا۔ میں ڈرائیونگ کے تمام اسرار و رموز مکمل طور پر جان چکا تھا۔ اب میری خواہش تھی کہ کسی بڑی بس کا ڈرائیور بنوں۔

ایک دن استاد گلو مجھے اپنے ساتھ لاہور لے گیا۔ اس نے مجھے ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا دیا اور خود ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے لاہور تک اور واپسی پر بس چلائی۔ استاد میری ڈرائیونگ سے بہت خوش اور مطمئن ہوا۔ اس نے مجھے 10/10 نمبروں سے پاس کر دیا تو اس خوشی میں استاد گلو کو دعوت کھلائی۔

اب استاد گلو کی کوششوں اور اس کی وساطت سے مجھے ایک بڑی بس کے ڈرائیور کی نوکری مل گئی۔ معقول تنخواہ کے ساتھ کھانا پینا سگریٹ وغیرہ مفت ملتے۔ اس کے علاوہ کمیشن الگ تو مہینے بعد جب اچھی خاصی رقم اماں ابا کے ہاتھ پر رکھتا تو وہ بہت خوش ہوتے۔ اماں دعائیں دیتیں ان کو توقع نہیں تھی کہ میں اتنے پیسے کماؤں گا۔

میں نے چار سال اپنے شہر سے مختلف روٹس جن میں فیصل آباد، جھنگ، گوجرہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ وغیرہ بسیں چلائیں۔ پھر مجھے ایک بہت بڑی ٹرانسپورٹ کمپنی کی بس کی ڈرائیوری مل گئی جو ہمارے شہر سے صادق آباد جاتی تھی۔ اس مشہور کمپنی کی بس کی ڈرائیوری ملنا میرے لیے بہت بڑے اعزاز کی بات تھی۔ استاد گلو نے مجھے بطور خاص مبارک باد دی اور کہنے لگا۔

''غضنفر یار! تو بہت جلد ترقی کرے گا۔''

جب ہر ماہ ایک تگڑی رقم اماں ابا کو ملنے لگی تو انہیں میرے بیاہ کی سوجھی۔ بڑے بھائی اور بہن کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ اب میرا نمبر تھا۔ میری ایک خالہ رحیم یار خان میں رہتی تھیں ان کی ایک ہی بیٹی تھی۔ جس کا نام بلقیس تھا تو اماں نے خالہ شریفاں سے بلقیس کا رشتہ میرے لیے مانگا تو چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق میری شادی ہو گئی۔ شادی کے ابتدائی دو سال تو اچھے اور سکون سے گزرے مگر بعد میں رات گئے تھکا ہارا گھر آتا تو بلقیس شکایتوں کے دفتر کھول کر بیٹھ جاتی۔ وہی روایتی ساس بہو، جٹھانی، دیورانی کی چپقلش اور لڑائیاں جن کی وجہ سے گھر کی فضا مکدر ہونے لگی۔ میں بلقیس کو سمجھاتا کہ صبر کیا کرو اور خاموش رہا کرو۔ لڑائی جھگڑے سے گریز کیا کرو وہ کوشش تو بہت کرتی مگر پھر بھی کوئی نہ کوئی بات ہو جاتی۔ اوپر سے ستم یہ ہوا کہ ابھی تک ہمارے ہاں اولاد نہ ہوئی۔ شادی کو ساڑھے تین سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ اب تو بلقیس کو اولاد نہ ہونے کے طعنے ملنے لگے۔ وہ بے چاری

بہت پریشان رہنے لگی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے لڑائی جھگڑے شروع ہو جاتے۔

ایک دن بس خراب ہوگئی اور ورکشاپ میں اس کی مرمت کا کام ہو رہا تھا جس کی وجہ سے میں لاری اڈے سے جلدی گھر آ گیا تو لڑائی زوروں پر تھی۔ میں یہ صورت حال دیکھ کر بہت پریشان ہو گیا تھا۔ بلقیس زارو قطار رونے لگی کہ روز روز کی بک بک جھک جھک سے تنگ آ گئی ہے وہ کہنے لگی کہ وہ اپنی ماں کے پاس جانا چاہتی ہے۔ میں نے وعدہ کیا کہ اسے لے جاؤں گا۔ اس کا دل بہلانے کے لیے اسے بازار گھمانے پھرانے لے گیا۔ سینما ہال میں فلم دکھائی۔ ہوٹل سے کھانا کھلایا اور اگلے دن اسے ساتھ لیا اور رحیم یار خان خالہ شریفاں کے گھر چھوڑ دیا جہاں وہ سکون سے رہنے لگی۔

میں چونکہ روزانہ بس لے کر صادق آباد جاتا تھا تو وہیں سے رحیم یار خان چلا جاتا، اسی روٹین میں آٹھ نو ماہ گزر گئے۔ اب تو اماں بھی بلقیس کی کمی محسوس کرنے لگیں اور تقاضا کرنے لگیں کہ ''بلقیس کو واپس لے کر آؤ کیونکہ اب ان کی بڑی بہو یعنی بلقیس کی جٹھانی سے نہیں بنتی تھی اس کے ساتھ اَن بن رہنے لگی تھی۔''

میں کہا کہ ''اگر اسے لے آیا تو پھر وہی دنگا فساد شروع ہو جائے گا تو بہتر ہے وہ وہیں رہے۔''

مگر اماں کہتیں۔ ''یہ غلط بات ہے۔ بلقیس کو اپنے گھر میں ہونا چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا سوچوں گا۔''

ایک دن میں بس لے کر جا رہا تھا جب صادق آباد کے قریب پہنچا تو دس منٹ پہلے روڈ پر ایک ہولناک ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ دو گاڑیاں تیز رفتاری کے باعث آمنے سامنے آپس میں ٹکرائی تھیں جس کے نتیجے میں کئی مسافر جاں بحق ہو گئے اور بہت سارے زخمی ہو گئے تھے۔ میں نے فوراً بس ایک سائیڈ پر روکی اور دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر امدادی کاموں میں شامل ہو گیا۔ زخمیوں کو اپنی بس میں ڈالا اور انہیں صادق آباد سول اسپتال میں شفٹ کیا۔ جہاں انہیں فوری طبی امداد دی جانے لگی۔

وہیں سول اسپتال میں مجھے ایک عمر رسیدہ خاتون اور جوان لڑکی ملیں۔ لڑکی کے ہاں بیٹے کی پیدائش ہوئی تھی۔ عمر رسیدہ خاتون جو کہ اس لڑکی کی ماں تھی، نے مجھے آواز دی۔ ''بیٹا ہمیں باہر سے چائے اور بسکٹ کے ساتھ ایک دو چیزیں لا دو۔''

چنانچہ میں نے ان کی مطلوبہ چیزیں لا دیں۔ انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ مجھ سے کہنے لگیں۔ ''تھوڑی دیر اس بچے کے پاس بیٹھو وہ ذرا باتھ روم تک جا رہی ہیں۔''

وہ چلی گئیں اور میں بچے کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ ایک دن کا بچہ تھا۔ اسے ایک کمبل میں لپیٹ کر بیڈ پر ڈالا ہوا تھا۔ وہ سو رہا تھا۔ بچہ بہت خوب صورت تھا۔ میں پورا ایک گھنٹہ اسپتال میں اس بچے کے پاس بیٹھ کر ان دونوں عورتوں کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئیں تو میں نے پورا اسپتال چھان مارا مگر وہ کہیں نہ ملیں۔ میں نے لاری اڈہ بھی پہنچنا تھا مگر ان عورتوں کا کوئی نام و نشان نہیں مل رہا تھا۔ اسی اثناء میں بچہ بھی جاگ گیا تھا اور رونے لگا تھا۔ اس کے پاس ہی دودھ والا فیڈر بھی پڑا تھا۔ ایک نرس نے آ کر بچے کو اپنی گود میں لیا اور فیڈر سے دودھ پلایا تو بچہ چپ ہو گیا۔

اسپتال میں میرے دو گھنٹے مزید لگ گئے۔ بالآخر دائیں بائیں مریضوں اور کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ بچے کو کسی یتیم خانے میں داخل کروا دو۔ چنانچہ میں بچے کو فیڈر سمیت لے کر اسپتال کے استقبالیہ میں آیا اور وہاں ان کے ریکارڈ میں سارا واقعہ لکھوا کر اپنا مکمل ایڈریس اور رحیم یار خان اپنی خالہ کا ایڈریس بھی لکھوا دیا کہ بچے کے وارث اگر آ جائیں تو وہ مجھ سے رابطہ کر سکیں تو اسپتال کی انتظامیہ نے بچہ میرے حوالے کر دیا۔ میں بچے کو لے کر لاری اڈہ آ گیا اور اپنے ٹرانسپورٹ اڈے والوں کے مشورہ سے لاری اڈہ کی پولیس چوکی میں بھی پوری رپورٹ درج کروا دی۔ اسپتال کا پورا واقعہ اور اپنا مکمل ایڈریس وغیرہ لکھوا دیا کہ کل کلاں کو کوئی مسئلہ پریشانی نہ بن جائے۔ ان تمام امور سے فراغت کے بعد میں بچے کو لے کر رحیم یار خان اپنی خالہ کے گھر چلا گیا اور سارا واقعہ بتا دیا۔ باہمی صلاح مشورے اور سوچ بچار کے بعد ہم

نے یہ فیصلہ کیا کہ بچے کو ہم رکھ لیتے ہیں چونکہ ابھی تک ہمارے ہاں اولاد نہ ہوئی تھی تو ہم اس بچے کو اپنا بیٹا ظاہر کریں گے کیونکہ مجھے پورا یقین تھا کہ اس بچے کو لینے کوئی نہیں آئے گا وہ اس لیے کہ اس بچے سے جان چھڑائی گئی تھی۔ دونوں عورتوں کا پراسرار طور پر اسپتال سے غائب ہو جانا اس بات کا واضح ثبوت تھا۔

بلقیس بچے کو پا کر بہت خوش ہوئی اس کے دل میں بھی بچے کی بڑی آرزو تھی۔ میرے نام کی نسبت سے بچے کا نام عنصر رکھ دیا گیا۔

اگلے دن میں بس لے کر اپنے شہر آ گیا اور اماں، ابا، بھائی، بھابی اور بہنوں کو بتایا کہ بلقیس نے بیٹا جنم دیا ہے تو سب کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور سب نے مبارک باد دی۔ اب اماں کا اصرار بلکہ حکم تھا کہ یا تو انہیں رحیم یار خان لے جاؤں یا بلقیس کو لے کر آؤں اب اماں اپنے پوتے کو دیکھنے کے لیے بہت بے چین ہو گئیں۔ چنانچہ دو دن بعد بلقیس اور عنصر کو لے کر آ گیا سب نے خوش دلی سے بلقیس اور عنصر کا استقبال کیا۔ اماں نے فوراً عنصر کو گود میں اٹھا کر خوب پیار کیا۔ مٹھائی منگوا کر سب کا منہ میٹھا کروایا ساتویں روز عنصر کی جھنڈ اتاری گئی۔ ختنے کروائے اور عقیقہ کیا گیا۔

میں اکثر سوچ میں پڑ جاتا کہ پتا نہیں یہ بچہ جائز ہے یا ناجائز۔ ہم نے اسے اپنا بیٹا ظاہر کر کے صحیح کیا ہے یا غلط۔ یہ سوچیں ہمیں اکثر پریشان کرتیں تو ہم اپنے دل کو تسلی دیتے کہ اگر خدانخواستہ بچہ ناجائز بھی ہے تو اس میں اس معصوم کا کوئی قصور نہیں ہے۔ باقی اگر اللہ نے اس بچے کا رزق ہمارے گھر میں لکھا ہے تو یہ اس پاک ذات کی کوئی مصلحت ہے۔ کچھ عرصہ اس قسم کے اندیشے ہمارے دلوں میں جنم لیتے رہے مگر بہت جلد ایسی سوچوں سے چھٹکارا مل گیا۔ بلقیس حقیقی ماں کی طرح عنصر کو پیار کرتی خوب خیال رکھتی اور دل و جان سے اس کی پرورش کرنے لگی۔

جب سے عنصر کو لے کر ہم آئے تھے تو بہت ساری خوشگوار تبدیلیاں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ سب سے پہلے تو یہ ہوا کہ سب گھر والوں کا رویہ بلقیس سے بہت حد تک ٹھیک ہو گیا۔ لڑائی جھگڑے بند ہو گئے۔ ابا نے گھر کے تین پورشن بنوا دیئے تو اس طرح ہمیں رہنے کے لیے الگ پورشن مل گیا۔ اب بلقیس آزاد تھی کوئی روک ٹوک نہ تھی، سب کا کھانا بنانا الگ کر دیا گیا تھا۔ اب میں اپنی پوری تنخواہ بلقیس کو دیتا وہ بڑی خوش اسلوبی سے گھر چلا رہی تھی۔ ایک اور خاص بات یہ ہوئی کہ پہلے میری تنخواہ بڑھائی گئی پھر مجھے بڑی ایئر کنڈیشنڈ بس دے دی گئی اور تنخواہ میں مزید اضافہ کر دیا گیا۔ حیرت انگیز طور پر ہماری مالی پوزیشن بہتر ہونے لگی۔ عنصر جب ایک سال کا ہوا تو بلقیس بھی امید سے ہو گئی اور ایک بیٹے کو جنم دیا۔ ماہ و سال گزرنے لگے۔ اللہ پاک ہمیں اولاد کی نعمت سے نوازتا گیا۔ اب عنصر سمیت ہمارے پانچ بچے ہو گئے۔

تین بیٹیاں اور دو بیٹے عنصر بچپن سے ہی بہت لائق اور ذہین بچہ تھا۔ وہ ہر کلاس میں اول آتا۔ پڑھائی میں بھائی بہنوں کی مدد کرتا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ باقی چاروں بچے بھی پڑھائی میں بہت اچھے جا رہے تھے۔ عنصر کا وجود اتنا بابرکت ثابت ہوا کہ خوش حالی نے ہمارے گھر کی راہ دیکھ لی ہم دن بدن ترقی کی طرف جا رہے تھے۔ اماں ابا نے حج کا فریضہ ادا کر لیا تھا۔ ہم سب بہن بھائیوں کی شادیوں کے فرض سے سبکدوش ہو گئے تھے۔ میرے دونوں بھائی ابا کی دکان چلاتے۔ میں نے پہلے ایک بس میں حصہ ڈالا پھر رفتہ رفتہ ایک بس کا مالک بن گیا۔ اللہ کی کرم نوازی سے ایک بس سے دو ہوئیں پھر تین، چار اور پانچ۔ وقت کے ساتھ میری بسوں کی تعداد بڑھتی گئی اور اگلے بائیس برسوں میں پوری بیس بسوں کا مالک بن گیا۔ میں نے ڈرائیوری چھوڑ دی اور لاری اڈے میں اپنا دفتر بنا لیا۔ اب میں عنصر ٹرانسپورٹ کمپنی کا نائیک تھا۔ لاری اڈہ میں گاڑیوں بسوں کے مالکان کو نائیک (مالک) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ عنصر ٹرانسپورٹ کمپنی کی بسیں مختلف منافع بخش روٹس پر چلتی تھیں۔ الحمدللہ خوب آمدنی ہو رہی تھی۔ عنصر اور سب بچے اپنی پڑھائی میں بہت مگن تھے اور کامیابی سے تعلیمی مراحل طے کر رہے تھے۔ بلقیس کی امی اور میری ساس خالہ شریفاں کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی کچھ زمین تھی جو وراثت میں بلقیس کے نام منتقل ہو گئی تھی۔ اب اتفاق سے وہی زمین کسی بہت بڑی ہاؤسنگ اسکیم کے ایریا میں آ رہی تھی جس کی وجہ سے

مین کی بہت آفرز آرہی تھیں۔ وہ زمین مین سڑک کے ساتھ تھی تو اس کے بیشتر حصہ کمرشل تھا اور صادق آباد شہر کے گنجان آباد علاقے کے ساتھ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مین بہت قیمتی تھی۔ مختلف پارٹیوں کی اچھی اچھی آفرز رہی تھیں۔ بالآخر ایک پارٹی نے سب سے اچھی آفر ی تو بلقیس اور بچوں کے صلاح مشورے اور رضامندی سے وہ زمین چار کروڑ میں فروخت ہوگئی۔ اس رقم سے بزنس کنڈیشنڈ بسیں اپنی کمپنی میں شامل کیں۔ شہر کے پوش لاقے میں ایک شاندار بڑی کوٹھی بلقیس کا سٹیج کے نام سے بنائی اور نئی کار خریدی۔

میں اپنے بھائیوں کی نسبت بہت زیادہ امیر اور خوش مال ہوگیا تھا۔ عنصر ٹرانسپورٹ کمپنی دن بدن ترقی کرتی ہارہی تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ عنصر نے گریجویشن کے بعد ایل ایل بی کا امتحان امتیازی نمبروں کے ساتھ ہائی فرسٹ ڈویژن میں پاس کرلیا۔ اسے وکیل بننے کا بہت شوق تھا۔ اپنی وکالت سے پہلے عنصر نے شہر کے چوٹی کے اور نامی گرامی وکیل کی شاگردی اختیار کی ور انتہائی لگن اور محنت سے وکالت سیکھ رہا تھا۔ ایک کیس جو کہ بہت پرانا اور انتہائی پیچیدہ نوعیت کا تھا، کوئی تیس چوبیس سال پرانا جس میں تین قتل اور جائیداد کا تنازعہ چل رہا تھا اس کیس کا فیصلہ سیشن کورٹ اور ہائی کورٹ سے ہو چکا تھا مگر اب سپریم کورٹ میں اپیل زیر سماعت تھی۔ یہ کیس خاصا مشہور اور ڈرامائی شکل اختیار کر چکا تھا۔ جو تین قتل ہوئے تھے وہ صادق آباد لاری اڈے میں ہوئے تھے۔ تینوں مقتول کسی کام کی غرض سے صادق آباد گئے تھے۔ کسی زمین کا تنازعہ تھا جس کی پاداش میں یہ قتل ہوئے تھے۔ قاتلوں کو سزائے موت سنائی جا چکی تھی مگر اب سزا کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کی تھی۔ ان تینوں قتل کی ابتدائی رپورٹ صادق آباد لاری اڈے کی پولیس چوکی میں کی گئی تھی۔ بعد ازاں متعلقہ پولیس اسٹیشن میں ایف آئی آر درج ہوئی مگر کچھ تبدیلیاں کی گئیں اور کچھ شواہد بھی مٹا دیئے گئے تھے تو اس بنا پر سپریم کورٹ نے تمام اصل ریکارڈ طلب کیا تھا۔ اس ضمن میں ایک کمیشن تشکیل دیا گیا تھا جو تمام ریکارڈ حاصل کر کے چھان بین کرے اور تمام شواہد سامنے لائے۔ چنانچہ کمیشن کے ارکان صادق آباد گئے اور پرانا اصل ریکارڈ نکلوایا۔ عنصر نے جب پولیس چوکی لاری اڈہ صادق آباد کے ریکارڈ اور روزنامچوں وغیرہ کی ورق گردانی شروع کی تو ایک رپورٹ پڑھ کر ٹھٹک گیا۔ یہ وہ رپورٹ تھی جو اس کے باپ عضنفر نے بچے کے بارے میں لکھوائی تھی۔ اپنے باپ کا نام بس کا نمبر شناختی کارڈ نمبر اور رحیم یار خان اور آبائی شہر کے ایڈریس دیکھ کر ہکا بکا اور حیران رہ گیا۔ وہ بہت جلد سمجھ گیا کہ یہ رپورٹ اسی کے بارے میں تھی۔ اس نے گھر آکر جب وہ ساری رپورٹ اپنے ماں باپ کو دکھائی اور حقیقت سچائی پوچھی تو عضنفر کو ساری بات بتانا پڑی۔

اب عنصر کا سکون برباد ہوگیا تھا۔ اس کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ وہ دن رات اسی شش و پنج میں رہنے لگا کہ کیا وہ ناجائز بچہ تھا جس سے جان چھڑائی گئی تھی۔ اب اسے اسی سوال کے جواب کی تلاش تھی اس نے ٹھان لی کہ وہ ہر حال میں اس سوال کا جواب تلاش کرے گا۔ گھر کا ماحول اور فضا خراب ہوگئی تھی اسے گھر کے تمام افراد اجنبی لگنے لگے تھے۔ وہ خاموش خلاؤں میں گھورتا رہتا اور گہری سوچوں میں مستغرق رہنے لگا۔ بالآخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا اس نے گھر والوں کو ایک ضروری کام کا بتایا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے دوسرے شہر جا رہا ہے۔ اگلے دن عنصر نے سفری بیگ میں اپنے چند سوٹ اور ضروری سامان ڈالا اور گھر سے نکل پڑا۔ اس کی منزل صادق آباد تھی۔ وہاں پہنچ کر اس نے ایک ہوٹل میں کمرہ لیا اور سفر کی تھکان اتاری۔ صبح اٹھ کر وہ سیدھا سول اسپتال پہنچا۔ لاری اڈہ میں درج رپورٹ کی نقل اس کے پاس موجود تھی جس پر تاریخ دن اور سال لکھا ہوا تھا۔ اس نے سب سے پہلے اسپتال کے ریکارڈ کیپر سے ملاقات کی اور اپنی آمد کا مقصد بتایا تو ریکارڈ کیپر نے اتنا پرانا ریکارڈ ڈھونڈنے کی معذرت کرلی کہ اسٹور بھرا پڑا ہے۔ ریکارڈ کا ملنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ عنصر نے جب ہزار ہزار کے کرارے نوٹوں کی جھلک دکھائی تو ریکارڈ کیپر لائن پر آگیا۔ پانچ نوٹ اس کی جیب میں منتقل ہو چکے تھے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ ایک آدھ دن میں مطلوبہ ریکارڈ تلاش کردے گا۔ بالآخر دو دن کی تلاش کے بعد ریکارڈ مل

گیا۔ جس میں غضنفر کے حوالے بچہ کرنے کی پوری تفصیل درج تھی پھر اس نے ایک دن پہلے کا لیبر روم کا ریکارڈ نکلوایا۔ اس تاریخ کو صرف تین ڈیلیوری کیس ہوئے تھے دو لڑکیاں پیدا ہوئی تھیں اور ایک لڑکا۔ اب یقیناً وہ لڑکا عنصر ہی تھا۔ اب عنصر کے کچھ مزید رقم خرچ کر کے اس روز ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹرز، نرسوں اور مریضہ عورتوں کے نام نکلوائے جن کے ہاں ڈیلیوری ہوئی تھی۔ جس عورت کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تھا اس کا نام تنزیلہ درج تھا، عمر 20 سال اور ایڈریس کے کالم میں لاڑوں کی بستی لکھا تھا۔ بچوں کی تعداد کے کالم میں پہلا بچہ اور نارمل ڈیلیوری کا اندراج تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی معلومات دستیاب نہ تھیں۔

عنصر کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اب اسے لاڑوں کی بستی میں جا کر تنزیلہ نامی عورت کو تلاش کرنا تھا اور یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ انجان علاقے میں جا کر کسی نوجوان لڑکے کا عورت کو تلاش کرنا بہت مشکل اور خطرناک کام تھا اور اس کام میں رازداری بھی ضروری تھی۔ اب تنزیلہ نامی عورت کو کس طرح تلاش کیا جائے۔ اس کا اتا پتا کیسے ڈھونڈا جائے یہ ایک کٹھن مرحلہ تھا۔ یہاں عنصر کا کوئی رشتے دار یا دوست نہ رہتا تھا۔ ہاں عنصر ٹرانسپورٹ کمپنی کی ایک شاخ یا سب آفس صادق آباد لاری اڈے میں تھا تو وہاں جا کر اس نے اپنی کمپنی کے عملے سے باتوں باتوں میں کسی ایسے بندے کا پوچھا جو لاڑوں والی بستی کا رہنے والا ہو تو ایک پچاس سالہ سلطان نامی بندے کا پتا چلا جو لاڑوں کی بستی کا رہنے والا تھا۔ وہ عنصر ٹرانسپورٹ کمپنی کی ایک بس کا ہیلپر تھا اور بس کے ساتھ ملتان گیا ہوا تھا بس نے شام کو واپس آنا تھا۔ عنصر نے اڈہ منیجر کو تاکید کی کہ جیسے ہی سلطان آئے اسے ہوٹل بھیج دے جہاں عنصر نے رہائش رکھی ہوئی تھی۔ اب عنصر کو سلطان کا شدت سے انتظار تھا۔ شام چھ بجے کے قریب سلطان آ گیا وہ ایک گٹھے ہوئے جسم کا درمیانے قد والا شخص تھا۔ اس کے خدوخال اور ظاہری حالت اس کی غربت کی داستان سنا رہے تھے۔ عنصر اسے بہت پرتپاک اور عزت سے ملا۔ سلطان کے لیے یہ بہت اعزاز کی بات تھی کہ کمپنی کے مالک نائیک نے اسے ملاقات کے لیے بلایا تھا۔ عنصر نے اسے چائے پانی پلایا اور لاڑوں والی بستی دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو سلطان کہنے لگا۔ ''نائیک جی آپ ابھی میرے ساتھ چلو۔'' عنصر تو پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔ اس نے ہوٹل کا کمرہ لاک کیا اور سلطان کو ساتھ لے کر پہلے بازار گیا جہاں اس نے دو زنانہ سوٹ ایک مردانہ سوٹ کا کپڑا خریدا۔ پھر ہوٹل سے کڑاہی گوشت، روٹیاں اور پھل فروٹ مٹھائی لی۔ ایک ٹیکسی والے سے بات کی اور سلطان کو ساتھ لیا اور لاڑوں کی بستی پہنچ گئے۔ سلطان اسے لے کر اپنے گھر گیا اور جا کر بڑے جوش و خروش اور خوشی سے اپنی بیوی حیاتاں کو بتا رہا تھا کہ ہماری ٹرانسپورٹ کمپنی کے نائیک عنصر صاحب آئے ہیں تو سلطان کے گھر والوں نے عنصر کا خوب استقبال کیا۔ عنصر نے بڑے ادب سے چاچی حیاتاں کو سلام کر کے اپنا سر آگے جھکا دیا تو حیاتاں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ عنصر نے خریدی گئی تمام اشیاء کار سے نکال کر چاچی حیاتاں کے حوالے کیں تو اس کی باچھیں کھل گئیں تو وہ رسماً بولی۔

''پتر اس تکلف دی کی ضرورت سی۔'' تو عنصر نے کہا۔

''اپنی چاچی کے گھر پہلی دفعہ آیا ہوں یہ کوئی تکلف نہیں ہے۔'' عنصر کا لایا گیا۔ کھانا سب نے مل کر کھایا تو اب عنصر اپنے اصل مقصد کی طرف آ گیا اور چاچی حیاتاں سے کہا کہ ''بستی میں تنزیلہ نامی عورت کو تلاش کرنا ہے اور یہ کام انتہائی رازداری سے کرنا ہے۔''

عنصر دو گھنٹے سلطان کے گھر رکا اور واپسی پر بچوں کو ہزار ہزار روپے دیے اور تیسرے دن آنے کا بول کر اپنے ہوٹل چلا آیا۔ عنصر کو پوری امید تھی کہ حیاتاں لازمی تنزیلہ کا کھوج لگا لے گی کیوں کہ وہ کافی تیز طرار اور چلتا پرزہ ٹائپ عورت لگتی تھی۔

تیسرے دن عنصر نے بازار سے کچھ لوازمات اور چاچی حیاتاں کے بچوں کے لیے کچھ چیزیں لیں اور سلطان کے ہمراہ لاڑوں والی بستی پہنچ گیا تو چاچی حیاتاں اور اس کا پورا گھرانہ عنصر کے آگے بچھ بچھ جا رہا تھا۔ چاچی حیاتاں کی معلومات کے مطابق ایک تنزیلہ نامی عورت کا دو سال پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ وفات کے

اس کی عمر پچھتر سال تھی تو یہ عنصر کی مطلوبہ عورت نہیں ۔ دوسری تنزیلہ ایک جواں سالہ لڑکی ہے جس کی عمر سال ہے۔ یہ بھی عنصر کی مطلوبہ عورت نہیں تھی جو ری تنزیلہ تھی۔ اس کی عمر پینتالیس سال تھی۔ وہ ایک عورت ہے اور انتہائی غربت اور کسمپرسی کی زندگی گزار ہے۔ اس کا کوئی آگے پیچھے نہیں ہے وہ تنہا زندگی بسر رہی ہے بستی کی بچیوں کو قرآن پاک پڑھاتی ہے یہ مر کی مطلوبہ عورت ہو سکتی تھی۔ اب اس کا ماضی کیسے نگالا جائے اور کیسے پتا چلے کہ یہ وہی عورت ہے یا کوئی ور ہے۔ عنصر نے اس کے ماضی کے بارے میں چاچی حیاتاں سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ تنزیلہ کی شادی چوبیس سال پہلے کسی اسلم نامی بندے سے ہوئی تھی۔ جب دس سال تک اولاد نہ ہوئی تو اس نے دوسری شادی کر لی۔ جب دوسری بیوی سے بھی اولاد نہ ہوئی تو اس نے تیسری شادی کرنا چاہی۔ عین نکاح والے دن دوسری بیوی نے اسے اپنے بھائیوں کے ہاتھوں مروا دیا اور اس کی جائیداد مکان پر قبضہ کر لیا۔ کچھ عرصے کے بعد تنزیلہ کو بھی گھر سے نکال دیا۔ تنزیلہ کی سوکن انتہائی چالاک، ہوشیار اور عیار عورت تھی۔ اس نے کمال ہوشیاری سے اپنے خاوند کو اس طرح مروایا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ پھر ساری جائیداد وغیرہ پر قبضہ کر کے تنزیلہ کو بے دخل کروایا تو وہ بے چاری روتی پیٹتی اپنی ماں کے پاس آ گئی۔ کچھ عرصے کے بعد اس کی ماں فوت ہو گئی۔ تب سے تنزیلہ تنہا رہ رہی ہے۔ اب کیسے پتا چلایا جائے کہ عنصر کو جنم دینے والی یہی تنزیلہ تھی یا کوئی اور تو اب یہ کھوج لگانا تھا۔ عنصر نے کافی غور و خوض کے بعد چاچی حیاتاں کو تیار کیا کہ وہ کل ہی تنزیلہ سے ملے اور باتوں باتوں میں اسے بتائے کہ وہ کچھ دن پہلے شہر گئی تھی۔ ایک بوڑھی نرس جو کہ حیاتاں کی جاننے والی ہے اس نے بتایا کہ چوبیس سال پہلے دو عورتیں سول اسپتال میں ایک بچہ چھوڑ کر چلی گئی تھیں تو وہ بچہ زندہ سلامت ہے۔ وہ نرس افسوس کا اظہار کر رہی تھی کہ پتا نہیں ان کو کیا مجبوری تھی جو وہ اپنا بچہ یوں چھوڑ کر غائب ہو گئی تھیں اور پھر پلٹ کر خبر بھی نہ لی تھی۔ حیاتاں کے ذمے صرف یہی کام تھا کہ وہ تنزیلہ کے پاس جا کر کسی نہ کسی طرح یہ بات سنا دے اور تنزیلہ کے چہرے کے تاثرات اور کیفیت نوٹ کرے۔ عنصر یہ ڈیوٹی چاچی حیاتاں کے ذمے لگا کر آ گیا۔

جب اگلے دن عنصر چاچی حیاتاں سے ملا تو اس نے بتایا کہ وہ آج صبح ہی تنزیلہ سے ملی تھی اور گھما پھرا کر باتوں باتوں میں فرضی نرس کی بات جب تنزیلہ کو سنائی پہلے تو اس کا رنگ اڑ گیا پھر وہ حیرت زدہ ہو کر انتہائی بے چین ہو گئی اور حیاتاں سے اس نرس کی بابت سوال جواب کرنے لگی اور کہنے لگی کہ ''اس نرس سے ملاقات کراؤ۔''

تب حیاتاں نے پوچھا۔ ''تنزیلہ تم اس نرس سے کیوں ملنا چاہتی ہو۔''

تنزلہ نے بتایا۔ ''وہ بدنصیب عورت وہ خود ہے جس نے اپنے ایک دن کے لخت جگر کو اسپتال میں اپنی ماں کے ساتھ ایک اجنبی بندے کے حوالے کر کے خود ماں بیٹی اسپتال سے کھسک گئی تھیں۔''

حیاتاں نے پوچھا۔ ''تمہاری تو کوئی اولاد نہیں ہے تو کب وہ بچہ جنم دیا اور اسے کیوں ایک اجنبی بندے کے حوالے کر کے آ گئی تھی؟''

تنزیلہ نے جو اپنی داستان سنائی وہ کچھ یوں تھی۔

میٹرک کے بعد تنزلہ نے شہر کے کالج میں داخلہ لے لیا کیونکہ اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ روزانہ بستی سے کالج جاتی تھی۔ وہاں اس کی ملاقات شاہ میر خان نامی ایک لڑکے سے ہوئی۔ دونوں کی یہ ملاقات بہت جلد محبت میں تبدیل ہو گئی۔ وہ پورا سال چھپ چھپ کر ملتے رہے۔ شاہ میر رحیم یار خان کے ایک بہت امیر وڈیرے کا بیٹا تھا۔ اس نے اپنی محبت اور دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تنزیلہ سے نکاح کر لیا اور یہ نکاح خفیہ رکھا۔ تنزیلہ بھی شاہ میر کے عشق میں پور پور ڈوب چکی تھی۔ اس نے بھی اپنی ماں سے چوری چھپے نکاح کیا تھا۔ شاہ میر نے کہا۔ ''فی الحال وہ اسی شادی کو خفیہ رکھے گا اور بہت جلد مناسب وقت پر اپنے ماں باپ کو اپنی اور تنزیلہ کی شادی کے بارے میں بتا کر انہیں راضی کر لے گا مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی ہوا کچھ یوں کہ شاہ میر کے والد کی کسی سے بڑی شدید پرانی دشمنی تھی۔ عدالت میں کیس چل رہا تھا۔ عدالت میں پیشی والے دن دونوں فریقین کا آمنا سامنا

اور ٹکراؤ ہوا۔ اس روز شاہ میر اپنے والد کے ساتھ تھا۔ اچانک کسی تلخ کلامی کے نتیجے میں دونوں فریقین کے درمیان لڑائی شروع ہوگئی۔ مخالف دشمنوں نے فائرنگ کھول دی جس کے نتیجے میں شاہ میر کو گولیاں لگیں اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہوگیا۔ جب شاہ میر کی موت واقع ہوئی تو اس وقت تنزیلہ چار ماہ کی حاملہ تھی۔ جب اس کی ماں کو پتا چلا تو وہ اپنا سر پیٹ کر رہ گئی۔ تنزیلہ نے اپنی ماں کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا تھا۔ تنزیلہ کی ماں نے اس کا رشتہ ساتھ والے گاؤں B-58 کے ایک اسلم نامی لڑکے سے طے کر دیا تھا۔ اب جب کہ تنزیلہ کے نکاح کا کوئی ثبوت ان کے پاس نہ تھا کیونکہ نکاح نامہ تو شاہ میر کے پاس تھا اب اس حالت میں اسلم کبھی بھی تنزیلہ سے شادی نہ کرتا۔ تنزیلہ کی ماں نے اس کا حمل ضائع کروانے کی کوشش کی مگر لیڈی ڈاکٹر نے بتایا۔ اب بہت مشکل ہے چنانچہ ماں بیٹی نے انتہائی چپکے سے اور رازداری سے اس بات کو چھپا رکھا اور خاموشی سے نومولود بچے کو اسپتال چھوڑ کر آگئیں۔

چاچی حیاتاں جب یہ داستان عنصر کو سنا رہی تھی تو اس وقت اس کا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے وہ پسلیوں کا پنجرہ توڑ کر باہر آجائے گا۔ چاچی حیاتاں کی بات مکمل ہو چکی تھی۔ عنصر کو روحانی سکون مل چکا تھا۔ وہ خوشی سے سرشار تھا اس نے رب کی بارگاہ میں شکرانے کے نوافل ادا کیے کہ وہ اپنے ماں باپ کی جائز اولاد تھا۔ اسے اپنی شناخت مل گئی تھی۔ اب وہ بہت بے تاب اور بے چین تھا کہ فوراً اپنی حقیقی ماں سے ملے۔ اگلے ہی لمحے وہ چاچی حیاتاں کے ساتھ اپنی ماں کی قدم بوسی کے لیے جا رہا تھا۔

جب سے تنزیلہ کو چاچی حیاتاں کی زبانی معلوم ہوا کہ اس کا لخت جگر شاہ میر کے پیار کی نشانی زندہ ہے تو وہ تڑپ اٹھی تھی۔ اس کو ایک پل بھی قرار نہیں آرہا تھا۔ اس کی بھوک اڑ چکی تھی۔ وہ کھانا پینا تک بھول گئی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے آج بھی اپنے معصوم ایک دن کے بچے کا چہرہ تھا۔ وہ بھلا اپنے جگر کے ٹکڑے کو کیسے بھول سکتی تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ پچھلے چوبیس سالوں میں ایک پل بھی نہ بھول پائی اور روزانہ روتی تھی۔ اپنے رب کے حضور گڑگڑا کر ہر نماز اور ہر رات اس نے اپنے اس گناہ کی معافی مانگی تھی اور فریاد کرتی تھی کہ اس کا وہ بیٹا مل جائے جسے وہ بے یار و مددگار ایک اجنبی شخص کے حوالے کر آئی تھی کتنا بڑا گناہ کیا تھا اس نے وہ بیٹا تو اس کی بیاہی اولاد تھا۔ اس نے نہ صرف اپنی ممتا کا گلا گھونٹا تھا بلکہ اپنے معصوم بیٹے کو جس کا کوئی قصور نہ تھا۔ وقت کی بے رحم لہروں کے سپرد کر آئی تھی۔ پتا نہیں اس پر کیا بیتی ہوگی زمانے کی ٹھوکروں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا وہ کن حالات میں پلا ہوگا پتا نہیں اسے پیار بھی ملا ہوگا کہ نہیں مگر اللہ سب سے بڑا ہے قدرت نے اس کے بچے کو نہ صرف ماں باپ بلکہ دنیا کے ہر رشتے کا پیار دیا تھا اس کی پرورش ناز و نعم میں ہوئی تھی۔ وہ خوش بختی کی علامت تھا۔ اس کے وجود کی برکت سے اللہ نے انہیں اولاد سے نوازا تھا جنہوں نے اسے پالا پوسا تھا۔ اسے گود میں اٹھا کر گھر لانے والا ایک معمولی ڈرائیور سے کروڑ پتی مشہور ٹرانسپورٹ کمپنی کا مالک بن گیا تھا وہ خود انتہائی نیک، ذہین اور کامیاب انسان بن گیا تھا۔ وہ چوٹی کا وکیل تھا۔ وہ کچھ کرنے کی ٹھان لیتا تو وہ کر کے ہی رہتا۔ وہ اپنی ماں کی کھوج میں نکلا تھا تو بالآخر اس نے اپنی حقیقی ماں جس نے اسے جنم دیا تھا۔ ڈھونڈ نکالا تھا وہ بے شناخت نہیں تھا۔

تنزیلہ مختلف وہموں اور اندیشوں میں گھری سخت مضطرب تھی جب سے حیاتاں اس کی طرف سے ہو کر گئی تھی اسے ایک پل بھی تو سکون نہیں ملا تھا۔ وہ بار بار آسمان کی طرف دیکھتی اس کی نظروں میں التجا تھی۔ سوال تھا اچانک اس کے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی وہ دوڑ کر گئی اور دروازہ کھول دیا۔ حیاتاں کے ساتھ ایک خوبرو نوجوان کھڑا تھا دونوں کی نظریں چار ہوئیں وہ دم بخود یک ٹک ایک دوسرے کو دیکھنے میں محو تھے۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنے لخت جگر کو اپنی ممتا کی آغوش میں لے لیا۔ حیاتاں اور سلطان اسے مبارک باد دے رہے تھے، وہ سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔ اپنے بیٹے کو چوم رہی تھی اور اپنی ممتا نچھاور کر رہی تھی جدائی کا سورج غروب ہو چکا تھا اب اس کے آنگن میں چودھویں کا چاند اس شب وصل میں مسکرا رہا تھا۔

☆☆☆

قوسِ قزح

راوی: چوہدری وسیم
تحریر: رانا حبیب الرحمٰن

جیل کی سلاخوں کے پیچھے سے فیوڈل سسٹم کے شکار اُس نوجوان کی سرگزشت
جس کے سینے میں انتقام کا جوالا مکھی بھڑک رہا تھا

(چوتھا حصہ)

کلاس روم میں داخل ہوا تو سب کلاس فیلوز نے کھڑے ہو کر استقبال کیا حاتکہ اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں اور وہ مجھ سے عارضی طور پر ناراض تھی کہ میں نے نہیں جاتے ہوئے اس کیوں نہیں بتایا تھا۔ اس کی آنکھوں سے پتا چلتا تھا کہ وہ روتی رہتی ہے۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا وہ منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ میں نے اسے کہا۔

''اگر تمہارے گاؤں سے مجھے بھاگنا نہ پڑتا تو آج میں شاید تمہارے سامنے نہ ہوتا اور اگر تمہیں اپنے گھر یعنی حویلی سے میرے بارے میں خبر مل چکی ہے تو تمہارا ناراض ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔'' وہ چپ رہی میں نے کہا۔

''اچھا ہے ناراض رہو تو بہت اچھی لگ رہی ہو۔'' وہ گھورنے لگی تو میں نے کہا۔ ''ایسے کیوں گھور رہی ہو کیا کبھی کوئی لڑکا نہیں دیکھا یا پھر میرے جیسا ہینڈسم نہیں دیکھا جس سے آج کل کی لڑکیاں دور دور سے ہی دیکھ کر آہیں بھرتی ہیں۔'' وہ اس بات پر بولی۔

''جی نہیں میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں۔'' میں نے فوراً چوٹ کی۔

''ہاں ہاں تم ان لڑکیوں کی طرح نہیں ہو کیوں وہ دور سے آہیں جو بھرتی ہیں اور تم نزدیک بیٹھ کر آہیں بھر رہی ہو۔'' اس نے قریب پڑی کتاب میرے سر پر ماری اور پھر اچانک میرے کاندھے پر سر رکھ کر رونے لگی بڑی مشکل سے چپ کروایا اتنی دیر میں پروفیسر صاحب کلاس روم میں داخل ہوئے اور پڑھانا شروع کر دیا اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ گویا ہوئے۔

''مسٹر حماد تم اچانک کہاں غائب ہو چکے تھے۔'' میں نے کہا۔

''سر اصل میں مجھے ایک بہت ضروری فوتگی پر شہر سے باہر جانا پڑ گیا تھا اس وجہ سے چند دن زیادہ لگ گئے اب انشاء اللہ غیر حاضر نہیں رہوں گا۔''

وہ میرے اس جھوٹ پر خاموش ہو گئے، چھٹیوں کی وجہ سے میں جتنا پیچھے رہ گیا تھا اور جو پڑھایا گیا تھا اس کے تمام نوٹس عاتکہ لیتی رہی تھی اور پھر میرے لیے بھی نوٹس بناتی تھی جب میں اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ پروفیسر پیریڈ ختم ہونے پر کلاس سے باہر نکلے تو عاتکہ نے تمام نوٹس مجھے دے دیے میں نے وہ نوٹس رکھ لیے۔ چھٹی کے وقت اچانک میرے موبائل پر وائبریشن نے مجھے کال کے متعلق مطلع کیا تو میں نے موبائل نکال کر اوکے کیا تو مجھ سے بات کرنے والی سونیا تھی وہ جب سے موبائل آیا تھا اس وقت سے ہی وقت فوقتاً کال کر کے دو چار باتیں کر لیتی تھی اب مجھے کہہ رہی تھی فوراً ہی گھر ہمارے آجاؤ، پاپا آپ کا انتظار کر رہے ہیں اور آج شام کا کھانا بھی ہمارے ساتھ کھاؤ گے میں نے کہا ٹھیک ہے میں پہنچ جاؤں گا میں عاتکہ کو اور چچا کی بیٹیاں عائشہ اور کرن کو بھی گھر چھوڑ کر آتا ہوں۔ سونیا کہنے لگی ایسا کرو عاتکہ کو بھی ساتھ لے آؤ میں بھی تو دیکھوں جس کی اتنی تعریفیں ہوتی ہیں وہ کیسی ہے ان تعریفوں کے لائق بھی ہے یا نہیں میں نے کہا۔ ہاں ضرور تو پھر ٹھیک ہے ہم انتظار کر رہے ہیں عاتکہ اس وقت میرے ساتھ ہی تھی اور یکطرفہ باتیں سن کر اندازہ لگا لیا تھا کہ کال کرنے والی بھی لڑکی ہے بولی سب سے پہلے تو یہ بتاؤ موبائل کہاں سے لیا ہے اتنا مہنگا اس وقت موبائل زیادہ عام نہیں ہوئے تھے لیکن مل ضرور جاتے تھے لیکن مہنگے داموں ملتے تھے میں نے کہا اب جس لڑکی سے باتیں کر رہا تھا اس کے والد نے دیا ہے اور اس لڑکی جس کا نام سونیا ہے اس نے ہی اس کے استعمال کا طریقہ بتایا ہے عاتکہ فوراً بولی تاکہ سونیا تجھ سے باتیں کرے اور آہستہ آہستہ تم اس کی طرف مائل ہو جاؤ ہے ناں یہ بات میں پوچھتی ہوں یہ تم نے کیوں لیا تم مجھے بتاتے تو میں اپنے پاس رقم سے تمہیں لے کر دے دیتی۔

میں نے کہا۔ ''تم مجھ سے لڑو نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

عاتکہ کہنے لگی۔ ''اگر ایسی ویسی بات نہیں ہے تو جہاں تم جا رہے ہو میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔''

میں نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔ ''مجھے پتا ہے تم مجھے لے کر جانا ہی نہیں چاہتے۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''پگلی میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔ ویسے بھی اس نے کہا ہے کہ تمہیں ساتھ لے کر آؤں۔''

وہ خوش ہو گئی۔ اتنی دیر میں عائشہ اور کرن آ گئیں اور ہم واپس کے لیے روانہ ہو گئے۔ عائشہ اور کرن کو گھر چھوڑ کر ہم روانہ ہوئے۔ چانڈیو صاحب کی کوٹھی کے گیٹ پر کھڑا چوکیدار مجھے جانتا تھا اس نے ہم دونوں کے لیے گیٹ کھول دیا سامنے ہی چانڈیو صاحب اور ان کی بیگم سلمٰی عاتکہ سمیت سمیت کھڑے تھے انہوں نے آگے بڑھ کر میرے سر پر پیار دیا، سلمٰی اور عاتکہ فوراً ہی گھر کی طرف چل دی پھر سونیا بھی مسکراتی ہوئی ان کے ساتھ

ہولیں تو چانڈیو صاحب مجھے ایک دوسرے کمرے میں لے آئے اور بولے۔

''بیٹا ہم نے دو ٹیمیں تشکیل دے دی ہیں اور تیاری بالکل آخری لمحوں پر ہے اس لیے میں نے تمہیں بلوایا ہے کہ تم بھی ہمارے ساتھ ہوں گے اور ہماری ایک ٹیم کو بریف کرو گے اسے محفوظ راستوں سے لے کر جاؤ گے تاکہ تمام مجرم رنگے ہاتھوں گرفتار ہوں اور کوئی جانی نقصان نہ ہو۔''

میں نے کہا۔ ''انکل وہ بھلا میرے کہنے پر کیسے چلیں گے انہوں نے کہا آرمی کے ایک کور کمانڈر اور خفیہ کے کرنل آفریدی نے تمہیں خاص طور پر مشن کے لیے چنا ہے اور اس مشن کے لیے تمہاری کچھ خاص صلاحیتیں دیکھ کر ہی شامل کرنے کا ارادہ انہوں نے ظاہر کیا ہے اس لئے ایک بار وہ تم سے ملنا بھی چاہتے ہیں۔ اس لیے اب ہم ان کے پاس جا رہے ہیں۔''

یہ کہہ کر چانڈیو صاحب نے اپنے موبائل میں ایک نمبر پر کال کی اور صرف چند لفاظ کہے کہ سر میں اور حماد نکل رہے ہیں آپ کے پاس آنے کے لیے۔ آگے سے کوئی بات سن کر کہنے لگے۔ ''چلو اٹھو وہ انتظار کر رہے ہیں۔''

میں ان کے ساتھ ہی اٹھ گیا اور ہم کرنل آفریدی کی طرف چل دیئے۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایک گنجان آباد علاقے کی طرف آئے وہاں سے تھوڑا پیدل چلنے کے بعد پر ایک چیک پوسٹ کے پاس پہنچے یہ عام سی چیک پوسٹ بنی ہوئی تھی کسی زمانے میں یہ ایک آرمی کی بڑی چیک پوسٹ ہوا کرتی تھی لیکن اب یہ کھنڈر نما بن چکی تھی لیکن دو چار چوکیدار ٹائپ فوجی وردی پہنے اب بھی موجود ہوتے تھے۔ یہ چیک پوسٹ ایک بار میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ جب کالج کے دوستوں کے ساتھ آوارہ گری کرتے ہوئے یہاں سے گزرا تھا تو یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ یہاں بھی کبھی دوبارہ آؤں گا۔ ہمیں باہر ہی سے ایک فوجی لے کر ایک طرف بنے ہوئے کوارٹر کی طرف بڑھا تھا ہم اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

جب ہم کوارٹر کے اندر داخل ہوئے تو اس فوجی نے اندر بنی ہوئی ایک کپڑوں کی الماری کھولی کوئی چھپا ہوا بٹن دبایا تو الماری سرک کر ایک طرف ہوگئی۔ الماری کے نیچے سے سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں اس نے ہمیں نیچے اترنے کے لیے کہا ہم جب نیچے اترے تو وہ بھی ہمارے پیچھے اتر کر ایک طرف دیوار میں بنے ہوئے سوراخ میں انگلی رکھ دی تو اوپر الماری اپنی جگہ پر آ چکی تھی۔ ہم آگے بڑھے کافی نیچے اترنے کے بعد ہم ایک ہال کمرے میں جا نکلے پھر اس ہال کمرے سے بھی نکل گئے، ہمارے سامنے اب ایک کھلا میدان تھا جس میں کئی جوان مختلف ٹریننگ کرنے میں مصروف تھے۔ ہال کمرے کے باہر برآمدے میں بٹھا کر وہ فوجی کرنل آفریدی کو لینے چلا گیا میں نے حیران ہوتے ہوئے چانڈیو صاحب سے پوچھا۔

''انکل کیا پہلے بھی یہاں آ چکے ہیں۔'' کہنے لگا۔

''نہیں بیٹا! میں بھی تمہاری طرح یہاں پہلی بار آیا ہوں اور جس طرح تم یہ نظام دیکھ کر حیران ہو رہے ہو، میں بھی ہوں۔ ہمارے ملک پاکستان کو کئی بیماریوں سے بچانے کے لئے ہمارے مجاہد کس طرح اپنے گھروں اپنے پیاروں سے دور رہ کر اپنا اپنا فرض ادا کر رہے ہیں لیکن ہمارے سیاست دان اور تمام دولت مند لوگ اسے اجاڑنے کے لئے کس طرح کوشاں ہیں۔''

ابھی باتیں ہو رہی تھیں کہ کرنل صاحب آ گئے اور ہم سے بہت تپاک سے ملے۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہی فوجی ہمارے لئے دودھ پتی چائے بنا لایا۔

کرنل صاحب کہنے لگے۔ ''چانڈیو صاحب! ہمارا یہ نیٹ ورک بہت اچھا ہے، یہ ایک محفوظ جگہ ہے، یہاں کسی کا دھیان نہیں جاتا اور ہم سب اپنا اپنا فرض بہت آسانی سے پورا کر رہے ہیں۔ اس سیٹ اپ کو پچھلے کئی سال سے استعمال کر رہے ہیں۔ آپ کو اس لئے بتا رہے ہیں تاکہ کسی بھی وقت آپ یہاں آ جائیں، جیسے کہ آپ کو اب ہماری ضرورت پڑی ہے، انشاء اللہ بعد میں بھی پڑتی رہے گی کیوں کہ آپ کے متعلقہ تمام انفارمیشن اور آپ کی کارکردگی کی مثالیں بمع کاغذی ثبوت ہمارے پاس موجود ہیں۔ آپ نے پہلے صرف میرا نام ہی سنا ہوا ہوگا لیکن آج میں آپ کے سامنے موجود ہوں۔ میں صرف خفیہ کا کرنل ہی نہیں بلکہ پورے پاکستان کی انٹیلی جنس فورس کا بھی جنرل ہوں۔ میں نے خفیہ میں کئی ٹیمیں بنائی

ہیں اور جس طرح دشمن ہم سے چھپ کر ہمارے ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہا ہے اسی طرح ہم بھی چھپ کر کسی کی نظروں میں آئے بغیر ان سے مقابلہ کرتے رہتے ہیں۔ میں نے جتنی ٹیمیں تشکیل دی ہیں ان میں ہی ایک کا نام خفیہ فورس رکھا ہے لیکن یہ نام کی ہی خفیہ ہے، اصل مقصد دوسری ٹیمیں محفوظ کی گئی ہیں۔ ان سب کے مختلف نام رکھے گئے ہیں، مثال کے طور پر خفیہ فورس، اسپیشل فورس، سی آئی اے فورس، ایف بی ایسے کئی دوسرے نام رکھے گئے ہیں لیکن مقصد صرف سب کا ایک ہی ہے، اپنے ملک کو بچانا۔ لیکن یہ راز ایسے ہیں کہ کم لوگ ہی سرکاری سطح پر جانتے ہیں یا پھر میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ کیوں کہ آپ اب ان کا حصہ ہیں۔ فورس کے ملازم بھی بہت کم معلومات رکھتے ہیں۔'' پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور بولے۔

''بیٹے حماد! تم کالج کا سال پورا کرو گے اور بعد میں ہمارے پاس آجاؤ گے، ہمیں تمہارے جیسے جانبازوں کی ضرورت ہے۔''

پھر انہوں نے اپنے پاس سے کچھ نقشہ جات نکال کر سامنے پھیلائے تو وہ تمام نقشے چوہدری کرم دین کے پروجیکٹ کے محل وقوع کے تھے۔ چانڈیو صاحب نے بھی میرا بنایا ہوا نقشہ انہیں دے دیا تھا، کچھ دیر بعد کرنل آفریدی صاحب گویا ہوئے۔

''یہ تمام نقشہ جات ہمارے خفیہ کے چند نوجوانوں نے بنائے ہیں۔ ہم آپ کی اطلاعات ملتے ہی مصروف ہو گئے تھے لیکن میرے چند نوجوانوں نے کہا ہے کہ وہ جنگل کے زیادہ اندر تک نہیں جا سکے۔ ان میں کچھ خودکار گنوں سے زخمی بھی ہوئے ہیں، جو جنگل کے اندر کہیں سیٹل کی گئی تھیں۔ اس لئے ہمیں زیادہ سے زیادہ معلومات کے لئے کوئی ایسا شخص چاہیے جو جنگل کے چپے چپے سے واقف ہو اور ڈرگ لیبارٹری تک ہمیں پہنچا دے۔''

میرے ذہن میں کرنل صاحب کی بات آچکی تھی۔ میں نے چانڈیو صاحب سے کہا۔ ''انکل! ہمارے پاس صرف ایک آدمی ایسا ہے جو جنگل کے علاوہ لیبارٹری کے اندر کے راز بھی یقیناً جانتا ہوگا۔''

کرنل بولے۔ ''بیٹا! وہ کون آدمی ہے جو ہمارا اعتماد کا ہو، ہمیں دھوکہ نہ دے۔''

میں نے جواب دیا۔ ''سر! اصل میں ہم اسے راز دار نہیں بنا سکتے لیکن اس سے کام ضرور لے سکتے ہیں لیکن اس کے لئے ہمیں ایک ایسا کام کرنا پڑے گا جسے صرف پولیس کی حد تک ہی رہنا ہوگا۔''

میری اس بات پر چانڈیو صاحب بولے۔ ''حماد! کیا کہنا چاہتے ہو؟''

میں نے جواب دیا۔ ''دراصل انکل یہ وہی آدمی ہے جس نے مجھے زندہ چھوڑا تھا اور اس سسٹم کو ختم کروانے کی خواہش کے ساتھ ساتھ آپ پر بھی احسان کیا ہے۔''

چانڈیو صاحب سمجھ گئے، کہنے لگے۔ ''لیکن پولیس اب کیا کرے گی؟''

میں نے جواب دیا۔ ''سب سے پہلے انکل ہمیں ان کے دونوں ساتھی جیل سے رہا کروانا ہوں گے اس کے بعد ہم انہی آدمیوں کو صرف ایک پیغام دیں گے جس میں صرف میں کہوں گا کہ وہ مجھے ملے اس کی ضرورت ہے۔''

کرنل صاحب میری بات سن کر بولے۔ ''حماد بیٹا! اگر یہ بات ہے تو وہ آدمی جیل سے دو دن کے اندر اندر آزاد ہو جائیں گے، کیوں چانڈیو صاحب اس میں آپ کو کوئی پرابلم تو نہیں ہوگی۔'' چانڈیو صاحب کہنے لگے۔ ''نہیں سر! ہمیں کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔ اگر ایک بڑے مجرم کو پکڑنے کے لئے چھوٹے مجرموں کو آزاد کرنا پڑے تو کوئی مہنگا کام نہیں ہے۔''

کرنل آفریدی صاحب بولے۔ ''بالکل کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے لہٰذا بیٹا تم آج سے بلکہ ابھی سے یہاں رہو گے اور کچھ ٹریننگ تمہیں لینی پڑے گی جو خاص طور پر ہمارے مشن کا حصہ ہے اور چانڈیو صاحب آپ وہ دونوں نام مجھے دے دیں، میں انہیں جیل سے رہا کروانے کی کوشش کرتا ہوں اور آپ ہادی کا پیغام لے جائیں اور انہیں جیل میں دیں، انہیں بتا دیں کہ حماد نے یہ خط دیا ہے کہ وہ اپنے سردار ملنگی کو دے دیں اور تمہیں ہادی کی سفارش پر ہی رہائی دی جا رہی ہے۔ ہادی سے ملنے کے لئے وہ کسی بھی تھانے میں جا کر یا اپنا آدمی بھیج کر چانڈیو صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کرے تو

سے چانڈیو صاحب ہادی سے ملوا دیں گے۔''

پھر کرنل صاحب چانڈیو صاحب کو لے کر باہر تک چھوڑنے گئے۔ جب واپس آئے انہوں نے مجھ سے کئی سوالات کئے، پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ ''بیٹا! آؤ میرے ساتھ۔''

میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے لے کر میدان میں ایک جگہ جہاں کئی میرے جیسے جوان مختلف ورزشیں کر رہے تھے، لے آئے اور مجھے بھی ایک مخصوص وردی دی اور کہا۔ ''اسے پہن کر ان کی طرح شروع ہو جاؤ۔'' میں شروع ہو گیا۔ گویا میں کالج نہیں جا سکتا تھا۔ لہٰذا شام کو تھک کر میں کچھ آرام کے لئے بیٹھا۔

میں مختلف ورزشیں کر چکا تھا۔ گاؤں کی پیداوار تھا لہٰذا دوسروں سے کافی اچھا رہا تھا۔ کرنل صاحب بہت ہی خوش تھے۔ وہ میرا حوصلہ برابر بڑھا رہے تھے۔ دوسرے دن میں نے سب سے پہلے چانڈیو صاحب کو کال کی اور کہا۔ ''جناب آپ ایک موبائل عاتکہ تک پہنچا دیں، وہ کالج میں ہوگی۔''

کرنل صاحب بولے۔ ''بیٹا موبائل استعمال کرنے کی میں اجازت تو نہیں دیتا البتہ آپ سرکاری طور پر نہیں بلکہ پرائیویٹ بھرتی ہوئے ہو اس لئے ذرا خیال رکھنا، اپنے متعلق کسی اپنے کو بھی نہیں بتانا۔''

میں نے کہا۔ ''سر! میں سمجھتا ہوں، آپ پریشان نہ ہوں، آپ کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچے گی۔''

میرے پاس کچھ دیر بعد ایک میسیج آیا جس میں عاتکہ کے موبائل کا نمبر درج کیا گیا تھا۔ میں نے وہی نمبر ری ڈائل کر دیا، دوسری طرف بیل جا رہی تھی، تھوڑی دیر بعد مجھے عاتکہ کی میٹھی سی آواز سنائی دی تو میں نے کہا۔ ''محترمہ مس عاتکہ صاحبہ کیسی ہیں؟''

وہ کہنے لگی۔ ''ہادی! یہ بتاؤ تم واپس کب آ رہے ہو، مجھے وہاں چھوڑ کر تم کہاں چلے گئے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''میں کم از کم 6 ماہ کے لئے پھر دوبارہ غائب ہو چکا ہوں۔''

کہنے لگی۔ ''اوہ! اس کا مطلب ہے کہ اب دوبارہ جب ملو گے تو تمہارا نام ٹارزن ہوگا، ہے نا؟''

میں اس کی بات سن کر بے ساختہ ہنس دیا۔ وہ سچ کہہ رہی تھی مگر انجانے میں پہلے بھی میں غائب ہوا تھا تو وسیم سے حماد بن گیا تھا۔ اب غائب ہو کر میں ٹارزن بننے جا رہا تھا۔ پہلے نام تبدیل کروانے والا ایک پولیس والا تھا، اب نام تبدیل کروانے والا ایک آرمی آفیسر تھا لیکن اسے میں یہ نہیں بتا سکتا تھا۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''جو مرضی سمجھ لو لیکن تم اس موبائل کو اپنے پاس رکھو گی، ہماری آپس میں بات ہوتی رہے گی۔'' تھوڑی دیر بعد میں نے موبائل بند کر دیا اور میں اپنی ٹریننگ کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆.....☆

تقریباً ایک ہفتہ بعد کرنل صاحب نے آپریشن کی تیاری کا حکم دے دیا۔ سب اپنی اپنی تیاری میں مصروف ہو گئے، ہماری ٹیم نے شب خون یعنی رات کو چھاپہ مارنا تھا اور دن کے پچھلے پہر جنگل میں جانا تھا۔ سردار منگی سے میں مل لیا تھا، چاند پور گاؤں جا کر اسے ساری صورت حال سمجھا دی تھی۔ اس کا کام صرف ڈیڈ ایریا تک پہنچانا تھا۔ ٹریننگ نے مجھے چاک و چوبند کر دیا تھا اور میں اب ایک سپاہی تھا۔ کرائے سے لے کر مارشل تک تمام آدمی پر بھاری ہونے کے لئے تمام ہتھکنڈے جان گیا تھا۔ اس لئے مجھے اب کسی قسم کا ڈر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں اب ایسا بن چکا تھا کہ تنہا دس آدمیوں پر بھی بغیر کسی ہتھیار کے بھاری تھا۔ نشانے میں بھی بہترین کھلاڑی بن چکا تھا۔

کرنل صاحب نے کہا۔ ''اگرچہ تم میری طرف سے پاس ہو لیکن پھر بھی مشن کی کامیابی کے بعد تم باقی ٹریننگ کا کورس بھی پورا کر لو تو بہتر ہوگا۔''

میں نے جواب دیا تھا۔ ''سر کوشش کروں گا۔''

دوپہر کے بعد ہم ایک ایک اور دو دو کی ٹولیوں میں مختلف اوقات میں شکاریوں کے بھیس میں جنگل میں داخل ہو چکے تھے۔ میری حیثیت سی آئی اے کے رضا کار کی تھی اور میں تھا بھی ایک رضا کار سپاہی۔ میرے ساتھ جو آرمی کا جوان تھا اس کا نام کاشف تھا، وہ لاہور کا رہنے والا تھا۔ وہ میرا دوست بھی بن چکا تھا۔ ہم جنگل کے اندر گھستے چلے گئے، ہمارے پاس ایسے ٹیپس تھے جو کہ بالکل کان میں آ جاتے تھے اور باہر سے نظر بھی نہیں آتے

تھے۔ تمام جوان اس سے منسلک تھے۔ کرنل صاحب جو حکم دیتے وہ سب کو سنائی دیتا۔ اتفاق سے تمام لیبارٹری کے سائنس دان اس وقت لیبارٹری میں موجود تھے۔ انہوں نے آج مال گاڑی پر لوڈ کر کے اوپر لکڑی ڈالتے اور پھر اسے کسی اور جگہ لے جاتے، پھر وہاں سے کسی طرح ملک سے باہر بارڈر سے پہنچایا جاتا۔ اسی لئے آج رات چوہدری بھی وہاں موجود تھا۔ وہ ہمیشہ گھوڑے پر سفر کرتا تھا۔ اپنی ٹانگ اس نے لندن سے پلاسٹک کی لگوالی تھی جس سے اسے چلنے کے علاوہ دوڑنے میں بھی پرابلم نہیں ہوتی تھی۔

اب ہم ڈاکوؤں کے سردار ملنگی کی رپورٹ کے مطابق ناجائز سیٹ اپ کے بالکل قریب تھے۔ کرنل صاحب ہدایات دے رہے تھے۔ اب ان کی آخری ہدایت رکنے کی تھی۔ پھر انہوں نے سیٹ پر فریکوئنسی ملائی۔ آری کی کور کمانڈر نصرت اللہ کو کال کی اور انہیں کچھ ہدایات دیں جن میں ہیلی کاپٹر کے ذریعے بھی نگرانی کرنا تھی۔ تھوڑی دیر میں ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دی تو کرنل آفریدی صاحب نے سب کو آپریشن حملہ کرنے کا حکم دیا تو ہم سب ایک دم کھڑے ہو کر بجلی کی کانٹے دار تاروں کے کنکشن کاٹتے ہوئے لیبارٹری کے اندر تک جا پہنچے اور کرنل صاحب نے لاؤڈ اسپیکر میں تمام مجرموں کو ہینڈ اپ ہونے کو کہا لیکن اسی وقت خودکار گنوں سے فائرنگ کے علاوہ کئی آدمی بھی فائرنگ کرنے لگے۔ مقابلہ زبردست تھا۔ آخر کار ہمارا پلہ بھاری رہا۔ کئی آدمی مارے گئے، کئی زندہ گرفتار ہوئے اور کئی بھاگنے میں کامیاب ہوگئے۔ کئی مجرموں کو ہماری ٹیم نے تلاش کر کے پکڑ لیا تھا لیکن جہاں میں تھا وہاں ایک بڑی قد آور جھاڑی کے قریب سے گھوڑے ہنہنانے کے بعد ایک طرف سرپٹ دوڑتے قدموں کی آواز نے مجھے چوکنا کیا لیکن اس وقت تک وہ کافی دور نکل گیا۔ اس کے پیچھے جانا بے کار تھا، میں جانتا تھا وہ چوہدری کرم دین ہوگا جو موقع ملتے ہی بھاگ کھڑا ہوا ہوگا۔ دو گھنٹے کے اندر اندر ہم نے کافی کامیابی حاصل کر لی تھی۔ پھر لیبارٹری کو ہینڈ گرنیڈ سے تباہ کر دیا اور افیون اور چرس کے کھیتوں کو کسیوں کی مدد سے جڑ سے اکھاڑ دیا تھا جو ہمیں وہیں سے مل گئی تھیں۔ ڈرگ لیبارٹری سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ ایک دو جدید قسم کی گاڑیاں بھی تھیں جن میں جدید قسم کا اسلحہ موجود تھا، دونوں گاڑیوں پر قبضہ کر لیا گیا اور واپسی کے لئے روانہ ہوئے۔ واپس آتے ہوئے ہم ایک غیر آباد سے مکان میں آئے اور وہاں کے گیٹ سے اندر چلے گئے اور پھر ہم ایک کشادہ سی سرنگ میں داخل ہوئے۔ گاڑیاں بھی اسی سرنگ سے اندر لائی گئی تھیں اور ہم اب اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے تھے۔ یہ ہمارا ایک کامیاب آپریشن تھا جس میں ہمارے صرف چند سپاہی زخمی ہوئے تھے لیکن دشمنوں کی کافی تعداد پکڑی گئی تھی، وہ بھی ایک خفیہ مقام پر منتقل کر دی گئی تھی جو وہاں سے کافی دور تھی اور وہ بھی اس سسٹم کی طرح زیر زمین واقع تھی۔ وہاں بھی مختلف قسم کے تشدد کے اوزار رکھے گئے تھے کیونکہ زیادہ تر دشمن اتنے سخت تھے کہ وہ اپنی زبان نہیں کھولتے تھے۔ یہ میں تمام جگہیں ایک ہفتہ کے اندر اندر دیکھ چکا تھا۔ مشن کی کامیابی کے بعد دوسرے دن میں تنہا ہی وہاں سے نکلا اور واپس گھر آ گیا تھا۔ پورے ملک کی تنظیمیں حیران تھیں، ٹیلی ویژن کے مختلف چینلز اور اخبارات کو ایک موضوع مل گیا تھا کہ آیا جنگل میں کیا تھا جو خفیہ طور پر اتنا بڑا آپریشن بغیر پولیس کے آرمی نے کیا لیکن اسی وقت کرنل آفریدی کی طرف سے نفی کی گئی کہ یہ آرمی نے نہیں بلکہ پولیس نے خفیہ طور پر آپریشن کیا گیا ہے جس میں ڈرگ لیبارٹری اور افیون کے کھیت تباہ کئے گئے اور کچھ مجرم گرفتار بھی کیے گئے ہیں جو خفیہ مقام پر منتقل کر دیئے گئے ہیں۔ یہ تمام کریڈٹ صرف اور صرف ڈپٹی کمشنر ناظم علی چانڈیو کے سر ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہی صحافیوں ٹیم نے ڈپٹی چانڈیو صاحب سے سوال و جواب شروع کر دیے ٹیلی ویژن میں ان کا بیان سن کر مجھے حیرت ہوئی جب انہوں نے کہا پاکستان کو اسی طرح دشمنوں سے پاک کرتے رہیں گے اور ان کے منصوبے خاک میں ملاتے رہیں گے لیکن یہ صرف میرا ہی نہیں بلکہ میرے ساتھ ایک 22 سالہ لڑکا حماد تھا جس کی وجہ سے ہم اس جگہ پہنچے میں کامیاب ہوئے، اب صحافی میرے متعلق پوچھ رہے تھے لیکن میں غائب تھا آخر چانڈیو صاحب نے کہا۔ دراصل میں سامنے نہیں آنا چاہتا

رانہیں کے متعلق معلوم ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا، ئی سرکاری وغیر سرکاری اہلکار اور آدمی میرے چہرے کے شناسا تھے۔

میں نے خطرے کے پیش نظر چانڈیو صاحب سے فون پر بات کی تو انہوں نے کہا۔

''بیٹا میں اب بوڑھا ہونے والا ہوں میں کریڈٹ لے کر کیا کروں گا یہ اب بیٹا تمہارا ابھی کام تھا کہ تمہاری وجہ سے ہی ہم نے اتنی بڑی کامیابی حاصل کی۔''

میں نے کہا۔ ''آپ بھول رہے ہیں، میری وجہ سے نہیں بلکہ ڈاکو سردار ملنگی کی وجہ سے کامیاب ہوئے ہیں۔''

کہنے لگے۔ ''ہاں وہ بھی مجھے یاد ہے۔ اس کا احسان تو میں پوری زندگی نہیں چکا سکتا اور ہاں اپنی ایک تازہ تصویر سینڈ کرواسے بھی نیوز چینل اور اخبارات کی زینت بننا چاہیے۔''

میں نے بھیج دی تھی جو دوسرے دن بڑے جوش و خروش سے نیوز چینل پر چلائی جارہی تھی۔ میں چھپنا چاہتا تھا لیکن میڈیا اور چانڈیو صاحب مجھے چھپنے نہیں دے رہے تھے۔ چینلز پر گرما گرم بحث چھڑ گئی تھی کہ میں کون ہوں جنگل کے سیٹ اپ اور ڈرگ لیبارٹری کا راز کس طرح حاصل کیا لیکن مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ کچھ دن کے لئے میں جب تک معاملہ ٹھنڈا نہ ہوتا چھپنا چاہتا تھا۔ یہ میری مشکل کرنل صاحب نے حل کردی۔ فوراً ہی گاڑی بھجوادی تاکہ وہ اس گاڑی میں بیٹھ کر ان کے پاس پہنچ جاؤں۔ میں نے ایسا کیا اور دوبارہ ان کے پاس چلا گیا۔

☆.....☆

گھر میں صرف دونوں حکیم چچاؤں کو ہی معلوم تھا کہ ہم نے کیا معرکہ سر کیا ہے۔ وہ بہت خوش تھے کہ میں ملک کی خاطر ایسے کام کرنے لگا ہوں جس سے ان کا سر فخر سے بلند ہوگا۔ میں نے باقی کے پانچ ماہ بھی وہیں ٹریننگ میں ہی گزارے اور جب معاملہ ٹھنڈا ہوگیا تو انہوں نے باقاعدہ ایک خفیہ کارڈ بنا کر دیا اور کہا۔

''بیٹا اس کارڈ کا ناجائز استعمال نہ کرنا، صرف خاص خاص جگہ پر استعمال کرنا۔'' میں نے وہ کارڈ اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

انہی دنوں ہمیں اطلاع ملی کہ چوہدری کرم دین دوبارہ ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ میں گھر جانا چاہتا تھا کیوں کہ کالج تو نہیں جاسکتا تھا اور نہ ہی اب میں پڑھنا چاہتا تھا۔ انہی دنوں سیالکوٹ بارڈر کے ایک قریبی گاؤں میں مشکوک اطلاعات فراہم ہوئیں تو مجھے کرنل صاحب نے مکمل معلومات کے لئے کچھ ساتھیوں سمیت جن میں کاشف بھی موجود تھا ادھر بھیج دیا اور ہم وہاں ایک قریبی غیر آباد ریلوے اسٹیشن پر آگئے۔ وہاں سے وہ گاؤں تھوڑی دور ہی تھا۔ اس گاؤں میں واقع ایک فارم ہاؤس جس میں مختلف پھل دار درخت تھے، اطلاع یہ تھی کہ اس فارم ہاؤس سے جو مال یا فروٹ باہر جاتا ہے اس کے بدلے میں جو بھی چیز باہر سے ڈیلیوری کے طور پر پاکستان میں آتی ہے اس میں ناجائز اسلحہ آتا ہے۔ ہم نے صرف اسے مکمل پکے ثبوتوں کے ساتھ پکڑنا تھا اور پھر خود سامنے آئے بغیر معاملہ پاکستان آرمی جو سرحدوں پر تعینات تھی اس کے سپرد کرنا تھا اور جو مجرم گرفتار ہوتے انہیں لے کر دوبارہ ملتان لے کر چلے جانا تھا۔ ہمارا ہیڈ کوارٹر اس وقت ملتان میں تھا جہاں میں نے بھی ٹریننگ حاصل کی تھی۔

ہم نے آٹھ دن کے اندر اندر دو ٹرک اسلحے کے پکڑے تھے، پھر ان ڈرائیوروں کو پکڑا اور ان سے تفتیش کی تو اصل مجرم بھارت کے اندر ہریانہ شہر کے تھے اور دوسرے پاکستان کے فارم والے دو حصہ دار تھے اور یہ سارا کام آرمی کے کچھ رشوت خوروں کی وجہ سے پایہ تکمیل تک پہنچ رہا تھا۔ ہم نے وہ آرمی آفیسر بھی گرفتار کر لئے۔ یہ دو میجر اور ایک کرنل تھا۔ ان پانچوں کو لے کر فوراً ملتان کا رخ کیا اور انہیں ہیڈ کوارٹر بھیج دیا گیا جہاں اس قسم کے مجرم رکھے جاتے تھے اور ہماری یہ تنظیم باہر کے کئی ممالک میں بھی مختلف کام سرانجام دے رہی تھی۔

انٹیلی جنس ایک حساس ادارہ ہے، جو لوگ پکڑے گئے تھے ان کی نشاندہی پر بھارت میں موجود خفیہ کے چند نوجوانوں نے کارروائی کر کے بڑے مجرموں کو پکڑا لیکن وہ موقع پر ہی منہ میں رکھے زہریلے کیپسول کھا کر خودکشی کر گئے تھے۔ ملتان آکر میں نے سوچا کہ عاتکہ سے

بات کروں گا کیونکہ کافی عرصہ سے میں نے موبائل بند رکھا تھا۔ آج کافی عرصے بعد اسے چارج کر کے لگایا۔ آخری بار میری بات چانڈیو صاحب سے ہوئی تھی۔ انہیں تو میرے متعلق تمام معلومات کرنل کے ذریعے ملتی رہتی تھیں اور وہ سونیا کو بھی بتاتے رہتے تھے، جو مجھے کرنل صاحب نے خفیہ کا کارڈ دیا تھا اس پر میری تصویر بھی لگی ہوئی تھی اور یہ تصویر غلطی سے پوری دنیا میں بھی چل چکی تھی۔ چھپنے والے نہ تو میرے کام تھے نہ ہی میں لیکن میں دنیا سے چھپا ہوا تھا۔ کئی معرکے سر کیے تھے، سوچا چلو آج چچا حشمت اور چچا عظمت سے بات ہو جائے تو ساتھ ہی عاتکہ سے بھی ہو جائے گی۔ میں نے فوراً عاتکہ کا نمبر ملایا تو وہ بند جا رہا تھا۔ موبائل کی سم پر کئی میسج آئے ہوئے تھے جو کچھ تو سونیا کے تھے اور باقی عاتکہ کے تھے۔ میں نے تمام میسج کھولنے شروع کر دیئے۔ جیسے جیسے میں میسج پڑھتا جا رہا تھا میری پریشانی بڑھتی گئی۔ آخری کئی میسجز میں عاتکہ نے لکھا تھا کہ ''میرے وسیم! مجھے بچالو، خدا کے لئے تم کہاں ہو، جلدی پہنچو، مجھے بچالو ورنہ میں تمہیں کبھی نظر نہ آؤں گی۔''

یہ پڑھتے ہی میرے پاؤں تلے زمین نکل چکی تھی۔ میں نے فوراً ایک گاڑی نکالی اور سیدھا بشیر آباد کی طرف نکل گیا۔

☆.....☆

گاڑی کی اسپیڈ کے ساتھ ساتھ میرا دل بھی بہت اسپیڈ سے دھڑک رہا تھا۔ نہ جانے میرے لئے کیا قیامت تھی، میں دل ہی دل میں عاتکہ کی خیریت کی دعائیں مانگ رہا تھا لیکن خیریت نہیں تھی۔ ابھی میں نے گلی کے موڑ سے ٹرن لیا تھا کہ میری نظر سیدھی چچا عظمت اور حشمت کے مکان پر پڑی اور گاڑی ایک بجلی کے کھمبے سے ٹکراتی ہوئی رک گئی۔ یہ اچانک دھچکہ تھا اس سے تو میں سنبھل گیا تھا لیکن چچا حشمت اور عظمت کا مکان دیکھ کر جو دھچکا لگا اس سے میں بے ہوش ہو چکا تھا کیونکہ تمام مکان جل کر کوئلہ ہو چکا تھا۔ عاتکہ میری محبت، میری زندگی۔ میرے پالنے والے، بے شک وہ میرے سگے ماں باپ نہ تھے لیکن انہوں نے مجھے جن امیدوں سے اپنا سمجھ کر پالا تھا، آج میں جس مقام پر تھا صرف انہی کی بدولت تھا۔ سب کے سب آگ کی نذر ہو چکے تھے۔ میری دنیا اندھیری ہو چکی تھی۔ میں بے ہوش پڑا تھا جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک اسپتال کے بیڈ پر آئی سی یو میں لیٹا ہوا تھا۔ میرے منہ پر آکسیجن تھی اور سر سے مختلف پائپ ایک کمپیوٹر کے ساتھ منسلک تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک نرس میرے کمرے میں داخل ہوئی اور مجھے آنکھیں کھولتا دیکھ کر وہ بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ اپنے ساتھ دو ڈاکٹروں کو لے کر آ گئی تھی۔ پھر وہ کمپیوٹر کے ساتھ کچھ چھیڑ خانی کرنے میں مصروف ہو گئے۔ آہستہ آہستہ مجھے ان کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ چند منٹ بعد ایک ڈاکٹر باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی مجھے ایک انجکشن لگایا۔ دوسرا مسلسل کمپیوٹر پر کچھ کرنے میں مصروف تھا۔ میں صرف ایک بازو ہلا سکتا تھا یا ٹانگیں، میں بجز سے ان کی تمام کارروائیاں دیکھ رہا تھا۔ میرے ایک بازو میں ڈرپ لگی ہوئی تھی، میری دونوں ٹانگوں کے درمیان ایک پیشاب کی تھیلی لٹک رہی تھی۔ چند گھنٹوں بعد ڈرپ ختم ہوئی تو دوسری لگا دیتے تھے۔ پھر انہوں نے میرے سر اور منہ سے لگی آکسیجن اتار دی اور میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ میرا سانس اپنی رفتار پر آ گیا تھا۔ اب نرس اندر میرے پاس آئی تھی اور دونوں ڈاکٹر واپس چلے گئے تھے۔

جب دونوں ڈاکٹر میرے کمرے سے باہر نکلے تو نرس میرے قریب آ کر بڑے پیار سے بولی۔

''گھبراؤ مت، تم اب بالکل ٹھیک ہو، ویسے تمہیں کیا ہوا تھا؟''

میں یہ جواب دینے سے قاصر تھا اور اب یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا ہوا ہوگا لیکن بہت یاد کرنے پر بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ نرس نے دوبارہ سوال کیا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے کہا ''میرا نام پتا نہیں۔'' نرس نے پریشانی سے پھر پوچھا۔ ''کہاں رہتے تھے؟'' میں نے کہا۔ ''کہاں رہتا تھا، نرس پتا نہیں میں کہاں رہتا تھا، میرا نام کیا ہے۔''

نرس فوراً ہی مجھے سوچتا چھوڑ کر ایک بار پھر باہر نکل گئی تھی۔ ایک بار پھر ڈاکٹر میرے اردگرد تھے اور میرے سر پر دوبارہ مشین لگ گئی تھی۔ پھر ایک ڈاکٹر نے کہا۔ ''تمہارا

لیا ہے؟ یاد کرو، یاد آیا؟'' اس طرح کے مختلف ات پوچھنے کے بعد پھر دوبارہ مشین کی طرف متوجہ ہوئے۔ چند منٹ بعد پھر وہی کام دوبارہ دہرایا گیا لیکن کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ آخر انہوں نے آپس میں کوئی مشورہ کیا۔ پھر میرے بازوؤں کی ایک نس سے خون کا نمونہ حاصل کیا۔ میرے سر سے کلپ نما مشین اتار کر خود چلے گئے۔ نرس دوبارہ میرے پاس آچکی تھی۔ اب وہ اتنی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور اندر ایک آدمی داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی تھی۔ آدمی نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور میں نے بھی سلام کا جواب ہاتھ ملا کر دیا تو وہ آدمی بولا۔ ''حماد بیٹے! کیا بات ہے، تم نے مجھے پہچانا؟'' میں نے نفی میں سر ہلا دیا تو وہ بولے۔ ''بیٹے! میں ناظم چانڈیو ہوں اور یہ میری بیٹی سونیا۔''

میں نے کہا۔ ''میں آپ کو نہیں جانتا لیکن بتائیں اگر آپ مجھے جانتے ہیں تو بتائیں میں کون ہوں؟''

سونیا بہت ہمدردی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے کوئی بات نہ کی تھی۔ اسی وقت باہر سے ڈاکٹر نے کہا۔ ''جناب چانڈیو صاحب! اسے پچھلی کوئی بات یاد نہیں رہی۔ اسے ایسا صدمہ پہنچا ہے کہ اس کی یادداشت چلی گئی، لیکن گھبراؤ نہیں۔ اسے کسی دوسرے ملک یعنی لندن یا نیویارک میں بھیجتے ہیں۔ عنقریب خدا نے چاہا تو یہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا، لہٰذا ایسا کریں اس کے دماغ کو زیادہ سوچنے پر مجبور نہ کریں۔''

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! میں کون ہوں؟''

وہ بولے۔ ''تمہارا نام حماد ہے بس، باقی باتیں تمہیں پھر بتائی جائیں گی لیکن اس وقت تازہ تازہ کام ہے، اس لئے تم سوچو مت، زیادہ ذہن نہ خرچ کرو۔''

اب میں سوچ رہا تھا کہ کیا میری یادداشت چلی گئی ہے۔ یہ کون لوگ ہیں جو بڑے پیار سے بلا رہے ہیں۔ دونوں واپس چلے گئے۔

☆.....☆

دو دن بعد مجھے لندن ایک اسپتال میں شفٹ کر دیا گیا۔ پاکستان سے لندن کا یہ سفر ہم نے ہوائی جہاز پر کیا تھا۔ وہاں موجود ڈاکٹروں نے میری تمام رپورٹس چیک کی تھیں۔ مجھ سے بھی کئی سوالات کئے تھے لیکن میں کسی کا جواب نہیں دے سکا تھا۔ انہوں نے جب مجھ سے نام پوچھا تو میں نے کہا۔ ''پتا نہیں میرا نام کیا ہے۔'' لیکن ڈاکٹر اور دوسرے لوگ مجھے حماد کہہ رہے تھے۔ میرے ساتھ ایک پاکستانی ڈاکٹر بھی تھا۔ چند دن بعد میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ پیشاب اور خوراک کی نالیاں بھی اتار دی گئی تھیں۔ میں لندن شہر کو بہت غور سے دیکھتا تھا۔ ایک نرس کی مکمل ڈیوٹی میرے پاس موجود رہنے کی تھی۔ وہ چوبیس گھنٹے موجود رہتی تھی۔ وہ مجھے مختلف جگہوں پر گھماتی تھی، مجھے ہر بازار ہر جگہ کا بتاتی اور میں اسے یاد رکھتا تھا۔ اسی طرح میں بہت کچھ جانتا گیا جو مجھے بتایا جاتا، جیسا بتایا جاتا اسے نہیں بھولتا تھا۔ جب بھی مجھ سے پوچھا جاتا تو میں فوراً ہی بتا دیتا لیکن پچھلی زندگی، پچھلی باتیں نہیں بتا سکتا تھا۔ کوشش کرنے پر بھی یاد نہ آتا۔ نرس مجھ میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ جوان عورت تھی، کئی دفعہ وہ مجھے اپنے گھر بھی لے کر گئی جہاں اس کا ایک بیمار شوہر ہر وقت کھانستا رہتا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا یہ نشہ بہت زیادہ کرتے ہیں، ہر وقت شراب اور ہیروئن نے ان کو ایسا بنا دیا ہے ورنہ یہ ایسے نہیں تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ کیا چیز ہوتی ہے۔'' اس نے ایک کمرے سے ایک چھوٹی سی پڑیا مجھے دکھائی اور بولی یہ وہ زہر ہے جس سے کھانے والا آہستہ آہستہ موت کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔ میں بچپن سے ہی ذہین تھا، بات کو سمجھ جاتا تھا لیکن اب ذہین تھا لیکن پچھلی زندگی کی کوئی بات یاد نہیں آ رہی تھی۔ انہی دنوں اسپتال لندن میں ایک خودکش دھماکا ہوا اور اسپتال تباہ ہو چکا تھا۔ کئی اموات ہوئی تھیں لیکن میں وہاں سے دور ایک مارکیٹ میں گیا ہوا تھا۔ فوراً ہی پولیس کی گاڑیاں، ریسکیو کی گاڑیاں الارم بجاتی ادھر سے ادھر جا رہی تھیں۔ مجھے بھی دکھ ہوا تھا لیکن میں اپنی شناخت کے مسئلے میں بھی الجھا ہوا تھا۔ میں واپس ہسپتال کے قریب سے گزرا تاکہ ثمن یعنی نرس ثمن کے گھر چلا جاتا ہوں، کیونکہ اس شہر میں کوئی اور جاننے والا نہیں تھا۔ اسی وقت ایک پولیس والے نے میرے قریب گاڑی روک کر مجھ سے پاسپورٹ مانگا لیکن میں حیرانگی سے اس کے منہ کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اس

نے دوبارہ کہا لیکن اس بار انگلش کی بجائے اردو میں پوچھا تھا۔ یہ خوش آئند بات تھی کہ یہ دونوں زبانیں اردو اور انگلش مجھے یاد رہی تھیں لیکن باقی سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔

یہ قانون فطرت ہے کہ حالات و واقعات ایک جیسے نہیں رہتے، کبھی غم، کبھی قہقہے تو کبھی بے بسی، کبھی موت تو کبھی زندگی، کبھی سوز کبھی ساز۔ غرض دنیا تغیر کا نام ہے۔ کبھی انسان خوشی سے پھولے نہیں سماتا تو کبھی اندازوں کی گہری کھائیوں میں جا گرتا ہے۔ اسی طرح میری آزمائش کے دن بھی شروع ہو چکے تھے۔ میں ذاتی طور پر اتنا بے ہمت اور بے بس کبھی نہ ہوا تھا لیکن زمانے کے حوادث کے چنگل میں پھنس کر بے بس ضرور ہو چکا تھا۔ میرے جواب دینے پر پولیس مین نے مجھے پکڑا اور اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر سیدھا پولیس اسٹیشن لے گیا اور پھر چند دن بعد مجھے پاکستان ڈی پورٹ کر دیا گیا۔ میرے ساتھ اور بھی لڑکے اور آدمی تھے لیکن سب اپنی اپنی جگہوں پر جانے کے لیے تیار تھے۔ ان کے ویزے یا تو ختم ہو گئے تھے یا پھر میری طرح تھے ہی نہیں۔ مجھے بالکل یاد نہیں تھا کہ میں نے کہاں جانا ہے یا کہاں جا رہا ہوں۔ بس اپنی ہی مرضی سے جدھر منہ اٹھتا چلا جا رہا ہوتا۔ اب میں ایک ایسی جگہ پہنچا یہاں مجھے محسوس ہوا کہ میں نے انہیں کہیں دیکھا ہے لیکن کافی سوچنے پر بھی مجھے یاد نہ آیا۔ دراصل یہ فوجی چھاؤنی تھی۔ میں وہاں سے بھی آگے پیدل ہی چلتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک پہاڑی سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ آخر میں نے ایک جگہ پتھروں سے بنے ہوئے کچھ گھر دیکھے۔ ان کے قریب سے گزر رہا تھا کہ ایک درمیانی عمر کی گوری چٹی عورت نے مجھے دور سے دیکھتے ہی چلانا شروع کر دیا۔ طلحہ، طلحہ، کہتے ہوئے میری طرف بھاگی۔ میں اس صورت حال سے گھبرا کر رک گیا۔ وہ قریب آتے ہی بولی۔ ''میرے بیٹے! کیا تم مجھ سے ناراض ہو جو کبھی ملنے نہیں آئے۔ میری یہ حالت بھی تمہارے ہی انتظار میں ہوئی ہے اور ساجدہ، انعم، عثمان سب لوگ تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔'' میں نے سوچا ہو سکتا ہے یہ مجھے جانتے ہوں یا رشتے دار ہوں کیونکہ میں تو اپنی تمام پچھلی زندگی بھولے ہوئے تھا۔ میں نے تو اب بہت کم ہی بولنا شروع کیا تھا۔ ویسے بھی پاگلوں کی طرح ہی چپ چپ رہتا تھا اور اپنائیت نام کی چیز سے بھی چڑ ہوتی تھی۔ میں اب سوچ رہا تھا کہ یہاں سے بھاگ جاؤں لیکن پھر یہ سوچ کر کہ شاید یہاں مجھے کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے، ویسے تو یہ میں جان گیا تھا کہ میری یادداشت ختم ہو گئی ہے یعنی اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن میں سب جاننا چاہتا تھا کہ میں کون ہوں؟ کہاں رہتا تھا۔ یہی شناخت جاننے کے لیے میں آخر اس عورت کے ساتھ چل دیا۔ وہ بڑی خوشی کے ساتھ مجھے اپنے گھر میں لے آئی۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے کچھ کچھ اچھا لگا تھا۔ گھر میں کچھ بھینسیں اور گائے ایک طرف بندھی جگالی کر رہی تھیں۔ ساتھ ہی ایک چارہ کاٹنے والی مشین لگی ہوئی تھی۔ اسی وقت اندر سے ایک جوان لڑکی نکلی اور حیرانی سے بولی۔ ''اماں!'' پھر اماں کی بات سننے سے پہلے ہی خوشی سے چہکتے ہوئے میرے ساتھ چمٹ گئی۔

''طلحہ! میں نے تمہیں کتنا مس کیا اور تم مجھے یونہی چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟ تمہیں کتنی بار بتا چکی ہوں کہ تمہارے بنا نہیں رہ سکتی۔''

اسی وقت اندر کی جانب سے ایک چھوٹی لڑکی اور لڑکا بھی بھاگتے ہوئے باہر آئے۔ وہ بھی یہی گلہ کرنے لگے۔ ''بھائی! آپ کہاں چلے گئے تھے؟ ہمارے ساتھ کھیلنے کے لیے کیوں نہیں آئے۔'' لیکن یہ عجیب سچویشن خوب صورت ہونے کے باوجود مجھے پریشان کر رہی تھی۔ میری خوب آؤ بھگت کی گئی لہٰذا بولنے کی کوشش مزید تیز ہوئی تھی یعنی مجھے ان کے کئی سوالات کے جواب دینا پڑے تھے۔ پھر اچانک میرے ذہن میں ایک منصوبہ آیا کہ اگر یہ مجھے جانتے ہیں تو انہیں پتا ہونا چاہیے کہ میں اسپتال سے لندن اسپتال بھیجا گیا تھا کیونکہ ایک آدمی اور لڑکی سونیا چانڈیو تھا جو پاکستان میں ایک اسپتال میں ڈاکٹر نے لیا تھا اور وہ مجھ سے ملنے ہی آئے تھے۔ وہ مجھے حماد کہہ رہے تھے لیکن یہاں میں حماد کے بجائے طلحہ بن چکا تھا۔ تقدیر کے بھی عجب تماشے ہوتے ہیں جن کو کوئی نہیں سمجھ پاتا۔ میں بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ ذہن کے

کسی نامگماں گوشے میں ایک قلق سا ضرور تھا کہ یہاں جو تماشا ہو رہا ہے اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ لوگ شدید غلط فہمی میں مبتلا ہو چکے تھے لیکن میری ایسی حالت نہیں تھی کہ میں بھی جان پاتا کہ تقدیر اب میرے لیے کیا چکر چلا رہی ہے۔ رات کافی دیر بعد مجھے نیند آنا شروع ہوئی تھی لیکن پھر دروازہ کھلنے کی آواز پر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنے والی لڑکی انعم تھی۔ چند گھنٹوں میں مجھے تمام اور رشتوں کے بارے میں جو مجھے معلومات ملی تھیں ان میں ہاجرہ بی بی وہ عورت جو سب سے پہلے مجھے ملی تھی، جو مجھے لے کر آئی تھی ساس تھی اور انعم میری بیوی تھی۔ باقی دونوں چھوٹے ساجدہ اور عثمان انعم کے بہن بھائی تھے۔ میری شادی کو صرف چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ میں اچانک کہیں گم ہو گیا تھا اور اب انہیں مل گیا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا بھی تھا کہ آپ سونیا اور چانڈیو کو جانتی ہیں تو انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا تھا اور میں یہ جاننے سے قاصر تھا کہ وہ کون لوگ ہو سکتے تھے۔ ان کے ہی مشورے پر مجھے یادداشت کے سلسلے میں لندن بھیجا تھا اور اس اسپتال کے اخراجات بھی انہی چانڈیو صاحب نے دیئے تھے۔

انعم کو اپنے پاس اس وقت آتے دیکھ کر میں کچھ گھبرا سا گیا تھا۔ میرے قریب ہی بیٹھ کر وہ اپنی نئی سہیلیوں کے بارے میں بتانے لگی کہ وہ ملنے کے لیے آئی ہیں اور پھر وہ دوسرے رشتے داروں کے بارے میں بتانے لگی۔ میں جب کافی سن کر تھک گیا تو میں نے کہا۔

''میں کچھ نہیں جانتا کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔''

وہ پریشانی کے عالم میں مجھے تکنے لگی۔ پھر وہ تذبذب میں نظر آئی۔ آخر بولی۔ ''طلحہ! تم کہاں تھے؟ کچھ یاد ہے؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں، صرف مجھے اتنا یاد ہے کہ میں ایک اسپتال میں تھا پھر وہاں سے ایک آدمی کے کہنے پر لندن اسپتال بھجوا دیا گیا پھر وہاں مجھے پولیس کے سپاہیوں نے پکڑ کر پاکستان میں بھیج دیا اور اب میں یہاں ہوں۔''

وہ بولی۔ ''وہ شہر کون سا تھا جہاں تم پہلے اسپتال میں تھے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے یاد نہیں، بھلا سا نام تھا، تم شہروں کے نام لو شاید میں جان جاؤں۔''

انعم چند جماعتیں پاس تھی۔ وہ یہ بات محسوس کر چکی تھی کہ میں ذہنی توازن سے فارغ ہوں یا میں سب کچھ بھول چکا ہوں۔ ویسے جتنی باتیں میں کر سکتا تھا اور جو مجھے معلوم ہوا تھا وہ پچھلے چھ ماہ میں ہی ہوا تھا۔ وہ بولی۔ ''یہاں سے سب سے زیادہ نزدیک تو کراچی ہے، دوسری طرف حیدرآباد، روہڑی، سکھر، ملتان۔''

میں نے فوراً ہی کہا۔ ''ملتان۔ وہ شہر ملتان تھا۔''

بہت ذہین لڑکی تھی، ویسے تو سب لوگ پیار و محبت کرنے والے معلوم ہوتے تھے لیکن میرا دل، میرا ذہن ہی نہیں مان رہا تھا، نہ ہی مجھے کوئی اپنائیت محسوس ہوئی تھی کہ جیسے اپنوں کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ جیسے میں نے ہوش کے بعد چانڈیو اور سونیا کو دیکھ کر محسوس کیا تھا کہ میں نے انہیں کہیں دیکھا ہے لیکن یاد نہیں تھا کہ کہاں دیکھا۔ کہنے لگی۔ ''ٹھیک ہے، کچھ سوچتے ہیں، لیکن تم ماما جی کو کبھی بتاؤ گے کہ تم طلحہ نہیں ہو۔ ویسے بن جاؤ تو اچھے رہو گے۔ میں تمہاری بھی ہو سکتی ہوں۔ کیوں میری اپنی عقل بھی یہی کہتی ہے۔ میں اپنے طلحہ کو کہیں کھو چکی ہوں۔ تم بھی کافی ہینڈسم اور خوبصورت ہو۔''

مجھے نیند آ رہی تھی۔ وہ اٹھی اور دوسری چارپائی پر لیٹ گئی اور کہنے لگی۔ ''اب تم سو جاؤ، پھر باتیں کریں گے، تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔''

میں نے سو جانا بہتر سمجھا اور سو گیا۔ سوتے میں میں نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ دیکھ رہا ہوں میں کہ بہت خوب صورت جگہ ہے۔ ہر طرف پھول ہی پھول ہیں۔ طرح طرح کی خوب صورت رنگوں کی بے شمار تتلیاں اِدھر اُدھر اڑ رہی ہیں۔ وہاں ان کے درمیان ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی ہوئی ہے اور میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں اور اس جگہ سے بہت دور موجود ہوں، یہاں اندھیرا ابھی ہے لیکن وہ مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ پھولوں اور تتلیوں سمیت پھر مجھے محسوس ہوا کہ وہ رو بھی رہی ہے اور مجھے آوازیں دے رہی ہے۔ ہادی! کہاں ہو، جلدی آ جاؤ، کہاں غائب ہو۔ میں

کہاں تلاش کروں یاد! اب تم اس نام سے بنی رہے ہو، اب تم نارزن تو نہیں ہو۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے قریب چلا گیا تو وہ روتے روتے میرے گلے لگ گئی۔ کہنے لگی مجھے تمہاری عاتکہ نے بہت یاد کیا ہے، اب بتاؤ وسیم کے بعد حماد بنے اور اب نام کیا ہے تمہارا۔ میں نے سوتے میں کہا۔ اب میرا نام طلحہ ہے۔ یہ نام میں نے سوتے میں ذرا اونچا لے دیا تھا اور ساتھ ہی ایک تتلی کو پکڑنے پر سیدھا چارپائی کے نیچے گر گیا تھا۔ انعم جو میرے قریب دوسری چارپائی پر تھی، میرے گرنے پر فوراً ہی بھاگ کر مجھے سنبھالنے لگی۔ میں بھی جاگ گیا تھا۔ میں فوراً ہی اٹھ کر دوبارہ شرمندہ شرمندہ سا چارپائی پر بیٹھ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اچانک یہ بات ہوئی کہ ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا اور میں حیرانی و پریشانی سے اردگرد دیکھنے لگا۔ انعم میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''انعم! یہ کس کا گھر ہے؟'' کہنے لگی ''یہ ہمارا گھر ہی ہے۔'' میرا مطلب وہ نہیں سمجھی تھی۔ حقیقت یہ تھی مجھے اچانک سب یاد آ گیا تھا کہ اور خواب والی حقیقت ابھی بہت دور تھی۔ اچانک میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ انعم جو بڑے غور سے میری طرف دیکھ کر حیران سی تھی اور مجھے عاتکہ یاد آ رہی تھی کہ وہ کیسے مجھے یاد کر کے اور میسج کر کے روتی ہوئی چلی ہوگی۔ وہاں آگ کیسے لگی ہوگی۔ میں نے اپنی جیبوں کی تلاشی لی تو میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ نہ ہی میرا موبائل نہ ہی میرا پاور سیکرٹ سروس یعنی پی ایس ایس کا خفیہ کارڈ جس کی چپ میں میرا تمام بائیو ڈیٹا موجود تھا۔ میں نے سوچا ہوسکتا ہے کہ ناظم چانڈیو صاحب نے نکال لیا ہو۔ جب میں ملتان اسپتال میں تھا۔ پھر میں سوچ رہا تھا کہ لندن بھیجنے کے بعد میری خیر خبر کیوں نہ لی گئی۔ آخر میں پی ایس ایس کا ایک بہترین کمانڈو تھا۔ اس کارڈ میں مجھے ملک و قوم کی خاطر قتل کرنے کی بھی اجازت تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اب وہاں نہ جاؤں کیونکہ اگر ان کے کام کا ہوتا تو وہ یوں مجھے بے آسرا نہ چھوڑ دیتے۔ انعم کے ضد کرنے پر کہ تم مجھے بہن کہہ رہے ہو تو بھائی بہنوں سے کچھ نہیں چھپاتے لہٰذا تم جو بھی سوچ رہے ہو مجھے بتاؤ۔ میں نے محسوس کیا کہ تمہاری یادداشت واپس آ گئی ہے لیکن تم پہلے سے بھی زیادہ خاموش ہو۔

میں نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''انعم! میں تمہیں دھوکا نہیں دیتا۔ میں ابھی اماں کو یعنی تمہاری والدہ کو بتا دیتا ہوں کہ میں طلحہ نہیں ہوں، میں حماد عرف ہادی ہوں۔ ایک آرمی آفیسر۔''

انعم یکدم چونک کر اچھل پڑی۔ ''کیا کہا، آرمی آفیسر؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں!''

اب صبح کا اجالا پھیل رہا تھا۔ میں باہر صحن میں آ گیا انعم بھی میرے ساتھ ساتھ تھی۔ انعم کی ماں ایک گائے کا دودھ نکال رہی تھی۔ باہر صحن میں ایک چارپائی پڑی تھی، میں وہاں بیٹھ گیا، ہاجرہ بی بی نے دودھ نکال کر پھر مجھے پوچھا۔ ''میرے بیٹے کی رات اچھی گزری؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں خالہ! لیکن مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔''

وہ بولی۔ ''کیا انعم نے کچھ کہا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں! انعم بہن بہت اچھی ہیں۔''

میرے منہ سے اپنی بیٹی کو بہن کہنے پر وہ یوں اچھلی جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ اس کے لیے یہ دھماکے سے کم نہ تھا۔ اس کی نظر میں تو میں اس کا داماد تھا۔ وہ جہاں کھڑی وہیں بیٹھ چکی تھی لیکن اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے پھر تمام باتیں انہیں بتا دیں۔ یہ بھی بتا دیا کہ میری یادداشت گم تھی، رات کو ہی آ گئی تھی۔ وہ ماننے کو بالکل تیار نہیں تھیں۔ آخر میں اور انعم نے بہت مشکل سے انہیں یقین دلایا۔

پھر وہ بولی۔ ''میرا میاں یعنی خاوند اور انعم کا باپ بھی ملتان کے کسی تھانے میں سپاہی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ہوگا اور مجھے جانتا بھی ہوگا۔ آخر شکلیں آپس میں مل بھی جاتی ہیں ان سے آدمی دھوکا کھا جاتا ہے۔

انہوں نے بے یقینی کے عالم میں دیکھا، پھر ناشتا وغیرہ بنایا اور سب ناشتا اکٹھے کرنے لگے۔ ابھی ناشتا مکمل کیا ہی تھا کہ ایک آواز میرے کان کے پاس سے

گزرتی ہوئی گئی۔ میں نے یہ آواز پہلے بھی سنی تھی۔ میں یکدم چوکنا ہوگیا۔ اتنی دیر میں باہر کا دروازہ کھلا۔ ایک آدمی اندر آیا تو میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ آنے والا آدمی اکرم تھا۔ وہی اکرم جس سے دوبار پہلے ٹاکرا ہو چکا تھا۔ ایک بار چوہدری کرم دین کی حویلی میں جب درویش کی لاش لے جائی گئی تھی تو حویلی میں مجھے اسی اکرم نے پوچھا تھا کہ کون ہو۔ دوسری دفعہ نور پور کے تھانے میں جہاں مجھے انہی کی وجہ سے قاتل بنادیا گیا تھا اور اب میں یہاں اسے دیکھ کر حیران ضرور ہوا تھا لیکن کچھ دیر پہلے میں اس گھر کے ایک اور مکین کے بارے میں تفصیلات سن چکا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ یہ انعم کا باپ ہے۔ اس گھر کا سربراہ اکرم چوہدری کرم دین کا خاص الخاص چیلا۔ اس نے میری طرف غور نہیں کیا تھا۔ اپنا بیگ رکھ کر وہ واش روم کی طرف چلا گیا تھا۔ چھوٹے بچے اور انعم کی ابوابو کی آوازیں بھی آرہی تھیں، جیسے انہیں بہت خوشی ہوئی ہو۔

میں فوراً ہی وہاں سے نکل بھاگنے کے لیے پر تولنے لگا۔ انعم میری برابر کیفیت نوٹ کررہی تھی۔ بولی ''بھائی کیا بات ہے؟'' ویسے پورے گھر میں وہ بہت ذہین معاملہ فہم سمجھ دار لگی تھی اور تھی بھی۔ میں نے کہا۔ ''تمہارے والد اکرم کو جانتا ہوں۔ یہ بھی میرے دشمنوں کے ساتھ ہوتا ہے۔'' اس پر وہ بھی پریشان ہوئی تھی۔ ساتھ ہی ہاجرہ بیگم بھی۔ اتنی دیر میں اکرم واش روم سے ہمارے پاس آگیا اور حال وغیرہ پوچھنے لگا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''طلحہ! آج کل کیا کررہے ہو؟'' اس بات پر ہم تینوں نے اطمینان کا سانس لیا تھا کیونکہ وہ کبھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ میں یہاں بھی ہوسکتا ہوں۔

میں نے کہا۔ ''کچھ خاص نہیں۔'' تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد وہ مجھے لے کر ایک کمرے میں تنہا لے آئے اور بولے۔ ''حماد! تمہیں پتا ہے۔'' یہ سن کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں نے کہا۔ ''کس بات کا؟'' ویسے میں نے فوراً ہی ایک پلان سوچ لیا تھا اور مطمئن تھا کہ جب اس اکرم نے کوئی حرکت کی تو یہ مجھ سے نہیں بچ سکتا لیکن وہ بڑے تحمل سے مجھے برداشت کیے ہوئے تھا۔ بولا۔ ''یہی کہ تمہیں ہر جگہ تلاش کیا جارہا ہے، تمام اخبارات میں تمہاری تصویر دی گئی ہے کہ ذہنی توازن درست نہیں، یادداشت کمزور ہے۔ یہ خبر پچھلے دو ماہ سے جاری ہے لیکن پچھلے دو ماہ سے بند ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں نہیں جانتا یہ خبر کون دے رہا ہے۔''

وہ کہنے لگا۔ ''یہ ہمارے ڈی پی او صاحب یعنی چانڈیو صاحب۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا چانڈیو صاحب کی ترقی ہوگئی ہے؟''

وہ بولا۔ ''ہاں، وہ اب ضلع کے ڈی پی او بن چکے ہیں اور انہوں نے تمام تھانوں میں بھی تمہاری تصاویر بھیجی تھیں کہ جہاں بھی دیکھیں تمہیں پکڑ کر اس کے پاس لے جائیں۔ لیکن ہماری آخری خبر کے مطابق تم لندن کے اسپتال میں تھے، وہاں دھماکے کے بعد گم تھے۔ آج میں یہاں اپنے گھر میں تمہیں دیکھ کر مجھے بہت زیادہ حیرت ہوئی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن تم مجھے طلحہ کیوں کہہ رہے تھے؟''

وہ بولا۔ ''یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ صرف یہ بتادیتا ہوں کہ میری بیٹی کا خاوند تھا، انعم کا۔ اب وہ زندہ نہیں ہے لیکن میرے گھر والوں کو اس بات کا بالکل علم نہیں ہے اور میں نے اپنی بیٹی کی خوشی کے لیے یہ بات چھپا رکھی ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو میں چوہدری کرم کی حویلی میں ہی تمہیں طلحہ سمجھتا تھا اس لیے وہاں تم سے پوچھا گیا تھا۔'' پھر بولا۔ ''حماد! اب کیا خیالات ہیں۔''

میں نے جواب دیا۔ ''خیالات اب تبدیل ہوچکے ہیں۔''

وہ بولا۔ ''کیسے؟''

میں نے کہا۔ ''مطلب یہ کہ واقعی میری یادداشت گم ہوگئی تھی لیکن گزرنے والی رات آپ کے گھر میں مجھے میری تمام یادداشت مل گئی ہے۔ ظاہر ہے اب واپس ملتان جاؤں گا، پھر جیسے حالات ہوئے ویسے گزار لیں گے۔''

وہ بولا۔ ''ویسے ایک بات کہوں، تم بہت اچھے ہو۔'' اور اچانک میرے آگے ہاتھ باندھ دیے۔

(جاری ہے)

گیم

ارم ناز

ارم ناز کے قلم سے، آج کا کریز، آج کی سفاک حقیقت

سیما اپنے شوہر کے بڑے گن گاتی تھی۔ جب بھی محلے کی چار عورتیں مل بیٹھتیں سیما بیگم ہو جاتیں شروع اپنے شوہر نامدار کے گیت گاتے۔

''شہریار تو ہر وقت میری تعریف کرتے رہتے ہیں۔ وہ تو میرے ہاتھ کے بنے کھانے اتنے پسند کرتے ہیں کہ تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ شہریار تو کبھی کچھ باہر نہیں کھاتے جو کچھ بھی پسند آتا ہے گھر لے آتے ہیں پھر ہم مل کر کھاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں سیما تمہارے بغیر میرے حلق سے نوالا نہیں اترتا۔''

باقی خواتین آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے سیما بی بی کی قسمت پر رشک کرتیں۔ سیما کے خاموش ہوتے ہی کوئی دوسری خاتون اپنے شوہر کے گن گانے لگتی غرض یہ کہ سب اپنے شوہر کی بڑھ چڑھ کے تعریفوں کے پل باندھنے میں اگلا دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتیں۔ اس طرح کے ماحول سے میرا دل اکتا جاتا تو میں کوئی بہانہ کر کے اٹھ جاتی۔ خواتین میں بیٹھ کر میں حتی الامکان کوشش کرتی کہ اپنے شوہر کے بارے میں کوئی دعویٰ نہ کروں وجہ یہ تھی کہ سیما کے شوہر کو کئی بار میں چاٹ کے ٹھیلے پر کھڑا چاٹ کھاتے دیکھ چکی تھی بات صرف چاٹ پر ہی ٹھہر جاتی تو ٹھیک تھا مگر آج کل وہ کسی لڑکی کے ساتھ بھی دیکھا جا رہا تھا۔ یہ اطلاع ابھی سیما تک نہ پہنچی تھی اور میں اسے بتا کر شرمندہ بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ ہی وجہ تھی کہ میں خواتین میں بیٹھ کر اپنے شوہر کی تعریفوں میں ہیرے موتی نہیں ٹانکتی تھی۔ مرد ذات کا کیا اعتبار رب جانے باہر کیا معاملات ہوں ویسے بھی میرے شوہر کے آفس میں کافی خواتین تھیں چند ایک کا ذکر تو وہ اکثر کرتے رہتے تھے۔ میں کبھی ان کی باتوں سے نہ چڑتی تھی۔ میرے خیال میں جو عورت چار پانچ سو لوگوں کی موجودگی میں رخصت ہو کر آتی ہے اور پھر بچوں کی ماں بن کر اس کی حیثیت خاندان میں اور شوہر کے دل میں بڑی مضبوط ہوتی ہے۔ اتنے مضبوط ہوتی ہے اتنے مضبوط قدم والی عورت کو کوئی اتنی آسانی سے اکھاڑ نہیں سکتا مگر پھر بھی خواتین میں بیٹھ کر ان کی باتیں سن سن کر میرے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہو گیا تھا کہ میرے شوہر فراز بھی تو کہیں سیما کے شوہر کی طرح کسی کے ساتھ گھوم پھر تو نہیں رہے۔ جس دن سے یہ خیال دماغ میں آیا تھا۔ میں بہت ٹینشن میں تھی۔ عجیب کیفیت تھی۔ جو بیان سے باہر تھی کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ کھانا پینا سونا بس نام کو رہ گیا تھا جتنا اس خیال کو ذہن سے جھٹکتی یہ اتنا ہی زور پکڑتا کئی بار فراز کے موبائل کو چیک کر چکی تھی مگر نتیجہ زیرو تھا۔ اپنے آپ کو مختلف کاموں میں مصروف رکھنے کی کوشش کرتی مگر شک کا ناگ دماغ میں کنڈلی مارے بیٹھ چکا تھا۔

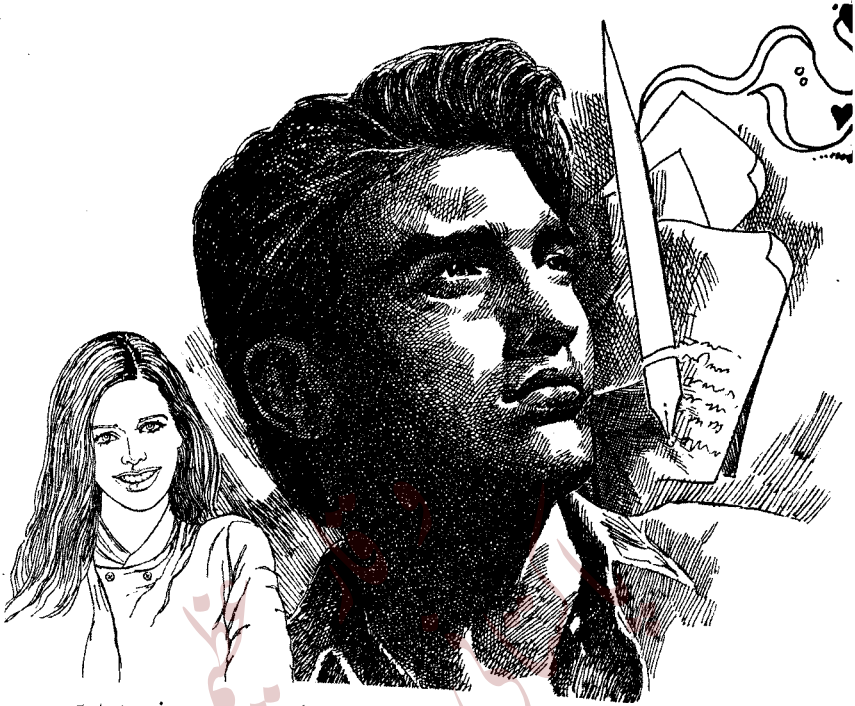

☆.....☆

گھر کے قریب گراؤنڈ میں ایک بچت بازار ہفتے کے ہفتے لگتا تھا۔ میں پورے ہفتے کی سبزی لاکر فریج میں رکھ دیتی تھی، اس طرح پورے ہفتے کھانا پکانا آسان ہو جاتا۔ آج ہفتے کا روز تھا، پڑوس والی بھابی آگئیں۔

''چلو صدف بچت بازار چل رہی ہو۔'' جانا تو ہے ایک سے بھلے دو۔ میں نے کہا۔ ''بھابی آپ بیٹھیں میں چادر اور پرس لے لوں۔''

میں بھابی کے ساتھ بازار آگئی۔ آلو، پیاز، لہسن، ادرک، دھنیا، پودینہ ایک کے بعد ایک لیتی ہوئی آگے بڑھی۔ ایک نوعمر لڑکا کمپنی کی مشہوری کے لیے گول مول باتیں کرتا ہوا موبائل سم بیچ رہا تھا۔ بھابی پچھلے ٹھیلے سے سبزی لینے رک گئیں۔ لڑکے نے مجھ سے کہا۔

''باجی سم خرید لیں، سو روپے کا بیلنس فری ہے۔''

میں مسکرا دی۔

''نہیں مجھے نہیں چاہیے۔''

وہ اصرار کرنے لگا۔ ''باجی لے لیجیے۔ ایک سم بیچنے پر مجھے بیس روپے پروفٹ ملتا ہے۔''

وہیں کھڑے کھڑے میرے دماغ میں کمال آئیڈیا آیا۔ اپنا این آئی سی نمبر مجھے یاد تھا۔ میں نے سم ایکٹویٹ کروا کر خرید لی۔ میں پلٹ کر بھابی کے پاس پہنچ گئی۔ بھابی ابھی ٹماٹر چھانٹنے میں مصروف تھیں۔ شاپنگ تمام ہوئی، میں گھر واپس آگئی۔ سامان ترتیب سے رکھا اور کچھ دیر آرام کرنے لیٹ گئی۔ پورا پلان میرے دماغ میں ریڈی تھا، اب صرف کوئی مناسب وقت دیکھ کر اس پر عمل کرنا تھا۔

☆.....☆

اتوار کا دن کام کاج اور بچوں کے ہلے گلے میں گزر گیا۔ پیر کو میں نے جلدی جلدی گھر کا کام نمٹایا۔ فراز آفس اور بچے اسکول چلے گئے، میرے پاس ایک ایکسٹرا موبائل سیٹ تھا جو کچھ عرصے قبل خراب ہو گیا تھا۔ فراز نے یہ سیٹ ریپیئر کرانے کے بجائے مجھے ایک نیا موبائل سیٹ لا دیا تھا۔ اب یہ خراب موبائل کبھی ٹیبل پر، کبھی کرسی پر، کبھی بیڈ پر پڑا رہتا۔ بچے اس سے کھیلتے تھے۔ میں نے یہ سیٹ اٹھایا اور موبائل مارکیٹ پہنچ گئی جو میرے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر تھی۔ صبح کے ساڑھے دس بجے تھے۔ موبائل مارکیٹ کی اکا

دکانیں ہی کھلی ہوئی تھیں۔ ایک دکان پر میں نے ٹھہر کر کہا۔ ''بھائی یہ موبائل ریپیئر کرانا ہے۔'' اس نے موبائل میرے ہاتھ سے لے کر کھولا۔ چیک کرنے کے بعد کہا۔

''تین سو روپے لگیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔'' میں وہیں رکھے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ بیس منٹ میں اس نے موبائل ٹھیک کر دیا۔ سم ڈال کر چیک بھی کرا دیا۔ میں نے اسے پیسے ادا کیے اور گھر آ گئی۔

☆.....☆

میں نے موبائل میں بچت بازار سے خریدی ہوئی سم ڈالی اور فراز کا نمبر ڈائل کیا۔ دو مس بیل دے کر لائن کاٹ دی۔ چند سیکنڈ بعد فوراً ہی فراز کا فون آ گیا۔ میں نے کال کاٹ کر موبائل سائلنٹ پر لگا دیا اور ایس ایم ایس کیا۔

''کون۔'' فراز کا جواب آیا۔

''آپ نے مس کال دی تھی۔ آپ کون؟''

میں نے جواب دیا۔ ''کرن۔''

فراز کا جواب آیا۔ ''میں کسی کرن کو نہیں جانتا۔''

میں نے جواب دیا۔ ''میں بھی آپ کو نہیں جانتی غلطی سے رونگ کال لگ گئی۔'' فراز کا ایس ایم ایس آیا۔ ''میرا نام فراز ہے اگر آپ چاہیں تو مجھ سے بات کر سکتی ہیں۔''

میں نے جواب دیا۔ ''میرے ابو ریٹائرڈ ہیں۔ ہر وقت گھر میں ہی ہوتے ہیں، اس لیے میں ایس ایم ایس پر بات کر سکتی ہوں، کال پر نہیں۔'' فراز کا جواب دیا۔ ''جیسے آپ چاہیں۔''

میں نے موبائل آف کر کے محفوظ جگہ چھپا دیا اور میں اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔

بچوں کے اسکول سے آنے کا وقت ہو چلا تھا۔ ابھی کھانا پکانا باقی تھا۔ شام کو فراز اپنے ٹائم پر گھر آ گئے۔ میرا رویہ ان کے ساتھ روزمرہ جیسا تھا۔ میں نے اپنے انداز یا اپنی باتوں سے انہیں کوئی پتا نہ دیا۔ میں اس گیم کو کامیابی سے کھیلنا چاہتی تھی۔ اگلی دوپہر پھر یہ ایس ایم ایس والا گیم شروع ہوا۔ میں نے ایس ایم ایس کیا۔

''کیسے ہیں فراز صاحب۔''

جواب آیا ''یہ صاحب کیا ہوتا ہے صرف فراز کہو۔''

میں نے لکھا۔ ''میں تو آپ کو صاحب کہہ کر عزت دے رہی تھی۔''

فراز نے جواب دیا۔ ''عزت بہت ہے محبت کی ضرورت ہے۔'' یہ سن کر میرے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا

کہاں کمی رہ گئی..... میں تو اپنے آپ کو ا... بہترین بیوی سمجھتی آئی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ میں اپنی ... شدہ زندگی میں ناکام تھی۔ آنکھوں میں آنسو آئے تو ... نمک کا سا ذائقہ گھل گیا۔ فراز کا ایس ایم ایس آیا۔

''کرن کہاں کھو گئیں جواب کیوں نہیں ... رہیں۔'' میں نے بہانا تراشا۔

''بیلنس زیرو کے قریب ہے۔ اس لیے یہ آخری میسج سمجھیں۔''

دس منٹ بعد سو روپے کا بیلنس میرے موبائل میں مو... تھا۔ میسجز کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ فراز نے یہ بھی کہا کہ ا... بیلنس ختم ہو جائے تو مجھے بتانا میں ایزی لوڈ کروا دوں گا۔''

مجھے نہیں یاد کہ فراز نے کبھی میرے موبائل پر ایزی لوڈ کروایا ہو۔ وہ مجھے خرچا دے کر گھر بار کی فکر سے آزاد ہو جاتے تھے۔ مہینے کا راشن، بچوں کی فیس، مدرسے کی فیس، کسی کے گھر شادی بیاہ میں جانا ہے تو وہ خرچہ سب میں بخوبی چلاتی تھی بلکہ بچت بھی کرتی تھی۔ کبھی ضرورت کے وقت میں اپنی بچت فراز کے ہاتھ پر نکال کر رکھتی تو فراز کا منہ اور آنکھیں دونوں کھل جاتے۔ ''صدف یار تم بہت کفایت شعار ہو۔ گھر کا خرچ چلانے کے بعد بچت بھی کر لیتی ہو۔ میری خوش قسمتی ہے کہ تم میری شریک زندگی ہو۔''

ایس ایم ایس کا سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ اتوار کے روز بھی میں چھپ چھپا کر دو تین میسج کر دیا کرتی تھی۔ میں نے فراز کا موبائل چیک کیا تھا وہ میسج پڑھتے ہی ڈیلیٹ کر دیا کرتے تھے۔ میرا نمبر انہوں نے صداقت حسین پلمبر کے نام سے لکھا تھا۔ میں میسج کر کے فراز کے پاس آتی اور انہیں میسج لکھنے میں مصروف دیکھ کر پوچھتی۔ ''فراز کیا کر رہے ہیں۔''

وہ بہانہ بناتے۔ ''کچھ نہیں گیم کھیل رہا ہوں۔''

میں مسکرا کر دل ہی دل میں کہتی۔ ''فراز صاحب گیم تو میں کھیل رہی ہوں' ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے اس ایس ایم ایس کے گیم میں فراز کی محبوبہ بن کر میں نے فراز سے وہ الفاظ سنے جو بیوی بن کر کبھی نہ سن سکی۔ شاید مجھے یہ سلسلہ بند کرنا پڑے فراز اب ملنے اور بات کرنے پر بہت اصرار کرنے لگے ہیں مگر خوف ہے کہ یہ ایس ایم ایس کا چٹخارہ انہیں کسی اور در پہ نہ لے جائے۔ بہرحال خواتین کے لیے بہترین آئیڈیا ہے آزمالیں اپنے شریف النفس شوہروں کو۔

☆☆☆

بھنور

شازمہ خان

اُس رات کی حکایت، جس کی صبح کھو گئی تھی

''ملک صاحب! میں آپ کو بار بار بتا چکا ہوں کہ اس سے آپ کو نقصان ہی پہنچے گا مگر آپ سنتے ہی کب ہیں؟ ہم دونوں آپ کے وفادار ہیں، وہ کل آپ کی چھتر چھاؤں میں آیا اور آپ نے اسے سارے کاروبار کا نگران بنا دیا۔ ہم کئی سالوں سے آپ کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں مگر ہمیں آپ نے ایک سائیڈ پر کر دیا ہے۔''

میں نے اپنی ساری گفتگو کا اثر ملک صاحب کے چہرے پر دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ موبائل پر کسی سے اُلجھ رہے تھے کہ ''اپنی کمائی سے آدھا حصہ مجھے بھیج دو۔'' ملک صاحب کے اس جملے پر میں نے غلام کی طرف دیکھا جو حیرانگی سے میری جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ملک صاحب کے منہ سے نکلنے والے جملے نے گہری پریشانی کے تاثرات رقم کر ڈالے تھے۔ نہ مجھے ایسی اُمید تھی اور نہ بدل کو کہ اب ملک صاحب تمام غیر قانونی دھندوں کے بعد خواتین سے بھی آدھا حصہ طلب کر رہے تھے۔

اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ملک صاحب کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''سکندر تم کچھ کہہ رہے تھے؟'' ملک صاحب کے لہجے کی کاٹ کو میں محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔

''تو پھر؟'' انہوں نے ہم دونوں کی طرف اشارتاً انداز میں دیکھا۔

اس بار میں خاموش رہا عبدل نے جھٹ سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ وہ بغیر سوچے سمجھے گولی داغ دیتا ہے۔ وہ تو خیر ہوئی جو پرسوں موٹر سائیکل والا بچ گیا جس کی جیب سے صرف تین سو روپے نکلے تھے اس غصہ میں توکل نے فائر کر دیا وہ تو اس کی خوش قسمتی تھی کہ گولی اس کے قریب سے گزر گئی ورنہ تین سو روپے کی خاطر ایک بے گناہ زندگی گنوا دیتا۔'' عبدل نے پیچ و تاب کھاتے توکل کی شکایت کی۔

''اچھا تم دونوں فکر نہ کرو میں اسے سمجھا دوں گا۔ اب تم جاؤ جا کر آرام کرو اور ہاں توکل سے مت اُلجھنا۔ وہ پڑھا لکھا لڑکا ہے، میں اسے خود سمجھا دوں گا۔'' ملک صاحب نے ہم دونوں کو تاکید کی اور ہم اُٹھ کر ڈیرے کے سائیڈ والے حصہ میں آ گئے جہاں ہمارے لئے کمرے بنائے گئے تھے۔

توکل اپنے کمرے کے باہر پڑی پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھا کوئی رسالہ پڑھ رہا تھا۔ ذرا بھر کو اس نے نظر اُٹھا کر ہماری طرف دیکھا اور دوبارہ پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ میں اور عبدل لاپروائی سے گزر کر اپنے کمرے میں آ گئے۔

کام پر جانے کیلئے ہم دونوں پیر صاحب کے دربار پر جا کر حاضری دیتے اور نیاز بانٹتے تھے، یہ ہمارا عقیدہ تھا۔ توکل کا ذہن کافروں سے ملتا جلتا ہونے کا سبب شائد اس کا پڑھا لکھا ہونا ہو گا۔ وہ درگاہ کے باہر ہی رُک کر ہمارا انتظار کرتا جب ہم دونوں باہر آتے تو وہ زہریلی ہنسی کے درمیان بولتا۔

''رشوت دے آئے بابا جی کو۔''

ملک صاحب کو کئی بار شکایت کر چکے تھے مگر وہ بھی ہنس کر ٹال دیتے تھے۔

☆.....☆

آج کی واردات میں جو پلان تھا وہ کچھ یوں بنا کہ توکل پیچھے سے ویگن میں سوار ہو کر آئے گا۔ صبح فجر کی پہلی ویگن میں جمعہ کو بڑے دوکاندار مال کی خریداری کیلئے فیصل آباد جاتے تھے اور ان کے پاس خاصی رقم ہوتی تھی۔ فیصل آباد کے راستے میں ایک دو جگہ سے سڑک خاصی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی اور ٹریفک کی رفتار قدرے کم ہو جاتی بس یہی موقع ہوتا واردات کرنے کا۔ جس جگہ ویگن لوٹنے کا پروگرام بنا وہ یہی راستہ تھا ہم دونوں کھیتوں میں موٹر سائیکل کھڑے کر کے توکل کے فون کا انتظار کر رہے تھے جس نے ڈرائیور کو پستول کے زور پر اسی مقام پر روکنا تھا جہاں ہم پہلے سے تیار کھڑے تھے۔ ابھی سورج نمودار نہیں ہوا تھا کہ میرے فون کی گھنٹی بجی دوسری طرف توکل نے ہوشیار رہنے کا کہا۔

زیادہ دیر نہ لگی کہ دور سے ویگن کی لائٹیں نظر آئیں سڑک پر اِکا دُکا ٹریفک رواں تھی۔ ہم نے خود کو تیار کر لیا تھا۔ فراٹے بھرتی ویگن یکدم آہستہ ہو گئی پھر سڑک سے اُتر کر سائیڈ میں رُک گئی۔ ہم دونوں نکل کر تیزی سے بھاگتے ویگن کے پاس آ گئے، توکل پستول سے ڈرائیور سمیت ساری ویگن کی سواریوں کو یرغمال بنائے بیٹھا تھا۔ ہمارے پہنچ جانے پر ویگن میں سوار سارے لوگ سہم گئے۔ ہمارے حکم پر ڈرائیور نے ویگن کھیتوں کے اندر جانے والے کچے راستے پر ڈال دی۔ سڑک سے ہمارا فاصلہ خاصا زیادہ ہو گیا تھا توکل اور عبدل سارے مسافروں سے لوٹ مار کر چکے تو میں نے دونوں کو موٹر سائیکلوں کی طرف جانے کا کہتے ویگن کے اگلے ٹائر پر فائر کر کے ٹائر پھاڑ دیا اور خود بھی ان کے پیچھے چل پڑا۔ وہ دونوں موٹر سائیکلیں میرے قریب ہی لے آئے تھے پھر میں عبدل کے پیچھے بیٹھ گیا۔ ویگن کے سارے مسافروں کو جان سے مار دینے کی دھمکی کام کر گئی تھی۔ اس لئے کوئی مزاحمت نہ ہوئی اور ہم ڈکیتی کر کے صحیح سلامت ڈیرے پر پہنچ گئے۔ سارا مال ملک صاحب کے سپرد کرتے اپنے اپنے کمروں میں آ گئے دوپہر کا کھانا اور ناشتا اکٹھا ہی کیا۔

''میرے خیال میں پانچ لاکھ سے اوپر ہی تھا۔'' عبدل نے مجھے مخاطب کرتے اپنا عندیہ دیا۔

''بڑی نظر رکھتا ہے توکل مگر میں نے پھر بھی

ہاتھ مار ہی لیا۔ تیس پینتیس ہوگا میرے پاس'' عبدل نے اپنی بنیان کے اندر پھینکے ہزار ہزار کے نوٹ نکالتے جواب دیا جب گنے تو وہ کل اٹھائیس ہزار ہوئے آدھے آدھے کرنے کے بعد ہم سو گئے۔ رات بھر کے جاگے ہوئے تھے۔

☆.....☆

مجھے اور عبدل کو ایک مقدمہ میں پولیس نے مفرور قرار دیتے وارنٹ گرفتاری نکال رکھے تھے۔ اپنے ہم پیشہ دوستوں کے پاس چھپتے چھپاتے ملک صاحب تک پہنچ گئے۔ تب سے ان کے زیر سایہ پڑے ہوئے تھے۔ جس مقدمہ میں ہم دونوں مفرور تھے وہ لڑائی کا تھا جس میں مخالف پارٹی کے دو بندے فائرنگ میں زخمی ہوگئے تھے اور ہمیں فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ کئی ہفتے ذخیرہ میں روپوش رہے پھر اِدھر اُدھر ہاتھ مار کے ملک صاحب تک رسائی ہوگئی۔

لوٹ مار کے مال سے جو بچا لیتے وہی ہمارا حصہ ہو تا ورنہ سب کچھ ہمیں پناہ دینے کی مَد میں ملک صاحب ہڑپ کر جاتے۔ ان کے ڈیرہ پر پولیس کی رسائی نہیں تھی کیونکہ ان کی ساکھ سیاسی طور پر بھی مضبوط تھی۔ توکل کو بھی کسی سیاسی وڈیرے نے ان کے پاس بھجوا رکھا تھا۔ جب سے وہ یہاں آیا تھا اس سے ہماری نہیں بنی تھی۔

ڈیرے کے کامے رمضان نے ہمیں اطلاع دی کہ ملک صاحب نے بلایا ہے۔ جب ہم ان کے کمرے میں پہنچے تو وہاں پہلے سے توکل موجود تھا۔

''آؤ بیٹھو!'' ملک صاحب نے بات ادھوری چھوڑتے ہمیں بیٹھنے کو کہا ہم دونوں بھی قریب بیٹھ گئے۔

''سکندر تم دونوں کو پولیس تلاش کرتے کرتے یہاں پہنچ گئی ہے۔ تمہیں کچھ دِنوں کیلئے یہاں سے جانا ہوگا، توکل کو میں آگے کسی دوست کے پاس بھیج رہا ہوں''۔ ملک صاحب نے جیب سے کچھ رقم نکال کر میری طرف بڑھاتے مجھے مخاطب کیا۔

میں نے وہ روپے پکڑ کر عبدل کی طرف بڑھا دیئے اور نظریں نیچی کرتے ملک صاحب کے اگلے حکم کو سننے کیلئے تیار ہوگیا۔ پھر ان کی آواز نے خاموشی توڑی۔

''اگر تم دونوں اپنی مرضی سے کہیں جانا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں تمہیں بھی ایک دوست کے سپرد کر دیتا ہوں''۔

میرے جواب دینے سے پہلے عبدل بول پڑا'' ملک صاحب اس کی ضرورت نہیں ہم خود ہی اپنا بندوبست کرلیں گے''۔

''تو پھر ٹھیک ہے اس سے پہلے کہ پولیس ڈیرے تک پہنچے تم تینوں آج رات کو ہی یہاں سے اِدھر اُدھر ہو جاؤ''۔

''جی بہتر ملک صاحب!'' میں اُٹھ کر کھڑا ہوگیا میرے ساتھ ہی عبدل بھی ان کے کمرے سے نکل کر باہر کی طرف چل پڑا۔

☆.....☆

رات کو تھوڑا بہت سامان ہم دونوں نے پیک کیا اور اپنے اپنے ریوالور سنبھالتے ہم آگے بڑھ گئے۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کچھ دن فوراً یل کے علاقہ میں رُکیں گے اور پھر کوئی اگلا پروگرام سوچنا ہوگا۔

جب ملک صاحب کے ایریا کو کافی پیچھے چھوڑ دیا تو ہمیں محسوس ہوا کہ جیسے بہت ساری آنکھیں ہمارے تعاقب میں ہیں۔ عبدل کے بتانے پر میرا شک یقین میں بدل گیا۔ مجھے بھی ایک آدھ بار یہی لگا۔

دریا کی طرف اُترنے والی گھاٹی ابھی ہم نے اُتری ہی نہیں تھی کہ چاروں جانب سے پولیس ہتھیار سنبھالے سامنے آگئی۔

عبدل نے یکدم فائر کھول دیا میں تیزی سے زمین پر لیٹ گیا مگر چاروں جانب سے آنے والی گولیاں عبدل کے جسم کو چیرتی ہوئی گزر گئیں۔ میں یونہی بے حس و حرکت زمین پر اوندھے منہ پڑا ہوا تھا میرے بازو پیچھے سے جکڑتے مجھے گرفتار کرلیا گیا۔ عبدل کی لاش کو اُٹھا کر پولیس والوں نے بے دردی سے وین میں پھینکتے مجھے اپنی تحویل میں لے لیا۔

یہ بتا کر سکندر خاموش ہوگیا۔

☆☆☆

بس محبت چاہیے

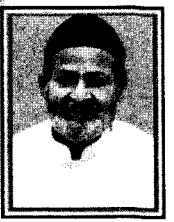

سید ابو محمد آزاد

اُس معصوم بچی کی داستان، جسے زندگی میں کبھی پیار نہ ملا تھا مگر.....

سیدہ خورشید شاہ کی چھوٹی بیٹی زلیخا ذہنی معذور تھی۔ کسی حد تک باتوں کو سمجھ سکتی تھی مگر باتیں کر نہیں سکتی تھی۔ ذہنی طور پر بھی کم زور تھی وہ جب جوان ہوئی تو شاہ صاحب کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ بہت مشکل سے ایک لڑکا ملا وہ دونوں ٹانگوں سے معذور تھا۔ انہوں نے اپنی بیٹی زلیخا کی شادی اس سے کر دی۔ انہیں یقین تھا کہ ان کی لڑکی کا نباہ ہو جائے گا کیونکہ لڑکا بھی دونوں ٹانگوں سے معذور تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ایک سال میں ہی ان کی لڑکی کی علیحدگی ہوگئی۔ وہ اپنے گھر آ بیٹھی اس دوران وہ حاملہ تھی۔ بعد میں اس نے ایک بچی کو جنم دیا جس کا نام گھر والوں نے حفصہ رکھا۔

☆.....☆

حفصہ نانا اور نانی دونوں کی بہت لاڈلی تھی۔ وقت کا پہیہ چلتا رہا اور حفصہ چودہ سال کی ہوگئی۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا تھا اکثر اپنی کلاس میں اول آتی تھی۔ اس کو تعریفی اسناد اور شیلڈ بھی ملے۔ اس کی ہمت افزائی کے لیے نانا نانی شاباشی اور انعام بھی دیتے تھے۔ اس طرح اس کے دیگر رشتہ دار بھی ہمت افزائی کے لیے انعام دیتے۔ اس کے باوجود حفصہ خوش نظر نہیں آتی تھی اکثر یہ کھوئی کھوئی اداس سی معلوم ہوتی تھی۔ وجہ جاننے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ اس کے ماں باپ کی ایک دوسرے سے علیحدگی ہوگئی تھی۔ وہ پیار جو اس کو ملنا چاہیے تھا وہ نہیں ملا تھا۔ ماں بات چیت کرنے سے معذور ذہنی مریضہ تھی۔ باپ کی شفقت سے محروم تھی۔ حقیقت میں یہ لڑکی پیار کی پیاسی تھی۔ اس کا دل بہلانے کے لیے گھر میں کوئی ہم عمر بچی نہیں تھی۔ نتیجتاً وہ تنہائی محسوس کرتی تھی۔ رشتہ دار تو تھے مگر کس کو غرض پڑی تھی جو اس کی دل جوئی کرتا۔ سب اسٹنڈرڈ کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ اس دور میں برابری کی برادری ہے۔ لوگ یتیموں، بیواؤں کے سر پر ہاتھ رکھنے سے گریزاں ہیں۔ شاہ صاحب کو ان کی اولاد اپنے ساتھ رکھنے کے لیے تیار تھی مگر متذکرہ ان کی بیٹی زلیخا اور نواسی حفصہ کو نہیں۔ وہ سب ان دونوں کی ذمہ داری اٹھانے سے گریزاں تھے۔ نانا ان دونوں کو منجھدار میں کس طرح چھوڑ سکتے تھے۔ لہٰذا دونوں ٹانگوں سے معذور اور اپنی ضعیف العمری کے باوجود اپنی بیٹی اور نواسی کا بوجھ اٹھانا گوارہ کیا مگر

تنہا اولاد کے ساتھ رہنے سے اجتناب کرتے۔ کچھ ایسی مجبوری لاحق ہوگئی کہ اپنے مکان کو بیچ کر فلیٹ خریدنا پڑا۔ فلیٹ کی رہائش ان کے لیے نئی تھی۔ یہاں کے ماحول اور طرز زندگی سے یہ رفتہ رفتہ آشنا ہوگئے۔ یہاں مشرق کی تہذیب غائب مغرب کی تہذیب غالب تھی۔ آٹھ سے چودہ سال کی عمر کی بچیاں تقریباً فلیٹ کے احاطے میں سائیکلیں اور ناگوں میں جوتا نما پہیہ چلاتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ لوڈ شیڈنگ کے دوران یعنی سات بجے شام سے دس بجے تک یہ بچیاں فلیٹوں کے درمیان کے اسپیس میں کھیل کے نام پر خوب ادھم بازی کرتیں۔ پتا نہیں اس دوران جوان نسل لڑکے ان سے چشم پوشی کرتے ہیں کہ نہیں۔

مذکورہ حالات سے شاہ صاحب اور ان کی بیگم بہت بیزار نظر آتے تھے۔ ان کو یہاں آئے ہوئے ابھی چند ایک ماہ ہوئے تھے کہ ان کی نواسی حفصہ کا قریب کے اسکول میں داخلہ ہوگیا۔ اس کے لیے بھی اسکول کا ماحول نیا تھا۔ زلیخا کے لیے بہت پرابلم یہ تھی کہ وہ بے چاری قوت گویائی سے محروم تھی۔

حفصہ کی دوستی ایک ہم کلاس طالبہ نیلوفر سے ہوگئی۔ وہ اور حفصہ ایک ہی اپارٹمنٹ میں رہتی تھیں۔ دونوں ایک ساتھ اسکول جاتیں۔ رفتہ رفتہ ایک دوسرے کے گھر والوں سے مراسم پیدا ہوگئے۔ نیلوفر کی والدہ گلناز بیگم، بیگم معصومہ سے ملنے آئیں اور یہ ایک اچھی پڑوسن بن گئیں۔ دونوں گھر کے لوگ ایک دوسرے کے یہاں آنے جانے لگے۔ بیگم معصومہ کی بچیوں کو کمپنی چاہیے تھی سو مل گئی۔ حفصہ کے گھر میں اس کی کوئی ہم عمر نہیں تھا۔ ماں ذہنی معذور تھی وہ شدت سے تنہائی محسوس کرتی۔ باپ کی شفقت و پیار

سے محروم تھی۔ اس کے ماں باپ کی ایک دوسرے سے علیحدگی تھی۔ گلنار بیگم کے سلوک سے اس کو ماں جیسی انسیت محسوس ہوئی۔ بیگم گلنار کا گھر چار افراد تھے۔ حفصہ اور اس کی امی زلیخا اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے اکثر و بیشتر ان کے گھر چلی جاتیں۔

☆.....☆

رات 12 بجے یک بیک زلیخا نے اپنے والد کو پکارا۔ شاہ صاحب نے پریشانی کے عالم میں اس سے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے۔''

واش روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ ''اندر سے دروازہ بند ہے اور امی بے ہوش گری ہوئی ہیں۔''

یہ سن کر وہ حواس باختہ ہو گئے اور سب مل کر دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگے۔ دروازہ کھولا تو بیگم معصومہ کو اندر بے ہوش پایا۔ شاہ صاحب نے اپنی بیگم کو قریب کے اسپتال بھجوا دیا۔ اس دوران رشتہ داروں کو مطلع کر دیا گیا۔ خبر ملتے ہی ان کے چھوٹے بیٹے فیض علی اپنی بیگم کے ساتھ آئے اور متعلقہ اسپتال اپنی والدہ کے پاس جا پہنچے۔ ان کی حالت اس قدر خراب تھی کہ مشکل سے ہل پارک اسپتال میں داخلہ ہوا۔ شاہ صاحب کے دوسرے بیٹے فیض الرحمٰن (جو اسلام آباد میں ملازمت کرتے تھے) اپنی والدہ کی حالت سے پل پل اپنے والد کو آگاہ کرتے رہے۔ ڈاکٹر کی تشخیص کے مطابق بیگم معصومہ برین ہیمرج اور فالج کے حملے کا شکار ہوئی تھیں۔

ان کا علاج اچھے سے اچھے ڈاکٹروں سے کرایا جا رہا تھا۔ علاج طویل اور بہت مہنگا تھا۔ ان کے علاج کے اخراجات کے لیے بیٹوں کے علاوہ ان کے میکے والے بھی بہت تعاون کر رہے تھے لیکن فیض الرحمٰن اور ان کی بیگم کے کیا کہنے وہ اپنی جان و مال ہر طرح سے اپنی والدہ کی خدمت کر رہے تھے۔ کچھ پل ملنے کے بعد وہ اسپتال سے اپنی والدہ کو اپنے والد کے فلیٹ میں لے آئے۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے ایک ماسی مقرر کر دی۔ وہ دن بھر میں دو مرتبہ ان کی صفائی ستھرائی کرتی۔

سید خورشید شاہ اپنی بیگم کو صاحب فراش پا کر [illegible] سے بالکل ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ اس ضعیفی عمری [illegible] اتنا بڑا صدمہ! بس اللہ ہی قوت برداشت عطا کر [illegible] یہ ایک عجیب سا منظر تھا کہ ان کے سامنے ان کی رفیق حیات منہ سے کچھ نہیں بول رہی تھیں۔ ان کے لیے یقین کی امید ہی ایک سہارا تھی کہ بیگم معصومہ انشاء اللہ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گی۔

جب سے بیگم معصومہ فلیٹ میں آئی تھیں تب سے انہوں نے خود کو ان کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ صبح ناشتا اور دوپہر رات میں کھانا کھلانے کے بعد دوائیاں دینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ان کی پوتی ڈاکٹر فصیحہ اپنے دادا کی خدمت کرتی اور دادی کے متعلق کہتی۔ ''دادا ابو آپ نے جو دو سال تک دادی امی کی خدمت کی ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔''

☆.....☆

اور پھر ایک رات جب چاند بادل میں چھپ گیا تھا۔ چپکے سے رات کی تاریکی میں بغیر قدموں کے آہٹ کے بیگم معصومہ شاہ صاحب کو چھوڑ کر دنیا فانی سے کوچ فرما گئیں۔ سید خورشید شاہ کی زندگی بے کیف اور بے مقصد ہو کر رہ گئی۔ عمر کے اس حصے میں رفیق حیات کا جدا ہو جانا ایک المیہ سے کم نہیں۔ امی جان کو یہ کس طرح سنبھالا دیں گے۔ ان دو بچیوں کا یعنی زلیخا اور حفصہ کا کیا بنے گا۔ ان کے اردگرد مسائل کے پہاڑ کھڑے ہیں لیکن یقیناً اللہ ان کو ان مسائل سے نکال دے گا۔

سوگواری کی فضا جب کچھ تحلیل ہوئی تو شاہ صاحب نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ حفصہ کا داخلہ ہوسٹل میں کرا دیا تاکہ اس کی تنہائی دور ہو۔ کوشش کے بعد فلیٹ بیچ کر اپنی بیٹی زلیخا کے ساتھ چھوٹے بیٹے کے یہاں چلے گئے۔

☆.....☆

حفصہ کے لیے ہوسٹل کی زندگی نئی تھی۔ ہوسٹل اچھا خاصہ بڑا تھا۔ اس کے ہر کمرے میں [illegible] بیڈ، ہر کمرے میں چھ سے آٹھ طالبہ کی گنجائش تھی۔ [illegible] زانہ رات میں ثمینہ نام کی وارڈن طالبہ کو چیک [illegible] نے آتی۔ ان کے ہاتھوں میں ایک رول ہوتا [illegible] کے

رول زمین پر پٹخنے کی آواز سے سب سمجھ جاتیں کہ مس ثمینہ آرہی ہیں۔

حفصہ کے لیے ہوسٹل نئی جگہ تھی۔ اس کو دیکھنے کے لیے وہ اکثر عمارت کے کوریڈور کی طرف چلی گئی۔

ایک رات اس نے دیکھا کہ بالائی منزل کی طرف جانے والی سیڑھیوں میں ایک پیاری سی کتیا لیٹی ہوئی ہے وہ کچھ دیر کے لیے کتیا کے پاس گئی۔ اس کو انجانی سی حسرت محسوس ہوئی۔ وہ اکثر اپنے بچے ہوئے کھانے کو اسے کھلاتی اور اس کے جسم کو تھپتھپاتی۔ کتیا بھی اپنے ٹانگوں سے اس سے چھیڑ چھاڑ کرتی۔ رفتہ رفتہ دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہوگئیں۔ دونوں پیار کی پیاسی تھیں۔

ایک رات ثمینہ وارڈن بچیوں کو چیک کرنے روم میں آئیں حفصہ کو اپنے کمرے میں نہ پاکر بہت پریشان ہوئیں۔ پریشانی کے عالم میں پوری عمارت کو چھان مارا بالآخر عمارت کی سیڑھیوں کے نیچے حفصہ کو کتیا کے پاس سوئے ہوئے پایا۔ ایک ہاتھ سے حفصہ کو کھینچا اور دوسرے ہاتھ کے رول سے کتیا کے سر پر اس قدر زور سے مارا کہ کتیا دردناک چیخ کے ساتھ ڈھیر ہوگئی۔ کتیا کی دردناک موت کا حفصہ کے دل دماغ پر بہت اثر ہوا۔

رات بھر نیم بے ہوشی کے عالم میں حفصہ مبتلا رہی اور اسے بخار ہوگیا۔ ہوسٹل کے انتظامیہ کی طرف سے ڈاکٹر نے علاج شروع کیا اور حفصہ کی بیماری کے متعلق اس کے سرپرست کو آگاہ کردیا گیا۔ اس کی امی اور نانا اسے دیکھنے آئے۔ اس کی حالت دیکھ کر وہ بہت پریشان ہوئے۔ شاہ صاحب اسے اپنے گھر لے جانا چاہتے تھے مگر ان کا گھر چھوٹا ہونے کی وجہ سے وہ ایسا نہ کرسکے۔ ہوسٹل کی انتظامیہ کی اجازت سے حفصہ کے دیکھ بھال کے لیے اس کی امی زلیخا وہیں رہنے لگیں۔ حفصہ کا مرض روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ بخار اور نیم بے ہوشی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھانے کے بعد مرض کی تشخیص کے لیے ڈاکٹروں کا بورڈ بٹھایا گیا پھر بھی مرض کی تشخیص نہیں ہوئی۔ روز بروز اس کی حالت خراب ہوتی چلی گئی۔ کہتے ہیں مارنے والے سے بچانے والے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ حفصہ کی بیماری کی وجہ سے اس کے نانا سید خورشید شاہ بہت سوچ وفکر میں مبتلا تھے۔ انہیں سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ حفصہ کی صحت یابی کے لیے کیا کریں۔ اچانک ان کے ذہن میں بات آئی کہ کیوں نہ اسے ڈاکٹر منہاج ماہر نفسیات کو دکھایا جائے۔ ہوسکتا ہے اللہ ان کی صلاح سے اسے صحت یاب فرمائیں۔ اس کی امی زلیخا ذہنی مریضہ تھیں اور وہ مذکورہ ڈاکٹر کے زیر علاج تھیں۔ ڈاکٹر منہاج کو حفصہ اور کتیا کے متعلق شروع سے آخر تک کی ہسٹری بتادی گئی۔ انہوں نے بنفس نفیس حفصہ کا معائنہ کیا۔ چند دنوں میں اللہ کی مرضی سے ان کی دواؤں سے حفصہ صحت یاب ہوگئی۔ مرض کے متعلق ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا۔ نفسیاتی مرض میں یہ بچی مبتلا تھی۔ یہ اور کتیا دونوں کو پیار چاہیے تھا۔ کتیا بوڑھی ہوجانے کی وجہ سے کسی کی منظور نظر نہ تھی۔ دوسری طرف حفصہ کو اپنے والدین کی طرف سے کوئی پیار ومحبت نہ ملا جو وہ چاہتی ہے۔ حسن اتفاق بلکہ یہ کہیے کہ حاثاتی طور پر کتیا کو پیار کرنے والی حفصہ مل گئی اور حفصہ کو کتیا۔ پیار میں دونوں ایک جان دو قالب بن گئے۔ اس رات جب حفصہ کتیا کے پاس بیٹھے بیٹھے سوگئی اور مس ثمینہ وارڈن اس کی تلاش میں ادھر آئیں تو اسے کتیا کے پاس دیکھا تو وہ اپنے غصے کو کنٹرول نہ کرسکیں جو رول ان کے ہاتھوں میں تھا اس سے اس کتیا کو اس زور میں مارا کہ وہ کربناک آواز کے ساتھ ڈھیر ہوگئی۔ اس منظر کا حفصہ کے دل دماغ پر بہت برا اثر پڑا۔

سید خورشید شاہ اپنی نواسی حفصہ کو صحت یاب پاکر اللہ کے حضور سجدہ سجود ہوگئے۔ حفصہ کی تنہائی دور کرنے کے لیے اس کے لیے لڑکے کی تلاش شروع کردی۔ جلد ہی انہیں اچھے خاندان کا تعلیم یافتہ ایک لڑکا مل گیا اس سے حفصہ کی شادی کردی۔ وقت کا پہیہ چلتا گیا اور اب حفصہ ایک لڑکے کی ماں اور پیار کرنے والے شوہر کی بیوی ہے۔

☆☆☆

رب کا انصاف

ماریہ یاسر

ظالم ظلم کرتے وقت ہمیشہ خدا کو بھول جاتا ہے، اِک حکایتِ عبرت

احسان اپنی بیوی نادرہ اور تین بیٹوں رضوان، کامران، صفدر کے ساتھ پہاڑوں پر بنے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا تھا۔ تینوں بچے برسرِ روزگار تھے اسی لیے گزر بسر اچھی ہو رہی تھی۔ بڑا بیٹا رضوان پہاڑوں کو کاٹ کے سڑک بنانے کا کام کرتا تھا جب کہ دونوں چھوٹے بیٹے پمپ پر ملازمت کرتے تھے۔ رضوان شادی کی عمر کو پہنچا تو نادرہ پاس کے گاؤں سے کم عمر اور سیدھی سادی نادیہ کو بیاہ کر لے آئی۔ شروع کے دنوں میں سب ٹھیک ہی رہا۔ پھر آہستہ آہستہ نادرہ روایتی ساس بننے لگی۔

''اٹھ یہاں سے چل کے میرے ساتھ کام کر، میں تجھے آرام کروانے کو نہیں بیاہ کے لائی جو یوں سارا سارا دن تُو پلنگ توڑتی رہتی ہے۔''

شادی کو چوتھا دن تھا۔ 15 سالہ نادیہ مہندی لگی ہتھیلیوں میں جانے کیا کھوج رہی تھی جب وہ دہاڑتی ہوئی آئی تھی۔ نادیہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ساس کا رویہ یوں بھی بدل سکتا ہے۔ وہ کانپتی ہوئی اس کے پیچھے ہولی۔ پھر اس کے بعد سے اس نے بھرپور کوشش کی کہ اپنی ساس کو شکایت کا کوئی موقع نہ دے۔ سارا سارا دن جانوروں کی طرح کام میں جتی رہتی لیکن پھر بھی نادرہ کا غصہ کم نہ ہوتا۔ رضوان بھی ماں کی سنتا۔ نادرہ کو نہ جانے کس بات کا غصہ تھا جو دن بدن بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اس کی شکایتوں میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ جو صبح سے رات تک کاموں میں لگی رہتی شام ہوتے ہی ڈر کے مارے کانپنے لگتی۔ کیونکہ بیٹے کے آتے ہی ساس جھوٹی سچی اس کی ایسی شکایتیں لگاتی جس پر رضوان آگ بگولہ ہو کے اس کی ایسی خبر لیتا کہ جس کے نشان کتنے دن تک اپنی داستان سناتے رہتے۔

ایسے ہی بے کیف دنوں میں اس نے پہلی بچی کو جنم دیا۔ اس کے بعد اسے جینے کے لیے وجہ مل گئی۔ چپ چاپ تو پہلے بھی وہ سہتی آ رہی تھی اب اس کی طبیعت میں ٹھہراؤ آ گیا۔ اس کی توجہ کا محور اس کی ننھی سی بچی بن گئی جس کا نام اس نے بڑے چاؤ سے فاریہ رکھا۔

''اتنے مہینوں میں بھی تجھے روٹی پکانی نہیں آئی۔ پتا نہیں کیا چیز ہے تو۔ چل جا کے مجھے دوسری روٹی لا کے دے۔'' وہ جو ساس کے سامنے کھانا رکھ کے

مڑنے لگی تھی۔ چپ چاپ روٹی کی ٹرے اٹھا کر کچن کی جانب چل پڑی۔

''توبہ توبہ چالاکی تو دیکھو کیسے کوٹ کوٹ کے بھری ہے۔ نیک بی بی بنتی پھرتی ہے۔ میں بول بول کے تھک جاؤں گی لیکن یہ زبان نہیں کھولے گی۔ منحوس ماری، جلی روٹی لا کے سامنے رکھ دی جیسے بڑا احسان کر رہی ہے۔'' وہ مارے غصے کے اس کی اچھائی کو بھی برائی کا رنگ دینے لگی۔

☆.....☆

شادی کا چوتھا سال شروع ہوا جب اس نے دوسری بیٹی کو جنم دیا۔ اب کے ساس نے لڑکیوں کے طعنے دینا شروع کر دیے۔ یہ وہ واحد بات تھی جس پر اسے بہت غصہ آتا۔ اپنی بیٹیوں کے خلاف وہ کوئی بات نہ سن پاتی تھی۔ پھر بھی وہ چپ رہنے کی کوشش کرتی۔ جانتی تھی شوہر بھی ساس کے ساتھ ہے اس لیے منہ کھولنا بے کار ہے۔ میکے میں بوڑھے ماں باپ کو کچھ بھی بتا کر پریشان نہ کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے سب خاموشی سے سہتی چلی آ رہی تھی۔ پھر ماں کی نصیحت بھی یاد تھی جو اس کی رخصتی پر کی تھی کہ ''بیٹی شادی ہو کے جا رہی ہو اب سے وہ ہی تمہارا اصلی گھر ہے۔ نیک لڑکیاں وہی ہوتی ہیں جو ڈولی میں سسرال جائیں اور مر کے ہی وہاں سے نکلیں۔''

اس بدنصیب ماں کو کیا معلوم تھا کہ جو وہ کہہ رہی ہے وہ سچ ہو جائے گا۔ اس کی بیٹی اپنی ماں کے کہے کا لاج رکھے گی اگر اسے یہ معلوم ہو جاتا تو وہ یہ سب کہنے کا کبھی سوچتی بھی نا۔

☆.....☆

وہ بھی ایک عام سا دن تھا۔ سورج مشرق سے نکلا اور مغرب میں ہی غروب ہوا۔ وہ صبح اٹھی تو تیز بخار میں پھنک رہی تھی۔ دونوں بچیاں ابھی تک سو رہی تھیں۔ اس کی ناشتا بنانے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ دو بار اٹھنے کی ناکام کوشش کی پھر چپ کیے پڑی رہی۔ نادرہ نے خوب آوازیں لگائیں پھر اس کے سر پر پہنچ گئی۔

''کیا بات ہے مہارانی! آج چائے ناشتا نہیں ملے گا کیا۔ کب سے تیرا گھر والا ناشتہ ناشتہ کر رہا ہے لیکن تو کان بند کر کے یہاں پڑی ہے۔ چل اٹھ جلدی اور جا کے ناشتہ تیار کر۔'' اس نے سنگدلی سے کہا۔

''امی مجھے بڑا تیز بخار ہے۔ اٹھا نہیں جا رہا۔ دو تین بار اٹھنے کی کوشش کی لیکن ذرا بھی ہمت نہیں

ہو رہی۔'' نقاہت اس کی آواز سے بھی واضح محسوس کی جاسکتی تھی لیکن نادرہ جیسے پتھر دل انسان کے محسوس کرنے کی بات نہ تھی۔

''زیادہ ڈرامے نہ کر۔ جیسے مجھ پر احسان کر رہی ہو۔ بڑی آئی بیمار۔ جلدی سے اٹھ جا۔ ورنہ مجھے اور طریقے بھی آتے ہیں کام کروانے کے۔''

سنگدلی کی تمام حدود پار کرتے اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ اس کی لال بیمار آنکھوں میں کتنی التجا تھی۔ شور سے دونوں بچیاں بھی اٹھ کے رونے لگ گئیں۔

''ایک تو ماں کے ڈرامے ختم نہیں ہوتے، اوپر سے یہ چڑیلیں اپنا راگ شروع کر دیتی ہیں۔'' اس نے غصے کے مارے بچیوں کو دو تھپڑ لگا دیے۔

نادیہ کانپ اٹھی اور بچیوں کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ شور کی آواز سے نادرہ کے بیٹے اور شوہر بھی آ گئے اور نادیہ کو ملامت کرنے لگے۔ مجبوراً اسے اٹھنا ہی پڑا۔ بڑی مشکلوں سے ناشتا بنا کے سب کو دیا پھر کمرے میں آ کے الماری سے بخار کی دوا ڈھونڈنے لگی جو نہ جانے کب کی پڑی تھی خالی پیٹ ہی پانی سے نگل کے بھوکی بچیوں کے پاس ہی لیٹ گئی۔ پھر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگی اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ حتیٰ کہ بھوکی بچیوں سے بھی غافل ہو کے وہ نیند کی وادی میں اتر گئی۔

☆.....☆

اسے مدہوشی میں پڑے پڑے کافی وقت گزر چکا تھا جب مجبوراً اٹھنا ہی پڑا۔ کچھ دیر تو اسے کچھ سمجھ ہی نہ آیا۔ اس کے بال نادرہ نے خوب مضبوطی سے پکڑ رکھے تھے۔ ساتھ ہی زبان بھی روانی سے چل رہی تھی۔ سمجھنے کی کوشش میں کبھی وہ اسے اور کبھی اپنی اولاد کی طرف دیکھتی جو زمین پر بیٹھی رو رہی تھیں۔ اس کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

''اِدھر اُدھر کیا دیکھ رہی ہے۔ سارا سارا دن یہاں پڑی آرام کرتی رہتی ہے لیکن اب اور نہیں میں بھی دیکھتی ہوں اب تو کام کیسے نہیں کرتی۔ چل دفع ہو اور رات کی روٹی کا بندوبست کر۔ بڈھا حرام تجھے ذرا احساس نہیں کہ ساس صبح کی لگی ہے۔ تجھے کیا، تیری بلا سے دن کو بھی میں اکیلی کرتی رہی لیکن تُو تو اب بھی اٹھنے کو تیار نہیں۔ ایسی بھی کیا موت پڑ گئی ہے۔'' جتنی تیزی سے اس کی زبان چل رہی تھی اس زیادہ اس کا ہاتھ۔

نادیہ کا ذہن اب مکمل طور پر بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے بال ساس سے چھڑانے چاہے۔

''امی میری ذرا ہمت نہیں ہو رہی، آج آپ کر لیں۔'' جانے اتنی ہمت اس میں کہاں سے آ گئی۔ پچھلے چار سالوں میں اس نے کبھی اف تک نہ کہا اور آج تو حد ہی ہو گئی کہ اس نے نادرہ کے منہ پر صاف انکار کر دیا۔ نادرہ سے یہ بات برداشت نہ ہو رہی تھی۔

''میرے آگے زبان چلاتی ہے۔ ٹھہر رک میں تجھے ابھی بتاتی ہوں۔'' اس کا خون کھولنے لگا۔ وہ باہر صحن میں کچھ ڈھونڈنے لگی۔ نادیہ خوف سے کانپنے لگی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ کہیں چھپ جائے لیکن ایسا بھلا کہاں ممکن تھا۔

نادرہ جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں خوب موٹا سا ڈنڈا دیکھ کے نادیہ سسر کے کمرے میں بھاگ گئی۔ ''ابو مجھے بچا لیں، دیکھیں امی مجھے مارنے آ رہی ہیں۔ آپ انہیں سمجھائیں ناں مجھے معاف کر دیں۔ میں سارا کام کروں گی لیکن وہ مجھے معاف کر دیں۔'' وہ سسر کے پیروں میں بیٹھی منتیں کر رہی تھی۔

''میں کیا کہوں یہ تیرا اور تیری ساس کا مسئلہ ہے تُو جان اور وہ۔'' احسان نے بے حسی سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا یہ دیکھے بغیر کہ نادیہ کے آنسو زمین میں جذب ہو رہے تھے۔ اسی وقت نادرہ نے اندر آ کے پوری قوت سے ڈنڈا اس کے سر پر دے مارا۔ وار اتنا کاری تھا کہ وہ گرتے ہی الٹی کرنے لگی۔ نادرہ کے سر پر بھوت سوار تھا۔ دوبارہ وار کیا۔ اب وہ بے ہوش ہو گئی۔

''مجھ سے زبان چلاتی ہے۔ اب آیا مزہ۔'' وہ واپس مڑی۔ بہو کو اسی حالت میں پڑے کافی دیر ہو گئی جب احسان کو خوف نے گھیر لیا۔

''دیکھ جا کے کہیں مر مرا تو نہیں گئی۔''

''مر جائے میری بلا سے۔'' اس نے بول تو دیا

لیکن دل میں خوف نے ڈیرا ڈال دیا۔ اتنے میں رضوان بھی آ گیا۔

اب اس نے اپنی مظلومت اور بہو کی زبان درازی کے وہ قصے سنائے کہ اسے بھی ماں کا یہ قدم جائز لگا۔

''بیٹا دیکھ ذرا کہیں مر تو نہیں گئی۔'' اب نادرہ کو صحیح معنوں میں خوف نے گھیر لیا۔

''مرنے دے اماں ہے ہی اسی قابل۔'' کہتے ہوئے وہ نادیہ کے پاس چلا آیا جہاں دونوں بچیاں ماں کے پاس بیٹھی رو رہی تھیں۔

''اماں اس کا سانس رک رک کے چل رہا ہے۔''

بیٹے کی بات پر دونوں میاں بیوی کے اوسان خطا ہو گئے۔ رات کی تاریکی بڑھ رہی تھی جب انہوں نے مل کے ایک منصوبہ بنایا۔ سفاک منصوبہ۔ 12 بجتے ہی انہوں نے بے ہوش نادیہ کو بوری میں بند کیا اور دور لے جا کے پہاڑیوں کے اس پار پھینک آئے کہ صبح تک اس کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ اس کو وہاں پھینک کے تیل چھڑک کے آگ لگا دی تا کہ شناخت ہی نہ ہو سکے لیکن اللہ کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا۔

بارشوں کے دن تھے۔ وہ ظالم آگ لگا کے تھوڑا آگے ہی پہنچے کہ بارش نے سب طرف جل تھل کر ڈالا۔ ٹھنڈک ایسی کہ بندے کے دانت بجنے لگتے۔ ایسی شدید سردی میں بھی اس کی نبض چل رہی تھی۔ خواہ آہستہ ہی سہی۔ ایسے موسم میں وہ بے سروسامان تین دن اور تین راتیں۔ پہاڑوں میں پڑی رہی۔ نادرہ اور بیٹوں نے سمجھا کہ اس کا نام و نشان مٹا آئے۔ دوسری طرف یہ خبر پھیلا دی کہ ساس سے جھگڑ کر گھر سے بھاگ گئی۔ اس کے ماں باپ بے چارے سخت پریشان تھے کہ آخر بیٹی کو ڈھونڈیں کہاں۔ پولیس کی مدد لی گئی لیکن اسے نہ ملنا تھا نہ ملی۔

نادرہ نے بہو کے کردار پر خوب ہی کیچڑ اچھالا۔ جانے کس آشنا کے ساتھ بھاگ گئی۔ پورے گاؤں میں خوب تھو تھو ہوئی۔

☆.....☆

تیسرے دن اس کی روح جسم سے پرواز کر گئی۔ خدا کی کرنی کچھ ایسی ہوئی وہ جگہ جہاں کوئی بھی بھولے سے نہ جاتا۔ گاؤں کا ایک لڑکا اپنے جانوروں کو لے کر اس واقعے کے گیارہویں روز وہاں نکل گیا۔ جب پاس پہنچا تو خوف کے مارے کانپ اٹھا۔ کوئی وجود جو اوندھا پڑا تھا۔ کہیں کہیں سے کپڑے جلے ہوئے اور گوشت بھی غائب تھا۔ پاس آ کے غور کرنے پر اسے جھرجھری آ گئی۔ بھاگتا ہوا واپس پہنچا اور گاؤں کے کچھ بندوں اور پولیس کو لے آیا۔ ساتھ نادیہ کا بوڑھا باپ بھی تھا اُس نے بیٹی کی جب یہ حالت دیکھی تو غم کے مارے پاگل ہونے لگا۔ اپنے کندھوں سے چادر اتار کے بیٹی کے وجود کو ڈھانپا جو اتنے روز گزرنے کے باوجود بھی شناخت کے قابل تھا۔ جب یہ خبر گاؤں پہنچی تو ایک کہرام مچ گیا۔ نادیہ کے ساس سسر، شوہر اور دیوروں کو گرفتار کر کے تفتیش کرنے پر ساری بات سامنے آ گئی۔ نادرہ جو بیٹوں کے ہاتھوں بہو کو جلا کے یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ اب کوئی اس کے گناہ پر اسے کچھ نہیں کہہ پائے گا لیکن وہ یہ بات بھولی بیٹھی تھی کہ اوپر والا جب انصاف دینا چاہے تو لاکھ پردوں میں چھپی سچائی کو بھی سامنے لے ہی آتا ہے۔ نادرہ اور اس کے گھر والے اب جیل میں اپنی سزا کے منتظر ہیں لیکن اس سب میں ان دو معصوم بچیوں کا کیا قصور جن کی بے گناہ ماں کو ان سے دور کر دیا گیا۔ اب نام نہاد باپ سے بھی محروم ہو بیٹھی ہیں۔ صرف اور صرف ایک انسان کے غصے کی وجہ سے دونوں معصوم کلیاں بچپن کے سہانے دور میں ہی اتنی بڑی محرومی سے دوچار ہو گئی ہیں۔ ننھیال میں خواہ کتنا ہی پیار کیوں نہ ملے لیکن وہ ماں کہاں سے لائیں گی جو ان کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھی۔ اسی لیے اسلام میں غصے کو حرام قرار دیا گیا ہے کہ ایک یہ جذبہ دوسری بہت سی برائیوں کو جنم دیتا ہے اگر نادرہ نے بھی اس وقت اپنے غصے کو قابو میں کر لیا ہوتا تو یہ سب کبھی بھی نہ ہوتا۔ کیوں آپ کا کیا خیال ہے؟

☆☆☆

حادثہ

کرن نورین

بس ذرا سی غفلت کبھی کبھی بہت بڑے نقصان کا باعث بھی بن جایا کرتی ہے

چند سال قبل ہمارے پڑوس میں نئے پڑوسی آئے معلوم ہوا کہ ان کے بچے بھی ہمارے بچوں کے ہی ہم عمر ہیں اس لیے جلد دوستی ہوگئی۔ اس فیملی میں میاں بیوی، تین بچے اور ایک بچے کی دادی تھیں۔ بظاہر تو فیملی بہت اچھی ملنسار تھی مگر ان خاتون کی ایک عادت مجھے بہت ہی عجیب لگی وہ اپنے بچوں کو کسی کے گھر جانے نہیں دیتی تھیں۔ بچیاں گلی میں کھیلتیں یا میری بچیاں ان کے گھر چلی جاتیں۔

ایک دن وہ خاتون تیز بخار میں چائے کی پتی لینے خود آئیں۔ ان کی ساس کہیں گئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے بچوں کو نہیں بھیجا۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ میں ضرور اس بات کی کھوج لگاؤں۔ آخر ایسی کیا وجہ ہے کہ وہ ایسے کرتی ہیں۔ اگلے روز میں ان کے لیے دلیہ لے کر ان کے گھر گئی۔ ان کی ساس بھی بیٹھی تھیں جو ان کی خالہ بھی تھیں۔ میں نے ان سے گزشتہ روز کا ذکر کیا اور اپنے تعجب کا بھی کہ ایسا بھی کیا کہ ایسی حالت میں بھی آپ بچوں کو بھیجنے کے بجائے خود آئیں۔''

وہ خاتون تو چائے کے بہانے کچن میں چلی گئیں۔ ان کی ساس کہنے لگیں۔

''رضیہ (میری پڑوسن) جب چھ سال کی تھی یہ اس وقت کا واقعہ ہے۔ یہ لوگ جس محلے میں رہتے تھے وہاں وہ پچیس سال سے رہ رہے تھے۔ ان کے دادا، دادی اور خاندان ان کی امی اسی گھر میں شادی کر کے گئی تھیں۔ پڑوس بھی کئی برس پرانا تھا۔ ہر وقت کا آنا جانا تھا۔ ویسے بھی وہ دور پرخلوص تھا۔ محلے میں روا داری تھی بچوں، بڑوں ہر کسی کا آنا جانا عام تھا۔ رضیہ لوگ چھ بھائی بہن تھے دو بھائی ایک بہن پھر ایک بہن پھر رضیہ اور پھر اس کی چھوٹی بہن۔

وہ بھی ایک عام سا دن تھا۔ جب گرمی کی لمبی دوپہریں ہوا کرتی تھیں۔ رضیہ کے کچھ گھر والے سو گئے۔ کچھ پنکھے یا کولر چلا کر اپنے کمروں میں مصروف تھے۔ رضیہ کی چھوٹی بہن فریدہ کھیلنے کے لیے پڑوس میں چلی گئی۔ رضیہ سو چکی تھی۔ شام ہوگئی مگر فریدہ واپس نہیں آئی۔ گھر میں سب کو تشویش ہوئی کہ وہ کہاں رہ گئی۔ دادی نے بتایا کہ وہ تو پڑوس میں گئی ہے۔ بھائی آس پڑوس میں پوچھ کر دیکھ کر آ گئے تھے۔ مین ہول بھی سب بند تھے۔ ایسے میں جب دادی نے کہا کہ وہ پڑوس میں گئی ہے تو اماں تڑپ گئیں۔

''کون سے پڑوس میں۔''

''ارے اسماء کے گھر میں۔'' دادی نے کہا۔

''ارے اسماء کی امی لوگ تو آج ہیں ہی نہیں، وہ تو اپنی اماں کے گھر گئی ہیں۔'' امی کی پریشانی حد سے سوا تھی۔

بھائی کس خیال کے تحت اسماء کے گھر گیا دروازہ پیٹا گیا مگر نہ کھلنا تھا نہ کھلا۔ یہی خیال آیا کہ بچی گھر سے نکلی ہوگی۔ دروازہ نہ کھلا اور کوئی اغوا کر کے لے گیا۔ گھر میں رونا پیٹنا مچا تھا۔ پولیس کو اطلاع کی گئی۔ پولیس نے تلاش شروع کی رات گہری ہوگئی تھی۔ بڑی بچی نے اسماء کی نانی کے گھر فون کر کے اطلاع کی وہ لوگ بھی تھوڑی دیر میں آگئے۔ وہ ہمارے گھر میں آگئے۔ کافی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ رضیہ کی ماں بے ہوش ہوگئی تھی۔ بس وہ بچی کا نام لے لے کر بے ہوش ہوئی جا رہی تھی۔ کافی دیر بعد اسماء کی بھی اپنے گھر جاننے کے لیے اٹھیں وہ اپنی ایک بچی کے ساتھ آگئی تھیں۔ انہوں نے رضیہ کے بھائی سے کہا۔

''بیٹا میرے ساتھ چل کر دروازہ کھول دو، بڑا تالا مجھ سے نہیں کھلتا، اندر کی لائٹ بھی جلا دو۔''

لڑکا اٹھ کر گیا۔ بڑے گیٹ کا تالا کھول کر وہ صحن کی لائٹ جلا کر اندر برآمدے کی لائٹ کھولنے لگا۔ اندر کمرے سے کراہنے کی آواز آئی۔ وہ تیزی سے اندر گیا اور اس کی دردناک چیخوں سے گھر گونجا۔ باہر موجود افراد اندر آئے۔ پولیس والے بھی موجود تھے۔ اندر کمرے میں بچی زخمی حالت اور بدترین حالت میں سسک رہی تھی۔ اس کے ساتھ زیادتی کی کوشش کی گئی تھی۔ فوری گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے جایا گیا مگر راستے میں ماں کی گود میں ہی اُس غریب نے دم توڑ دیا۔ جیسے وہ ماں سے ملنے کے لیے ہی زندہ تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اسماء کا ایک بھائی گھر پر تھا۔ جب بچی ان کے گھر گئی۔ اس نے زیادتی کی کوشش کی مگر اللہ کا کرم بچی بچ گئی مگر گر کر زخمی ہوگئی اور خون بہنے سے سسک کر دم توڑ گئی۔ وہ لڑکا گرفتار ہوگیا۔ رضیہ لوگ علاقہ چھوڑ کر دوسری جگہ شفٹ ہوگئے۔ اس کے بعد سے رضیہ کے دل میں یہ خوف بیٹھ گیا اور وہ بچوں کو محلے میں کسی کے گھر نہیں بھیجتی۔ چاہے گھر والے کتنے اچھے کیوں نہ ہو یا ساتھ کتنا ہی پرانا کیوں نہ ہوں۔ لوگوں کو شیطان بننے میں دیر نہیں لگتی۔''

''صحیح بات ہے اپنی اولاد کی حفاظت ماں باپ کا فرض ہے۔ احتیاط افسوس سے بہتر ہے۔'' میں کہہ کر اٹھ گئی۔

☆☆☆

جہالت

نازیہ جہانگیر خان

آج بھی کچھ خاندان، خاندانی جہالت کا شکار ہیں

میرے بڑے ماموں جواب اس دنیا میں نہیں رہے ان کی بیٹی کا رشتہ جس خاندان میں ہوا وہ بہت جاہل قسم کے لوگ تھے۔ میرے ماموں کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ میرے تین ماموں ہیں۔ منجھلے ماموں کے تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں اور چھوٹے ماموں کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ بڑے ماموں کے بڑے بیٹے بہت قابل اور نیک تھے اور ایئر فورس میں تھے۔ ان کی اچھی خاصی تنخواہ تھی۔ یہ بتاتی چلو کہ یہ فیملی مردن کے نواحی گاؤں میں رہائش پذیر ہے۔ بڑے بیٹے کی شادی دھوم دھام سے کی پھر چھوٹے کے سر پر سہرا باندھنے کی باری آئی پھر بیٹی کی شادی کی اور وہ اپنے سسرال چلی گئی۔ جو کچھ فاصلے پر تھا۔ شروع شروع میں وہ خوش تھی۔ اس کا شوہر دبئی میں ملازمت کرتا تھا۔ اس کو پیسے بھیجتا رہا۔ اس کے تین بچے تھے۔ آہستہ آہستہ اس کے سسرال والوں کا رویہ خراب ہوتا گیا۔ روز مار کھانا، کام کرنا، گالیاں کھانا اس کا معمول بن گیا۔ وہ بے چاری خاموشی سے برداشت کرتی کہ چلو شوہر آئے گا تو غم ہلکا ہو جائے گا اسی دوران چھوٹے ماموں لاہور میں شفٹ ہو گئے اور ان کا آنا جانا کم ہو گیا۔ ان کے بیٹے باہر ملازمت کرنے لگے۔ سب سے چھوٹا لاہور میں ہی رہا اور پڑھ رہا تھا۔ ہمارے گھر اس کا آنا جانا بہت تھا۔ ہمیں وہ بھائی دوست کی طرح لگتا تھا۔ مجھے تو تمام بہن بھائیوں اور ننھیال کے کزنز میں وہ عزیز تھا۔ میری چھوٹی بہن عظمیٰ سارا دن اس کے ساتھ گپ شپ ہنسی مذاق کرتی رہتی۔ ایک دن کسی نے اطلاع دی کہ میری کزن جو اپنے سسرال میں خوش نہیں تھی۔ اس کے شوہر نے باہر جا کر دوسری شادی کر لی ہے۔ میری کزن پر تو گویا قیامت ٹوٹ پڑی وہ تو اسی کے آسرے بیٹھی تھی وہ رو دھو کر اپنے میکے بیمار ماں باپ کے پاس آ گئی۔ سب نے دلاسے دیے اور سمجھایا کہ ہم بات کرتے ہیں اس کے بڑے بھائی جو ایئر فورس میں تھے۔ وہ آئے تو ان کا غصے سے برا حال تھا۔ ہم نے کہا آرام سے بات کرتے ہیں ہم نے ان لوگوں کو سمجھایا کہ اس کے بچے کا کیا کریں گے مگر اس کے جاہل سسرال والے بات سننے کو تیار نہیں تھے۔ اور فضول قسم کی باتیں کرنے لگے اور ہماری کزن پر الزام تراشی کی۔ جب وہ کچھ نہ سمجھنے کے موڈ میں نظر آئے تو میرے بڑے کزن نے کہا کہ ہر مہینے وہ اپنے بچوں کو 15 ہزار روپے ماہانہ بھیجے گا۔ جب وہ نہ مانے ان پر کیس کر دیا کہ تاکہ ان پڑھ لوگ کا دماغ ٹھکانے آ جائے تب جا کر وہ مانے مگر دل میں بدلہ لینے کی ترکیب بنانے لگے۔ میرے ماموں نے ایک گاؤں میں رہتے ہوئے ان سے تعلق ختم کر دیا نہ دعا نہ سلام نہ خوشی نہ غم۔

میری کزن بے چاری تین بچوں کے ساتھ خاموشی سے زندگی گزارنے لگی۔ تقریباً تین چار ماہ تک وہ پیسے بھیجتے رہے۔ میرے بڑے کزن جب ڈیوٹی سے آتے تو اپنی بہن کا خیال رکھتے اور بیوی سے بھی خیال رکھنے کو کہتے۔ بوڑھے ماں باپ کا

خیال وہی رکھتے کہ اچانک وہ ہو گیا جس کا ہم نے تصور نہیں کیا۔ میرے چھوٹے ماموں کا چھوٹا بیٹا لاہور سے اگلے شہر مزدا لے کر جاتا یعنی وہ ایک شہر سے دوسرے شہر سامان لے کر جاتا حالانکہ وہ پڑھ رہا تھا لیکن اس نے ماموں سے ضد کر کے مزدا خریدا اور ڈرائیور کے ساتھ آنے جانے لگا وہ اپنے آبائی گاؤں یعنی مردان بھی ہو کر آتا۔ وہاں کزنز کے ساتھ مل کر اگلی صبح واپس آنے کی تیاری کرتا۔ ایسی ہی ایک صبح وہ روانہ ہو گیا اور پہنچ کر اپنے والدین کو فون کیا کہ وہ اپنے گاؤں چلا گیا۔ وہاں میرے بڑے ماموں کے بیٹے بھی آئے ہوئے تھے۔ سب نے ہنسی مذاق کیا۔ گپ شپ لگائی اور کرکٹ کھیل رہے تھے کہ بچے دوڑتے ہوئے آئے اور میرے کزنز کو بتایا کہ ان کی میری کزن کی سسرال والوں سے لڑائی ہو گئی ہے جو قریب ہی رہتے تھے۔ لڑائی کی وجہ پوچھی تو بتایا کہ بچوں میں لڑائی ہو گئی تھی مگر وہ ابھی بھی شور مچا رہے ہیں۔ میرے بڑے ماموں کے بیٹے نے کہا کہ کوئی بات نہیں ہم سمجھائیں گے وہ پڑھے لکھے انسان تھے اچھی طبیعت کے مالک تھے۔ دونوں نے کہا آؤ ان کی طرف چل کر معذرت کرتے ہیں۔ دوسری طرف ان جاہلوں کے دل پہلے سے بھرے تھے وہ اس انتظار میں تھے کہ کب کوئی بات ہو اور وہ جا کر لڑیں۔ ان لوگوں کو گاؤں والوں نے کہا کہ میرے دونوں کزنز ان کو مارنے کے لیے آ رہے ہیں۔ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ گاؤں میں تو ویسے بھی جلدی اندھیرا ہو جاتا ہے اور لائٹ بھی کم ہی آتی ہے۔ جب میرے کزنز اندھیرے میں ان کی طرف بڑھنے لگے تو ان ظالموں نے اوپر سے فائرنگ شروع کر دی۔ میرے ایک کزن کے دل پر گولی لگی اور چھوٹے کزن کو سر پر گولی لگی۔ تیسرے کو ٹانگوں پر گولیاں مار کر فرار ہو گئے۔ گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ اندھیرا چھٹا روشنی ہو گئی تو قیامت خیز منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ میرے بڑے کزن اور چھوٹے کزن وہیں شہید ہو گئے جو سب سے چھوٹا تھا وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ وہ لوگ پہلے سے تیاری کر چکے تھے فرار ہو گئے سب کے سب میرے کزن کے بوڑھے والدین میری والدہ ہم سب بہن بھائی جب وہاں پہنچے تو قیامت کا سماں تھا ہر آنکھ اشک بار تھی۔ وہ بے چارے تو سمجھانے آئے تھے ان جاہلوں کو مگر قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔ میری بہن عظمیٰ اور میں ہم سب چھوٹے کزن کے ساتھ بہت اٹیچ تھے۔ اس کی وفات کا آج بھی یقین نہیں آتا۔ میری کزن خود کو ذمہ دار ٹھہراتی ہے کہ نہ میری شادی ہوتی نہ ان لوگوں کے ساتھ تعلق بنتا اور نہ ان پر کیس کرتے۔ خیر قسمت سب کچھ کرواتی وہ لوگ آج بھی فرار ہیں۔ کچھ عرصے بعد میرے بڑے ماموں کی ڈیتھ ہو گئی اور ان کی بہو کے والد صاحب کی بھی ڈیتھ ہو گئی اپنی بیٹی کو اور اس کے بچوں کو روتا بلکتا کیسے دیکھتے۔ یوں دو خاندانوں کی تباہی ہو گئی میری آپ سے درخواست ہے ہمیشہ پڑھے لکھے خاندانوں میں اپنے جگر کے ٹکڑوں کا رشتہ کریں آپ کا ایک غلط فیصلہ کتنے خاندان تباہ کر سکتا ہے۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں اور ہمارے حق میں دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ سب کو غموں سے اولاد کے غم سے بچائے، آمین۔

☆☆☆

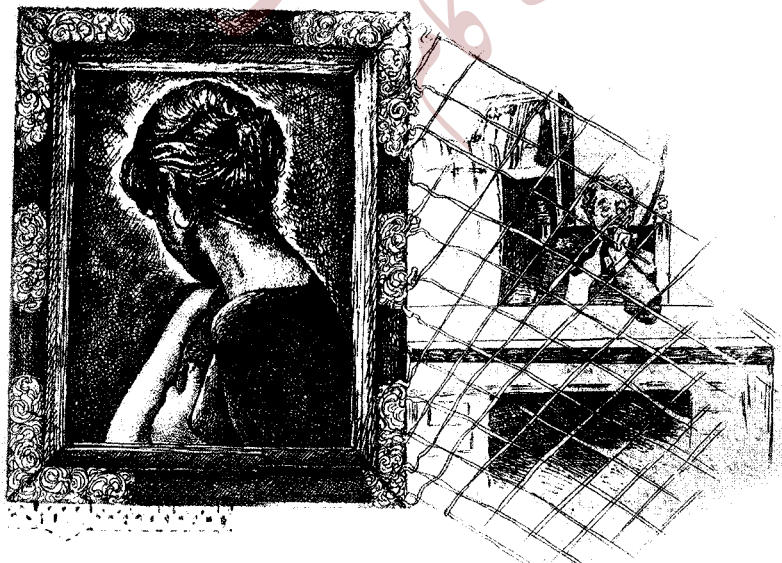

پچھتاوا

عارف شیخ

پچھتاوا صرف ہمارے ہی کیے کا عکس ہوتا ہے، سستی کبھی زندگی بھر کا روگ بھی بن جاتی ہے

گرمیوں کے دنوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ اسی لیے موسم کی سختی بھی اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ ان مہینوں میں قدرت ہی امتحان نہیں لیتی ہے بلکہ مل کر ادارے بھی ہمارا امتحان لینے لگتے ہیں۔ لوڈ شیڈنگ طویل ہو جاتی ہے، رہی سہی کسر پانی کی کمی پورا کر دیتی ہے اور اس مرتبہ تو رمضان کی آمد بھی انہی سخت دنوں میں ہوئی تھی۔

سلمیٰ خاتون جو حسب معمول صبح جلد ہی اٹھ جاتی تھیں۔ ان کی یہ عادت رمضان کے مہینے میں بھی اسی طرح قائم و دائم رہتی تھی۔ آج بھی وہ جلد اٹھ گئی تھیں اور اپنے گھریلو معاملات نمٹا رہی تھیں۔ لیکن ان کے کام میں اس وقت دشواری آنا شروع ہوئی جب انہوں نے دیکھا کہ نل میں آنے والا پانی دھیرے دھیرے اپنی رفتار کم کر رہا ہے۔

''آج یہ پانی کو کیا ہو گیا۔'' وہ بڑبڑائیں ساتھ ہی انہوں نے اپنے بیٹے ساجد کو آواز لگائی۔

''ساجد..... ساجد..... دیکھو پانی نہیں آ رہا ہے۔''

لیکن ان کی آواز صحرا کی آواز ثابت ہوئی کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ آخر کار پانی نے آنا بند کر دیا تھا۔ وہ جھنجلاتی ہوئی کچن سے نکل کر ہال میں آئیں تو انہوں نے دیکھا کہ دن کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ ساجد کے کمرے کی طرف جاتیں سامنے سے بیٹی شمائلہ آتی دکھائی دی جس نے ماں کو دیکھتے ہی پوچھا۔

''واش روم میں پانی نہیں آ رہا ہے۔''

سلمیٰ خاتون جانتی تھیں کہ شمائلہ ابھی سو کر اٹھی تھی گھر میں سب لوگ ہی سو رہے تھے، دراصل آج اتوار کا دن تھا۔ ساجد کی یونیورسٹی بند تھی اور شمائلہ کا کالج بھی بند تھا۔ اس لیے دونوں دیر تک سو رہے تھے۔ انہوں نے شمائلہ کو جواب دیا۔ ''کب سے آواز دے رہی ہوں ساجد کو کہ جا کر پانی کے بارے میں معلوم کرے لیکن مجال ہے جو اس کے کان پر جوں بھی رینگ جائے۔'' ''وہ بے خبر سو رہا ہوگا۔'' شمائلہ بولی۔ ''اس نے آپ کی آواز سنی تک نہیں ہوگی جواب کیسے دے گا۔''

''اچھا تو بھائی کی حمایت مت کر، میں ویسے ہی پریشان ہوں۔'' سلمیٰ خاتون نے ناراضگی دکھائی۔ ''میں ابو کی طرف جا رہی ہوں۔ انہوں نے آواز لگائی ہے۔'' شمائلہ نے بتایا۔

''تم ذرا کچن میں جا کر صفائی کرو۔ میں تمہارے ابو کو دیکھتی ہوں۔'' امی نے ہدایت جاری کی لہٰذا شمائلہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔ سلمیٰ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں تو اخلاق احمد کو اٹھتے دیکھا۔

''ارے میں آ رہی تھی آپ کیوں اٹھ گئے۔'' وہ جلدی سے لپکیں۔

''مانا میں بیمار ہوں۔'' اخلاق احمد بیماری مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ''لیکن ایسا بھی بیمار نہیں ہوں کہ میں ہل جل بھی نہیں کر سکتا۔''

''آپ کو دو مرتبہ ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے۔'' سلمیٰ

خاتون نے لفظوں کو دانتوں تلے چباتے ہوئے کہا۔ ''یہ بیماری کم اور ریڈ سگنل زیادہ ہے کہ آپ کو ہر چیز میں احتیاط کرنی ہے۔'' ''میں احتیاط کرتا ہوں۔'' اخلاق احمد نے جواب دیا۔ پھر پوچھنے لگے۔ ''یہ تم ساجد کو کیوں آواز لگا رہی تھیں۔''

''ارے وہ پانی نہیں آرہا ہے۔'' سلمٰی خاتون نے کہا۔

''پڑوس میں معلوم کیا اگر ان کے یہاں نہیں آرہا ہے تو ہماری اوپر والی ٹنکی میں پانی نہیں ہوگا۔'' اخلاق احمد نے سمجھایا۔ ''ہاں فلیٹوں کی رہائش میں یہی مسئلہ ہوتا ہے۔'' سلمٰی خاتون نے خود کلامی انداز میں کہا۔ ''لیکن تم تو گراؤنڈ فلور پر رہتی ہو۔''

''ارے پانی کی ٹنکی تو چوتھی منزل کی چھت پر ہے نا۔''

''غصہ کرنے سے پانی نہیں آئے گا۔ پہلے پڑوس میں معلوم کرو اور پھر ساجد کو اٹھاؤ۔''

''ہاں یہی کرتی ہوں۔'' وہ کمرے سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھیں شمائلہ نے اپنی ماں کو پڑوس میں جاتے دیکھا اور پھر واپس آتے دیکھا لیکن اس نے کوئی سوال نہیں کیا اس لیے کہ اب وہ ساجد کے کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔ ''ساجد..... ساجد اٹھو جا کر دیکھو پانی نہیں آرہا ہے۔'' امی کی آواز خاصی تیز تھی۔

''ہاں ابھی اٹھتا ہوں۔'' ساجد نے بند آنکھوں کے ساتھ جواب دیا۔

''پانی بالکل ختم ہو جائے گا تو سخت پریشانی ہو جائے گی۔'' امی وہاں سے نہیں ٹلی تھیں۔ ''وہ ابھی موٹر چلے گی تو پانی آجائے گا۔'' ساجد نیند میں ڈوبی آواز کے ساتھ جواب دے رہا تھا۔ ''موٹر صبح چل چکی ہے اور ہماری بلڈنگ کے دوسرے گھروں میں پانی آرہا ہے۔'' امی نے بتایا۔

''اچھا ابھی اٹھتا ہوں۔'' وہ بولا۔

''جلدی اٹھ جانا۔'' وہ یہ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔

☆.....☆

ڈیڑھ بجے اخلاق احمد کمرے سے باہر آئے تو شمائلہ سے سامنا ہوا۔ ''ابو نماز کے لیے جا رہے ہیں۔'' اس نے سوال کیا۔ ''ہاں مسجد جا رہا ہوں۔'' اخلاق احمد نے جواب دیا۔

''دھیرے دھیرے چلیے گا اور فلیٹوں کی مسجد میں نماز پڑھیے گا۔'' سلمٰی خاتون نے کمرے میں داخل ہوتے ہی آواز لگائی۔ ''ہاں بھئی مجھے مشقت نہیں کرنی ہے۔'' اخلاق احمد نے جواب دیا اور گھر سے باہر چلے گئے۔

''میں نماز پڑھ لوں پھر تم نماز پڑھ لینا۔'' سلمٰی خاتون

ناول

کاوش صدیقی

خانقاہ

قسط نمبر: 04

خانقاہوں، آستانوں، درباروں، مزاروں سے جڑی ایک مردِ درویش کی داستانِ عجیب

تصوف اور محبت کی پراسرار دنیا کی کہانی

''تنزیل میاں۔!'' قادری سرکار ایک طویل سانس لے کر ذرا ٹھہر کے کہا۔ ''ذرا آپ اس خط کو دیکھ لیجئے۔ اگر اس میں کوئی کمی بیشی کرنا ہو تو ضرور کر لیجئے گا۔''

''کیا کہہ رہے ہیں'' میں بری طرح سٹپٹا گیا۔ میں تو خط کے آسان اور سادہ لفظوں سے متاثر ہوا تھا۔ کتنی سادگی اور پرکار انہوں نے خادم حسین کے لئے انتہائی دلکش لب و لہجے کا انتخاب کیا تھا۔

''آپ کے اس خط کو ... کمی نہیں ہے۔!'' میں نے حقیقتاً بے حد خلوص سے کہا۔ ''اگر اس خط کو ... سے پھیلایا جائے ... کے ذریعے بھرپور نتیجہ لینا چنداں مشکل نہیں۔!''

''آپ اس سے ... پھر ...'' انہوں نے میری دلچسپی کو بھانپ کر کہا اور اس چائے کی طرف اشارہ کیا جو اس دوران خادم رکھ گیا تھا۔ خط کے انہماک کو توڑ کر چائے پینے کا کسی کا بھی دل نہیں چاہتا تھا۔

''جی ہاں۔'' میں نے سر ہلایا۔

''ندیم۔!'' انہوں نے اپنے خادم خاص کو بلایا۔ وہ لمحوں میں حاضر ہو گیا۔ ''ذرا طاہر حسین کو بلائیے۔!''

''جی اچھا۔!'' ندیم اور پلک جھپکتے ہی غائب ہو گیا۔ چند منٹوں کے بعد ایک چالیس پینتالیس سال کے پیٹے کے درمیان کا شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے سب سے پہلے لپک کر قادری سرکار کے ہاتھوں کو تھاما، بوسہ دیا، جھک کر ہاتھ لگایا اور مودب کھڑے ہو کر بولا۔ ''سرکار حکم دیجئے۔!''

''طاہر میاں اس خط کو ... ار چھاپ دیجئے۔ سائز اے فور کا ہی رکھئے گا۔'' انہوں نے میرے ہاتھ میں تحریر شدہ خط کی جانب اشارہ کیا۔ میں نے وہ خط اس کے سپرد کر دیا۔

''سرکار کب حاضر ہو ...!'' اس نے نہایت احترام سے دریافت کیا۔

''جتنی جلدی ممکن ہو سکے۔'' قادری سرکار نے فرمایا۔

''صبح 9 بجے یہاں پہنچ جائیے گا۔'' اس نے بلا تامل حامی بھر کے وقت کا تعین بھی کر دیا۔ ''کیا فائنل پروف کے لئے میں خود حاضر ہو جاؤں۔!''

''نہیں تنزیل میاں ... ساتھ جا رہے ہیں۔'' انہوں نے بتایا۔ ''یہ فائنل کر لیں گے۔ کیوں تنزیل میاں؟''

''جی۔۔۔ جی ہاں'' میں نے جلدی سے کہا۔

''تو پھر چلئے۔'' پھر طاہر حسین نے کہا۔ ''وقت کم ہے''۔ قادری سرکار نے سر کے اشارے سے اجازت دے دی۔ طاہر حسین مجھے لیکر باہر نکل آیا۔ باہر نکل کے وہ اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے بولا۔ ''تنزیل میرے پیچھے چلے آئیے!''

میں نے اپنی موٹر ... اسٹارٹ کی اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ آدھے گھنٹے کے بعد ہم پریس پہنچ گئے۔ طاہر حسین نے مجھے دفتر میں بٹھایا اور کمپوزنگ والے لڑکے کو بلا کر ہدایت دینے لگا۔ آدھے گھنٹے میں کمپیوٹر آپریٹر نے خط کمپوز کر دیا۔ میں نے غلطیاں درست کروائیں۔ وہ فائنل پروف لے آیا۔ میں نے پڑھ کر اسے دیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد ... بن کر پرنٹنگ پریس میں چلی گئی۔ تقریباً ساڑھے بارہ بجے دس ہزار لیٹر تیار ہو چکے تھے۔ پیکنگ مکمل ہوتے ہی طاہر حسین نے گاڑی منگوائی اور مجھ سے بولا۔ ''لیجئے جناب تنزیل صاحب دس ہزار لیٹر تیار ہیں۔ آپ کو یہ لیٹر خانقاہ پہنچ جائیں گے۔ یا پھر آپ کے سپرد۔!''

''خانقاہ ہی بھیج دیں۔'' میں نے کہا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ لائٹ نہیں گئی۔ ورنہ نا جانے کتنا ٹائم لگ جاتا۔!''

''لائٹ نہیں جاتی۔!'' طاہر نے مسکرا کے کہا۔ ''جب بھی سرکار کا کوئی کام ہو رہا ہو لائٹ نہیں جاتی۔ یہ

بات برسوں کی آزمائی ہوئی ہے۔آپ دیکھئے گا۔'' طاہر حسین کے ان جملوں کے درمیان ہی لائٹ چلی گئی۔

''کیا ہوا مال رکھ دیا۔!'' طاہر حسین نے پکار کر پوچھا۔

''جی ہاں جی۔!'' قریب ہی سے ایک لڑکے نے کہا۔''آخری پیکٹ گاڑی پر رکھا ہی تھا کہ لائٹ چلی گئی۔!''

''دیکھا آپ نے۔'' طاہر حسین نے ایمرجنسی لائٹ میں مجھے غور سے دیکھ کر کہا۔''سرکار کے کام سے پہلے کوئی گڑبڑ نہیں ہوتی۔''

میں بے حد حیران تھا۔یہ کیا ہے۔کرامت یا حسن اتفاق۔میرا ذہن تشکیک کے دائروں میں الجھنے لگا۔

''آیئے جی۔!'' گاڑی والے نے کہا۔''ہمیں سیدھا خانقاہ کا راستہ لینا ہے۔!''

سب ہی سیدھے راستے پر تھے۔شائد میرا سوا۔! میرے دل میں ایک کسک سی اٹھی۔میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کر دی اور آگے بڑھ گیا۔گاڑی میرے پیچھے پیچھے آرہی تھی۔خانقاہ پہنچے تو رات کے ڈیڑھ بج رہے تھے۔سب سو رہے تھے سوائے خادم ندیم کے۔اسی نے دروازہ کھولا اور پیکٹ اندر رکھوائے اور مجھ سے بولا۔''قادری سرکار نے فرمایا ہے کہ آپ صبح نو بجے تشریف لے آئیں۔حضور کو خاص کام ہے۔!''

''اچھا۔۔!'' میں نے کہا اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔

''کھانا کھا لیجئے۔!'' ندیم نے کہا''تیار ہے۔!''

''بھوک نہیں ہے۔!'' میں نے کہا اور باہر نکل آیا۔مجھے سچ مچ بھوک نہیں تھی۔اور ویسے بھی زیادہ رات تک گھر سے باہر رہنے کا عادی نہیں تھا۔طبیعت میں ایک عجیب سی اداسی، کسلمندی، بے چینی تھی۔ہر چیز سے، اپنے اندر باہر سے خالی ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔اپنا وجود ایک ایسی خالی بوتل کی طرح لگ رہا تھا جو اپنا آپ خالی کر کے بے مصرف ہو گئی ہو۔

میں گھر پہنچا تو مومی جاگ رہی تھی۔''تم سوئی نہیں۔؟''

''بس نیند نہیں آرہی تھی۔!'' وہ بولی۔''پھر آپ بھی تو نہیں آئے تھے۔کم از کم اپنا موبائل ہی پاس رکھا کریں۔'' اس کے انداز میں خفگی تھی۔

''اچھا بابا معاف کر دو۔!'' میں نے اس کے گالوں پر چپت لگائی۔میری اکثر عادت تھی کو موبائل گھر ہی بھول جاتا تھا۔جدید زمانے کا یہ گشتی ہاتف آدمی کی تنہائی کا دشمن تھا۔کہیں بھی، کسی بھی جگہ انسان اکیلا نہیں رہ سکتا۔

''چلیں کھانا کھا لیں۔ہم نے آپ کے انتظار میں ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔!''

''اور اماں نے؟۔!'' مجھے سب سے زیادہ اماں کی فکر رہتی تھی۔

''اماں کا آج تھوڑا سا بلڈ پریشر زیادہ تھا۔میں نے انہیں زبردستی کھانا کھلا کر دوا دی تھی۔ابھی وہ سو رہی ہیں۔!'' مومی نے بتایا۔

ہم دونوں چلتے ہوئے کچن میں آگئے تھے۔مومی کھٹر پٹر کرتے ہوئے بتا رہی تھی۔

ہماری آواز سن کر اندر والے کمرے سے نرگس بھی باہر نکل آئی۔مجھے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹک کر رک گئی، شاید وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اندر آئے یا لوٹ جائے۔اسی وقت سالن گرم کرتے ہوئے مومی کی نظر اس پر پڑی۔''ارے نرگس آپ آجائیں باہر کیوں کھڑی ہیں۔!''

نرگس کچن میں چلی آئی۔ہمارا کچن خاصا بڑا تھا۔بعض اوقات ہم کچن میں ہی کھانا کھا لیتے تھے۔مومی نے

فرج میں سے آٹا نکالا اور توے کو چولہے پر رکھا۔

''میں روٹی بنا لیتی ہوں۔!'' نرگس نے کہا۔ پھر اس نے بیسن پر ہاتھ دھوئے اور آٹے کا باؤل تھام لیا۔

''ارے نہیں۔!'' مومی نے کہا۔ ''آپ بیٹھیں، باتیں کریں، پانچ منٹ میں گرم گرم روٹیاں تیار ہو جائیں گی۔!''

''تو پھر مجھے بنانے دیں۔'' نرگس نے کہا۔ ''آپ سالن نکالیں۔''

میں کچن میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ نرگس روٹی بنانے لگی۔ روٹیاں بیلتی ہوئی، ہاتھوں سے شیپ دیتی ہوئی، تھپتھپاتے ہوئے اس کی چوڑیاں بج رہی تھیں۔ ایک کھنکتی موسیقی فضا میں گونجنے لگی۔

''آپ لوگ گاؤں میں روٹی کیسے پکاتے ہیں۔!'' مومی نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''تھوڑے لوگ ہوں تو چولہے پر بنا لیتے ہیں۔ زیادہ ہو جائیں تو پھر تنور گرم کر لیتے ہیں۔ شہر میں تو بس بٹن گھماؤ ماچس لگاؤ بھک بھک آگ جلنے لگتی ہے۔!''

آپ کتنے بہن بھائی ہیں۔؟!'' مومی نے پوچھا۔

''دو بھائی تھے اور میں ایک بہن۔ ماں کو ہیضہ ہو گیا تھا۔ پانچ سال پہلے۔ گاؤں کی سرکاری ڈسپنسری بند تھی اس میں ڈاکٹر کے بجائے نمبردار کی بھینسیں بندھتی تھیں۔ شہر جاتے جاتے ماں کی جان نکل گئی۔ ایک بھائی کو کھیتوں میں پانی لگاتے ہوئے سانپ نے ڈس لیا اور دوسرے بھائی کو کتے کھا گئے۔!''

''کیا۔!'' سالن کا چمچ مومی کے ہاتھوں سے گر گیا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔؟!''

''آپ نہیں جانتیں۔!'' نرگس ہنسی۔ ''ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب جیتے ہوئے پر، آپ اپنی بیتی پر یقین نہیں آتا۔ یہ مٹی کے پتلے جی بڑی لچک والے ہوتے ہیں۔ آنسوؤں سے گیلی مٹی جھڑتی نہیں۔ آٹے کی طرح چپکی رہتی ہے۔ جی سوہنے رب نے بڑا کرم کیا جی۔ ہمیں مٹی سے بنایا، ایسی مٹی جو اگر گھر بھی جائے تو پانی میں مل کر اپنا آپ دوسروں کے سپرد کر دیتی ہے۔!'' اس کے انداز میں شکوہ، شکایت، گلہ کچھ نہیں تھا اور سب کچھ تھا۔

''آپ بھائی کے متعلق بتا رہی تھیں۔!'' مومی کو اس کے بھائی کے متعلق فکر ہو رہی تھی۔

''جی وہ چھوٹے شاہ جی کو کتوں کے ذریعے شکار کا بہت شوق ہے۔ ان کے پاس درجنوں بڑے بڑے شکاری کتے ہیں۔ جو شکار کی بو پاتے ہی میلوں دوڑ کر بھی شکار کو پکڑ لیتے ہیں۔ چھوٹے شاہ جی نے دو تین بکریاں بھائی کو دیں کہ انہیں دوڑائے، پھر اس کے پیچھے کتے چھوڑ دیئے، کتوں نے جی بکریوں کو پکڑا ایک کتے نے بھائی کو پکڑ لیا اور اس کی ٹانگوں کو بھنبھوڑ ڈالا۔ انسان اگر گر جائے تو بہت آسان شکار ہوتا ہے۔ خون کی بو پر دوسرے کتے بھی آ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے درجن بھر کتوں نے میرا بارہ برس کا بھائی تکا بوٹی کر ڈالا۔ صرف سر اور کچھ ہڈیاں ہی بچی تھیں۔۔۔!''

مومی رونے لگی۔ میرا حلق عجیب طرح سے نمکین سا، کڑوا سا ہو گیا۔

''پولیس نے کوئی کاروائی کی۔؟''

''پولیس والوں نے رپورٹ دی کہ یہ ایک حادثہ تھا۔ شکار والی جگہ تو سب کو پتا ہے وہاں پر بکریاں لیکر جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اس لئے غلطی سلطانے کی تھی۔'' وہ چپ ہو گئی۔

''نہ مدعی نہ شہادت، حساب پاک ہوا۔ یہ خون خاک نشیناں تھا، رزق خاک ہوا۔ کیا انسان اتنا ہی بے وقعت، اتنا فالتو، اتنا نامعتبر ہے کہ کوئی پرسان حال نہیں۔ کوئی ضابطہ، کوئی سماجی دباؤ، کوئی ریاست کی ذمہ داری نہیں۔؟ بے شمار سوالوں نے بگولوں کا رخ اختیار کر لیا۔

''چھوڑیں جی۔!'' نرگس نے کہا۔ ''بے وجہ ہی میں نے اپنی کہانی سنا کر آپ لوگوں کو اداس کر دیا۔ کھانا کھائیں۔!''

اس ساری گفتگو کے بعد کس کم بخت کا دل کھانے کو چاہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر قبل گندم کی اٹھتی ہوئی مہک سے جو بھوک پیدا ہوئی تھی۔ اب جیسے وہ ہُوک میں بدل گئی تھی۔

''دکھ ہوں یا غم، بیماری ہو یا صحت، بھوک سے تو بھاگ نہیں سکتے نا۔!'' نرگس نے کہا۔

کس قدر سادہ فلسفہ ہے۔ ان لوگوں کا۔ میں نے سوچا، اور پھر سر ہلایا۔ دونوں نے چند ہی منٹوں میں کھانا لگا دیا۔ ہم تینوں چھوٹی میز کے گرد بیٹھ گئے اور لقمے زہر مار کرنے لگے۔ کھانے کے دوران ہی موی نے اٹھ کر چائے کا پانی چڑھا دیا تھا۔ کھانا ختم ہونے تک چائے تیار ہو گئی۔ ہم لوگ چائے پینے لگے۔

میں نے پہلی بار نرگس کو غور سے دیکھا۔ دبلی پتلی نازک سی یہ لڑکی اپنے اندر کتنے دکھ چھپائے ہوئی تھی۔ اس کا گلابی چہرہ، ناک میں پڑی چاندی کی لونگ، سرخ موتی کے ساتھ سر کے ہلنے کے مختلف زاویوں کے ساتھ بعض اوقات عجیب سی جھلملاہٹ پیدا کر رہی تھی۔

نرگس کے انداز میں عجیب سی سادگی تھی۔ جس سے ہم شہر والے نابلد تھے۔ ہمیں تو اپنے دکھوں کے اظہار کے لئے بھی بڑے پیرایئے چاہئے ہوتے ہیں۔ لفظوں کی ترتیب و بُنت میں، مخاطب کے رویئے کی جانچ پڑتال میں، سچ و جھوٹ بے اعتباری اور اعتبار کے درمیان لٹکتے ہوئے سچائی گم ہو جاتی ہے۔ احساسات جذبات کے نازک تاروں کے بیچ ہی رہ جاتے ہیں اور ہم بظاہر ضبط کی تصویر بنے ہوئے ہوتے ہیں اور پھر یہی کمال ضبط ہمیں اکیلا کر جاتا ہے۔

''آپ بہت دکھ اٹھائے ہوئے ہیں۔!'' میں نے دھیمے سے کہا۔

''پتا نہیں جی۔! اپنے آپ پر بیتا ہوا دکھ ہوتا ہے یا پھر تقدیر۔ ہم تو ہر دکھ کو تقدیر کا حصہ سمجھ کر صبر کر لیتے ہیں کہ مالک کا شکر ہے کہ اس سے زیادہ نہیں ہوا۔ ورنہ بہت کچھ اس سے زیادہ برا بھی ہو سکتا تھا۔!''

میں حیرت سے اس کو دیکھ کر رہ گیا۔ کیا عجیب شے ہے یہ۔ میں تو اپنے دکھ کو بڑا سمجھتا تھا۔ مگر اس کا دکھ تو مجھ سے بھی سوا ہے۔ بقول میر سرسری تم جہاں سے گزرے۔۔۔ وگرنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا۔ واقعی ہر جگہ اپنی ہی نئی دنیا ہوتی ہے۔ اچانک مجھے قادری سرکار کا ایک قول یاد آیا۔ ''عالم روحانیت کی طرف دیکھئے تو اللہ تعالیٰ نے اٹھارہ ہزار عالم پیدا کئے ہیں۔ اور ہر عالم کی وسعت عقل و فہم سے ماوراء ہے۔ ہر انسان خود اپنی جگہ ایک عالم ہے۔ دو ہاتھوں، دو ٹانگوں سمیت چند اعضاء کا مجموعہ۔ لیکن اس کے ذہن کی دنیا جب وسعت اختیار کرے تو پھر قدوسی و جبروت کے معاملات اس کے لئے مثل سبق ازبر ہو جاتے ہیں۔''

میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ کپڑے بدل کر لیٹا تو چند ہی منٹوں میں بے خبر ہو گیا۔

صبح میری آنکھ فون کی بیل سے کھلی۔ میں نے ٹٹول کر فون اٹھایا تو اسکرین پر ایک اجنبی نمبر تھا۔ ''ہیلو۔۔ کون'' میں نے نیند بھری آواز میں پوچھا۔

''السلام وعلیکم جی۔ تنزیل میاں بات کر رہے ہیں۔؟'' دوسری طرف بہت مودب آواز آئی۔

''جی وعلیکم اسلام۔!'' مجھے سلام میں پہل نہ کرنے پر خجالت محسوس ہوئی۔

''جی میں ندیم عرض کر رہا ہوں۔ قبلہ قادری سرکار کا خادم خاص۔!'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''جی فرمایئے۔!'' میں قادری سرکار کا نام سنتے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میری نیند ہوا ہو گئی۔

''سرکار نے فرمایا ہے کہ آپ نو بجے تک خانقاہ پہنچ جائیں۔ ابھی ساڑھے چھ بجے ہیں۔ آپ ذرا ا ا ا ا کر آیئے گا۔ ہو سکے تو کپڑوں کے چند جوڑے وغیرہ بھی۔'' ندیم نے کہا اور سلام کہہ کر فون بند کر دیا

میں حیران ہو گیا۔ قادری سرکار مجھے کہاں جانے کا حکم دینے والے ہیں۔؟ اور وہ بھی ایسی جگہ جہاں ا ا کرنا پڑ جائے۔ میں نے ذہن کو جھٹک دیا۔ اور غسل کرنے کے لئے باتھ روم میں گھس گیا۔ نہا کر نکلا تو ا بج رہے تھے۔ باہر آیا تو دھوپ صحن میں اتر آئی تھی۔ اماں حسب معمول برآمدے میں بیٹھی تھیں۔ اماں کو دیکھ میں ان کی طرف بڑھ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائیں۔ میں ان کے پاس تخت پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت موی ا کمرے سے باہر نکلی۔

''اسلام علیکم بھائی۔!'' وہ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ''چائے لے آؤں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ چند ہی لمحوں میں چائے، پاپے اور ابلے ہوئے انڈے لے آئی۔ ہم تینوں چائے پینے لگے۔

''نرگس کیسی ہے۔؟'' اماں نے پوچھا۔

''اب بخار اترا ہے تو سو رہی ہیں۔؟'' موی نے کہا۔ ''بہت تیز بخار تھا۔!''

''رات تو اچھی بھلی تھی۔'' میں نے چائے کا کپ رکھ دیا۔ ''اگر ہاسپٹل لے جانا تھا تو مجھے کیوں نہیں اٹھا دیا۔!''

''میں نے کہا تھا۔ مگر انہوں نے کہا کہ بخار ہی تو ہے اتر جائے گا۔ وقفے وقفے سے پیناڈول دی تھی۔!'' موی نے بتایا۔

''بہت صابر بچی ہے۔!'' اماں نے دھیمے سے کہا۔ ''بعض اوقات جب ٹھہراؤ ملتا ہے تو پھر سارے زخم، ساری الجھنیں عود کر آتی ہیں۔!''

اماں کی بات سن کر مجھے یوں لگا کہ جیسے میں مجرم ہوں۔ نا میں اس سے ذاتی سوالات کرتا۔ نہ زخم ہرے ہوتے۔ لیکن بعض زخم تو رستے ہی کچے ہیں۔ ہرے ہرے تازہ بہ تازہ، برسوں کے باوجود یوں لگتا ہے کہ ظلم و جبر زیادتی کا ظالم پنجہ ابھی ابھی زندہ گوشت نوچ کر لے گیا ہے۔ خون ٹپکتا، سوجن سے بھرا پنڈا، اور پیپ کا بھاری پن لڑکا رہتا ہے۔ تپش، جلن، ٹیس، درد کا سونامی سارے بدن کو لرزاتا رہتا ہے۔

''اگر دکھوں کو جھنجھوڑا جائے، بار بار ذکر نہ کیا جائے تو پھر گھٹن کی صورت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ پانی کو نکاس نہ ملے تو وہ کناروں سے اچھل کر اپنے ہی آبادکاروں کو تہس نہس کر دیتا ہے۔ دکھوں کو زبان نہ ملے تو ہستی کے تار و پود بکھر جاتے ہیں۔!'' اماں نے دھیرج کہا۔

اماں کی گفتگو سن کر ہمیشہ ہی مجھے ایسا لگتا تھا کہ اماں کے اندر کوئی بہت بڑا ادیب، بہت بڑا تخلیق کار چھپا بیٹھا ہے۔ بعض اوقات تو ہم اماں سے کہتے تھے کہ اماں آپ کیوں نہیں لکھتی ہیں۔ تب وہ بڑے اطمینان سے جواب دیتیں کہ لکھنا بھی تخلیق ہے اور اولاد پیدا کرنا ان کی دیکھ بھال، تعلیم و تربیت، پرورش یہ سب بھی تخلیقی عمل ہیں۔ اگر ان سے تخلیق کی طرح پیار نہ کیا جائے تو پھر نسل بگڑ جاتی ہے۔ اماں بہت پڑھنے لکھنے والی خاتون تھیں۔

''کیا تمہیں کہیں جانا ہے۔؟'' اماں نے پوچھا۔ ''بہت جلد اٹھ گئے ہو۔''

''اماں۔ وہ قادری سرکار کی طرف سے فون آیا تھا کہ وہ مجھے کہیں بھیجنا چاہ رہے ہیں۔ غالباً کچھ دنوں کے لئے۔!''

''اچھا۔!'' اماں نے چائے کا آخری گھونٹ لیا۔ ''چلے جاؤ۔ کچھ دنیا دیکھو، سیکھو، سمجھو۔!''

انہوں نے ہولے سے میرے گالوں کو تھپکی دی اور مومی سے بولیں۔ ''جاؤ دیکھو بھائی کے کون سے کپڑے رکھنے ہیں۔!''

''جی اماں۔!'' مومی نے اپنی چائے ختم کی۔ برتن سمیٹ کر ٹرے میں رکھے اور مجھ سے بولی۔ ''بھائی میں ٹرے کچن میں رکھ کر آ رہی ہوں۔ آپ بتائیے کہ کون کون سے کپڑے رکھنے ہیں۔!''

وہ ٹرے اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئی۔ میں اپنے کمرے میں آ کر الماری میں سے کپڑے نکالنے لگا۔ میرے پیچھے پیچھے ہی مومی آ گئی۔ اس نے ایک سفری بیگ میں کپڑے ٹوتھ برش، ٹوتھ پیسٹ اور دو چار استعمال کی اشیاء رکھیں اور بیگ تیار کر دیا۔ ابھی میں بیگ لے کر کمرے سے نکلا ہی تھا کہ گیٹ پر بیل ہوئی۔ میں نے بیگ اماں کے تخت پر رکھا اور دروازہ کھولا۔ سامنے ہی ندیم کھڑا تھا۔ قادری سرکار کا خادم خاص۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے مجھے بڑے ادب سے سلام کیا اور بولا۔ ''تنزیل جی آپ کے لئے سرکار نے گاڑی بھیجی ہے۔ اگر زحمت نہ ہو تو اس میں تشریف لے چلیں۔!''

میں نے گردن ہلائی اور اماں سے اجازت لیکر مومی کو خدا حافظ کہہ کر گاڑی میں آ بیٹھا۔ اس آنے جانے کے چکر میں مجھے خیال ہی نہ رہا کہ ندیم کو میرے گھر کا پتا کیسے چلا۔؟

جب ہم خانقاہ قادری سرکار کے پاس پہنچے تو پونے نو بج رہے تھے۔ رسمی سلام و دعا کے بعد انہوں نے بلا تمہید کہنا شروع کیا۔ ''تنزیل میاں۔ جہاں ہم آپ کو بھیج رہے ہیں۔ وہاں ہمارے ایک مرید کا بیٹا خادم حسین آپ کا منتظر ہے۔ وہاں ضمنی الیکشن ہو رہے ہیں۔ گاؤں اور آس پاس کے لوگوں نے خادم حسین کو اس کی شرافت اور دیانت داری کے باعث منتخب کیا ہے۔ آپ کو جا کر اس کی انتخابی مہم کی نگرانی کرنا ہوگی اور اس کے معاملات کو بھی دیکھنا ہوگا۔''

انہوں نے مجھے سفر کی غرض و غایت سے آگاہ کیا۔

میں کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں انہیں دیکھنے لگا۔ انہوں نے میرا چہرہ پڑھ لیا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں تمام معاملات حلقے والے ہی دیکھیں گے۔ آپ صرف انتظامی امور دیکھیں گے، اور پھر جب تک عملی زندگی میں قدم نہیں رکھیں گے۔ دنیا کے اسرار و رموز کس طرح جان پائیں گے۔؟ اللہ کا نام لیکر جائیں۔ اللہ تعالیٰ نیک معاملات میں فرد کی نیت پر اسباب مہیا فرمانے پر قادر ہے۔!'' انہوں نے مجھے تسلی دی۔ ان کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔ وہ اعتماد جو اپنا سب کچھ ذات باری کو سونپنے، اس کی رضا میں ڈھل جانے پر عطا ہوتا ہے۔

''جی بہتر ہے۔!'' میں نے کہا۔

''اس علاقے میں دس بڑی مساجد ہیں۔ جن میں کافی لوگ نماز کے لئے پانچوں وقت حاضر ہوتے ہیں۔ خادم حسین کے والد غلام حسین سے کہیے گا کہ ان کے امام صاحبان سے آپ کو ملا دے۔!'' قادری سرکار مسکرائے۔ اور مجھے غور سے دیکھنا۔ ان کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ دانائی کا نور تھا۔

تب اچانک جیسے میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اور جیسے الہام کی طرح قادری سرکار کا سادہ سا، مگر ذہانت سے بھرپور منصوبہ میرے قرطاس ذہن پر روشن ہو گیا۔ مجھے رشک آ گیا ان پر۔ کتنی سادگی و پُرکاری سے انہوں نے ان لوگوں کو شکست سے دوچار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ جو بلاشبہ بے حد طاقت ور، وسیلہ مند صاحب اقبال ہوں گے۔ مگر انہیں جس زاویئے سے شکست ہوگی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا۔

''تم اپنی چالیں چلتے ہو اللہ اپنی تدبیر فرماتا ہے۔!'' قادری سرکار نے قرآن مجید کی ایک آیت مبارکہ کو پڑھا۔ واقعتاً اللہ غالب، حکمت والا کارساز ہے۔

''جایئے میاں اللہ بیلی۔!'' انہوں نے کہا۔ ''وہاں آپ تنہا نہیں ہونگے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور [illegible] آپ کے اوپر سایہ فگن رہے گی۔ انشاءاللہ۔''

میں نے نہایت ادب سے انہیں رخصتی کا سلام کیا۔ ہاتھ کو بوسہ دیا اور گاڑی میں آ بیٹھا۔ اسی اثنا میں [illegible] مرید میرا بیگ تھامے اگلی سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس کا نام عبدالشکور تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے [illegible] وی اور رش والے علاقے سے نکل کر اس کا رخ بیرون شہر جانے والی شاہراہ پر ہو گیا۔ ایک نئی دنیا کی طرف [illegible] میرے لئے بالکل اجنبی تھی۔

☆☆☆

عبداللہ شاہ گیلانی کے پہلے عوامی جلسے کے لئے بھرپور تیاریاں تھیں۔ پورے علاقے میں قد آدم پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ جس میں عبداللہ شاہ گیلانی، شاہ ہارون گیلانی کے ہمراہ نظر آ رہا تھا۔ شاہ ہارون گیلانی کی پس منظر کی تصویر لوگوں کو یاد دلا رہی تھی کہ عبداللہ شاہ گیلانی کس خاندان کا فرزند ہے اور اس کی سرپرستی کون کر رہا ہے۔ سیاست میں بیک گراؤنڈ اور گاڈ فادر کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارا امیدوار کتنا طاقت ور، مخالف کو کس طرح زچ کرنے والا، اور پھر مدِ مقابل کو کیسے نکیل ڈالے گا۔ اس سارے عمل کا سب سے دلچسپ، عبرت انگیز پہلو یہ ہے کہ ان خصوصیات کے حامل امیدوار کو جب ووٹ کی طاقت میسر آ جاتی ہے۔ تو وہ پھر ساری صلاحیتیں اپنے ہی ووٹر کو دبانے، ستانے، نچوڑنے اور تھپکیاں دینے میں صرف کر دیتا ہے۔ یہ اس خطے کی سیاست کا وہ پہلو تھا۔ جس کو سب جانتے ہوئے بھی نظر انداز کرتے تھے۔ اس تکلیف دہ تصور کے ساتھ۔ کیا کریں ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے۔ تن آسانی، مصلحت پسندی، بزدلی اور ذات برادری کے طلسم کے اسیر، مجبوری اور بے کسی کے نام پر بڑی خوشی سے اپنا استحصال کرواتے تھے۔ اور گڑھے میں پڑے لال بیگوں کی طرح اپنے سے اوپر نکلنے والوں کی ٹانگیں کھینچ کھینچ کر گڑھے کی محدود، پُرتعفن فضا میں خوشی خوشی سانس لے رہے تھے، اور نسل بڑھا رہے تھے۔

ہر جگہ بینرز اور فلیکس کی بہار آئی ہوئی تھی۔ عبداللہ شاہ گیلانی نجات دھندہ بن کر سامنے آ رہا تھا۔ نئی قیادت نیا جذبہ، نیا ولولہ۔ نئی بوتل میں پرانی شراب پبلسٹی کے اوپر بیچی جا رہی تھی۔ مگر لوگ یہ بھول رہے تھے کہ شراب جس قدر پرانی ہوتی ہے۔ اسی قدر نشہ آور، اور بے سود کرنے والی بھی ہوتی ہے۔

اصل پنڈال اتنا بڑا تھا کہ جس میں تقریباً پانچ ہزار آدمی سما سکیں۔ اسٹیج بہت لمبا چوڑا تھا۔ اسٹیج پر تقریباً پندرہ کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ جن کے آگے میزیں لگی تھیں۔ جن پر پھولوں کے گلدستے رکھے ہوئے تھے۔ معروف کمپنی کی منرل واٹر کی بوتلیں رکھی تھیں۔ ٹشو پیپرز کے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ کرسیوں سے آٹھ فٹ دور انتہائی خوبصورت ڈائس رکھا ہوا تھا۔ جس پر مائیک لگا ہوا تھا۔ یہ سارا سسٹم، جلسے کا، کھانے کا انتظام شہر کی ایک معروف فرم نے کیا تھا۔ اسٹیج کے عقب میں کھانے کا انتظام تھا۔ جہاں سے خوشبوؤں کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ جلسہ گاہ تقریباً بھر گئی تھی۔ مگر اسٹیج خالی تھا۔ جلسہ گاہ میں اسٹیج اور لوگوں کے درمیان تقریباً 15 فٹ کی جگہ خالی تھی۔ جہاں صرف سرخ رنگ کے قالین بچھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد لوگ قطار در قطار بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک شخص نے آ کر مائیک سنبھال کر روایتی انداز میں گفتگو کا آغاز کر دیا۔ لوگ بڑے اشتیاق سے مقررین خصوصاً عبداللہ شاہ گیلانی کا انتظار کر رہے تھے۔ اچانک گاڑیوں کا شور اٹھا اور سیاہ سرف گاڑیوں کے قافلے میں نمودار ہوئی۔ اس کی کھلی چھت میں عبداللہ شاہ گیلانی ہاتھ ہلاتے ہوئے لوگوں کے نعروں کا جواب دے رہا تھا۔ کئی لوگ گاڑیوں کے اس قافلے کے ساتھ ساتھ پیدل بھاگ رہے تھے۔ ان کے چہرے تمتما رہے تھے۔ آوے گا بھی آوے

گا۔سوتی قوم جگاوے گا۔عبداللہ شاہ آوے گا۔مخالفوں کو ٹھاہ۔۔۔عبداللہ شاہ۔عبداللہ شاہ۔۔دکھی دلوں کا سہارا۔عبداللہ شاہ ہمارا۔

عبداللہ شاہ کے چہرے پر بے حد روشنی تھی۔اس کے اردگرد سینکڑوں، ہزاروں لوگ تھے۔نعروں، محبتوں، والہانہ جذبات کے یہ منظر اس کو بے حد متاثر کر رہے تھے۔وہ بہت بچپن میں امریکہ چلا گیا تھا۔اس دوران اگر آیا بھی تو الیکشن کے حالات نہیں تھے۔اور اب جب آیا تو بحیثیت امیدوار الیکشن میں حصہ لے رہا تھا۔

اس کو نہیں معلوم تھا کہ اس ساری محبت، والہانہ انداز، لوگوں کے جوش و ولولے کے پیچھے عبداللہ شاہ کی محبت نہیں، شاہ ہارون گیلانی کی دولت، اثر ورسوخ اور حکمت عملی کام کر رہی ہے۔

پنڈال کے مرکزی دروازے پر جا کر گاڑیاں رک گئیں۔پنڈال کے مرکزی دروازے سے اسٹیج تک سرخ قالین سے راستہ بنایا گیا تھا۔جس کے دونوں اطراف لوگ کھڑے تھے۔جونہی عبداللہ شاہ گیلانی نے اپنی سیاہ سرف سے قدم نیچے رکھے۔خیر مقدمی نعروں سے فضا گونج اٹھی۔سینکڑوں لوگوں کے جلو میں عبداللہ شاہ نے اسٹیج کا رخ کیا۔لوگ نعرے لگاتے۔پھول لٹاتے رہے۔اسٹیج کے قریب جیسے ہی عبداللہ شاہ پہنچا۔اچانک ٹھٹک کر رک گیا۔اسٹیج کے عین سامنے وہیل چیئر پر بڑے شاہ جی شاہ سکندر گیلانی بیٹھے ہوئے تھے۔وہ آگے بڑھ کر بڑی سعادت مندی سے ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔''پاپا آپ یہاں۔؟ مجھے بتانا تھا۔ہم ساتھ آجاتے۔''

شاہ سکندر گیلانی نے بڑی محبت اور فخر سے بیٹے کو دیکھا اور بولے۔''ہمیں تو آپ کو یہاں سے دیکھنا تھا اور یہاں سے آپ کو وہاں تک۔۔۔عروج پاتا ہوا دیکھنا ہے۔''

''پاپا آپ میرے ساتھ اوپر چلیں۔!''اس نے بڑے ناز سے باپ سے اصرار کیا۔

''اقتدار کی ابتداء کیجئے عبداللہ شاہ۔!'' شاہ سکندر گیلانی نے مسکراتے ہوئے اسٹیج کی جانب جانے کا اشارہ کیا۔عبداللہ شاہ نے باپ کے ہاتھوں کو تھام کر بوسہ دیا۔پیروں کو ہاتھ لگایا اور آگے بڑھا۔سینکڑوں افراد نے باپ بیٹے کی محبت اور احترام کا یہ نظارہ دیکھا اور تسلیم کیا کہ شاہ سکندر گیلانی کے خاندان میں اخلاقی روایات، بزرگوں کا احترام اور نوجوانوں کی سعادت مندی آج بھی باقی ہے۔

عبداللہ شاہ گیلانی نے اسٹیج کا رخ کیا۔اس کے ساتھ بہت سارے لوگ بھی اسٹیج پر چڑھ گئے۔درمیان کی سب سے اونچی کرسی پر عبداللہ شاہ بیٹھا۔اس کے بعد اردگرد کے لوگ ان کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔شام پڑنے لگی تھی۔ٹھیک 6 بجے عبداللہ شاہ نے اپنے خطاب کا آغاز کیا۔نرم و دھیما سا عبداللہ شاہ گیلانی۔جب اس نے بولنا شروع کیا تو بڑے شاہ جی شاہ سکندر گیلانی اور پنڈال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو حیرت آمیز جھٹکا لگا۔عبداللہ شاہ گیلانی نے جو بولنا شروع کیا تو سماں باندھ دیا۔وہ امریکا کا تعلیم یافتہ، ڈیبیٹ سوسائٹی کا صدر اپنے خطاب کے جوہر دکھا رہا تھا۔مجمع خوشی اور مسرت سے تالیاں بجاتے ہوئے قدرے آگے کھسک آیا تھا۔بڑے شاہ جی شاہ سکندر گیلانی کی وہیل چیئر رش کے وجہ سے آگے آگئی تھی۔انہیں احساس بھی نہ ہوا تھا کہ وہ کتنے آگے بڑھ آئے ہیں۔پنڈال کے باہر کھڑی ہوئی بس کی چھت پہ کھڑے رحیم شاہ نے اپنی گھڑی کی جانب نگاہ کی۔منٹ کی سوئی ساڑھے 6 کے ہندسے کو چھو رہی تھی۔

تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ٹھیک ساڑھے چھ بجے عبداللہ شاہ گیلانی نے اپنا خطاب ختم کیا۔لوگوں نے بے قابو ہو کر نعرے بازی شروع کر دی۔عبداللہ شاہ گیلانی مسکراتے ہوئے، تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ ہاتھ ہلا ہلا کر مجمعے کے نعروں کا جواب دے رہا تھا۔ساتھ ہی وہ اپنے باپ شاہ سکندر گیلانی کو متلاشی نگاہوں سے ڈھونڈ رہا تھا۔مگر وہ ہجوم میں کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے پلٹا اور اسٹیج پر رکھی ہوئی کرسیوں

کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ کرسی پر بیٹھ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک فلک شگاف دھماکا ہوا۔ عبداللہ شاہ [illegible] جیسے کانوں کے پردے پھٹ گئے ہوں۔ اس نے سامنے دیکھا ہجوم میں دھوئیں اور گرد کے سوا [illegible] تھا۔ اچانک اس نے اوپر دیکھا۔ ہوا میں ایک وہیل چیئر قلابازی کھاتی ہوئی نیچے کی طرف گر رہی تھی [illegible] پر بیٹھے شاہ سکندر گیلانی غائب تھے۔

☆☆☆

گرد، غبار۔ چیخ و پکار، ملگجا اندھیر، گوشت جلنے کی بدبو، آہیں، سسکیاں، کراہیں، خون، دہشت مایوسی، نامرادی، حادثہ کتنی چیزوں سے عبارت ہے۔ عبداللہ شاہ گیلانی جس وجود سے جما تھا۔ اسی وجود کا ایک ہاتھ فضا میں اڑتا ہوا اس کے سامنے آن گرا تھا۔ سفید خوبصورت ہاتھ، نرم و ملائم سفیدی مائل سیاہ بال جو سرمئی ہو رہے تھے۔ اس کی انگلیوں سے جڑے گلابی مائل سرخ ناخنوں والا یہ ہاتھ۔ وہ ہزاروں میں پہچان سکتا ہے۔ پھر اس ہاتھ کی انگلی میں پلاٹیم کی سفید انگوٹھی میں جڑا سرخ جگمگاتا یاقوت جو خون کی طرح سرخ چمک دار تھا۔ کلائی میں تین باریک موتیوں والا سیاہ دھاگا۔ جو نجف اشرف سے بڑے شوق سے لائے تھے۔ ابھی تک کلائی میں پڑا ہوا تھا۔ کہنی سے جدا ہاتھ۔ عبداللہ شاہ گیلانی کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ یوں جیسے کہہ رہا ہو۔ ''اب تم مجھے تھام لو۔ بچپن میں تم ان ہی انگلیوں کو پکڑ کے لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھتے تھے۔ اب تم آؤ، اس بڑھاپے کو تھام لو۔ اس کو اپنے جوان ہاتھوں سے، مضبوط بدن کی قوت سے سہارا دو۔''

عبداللہ شاہ گیلانی نے جیسے کسی غیر مرئی طاقت کے زیر اثر اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

اچانک جیسے کسی نے اسے زور سے دھکا دیا۔ عبداللہ شاہ گیلانی نے دیکھا، فیقا اسے کھینچ رہا تھا۔ فیقے کے انداز میں عجیب سی وحشت تھی ''چلیں شاہ جی جلدی چلیں۔۔۔''

وہ ایک ٹرانس کے عالم میں اس کے ساتھ گھسٹنے لگا۔ فیقا اسے ڈائس کے عقبی حصے کی طرف کھینچ لایا۔ جہاں کھانے کی میزیں گڈمڈ پڑی تھیں۔ کئی دیگیں الٹ گئی تھیں۔ سالن، چاول، فیرنی سب اس میں ملے جلے ملغوبے کی صورت پڑے تھے۔

لوگ یوں بھاگ رہے تھے کہ جس کا جس طرف منہ اٹھا نکل بھاگا۔ افراتفری میں تمام انتظامات تباہ ہو گئے تھے۔ گوشت، چاول،، فیرنی کی خوشبو، خون، مٹی، گرد و غبار، بارود کے ساتھ مل کر عجیب وحشت انگیز بو پیدا کر رہی تھی۔

اچانک چاروں طرف سے سائرن بجنے لگے۔ پولیس کی گاڑیاں، ایمبولینس، مختلف چینلز کی گاڑیاں کوریج ٹیم کے ساتھ پہنچنے لگیں۔ فیقے نے عبداللہ شاہ گیلانی کو ایک کالی ٹیوٹا میں بٹھا کر گاڑی اسٹارٹ کی اور ایک زناٹے کی آواز کے ساتھ نکلتا چلا گیا۔ کئی لوگ بے ساختہ انہیں اس تیزی سے بھاگتا دیکھ کر۔ زخمیوں کو چھوڑ کر جاتے ہوئے، محسوس کر کے بے تحاشا چیخنے اور گالیاں دینے لگے۔ ان میں سے کئی نے فیقے اور عبداللہ شاہ کو پہچان لیا تھا۔ خوف اور جان بچانے کا طاقت ور جذبہ، حفظ مراتب کو بری طرح کچل دیتا ہے۔

پتا نہیں کیسے خود کو عبداللہ شاہ گیلانی نے گھر میں پایا۔ نازاں اس کو دیکھتے ہی چیخی۔ ''عبداللہ۔۔۔!''

''کیا ہوا۔؟'' اس کی ماں اس تیزی سے اٹھی کہ اس کا دوپٹا سر سے پھسل گیا۔ سیدانی کو اپنے دوپٹے کی پرواہ نہیں تھی۔ اس کے سامنے تو گرد و غبار میں اٹا ہوا بے رنگ، داغ دار کپڑوں کے ساتھ عبداللہ شاہ کوئی چیز اپنے سینے سے چمٹائے کھڑا ہوا تھا۔

''میرے بچے۔!'' اچانک کسی نے اس لوتھڑے [illegible] اس طرح سیدھا بیٹھا جیسے کوئی عمارت اپنی ہی بنیادوں پر زمیں بوس ہوتی ہے۔ [illegible] شاہ گیلانی کے سینے سے کوئی چیز چمٹائے ہاتھ کھل گئے۔ اور اس کے ساتھ ہی سکندر گیلانی کا ہاتھ [illegible] کھا کر شاہ ہارون گیلانی کے دونوں قدموں کے درمیان جا رکا۔

''ہائے میں مرگئی۔!'' شاہ ہارون گیلانی کی بیگم نے تڑپ کر کہا، اور [illegible] صحن مار کر غش کھا کر گری اور بے ہوش ہوگئی۔ حادثہ کتنا ذکی الحس ہوتا ہے۔ لمحے بھر میں خوف کی لہر بن کر راہوں میں سرایت کر جاتا ہے۔

''عبداللہ۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے عبداللہ شاہ کے گالوں کو تھپتھپایا۔ ''کچھ تو بولو۔۔!''

''پاپا۔۔۔ پاپا۔۔۔۔!'' نعمان شاہ چیختا ہوا اندر داخل ہوا۔ ''بھائی کے جلسے میں دھماکا ہوگیا ہے۔ تایا جان بھی شہید ہوگئے۔!''

''کیا۔۔۔؟'' شاہ ہارون گیلانی کی آواز ایک چیخ کی صورت میں نکلی۔ انہوں نے عبداللہ شاہ گیلانی کو وہیں چھوڑا اور تیزی سے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ اندر آتے ہی انہوں نے نہایت تیزی سے اپنے موبائل فون کے نمبر ڈائل کیئے۔ ''تم کہاں ہو۔۔!'' انہوں نے سلسلہ ملتے ہی سوال کیا۔

''میں جی ایئر پورٹ جا رہا ہوں۔۔۔'' دوسری طرف سے رحیم شاہ کی پرسکون اور مودب آواز سنائی دی۔

''ٹھیک ہے۔!'' انہوں نے مطمئن ہو کر ایک گہری سانس لی۔ اس کے بعد انہوں نے دوسرے نمبر پش کیئے۔ دوسری طرف سے چند لمحے میں سلسلہ بحال ہوگیا۔ ''تمہیں! اچھی طرح معلوم ہے نا تمہیں کیا کرنا ہے۔؟'' انہوں نے خشک لہجے میں سوال کیا۔ وہی لہجہ، وہی طنطنہ جس سے روح کانپ جاتی تھی۔

''جی سرکار جی۔!'' دوسری طرف سے اعتماد سے بھرپور آواز آئی۔ ''آپ بالکل بے فکر رہیں۔ تھوڑی دیر میں ہی آپ کو اطلاع مل جائے گی۔''

''شاباش۔!'' انہوں نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

''آجاؤ۔!'' انہوں نے کہا۔

دروازہ کھلا۔ ان کی بیگم اندر داخل ہوئیں۔ ''آپ یہاں ہیں باہر قیامت مچی ہے۔'' وہ بولیں۔ ''پریس والوں سے پورا ڈرائنگ روم بھرا ہوا ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ عبداللہ شاہ کو میں نے بیڈ روم میں بھیج دیا ہے۔ اس کے حواس درست نہیں ہیں۔ ڈاکٹر اشفاق اسے دیکھ رہے ہیں۔!''

''ہاں۔۔!'' انہوں نے ایک گہری سانس لی اور بولے۔ ''میرا بھائی شہید ہوگیا۔ ان تخریب کاروں نے اس کی جان لے لی۔'' ان کی آواز بھاری اور لہجہ گلوگیر تھا۔

''پتا نہیں آپ اور آپ کی حکومت کیا کر رہی ہے۔؟'' ان کی بیگم نے ناگواری سے کہا۔ ''پہلے جو آگ دوسروں کے آنگن کو جلاتی تھی۔ اب وہ ہمارے گھروں کی دیواروں کو چاٹ رہی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خود کو بچاتے بچاتے ہر چیز جل کر راکھ ہو جائے اور کف افسوس ملنے کے لئے بھی کچھ نہ بچے۔!''

''جتنی ممکن ہو اتنی سیکیورٹی، احتیاط سب کو ہی مہیا کی جاتی ہے۔ اب یہ تو نہیں ہوسکتا کہ اٹھارہ کروڑ کی حفاظت کے لئے، اٹھارہ کروڑ پولیس والے تعینات کر دیئے جائیں۔۔۔'' انہوں نے اکتاہٹ سے کہا۔

''رہنے دیجئے۔ اپنی تسلی، دلاسے۔'' وہ چیخ کر بولیں۔ ''اگر اٹھارہ کروڑ پولیس والے بھی ہوتے نا تو وہ بھی وی آئی پیز کی ڈیوٹیاں کر رہے ہوتے۔ ان کے بچوں کو اسکول، کالج [illegible] لانے پر مامور ہوتے اور بے

چارے عوام صرف ان کی تنخواہوں کے لئے نیلیس دے رہے ہیں۔ بے یار و مددگار، غیر محفوظ۔''

''پتا نہیں کس احمق نے تمہارے باپ کو تمہیں اتنا پڑھانے کا مشورہ دیا تھا۔ بی بی یہ لندن نہیں ہے۔'' ان کا لہجہ تبدیل ہونے لگا۔ ''یہاں وہی ہوگا جو ہم چاہیں گے۔ یہ عوام کی محبت کا جو درد تمہیں اٹھتا ہے نا اس کو کنٹرول کرو۔ یہ آکسفورڈ کا ڈیبیٹ ہال نہیں۔ ہارون گیلانی کا گھر ہے اور تم اسکی بیوی۔۔!''

''شاہ جی خدا کے غضب سے ڈریں۔!''

''بس۔۔۔ بہت ہوگئی۔!'' انہوں نے اپنا ہاتھ بلند کر کے بحث بند کروی۔ ''آپ وہی کیجئے جو اس موقع کا تقاضا ہے۔ ان معاملات کو چھوڑ دیئے، بڑا وقت پڑا ہے۔!'' وہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

ان کی بیگم انہیں دیکھتی رہیں۔ وہ کیا کر سکتی تھیں۔ انہیں اس شعلہ و شبنم، بدلحاظ اور بامروت، دلکش اور ظالم شخص سے پیار بہت تھا۔ وہ پیار جو عشق کی سرحدوں کو چھوتا ہو۔ اُس میں ہر حال میں جھکنا ہی پڑتا ہے۔ انہوں نے اپنے آنسو پونچھے۔ اسی وقت نازاں اندر داخل ہوئی۔ اس کی آنکھیں بے حد سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ وہ ذرا بھی روتی تھی تو اس کی آنکھیں سوج جاتی تھیں اور آج تو اس کا غم بہت بڑا تھا۔ اس کا منگیتر ٹوٹ گیا تھا، بکھر گیا تھا۔ اس کا تایا شہید ہو گیا تھا۔ وہ تایا جو روز اس کا منہ دیکھ کر صبح کرتا تھا۔

''امی یہ سب کیا ہو گیا ہے۔؟'' نازاں ماں سے لپٹ کر سسک پڑی۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولیں۔ بس اس کو خود سے لپٹائے ہوئے اس کی پشت کو تھپتھپاتی رہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ لفظ اپنے تاثر کو منتقل کرنے میں بے بس ہو جاتے ہیں۔ اس سے صرف وجود کی حرارت اور لمس کا احساس ہی تسلی، سہارا، اپنائیت، دکھ میں راحت دیتا ہے۔ تنہائی میں دوئی پیدا کرتا ہے۔ اور یہی لمحہ ان پر وارد ہو رہا تھا۔

شاہ ہارون گیلانی جب میڈیا والوں کے سامنے آئے، تو ان کے چہرے کے تاثرات اور بدن بولی میں ایک خاص قسم کا اعتماد تھا۔ انہیں دیکھتے ہی کیمروں کے شٹر آن ہو گئے۔ فلیش لائٹس کے جھماکے ہونے لگے۔ اچھا خاصا شور ہونے لگا۔ سب بیک وقت بولنے لگے۔ انہوں نے ہاتھ بلند کیا۔ فضا میں جیسے اچانک خاموشی چھا گئی۔

''میں زیادہ گفتگو نہیں کرونگا۔۔!'' شاہ ہارون گیلانی کی بھاری اور پر اعتماد آواز گونجی۔ ''میں آج اور اس لمحے اپنے لوگوں کو، اپنے بھائیوں کو، اپنی قوم کو صرف ایک مختصر سا پیغام دینا چاہتا ہوں۔ یہ بم دھماکے، خود کش حملے ان میں صرف آپ کی ہی نہیں، آپ کے پیاروں ہی کی نہیں، ہمارے بھی رشتوں کی جانیں جاتی ہیں۔ جس طرح ہمارے عوام دشمنوں کے نشانے پر ہیں۔ اسی طرح ہمارے لیڈر، رہنما، حکومتی ارکان بھی نشانے پر ہیں۔ تخریب کار، دہشت گرد سن لیں اور اچھی طرح سن لیں کہ وہ ہمارا جمہوری عمل، ہمارے انتخابی معاملات کسی صورت سبوتاژ نہیں ہونگے۔ ہم جمہوریت کے لئے قربانیاں دے سکتے ہیں۔ سُو دے رہے ہیں، اور دیتے رہیں گے۔ یہ وقت متحد رہنے کا۔ باہمی اختلافات دور کرنے ایک ہونے کا ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو۔ بھائی جان سکندر شاہ گیلانی کی قربانی، ان کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔'' ان کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

اس وقت وہ ایک ایسے قومی رہنما معلوم ہو رہے تھے جو اپنی قوم کے لئے اپنا سب کچھ لٹانے کے لئے آمادہ ہو۔ سلسلہء جاں فروشی کے ہم ہیں نقیب۔ قافلۂ حسینؓ کبھی رُکا ہی نہیں۔ پورا ملک انہیں براہ راست دیکھ رہا تھا۔

ان کے خیالات، ان کے تاثرات میڈیا کے ذریعے عوام تک پہنچ رہے تھے۔ اور عوام ان کے عزم اور حوصلے پر والہ و شیدا ہو رہے تھے۔

ہر چینل کے لئے تخریب کاری کا یہ واقعہ جس میں ایک اہم وفاقی وزیر کے سگے بھائی کی جان چلی گئی ہو۔

بے شمار زخمی اور کئی شہید ہوئے ہوں، اور تعلق ضمنی الیکشن سے جڑا ہو، بہترین بریکنگ نیوز، ہاٹ کیک تھا۔ جس کو عوام تک پہنچانا بے حد ضروری تھا۔ اور ابھی تو دیگر معاملات نے سامنے آنا تھا۔ سب سے طاقتور حریف کے انٹرویو، شہیدوں کے وارثین، زخمیوں کے لواحقین کام کرنے والے ایک ایک پہلو سامنے لانا تھا۔

اچانک اسی دوران اسکرین کے نچلے حصے پر بریکنگ نیوز کا فلیش ہوا۔ اور بریکنگ نیوز چلنے لگی۔ ائیر پورٹ جانے والی ایک کار بریک فیل ہو جانے کی وجہ سے بے قابو ہو کر پل کے نیچے گر گئی اور اس میں موجود ڈرائیور موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ ہلاک ہونے والے کا نام رحیم شاہ بتایا جاتا ہے۔

شاہ ہارون گیلانی نے خبر پڑھی اور خفیف سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں کے گوشوں پر نمودار ہوئی۔ یہ اپنا بالا بڑے کام کا آدمی ہے۔ انہوں نے سوچا اور فون کی جانب متوجہ ہو گئے۔ جو بہت سریلی سی دھن بجا رہا تھا۔

''ہیلو۔۔۔!'' انہوں نے کہا۔ ''کہو کیا بات ہے؟''

''شاہ جی۔!'' دوسری طرف سے احمد اورنگ زیب کی آواز آئی۔ جو ان کا میڈیا ایڈوائزر تھا۔ ''اظہر صدیقی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔!''

''میں فی الحال بات نہیں کرنا چاہتا۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے بیزاری کا اظہار کیا۔

''شاہ جی چند لمحوں کے لئے بات کر لیجئے۔ اظہر صدیقی کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ کتنے بڑے کالم نگار ہیں اس اخبار کے۔!'' احمد اورنگ زیب نے انہیں آمادہ کرنا چاہا۔

''تمہاری رائے میں ملنا ضروری ہے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے سوال کیا۔

''شاہ جی۔!'' احمد اورنگ زیب نے کہا۔ ''حادثے رک تو نہیں سکتے۔ سب نے ہی چلے جانا ہے۔ مگر حادثے بعض اوقات رخ بھی تبدیل کر دیتے ہیں۔!''

''تم بھی آ جاؤ۔!'' شاہ ہارون گیلانی کے ذہن رسا نے چند لمحوں میں فیصلہ کر لیا۔ اور ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد احمد اورنگ زیب، اظہر صدیقی کے ساتھ شاہ ہارون گیلانی کے پاس پہنچ گیا۔ وسیع و عریض حویلی میں ان کے ملنے جلنے والے، تعزیت کو آنے والے، پُرسا دینے والے، کسان، ہاری سب جمع تھے۔ شاہ سکندر گیلانی کی باقیات آ چکی تھیں۔ انہیں ایک کمرے میں مرتب کیا جا رہا تھا۔ کئی ڈاکٹرز اور پیرا میڈیکل اسٹاف تندہی سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ شاہ ہارون گیلانی کے ایک اشارے پر پورا ہاسپٹل حویلی میں سمٹ آیا تھا۔

موت بھی ہنگامہ اور زندگی ہنگامہ در ہنگامہ۔ بعض چیزیں، جس قدر اپنی حقیقتوں میں سفاک ہوتی ہیں۔ مگر اُسی قدر ضروری بھی۔ دکھ، غم، سہنے کی کیفیت ہر سطح، ہر طبقے میں اپنا علیحدہ مزاج رکھتی ہے۔ کہیں موت، ہنگامہء کارزارِ حیاتی کو منجمد کر دیتی ہے، اور کہیں موت ہلچل، منصوبہ بندی، نئے معاملات کی نقیب ثابت ہوتی ہے۔ شاعر نے کہا۔ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا۔ جب لاد چلے گا بنجارہ۔ مگر یہ نہیں کہا بعد میں ٹھاٹھ کو سنبھالنے والے کیسی کیسی چالیں چلتے ہیں۔ ایسی چالیں جہاں مخالف ایسا چت گرتا ہے کہ نہ حواس سلامت رہتے ہیں اور نہ جان۔

اپنے وسیع و عریض کمرۂ خاص میں انہوں نے بلا تمہید اظہر صدیقی سے پوچھا۔ ''آپ فوراً کیوں ملنا چاہتے تھے۔؟''

''سر۔!'' اظہر صدیقی نے بنا کسی ہچکچاہٹ کے کہنا شروع کیا۔ ''یہ سارا معاملہ ضمنی الیکشن سے جڑا ہے۔ اس موقع پر آپ کے ساتھ جو حادثہ ہوا ہے۔ اس حادثے کو آئندہ الیکشن کی بنیاد کے لئے بہت اچھی طرح

استعمال کیا جاسکتا ہے۔ میں نے آپ کی گفتگو دیکھی تھی۔ جو دو گھنٹے قبل آپ نے میڈیا کے نمائندوں
تھی۔ آپ آگے بڑھیں۔!''
''کہاں۔؟''
''وہاں جو ہر سیاستدان کا خواب ہے۔ جس کے لئے سارے پاپڑ بیلے جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے
تجربے، دولت اور شخصیت کے اعتبار سے آپ موزوں تر بھی ہیں۔'' اظہر صدیقی نے گفتگو میں ایک وقفہ دیا۔
اور ان کو غور سے دیکھا۔

شاہ ہارون گیلانی کا چہرہ بے تاثر تھا۔ وہ گھاگ سیاست دان تھے اور جانتے تھے کہ غیر ضروری اشتیاق ظاہر کرنا قیمت بڑھانے کا جواز بن جائے گا۔ مگر اظہر گیلانی کی تیز نگاہوں سے ان کی آنکھیں پڑھی گئیں۔ چغل خور آنکھیں۔

''وزارت عظمیٰ۔!'' اظہر گیلانی صاف صاف لہجے میں کہا۔

''عوامی ہمدردی کا ایک سیلاب آسکتا ہے۔ پارٹی میں آپ کی پوزیشن کو دیکھا جائے تو آپ ابھی کم از کم دس طاقتور افراد سے نیچے ہیں۔ وہ جو آپس میں رشتے دار ہیں۔ جبکہ تھوڑی سی پلاننگ سے آپ سپر سیڈ ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں گے تو ہم آپ کے ساتھ ہونگے۔۔!''

''کس طرح۔؟'' احمد اورنگ زیب اس لمحے جیسے شاہ ہارون گیلانی کا ترجمان ہو گیا۔ ان کی کیفیات، دلی جذبات اور اندر کے موسموں کا۔

''ہر چیز کی، ہر صلاحیت کی، ایک قیمت ہوتی ہے۔ صحیح افراد کو، صحیح وقت میں، صحیح قیمت ادا کر دی جائے تو پھر کامیابی کا نہ رکنے والا سفر شروع ہو جاتا ہے۔!'' اظہر صدیقی نے جواب دیا اور کہا۔ ''قیمت کے ساتھ ساتھ جب مفادات میں بھی یکسانیت آجائے یا یوں کہہ لیں کہ مشترکہ مفادات ہوں تو پھر ساتھ طوالت اختیار کر سکتا ہے۔ جب آپ وزیر اعظم کا منصب سنبھالیں تو پھر ہمارا خیال رکھئے گا۔ ورنہ ہم رائے عامہ آپ کے حق میں بنا سکتے ہیں۔ تو پھر بگاڑنے کا ہنر تو ہمیں لازماً آتا ہی ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے اتنی دیر میں پہلی بار مداخلت کی۔ ''تم احمد اورنگ زیب سے معاملات طے کرلو۔۔!'' ''شاہ ہارون گیلانی اچانک آپ سے تم پر آگئے۔ جب قیمت دیکر خریدنے کا فیصلہ کرلیں تو پھر تکلفات غیر ضروری ہو جاتے ہیں۔'' جتنا طے ہوگا اس کا آدھا پہلے اور آدھا حلف اٹھانے کے بعد۔!''

''ٹھیک ہے سر۔!'' اظہر صدیقی نے خوش دلی سے کہا۔ ''مجھے اجازت دیجئے۔ آپ اس موقع پر بے حد مصروف ہونگے۔!''

شاہ ہارون گیلانی نے سر ہلایا، اور احمد اورنگ زیب کی طرف دیکھا۔ احمد اورنگ زیب فوراً ہی اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں اظہر صدیقی کو باہر تک رخصت کر آؤں۔!''

اظہر صدیقی اور احمد اورنگ زیب انہیں سلام کر کے رخصت ہو گئے۔ باہر آکے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اظہر صدیقی نے اپنی جیب سے ایک چیک نکالا اور احمد اورنگ کی طرف بڑھایا۔ ''یہ تمہاری نذر۔۔۔!''

احمد اورنگ زیب نے چیک پر نظر ڈالی۔ ''ایک کے ساتھ سات صفر۔۔۔!''

''لیکن اپنی ڈیمانڈ تو بتاؤ۔!''

''معمولی سی صرف پچاس کروڑ۔۔۔!'' اظہر صدیقی نے کہا اور اس کو دیکھا۔ احمد اورنگ زیب نے ایک لمحے کے لئے سوچا پھر اثبات میں گردن ہلا دی۔

''شاہ جی سے پوچھنا ہے تو پوچھ لو۔!'' اظہر صدیقی نے سرسری لہجے میں کہا۔

''شاہ ہارون گیلانی کے لئے پیسہ کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔۔۔!'' احمد اورنگ نے کہا۔ ''پیسا ان کے قدموں کی دھول بن کر ان کے ساتھ ساتھ رہتا ہے یہ تو معمولی سی رقم ہے۔!''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔!'' اظہر صدیقی مسکرایا۔ ''سمندر سے چند بالٹیاں نکالنے سے پانی کم نہیں ہوتا ہے۔''

''لیکن۔۔۔!'' احمد اورنگ زیب نے کہا ''مجھے سرف چاہیے۔!''

''ٹھیک ہے مل جائے گی۔!'' اظہر گیلانی نے کہا۔ ''میں کب آؤں''۔

''پرسوں۔۔۔!'' احمد اورنگ نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔!'' اظہر صدیقی نے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ احمد اورنگ زیب دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی آگے نکل گئی۔

احمد اورنگ زیب حویلی کے اندر چل دیا۔ جب وہ شاہ ہارون گیلانی کے پاس پہنچا تو وہ کئی لوگوں میں گھرے ہوئے تھے۔ یہ سب ان کے عزیز و اقارب تھے۔ احمد اورنگ زیب خاموشی سے مودب کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر میں لوگ آہستہ آہستہ چلے گئے۔ احمد اورنگ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے ان کے قدموں میں آ بیٹھا۔ ''شاہ جی پچاس کروڑ مانگ رہے ہیں۔ میں نے پرسوں بلایا ہے۔!''

''ٹھیک ہے۔!'' انہوں نے لاپرواہی سے کہا۔ ''دے دو۔۔!''

''اور یہ۔۔۔!'' احمد اورنگ زیب نے جیب سے چیک نکالا۔ اور ان کے قدموں میں رکھ دیا۔ ''یہ انہوں نے مجھے دیا ہے۔ آپ کا صدقہ''۔

''اچھا۔'' شاہ ہارون گیلانی مسکرائے۔ ''صرف یہ۔۔!''

''سرف بھی دے گا۔۔۔!'' اس نے بتایا۔

''اچھی بات ہے۔!''

''حضور یہ سب آپ کی جوتیوں کے طفیل ہے۔ آپ سے جڑا ہوں تو لوگ آنکتے ہیں۔ ورنہ میں کیا، میری بساط کیا۔ آپ نے ہی انگلی تھام کے چلنا سکھایا۔ پڑھنا لکھنا۔ بات چیت کا سلیقہ۔ شاہ جی ہم تو آپ ہی سے بنے ہیں۔ پھر مالک سے کچھ چھپانا تو نمک کی توہین ہے۔'' احمد اورنگ زیب کی آواز بھرا گئی۔

شاہ ہارون گیلانی نے احمد اورنگ زیب کے جھکے ہوئے سر کو تھپتھپایا۔ ''تم ہمارے بچے ہو۔۔!''

''بس یہیں مروں۔!'' احمد اورنگ زیب نے ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھا۔

شاہ ہارون گیلانی نے بہت عمدہ جدید سہولیات سے آراستہ ایک بورڈنگ اسکول کھول رکھا تھا۔ جس میں تقریباً دو ہزار بچے پڑھتے تھے۔ پانچویں سے انٹر تک کے اس اسکول میں غریب اور نادار بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ رہائش، خوراک، کتابیں ہر چیز شاہ ہارون گیلانی کا ٹرسٹ فراہم کرتا تھا۔ ان بچوں کی بچپن سے ہی برین واشنگ کر کے انہیں صرف اور صرف شاہ ہارون گیلانی لکھایا، پڑھایا، سکھایا جاتا تھا۔ سینکڑوں بچے اس اسکول سے فارغ التحصیل ہو چکے تھے اور زندگی کے مختلف معاملات میں مصروف تھے۔ لیکن وہ جہاں بھی تھے۔ جیسے بھی تھے۔ شاہ ہارون گیلانی ان کے گاڈ فادر تھے۔ ان کے احسانات کے بوجھ تلے دبے ہوئے، رواں، رواں قرض دار۔ اس اسکول کے ہی ذہین ترین بچے ان کے ذاتی معاملات میں آہستہ آہستہ شامل کئے جاتے۔ احمد اورنگ زیب، منیجر طارق۔ بالا وغیرہ جیسے بے شمار لیکن بظاہر چند، ان کی طاقت تھے۔ خاموش، پوشیدہ، طاقت ور، سریع الاثر۔

تصوف اور محبت کی اِس پراسرار دنیا کے حیرت ناک واقعات' اگلے ماہ ملاحظہ فرمایئے

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اِس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات ٹوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1).....مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2).....منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3).....اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

عزیز بچو!

اللہ تم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ پریشانیوں سے نجات اور سکون قلب حاصل کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے نماز کی پابندی اور تلاوت قرآن پاک..... نمازیں قضا کرنے والے سوائے اللہ کی ناراضگی کے کچھ نہیں پاتے' ایک بات یاد رکھو اللہ گن گن کر نہیں دیتا۔ وہ بے حساب عطا کرتا ہے تو اُس کو یاد کرتے وقت حساب کتاب مت رکھا کرو۔ سچے دل سے ایک بار ہی پکارا جانا ہی کافی ہوتا ہے مگر پکارو تو..... ماہ رمضان کی آمد آمد ہے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اِس بابرکت ماہ کو اپنے درمیان پائیں گے۔ میں نصیحت کروں گا کہ اِس ماہ کے تقدس کا خیال رکھا جائے خوب صدقہ خیرات کرو۔ کچھ بدنصیب پورا رمضان یہ سوچتے ہی گزار دیتے ہیں کہ افطار اور سحری میں کیا پکائیں اور کیا کھائیں..... اپنے آپ کو ایسے لوگوں کی فہرست میں شامل مت ہونے دینا۔ جتنی نیکیاں کما سکو کمانے کی سعی کرنا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ آخری رمضان ہو..... جو لوگ بچیوں کی شادی کے لیے مدد کرنا چاہیں وہ سچی کہانیاں کے دفتر فون کرکے بتا سکتے ہیں یا پھر بذریعہ خط مجھے مطلع کردیں..... اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

□ ممتاز۔ کراچی۔

o السلام علیکم! میرا نام ممتاز ہے۔ میری ماں کا نام سعیدہ ہے۔ میرے بیٹے کا نام کامران ہے۔ میرے بیٹے کی عمر 36 سال ہے اور اُس کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ رکاوٹ بہت آتی ہیں۔ بابا جان میں بہت غریب پریشان عورت ہوں۔ آپ میری مدد کریں۔ میرا بیٹا باہر دکان پر جاکر کام نہیں کرتا ہے۔ کوئی آسان سا حل بتادیں۔ میں نے اپنے بیٹے کامران پر بہت دعائیں پڑھ کر پھونکیں ہیں لیکن اِس پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔

☆: بیٹی ممتاز! اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دکھائے۔ ہر نماز کے بعد بیٹے پر الحمد شریف اور چاروں قل پڑھ کر ضرور دم کیا کرو۔ شادی کا خیال ابھی دل سے نکال دو۔ پہلے وہ اس قابل تو ہو کہ اپنی اور اپنی ماں کی ذمہ داری اٹھا سکے۔ بنا نوکری بیوی بچوں کو پالنا ممکن نہیں..... تم یہ دعا کرو کہ وہ راہِ راست پر آجائے۔ چلتے پھرتے حسبان اللہ ونعم الوکیل کا ورد کیا کرو۔

□ ایس کے۔ فیصل آباد

o محترم جناب بابا جان! السلام علیکم! عرض یہ ہے کہ بابا جان میں آپ کو کئی سالوں کے بعد خط لکھ رہی ہوں۔ بابا جان حالات شدید خراب ہوگئے ہیں۔ زندگی اتنی مشکل ہوگئی ہے کہ اب تو زندہ رہنے کو بھی دل نہیں کرتا۔ بابا جان میں بہت تھک گئی ہوں۔ اب میری ہمت جواب دے گئی ہے۔ بابا جان دشمن اتنے ہوگئے ہیں کہ اُن کی کوئی انتہا نہیں' بابا جی میرے شوہر پر جھوٹا پرچہ کروادیا ہے۔ پہلے بھی تقریباً ڈیڑھ سال پہلے آٹھ مہینے جیل میں رہے ہیں۔ اب پھر تقریباً دو ماہ سے جیل میں ہیں۔ بابا جی یہ سب میرے شوہر کا دور کا بھانجا ہے اُس کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے وہ خود لوگوں سے پیسے لے کر کھا گیا ہے۔ اور نام میرے شوہر کا لگادیا ہے کہ میں نے سارے پیسے اِن کو دیے ہیں۔ بابا جی اِس شخص کا ایبٹ آباد میں بھی آنا جانا تھا۔ اِس نے وہاں بھی میرے شوہر اور میرے بڑے بیٹے کا نام لے کر کہہ دیا کہ میں

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: II C-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 021-35893121 - 35893122

نے سارے پیسے اِن دونوں باپ بیٹوں کو دیے ہیں۔ وہاں پر بھی میرے بیٹے اور شوہر پر ایف آئی آر کٹ گئی۔ بابا جی پچھلے چار سال سے اِس شخص کی وجہ سے ہم پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ گئے ہیں۔ میرے شوہر کے بھانجے کا نام میں خط میں لکھ رہی ہوں۔ ساتھ ہی اپنے خاندان کے افراد کے نام عمر سمیت لکھ رہی ہوں۔ بابا جی میرے شوہر پر قرضہ بھی بہت ہے۔ دشمن بھی بہت ہیں۔ بڑا بیٹا بھی مصیبتوں میں پھنسا ہوا ہے۔ چھوٹا بیٹا پی آئی اے میں جاب کرتا ہے۔ اُس کی تنخواہ 18-17 ہزار ہے۔ گھر کے خرچے بڑی مشکل سے ہوتے ہیں۔ ہم قرضہ کیسے اور کہاں سے ادا کریں۔ بابا جی جس گھر میں ہم رہ رہے ہیں۔ یہ گھر ہم نے گیارہ سال پہلے خریدا تھا۔ بابا جی جب سے اس گھر میں آئے ہیں۔ ہمیں نقصانات ہی ہو رہے ہیں۔ جب بھی ہم اِس گھر کو بیچنے کا ارادہ کرتے ہیں یا اِس گھر سے جانے کا ارادہ کرتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی رکاوٹ آجاتی ہے۔ یا کوئی بڑی مصیبت آجاتی ہے۔ حالات کی وجہ سے بچے ڈپریشن کے مریض بن گئے ہیں۔ اگر ہم کوئی وظیفہ یا پڑھائی کسی کے بتانے پر کرتے ہیں تو ہم پر اُلٹا اثر ہو جاتا ہے۔ حالات بہتر ہونے کے بجائے اور بگڑ جاتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں اِس گھر میں جنات ہیں یا جنات کا گزر ہے۔ وہ آپ کے ہر کام میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ اور آپ کا رزق کھا رہے ہیں۔ بابا جی آپ بتائیں ہماری فیملی پر کوئی اثرات ہیں یا جادو ہے یا ہمارے گھر پر کوئی اثرات ہیں۔ ہماری فیملی پر کسی نے کوئی کالا جادو تو نہیں کروا دیا یا نظر بد کے اثرات ہیں۔ بابا جی کچھ ایسا بتائیں کہ میرے شوہر اور میرے بیٹے پر جو مقدمات ہیں وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں۔ دشمنوں اور قرضوں سے نجات مل جائے۔ دونوں بیٹوں کے لیے روزگار کے بہت اچھے اسباب بن جائیں اور ہمارا گھر بھی اچھی قیمت پر بک جائے۔ چھوٹا بیٹا پی ایچ ڈی کے لیے امریکہ یا کینیڈا جانا چاہتا ہے۔ اُس کا بھی کوئی اچھا سلسلہ بن جائے۔ اُس نے انگلش میں ایم فل کیا ہے۔ بڑا بیٹا امریکہ جانا چاہتا ہے۔ اُس کا ویزہ لگا ہوا ہے لیکن جانے میں رکاوٹ ہے۔

☆: بیٹی! تمہارا خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ حالات اس قدر خراب ہو گئے تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کیا۔ بہرحال سب سے پہلے کوشش کرو کہ اس گھر کو فروخت کر کے کہیں اور رہائش اختیار کر لو۔ بلا ناغہ 7 دن بعد نماز فجر کھلے صحن میں بیٹھ کر جہاں آسمان سر پر ہو سورۃ جن ایک بار پڑھو دانہ اور پانی پابندی سے فجر کے قریب چڑیوں کو ڈالو۔ بچوں اور میاں سے کہو وہ بھی بکثرت یا اللہ اور نصر من اللہ والفتح قریب کا ورد کریں انشاء اللہ جلد مسائل حل ہوں گے۔

□ شاہ بی بی۔ میر پور خاص

o محترم بابا جی! السلام علیکم! میں پہلی بار آپ کو خط لکھ رہی ہوں میرا ایک بہت اہم مسئلہ ہے۔ میری ساری زندگی ہی لڑکا تھا۔ اب یہ گیا تو میں زندگی ہار جاؤں گی کیونکہ میں ایک بیوہ ہوں۔ تین لڑکیوں کے بعد ایک لڑکا ہوا اور اللہ نے رحم کیا مجھ پر کہ بیٹا پچھلے سال سے 21 سال کی عمر میں بحرین گیا اور وہ وہاں فوج میں بھرتی ہوا اور میں بہت خوش ہوئی مگر وہاں ایک جھوٹی لڑکی کے ساتھ اُس کی منگنی ہو گئی، دوستی سے اور لڑکی نے اُسے پھنسا دیا مگر دو سال بعد لڑکی کی پوری فیملی والدین اور دادی پھوپو یہ سارے میرے بیٹے کے خلاف ہو گئے۔ لڑکی بھی نہیں دے رہے ہیں۔ کئی لاکھ بیٹے نے انہیں دیے۔ اب آپ مجھے میرے بیٹے کے لیے ایک تعویذ دے دیں تاکہ میں بحرین بھجوا دوں۔ اُن کا رشتہ ہو جائے۔ لڑکا خود بہت قرض دار ہے سال سے مجھے خرچہ نہیں دے رہا۔ آپ کو اللہ کا واسطہ دیتی ہوں آپ تعویذ جلدی دینا۔

☆: بیٹی! مجھے ذاتی طور پر خط لکھو اور ہمراہ جوابی لفافہ بھی ارسال کرو۔ تمہارے مسئلے کے حل کے لیے میں تعویذ تجویز کروں گا۔

□ عائشہ۔ کوئٹہ

☆: بیٹی عائشہ! تم جس قدر جلد ہو مجھ سے تعویذ منگوا لو اولاد کے مستقبل سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔ ہر نماز کے بعد 7 تسبیح یا حافظ یا حفیظ کی پڑھو اور دعا کرو۔ ہدیہ ارسال کرنے کے بعد تعویذ تیار کیا جائے گا۔ تم صبح و شام ایک ایک بار آیت الکرسی پڑھ کر بیٹے پر تصویر میں دم کر دیا کرو۔ میں بھی حصار میں لے رہا ہوں۔

□ شبانہ۔ کراچی

o پیارے بابا جان! السلام علیکم! بابا جان میں سچی کہانیاں بہت شوق سے پڑھتی ہوں اسی لیے ایک امید سے آج آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ دو مسئلے ہیں ایک میرا، ایک بھانجی کا۔ میرا نام شبانہ ہے اور بھانجی کا نام کنول ہے میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی کو دس سال ہوگئے اولاد نہیں ہے۔ ڈاکٹر اور روحانی علاج بہت کروایا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ جس دن سے شادی ہوئی ہے چھپکلیاں بہت تنگ کرتی ہیں۔ برتنوں میں کمرے میں غرض جہاں بھی میں ہوں اک دم سے نکل آتی ہیں۔ میں ڈر کر اچھل جاتی ہوں بابا جی میں بہت امید سے آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ میرے گلے میں تکلیف رہتی ہے (تھائیرائڈ) ہے۔ بھانجی کی شادی کا مسئلہ ہے۔ رشتے آتے ہیں لیکن بات نہیں بنتی۔ باجی بہت پریشان اور بیمار رہتی ہیں۔ تین بیٹیاں ہیں لیکن ابھی تک ایک کا بھی رشتہ نہیں ہوا کنول کی عمر نکلتی جارہی ہے۔ بابا جان کنول بہت نرم دل بچی ہے پھر اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ نماز بھی پابندی سے پڑھتی ہے۔

☆: بیٹی شبانہ! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ اپنے غدود کا مکمل علاج کرواؤ انشاء اللہ اس کے بعد اللہ اولاد بھی عطا کرے گا۔ چاہو تو مجھ سے اپنے لیے اور بھانجی کے لیے تعویذ منگوالو۔ ہدیہ اور جوابی لفافہ وصول ہونے کے بعد تعویذ تیار کرکے ارسال کیا جائے گا۔ حالات حسبِ منشا ہوتے ہی مجھے مطلع کرنا۔ تعویذ لینے کے بعد غائب ہوجانے سے حالات مزید مخدوش ہوجاتے ہیں رابطہ میں رہنے سے حل ضرور نکلتا ہے۔

□ ارشد۔ کراچی

o بابا جی اسلام علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ آپ نے اکتوبر 2014ء میں میری بہن کو رشتے کے لیے تعویذ دیا تھا فوراً ہی رشتہ آگیا۔ لڑکے والوں نے کہا سپلائی کام 20 ہزار تک انکم ہے مکان کرایہ کا ہے۔ بابا جی آپ پر ہم لوگوں کو بے حد اعتقاد ہے اللہ کا نام لے کر 5 فروری 2015ء کو نکاح کردیا پھر اُن کی ڈیمانڈ پر اکتوبر 2015 میں رخصتی کردی شادی کے بعد ہی بلیک میلنگ شروع کردی۔ آمدنی کچھ بھی نہیں ہے نہ سپلائی ہے اور نہ ہی وہ کوئی کام کرتے ہیں۔ اُس دن سے آج تک گھر کا کرایہ اور خانہ داری میں ہی چلا رہا ہوں آپ سے یہ مشورہ کرنا ہے کہ میں کیا کروں۔ اسی طرح چلاتا رہوں یا علیحدگی اختیار کرلوں۔ میرے حق میں کیا بہتر رہے گا۔ یہ بتاتا چلوں کہ ان کی وجہ سے میری اپنی شادی رُکی ہوئی ہے کیونکہ 15 ہزار کے اخراجات میں اکیلے ہی برداشت کررہا ہوں اور میری آمدنی اتنی ہی ہے، اگر بہنوئی کو لے کر چلوں تو میں اپنی شادی نہیں کرسکتا برائے مہربانی استخارہ کرکے بتائیں میرے لیے کیا کرنا بہتر رہے گا۔ بابا جی میرے لیے کوئی ایسا وظیفہ دیں کہ کچھ سپورٹ والی لڑکی سے میری شادی ہوجائے جو ہمیں تھوڑا سا تعاون کردے۔ بابا جی میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ضیاء احمد ولد بدرالدین کے پاس میری دو لاکھ کی رقم پھنسی ہوئی ہے۔ کافی عرصے سے اُس کے لیے کوئی ایسا وظیفہ دیں کہ مجھے رقم مل جائے اللہ تعالیٰ صحت اور سلامتی کے ساتھ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ بابا جی مسئلہ شدید ہے جلد جواب دینے کی کوشش کیجیے گا فقط آپ کی دعاؤں کا طالب.....

☆: بیٹے ارشد! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے اور تمہیں بہتر فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ بنا استخارہ رشتہ طے کرنا مناسب نہیں ہوتا۔ مجھے مطلع تو کیا ہوتا بہرحال ساری زندگی بھی ذمہ داری اٹھاتے رہو گے تو کچھ نہیں بنے گا بہن کو واپس بلالو۔ اس کی ذمہ داری اٹھاؤ۔ بہنوئی کو پالنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم اپنے دونوں مسائل کے لیے مجھ سے تعویذ منگوالو انشاء اللہ جلد کرم ہوگا۔

□ روبینہ۔ سانگھڑ

o السلام علیکم! محترم بابا جی! میں نے 8 تاریخ کو خط لکھا' اتنا ذہن خراب ہوگیا ہے' ٹینشن کی وجہ سے پتا بھی نہیں لکھا۔ برائے مہربانی میرے دونوں مسئلوں کے لیے کوئی تعویذ یا وظیفہ دے دیں۔ خدا کے واسطے اپنی بیٹی سمجھ کر میرے دونوں مسئلوں کا حل بتا دیں۔ ایک میرے بھائی کا ہے جو ہمارے ساتھ جانوروں کا سلوک کرتا ہے۔ دوسرا میرے خاوند کا ہے جو ہے ہی نشئی جو ہر قسم کا نشہ نہیں چھوڑتا۔ میرے دو بچے ہوگئے

ہیں جن کا کوئی سہارا ہی نہیں۔ میرا بھائی جو باہر سے آ ہی نہیں رہا ہے' آپ کے وظیفے سے ٹھیک ہوگیا تھا۔ اب ویسا ہی بگڑ گیا ہے' نہ پاکستان آتا ہے اور نہ شادی کا نام لیتا ہے۔ دُعا کریں کہ وہ ہم ماں' بہن کا اچھا بھائی اور اچھا بیٹا بن جائے اور اللہ کے واسطے' شادی کرلے۔ میرے خاوند کا نشہ کرکر کے ذہن ہی خراب ہوگیا ہے۔ وہ کوئی کام بھی نہیں کرتا اور نہ میری اور بچوں کی ذمے داری اُسے قبول ہے۔ اللہ کے واسطے' اس کے حبیبؐ کے واسطے' میری مدد کریں۔

☆ بیٹی روبینہ! اللہ تمہارے حال پر رحم فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ ہر نماز کے بعد 3 تسبیح پڑھو۔ ''اَللّٰھُمَ ھُدیٰ میرا شوہر'' پھر دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ شہزادی۔ کراچی۔

o جناب بابا جی! آداب وسلام! آپ کو یاد ہوگا کہ تقریباً تین ماہ پہلے میں نے آپ سے براہ راست تعویذ منگوایا تھا۔ میں اپنے شوہر کی بے راہ روی اور مار پیٹ سے عاجز آچکی تھی مگر خدا کا شکر ہے کہ اب وہ سدھر گئے ہیں۔ انہوں نے بری عادتیں چھوڑ دی ہیں۔ مار پیٹ بھی نہیں کرتے اور سب سے بڑی بات یہ کہ بچوں سے پیار کرتے ہیں اور گھر کا پورا خرچہ دیتے ہیں۔ آپ نے اطلاع دینے کو کہا تھا' سو اطلاعاً عرض کررہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کارِ خیر کا نیک اجر دے۔

☆ بیٹی شہزادی..... ! اللہ تعالیٰ تمہیں شاد و آباد رکھے۔ بیٹی! مجھے تمہارا خط یاد ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ خودکشی کے لیے سوچنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ زندگی تو اسی ذات پاک کی امانت ہے جو ساری کائنات کا مالک ہے۔ نماز کی پابندی برقرار رکھنا اور بچوں کو بھی نماز کی تلقین کرنا۔

□ ناہید۔ خان بیلا

☆ بیٹی ناہید! تمہارا رونا فضول ہے۔ جو چیز قسمت میں نہیں ہوتی' وہ نہیں ملتی ہے لہٰذا انسان کو صبر و شکر کرنا چاہیے۔ جو ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے' وہی ہوتا ہے۔ تم میری ایک نصیحت مان لو' رونا ترک کردو' گھر کا ماحول اچھا رکھو' ماں باپ کی خدمت کرو اور اللہ تعالیٰ سے چپکے چپکے دُعا کیا کرو۔ صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ بہت عطا [illegible] ہے۔ صرف ایک ماہ نمازِ عصر کے بعد سورۃ انبیاء [illegible] 10-9' 33-33 بار پڑھو اور دُعا کرو۔ مطمئن رہو۔ اللہ تعالیٰ بہت جلد کرم کرے گا۔

□ زارون شاہ۔ پشاور۔

o مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنا مکان فروخت کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ فروخت نہیں ہورہا ہے جس کی وجہ سے سب گھر والے پریشان ہیں۔ پارٹی دیکھنے آتی ہے' اس کے بعد واپس نہیں آتی' قیمت بھی مناسب نہیں لگتی ہے۔ آپ ایسا تعویذ دیں جس کی برکت سے یہ مسئلہ حل ہوجائے۔

☆ بیٹے زارون! ہر نماز کے بعد 101 بار سورۃ الناس پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے آفس فون کرکے معلومات حاصل کرلو۔

□ شگفتہ۔ منڈی بہاؤالدین

o بابا جی! السلامُ علیکم! میں آپ کی بیٹی شگفتہ ہوں۔ میں نے آپ سے ایک مسئلے کے لیے تعویذ لیا تھا اور پھر جلد بازی کا مظاہرہ کرکے اس تعویذ کو تلف کرکے کسی اور جگہ سے اپنا مسئلہ حل کرانا چاہا تھا لیکن میرا مسئلہ تو حل نہیں ہوا لیکن بس اچانک ہی مجھے بہت سی بیماریوں نے گھیر لیا ہے۔ مجھے خونی بواسیر ہوگئی تھی۔ اس کا علاج کروایا تو مجھے گھٹنے کی تکلیف ہوگئی جو ابھی تک ہے۔ بابا جی! میری ایڑی میں اتنا درد ہوتا ہے کہ پیر زمین پر نہیں رکھا جاتا اور گھٹنے میں بل پڑتے ہیں۔ میں بہت تکلیف میں ہوں' صبح مجھ سے بالکل چلا نہیں جاتا۔ کہیں یہ تکلیف آپ کے تعویذ کو تلف کرنے کی وجہ سے تو نہیں ہوئی؟ بابا جی! میرے لیے کچھ کریں' میری تو ماں بھی نہیں ہے۔ میرے خط کا جواب رسالے میں ضرور دیجیے گا۔ بابا جی! مجھے آپ کی دُعاؤں کی بہت ضرورت ہے۔

☆ بیٹی شگفتہ! اللہ تمہیں درست سمت میں علاج کروانے کی توفیق دے۔ اپنی مرضی سے تعویذ مت تلف کرو۔ یہ مناسب نہیں۔ تعویذ بہت جلالی ہوتا ہے اور میں ہر ایک کو دیتا بھی نہیں ہوں۔ بہرحال جلد از جلد دوسرا تعویذ منگواؤ۔ دن میں ایک بار نیم گرم پانی میں ہلدی ملا کر پاؤں آدھے گھنٹے کے لیے ڈبو دیا کرو۔

دوسری تکلیف کے لیے جب بھی آب دست لو اس میں نمک ملا کر استعمال کرو افاقہ ہوگا۔

□ نوشین۔ میانوالی

o اچھے باباجی! السلامُ علیکم! باباجی! جس مسئلے کا وظیفہ میں آپ سے چاہتی ہوں' وہ میرے لیے بہت زیادہ شرمندگی کا باعث ہے۔ باباجی! میرے چہرے اور جسم پر بہت زیادہ فالتو بال ہیں جن سے مجھے بہت زیادہ ندامت اور شرمندگی ہوتی ہے۔ میں اپر لپ اور ٹھوڑی سے تھریڈنگ بھی کرتی ہوں لیکن بال کم ہونے کی بجائے مزید موٹے ہوگئے ہیں۔ باباجی! مجھے وظیفہ دیں اور میرے لیے دُعا بھی کریں کہ میری یہ پریشانی دور ہو اور فالتو بال بالکل ختم ہوجائیں۔ آپ کے لیے بہت بہت سی دُعائیں!

☆ بیٹی نوشین! تمہارا مسئلہ اتنا شدید نہیں' کسی اچھے پارلر جاؤ اور گرم ویکس کے ذریعے بال صاف کروالو۔ جب بار بار ایسا کرو تو رفتہ رفتہ بال ختم ہو جائیں گے۔ یہ کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں۔ بس بڑوں سے مشورہ کرلیا کرو۔

□ روحانہ۔ میلسی

o باباجی! السلامُ علیکم! آپ نے میرا ایک بہت بڑا مسئلہ حل کروایا۔ دل سے آپ کے لیے دُعا نکلتی ہے۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش اور آباد رکھے۔ (آمین!) اب نیا مسئلہ میرے میاں کا ہے۔ پتا نہیں کیا چکر ہے' وہ کسی بھی نوکری کے لیے کوشش کرتے ہیں' بات طے ہوتے ہوتے ختم ہوجاتی ہے۔ میرے میاں بہت محنتی اور ایماندار بھی ہیں لیکن معاشی طور پر ہمیشہ ہاتھ تنگ رہتا ہے۔ عید کے کپڑے تک نہیں بنا پاتے۔ سعودی عرب کے لیے کوشش کر رہے ہیں' کام نہیں ہوتا۔ آپ کو ہمارے مالی حالات کا اندازہ ہوگیا ہوگا۔ کوئی وظیفہ یا دُعا بتائیں جو میں پڑھوں اور ہمارا باہر جانے کا ہوجائے۔

☆ بیٹی روحانہ.....! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد سورۃ الناس 21 21- بار پڑھو اور دُعا کرو۔ یہ وظیفہ نہایت پابندی کے ساتھ ایک ماہ کرو پھر مجھے مطلع کرو۔ انشاء اللہ' ضرور کرم ہوگا۔

□ مینا خان۔ بھکر

o محترم باباجی! السلامُ علیکم! میرا نام مینا خان ہے۔ میں اپنا مسئلہ لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ جب سے میری تایا کے گھر منگنی ہوئی ہے' وہ یہ ہی کہتے ہیں کہ ہمارے گھر کے حالات' کاروبار ٹھیک نہیں ہیں حالانکہ میرے تایا ابو کی وجہ سے میرے ابو کا کاروبار ختم ہوگیا۔ وہ لوگ میرے ماں باپ کی عزت تک نہیں کرتے۔ ان کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں۔ میرے ابو نے اس کو کاروبار بھی شروع کرا دیا تھا لیکن اس کی لاپروائی سے کاروبار بند ہوگیا۔

☆ بیٹی مینا.....! جو حالات تم نے لکھے ہیں' اس میں بہتر ہے کہ اس رشتے کو ختم کردیا جائے ورنہ تمہاری زندگی برباد ہوجائے گی۔ سورۃ آلِ عمران' آیت ۹۹ بکثرت پڑھو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ ریحانہ۔ واہ کینٹ۔

☆ بیٹی ریحانہ! معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کردو۔ ایک بات ذہن میں رکھو کہ اگر کوئی باپ یا ماں یہ لکھ بھی دے کہ ہمارا بچے سے کوئی واسطہ نہیں' تب بھی اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔ وہ جب چاہے' عدالت میں اپنی ہی تحریر کو چیلنج کرسکتا یا کرسکتی ہے کہ مجھ سے زبردستی یہ لکھوایا گیا لہٰذا ایسا کچھ مت کرو جو آگے چل کر مشکلات پیدا کرے۔ دونوں طرف کے بڑے بیٹھ کر فیصلہ کریں۔ تم جس قدر ممکن ہو' یَا صَمدُ کا وِرد کرو۔ دُرود شریف بہت پڑھو اور نماز کی پابندی رکھو۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔ اللہ تعالیٰ کرم فرمانے والا ہے۔

□ فرزانہ۔ میرپور خاص

o محترم باباجی! السلامُ علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وتندرستی کے ساتھ لمبی عمر عطا کرے۔ (آمین!) باباجی! اللہ تعالیٰ کا شکر ہے' اور آپ کی دُعاؤں سے میرا رشتہ بھی ہوگیا ہے۔ عید کے بعد میری شادی ہے۔ باباجی! آپ سے ایک اور گزارش ہے کہ جہاں آپ نے رشتے کے لیے دُعا کی' وہاں عزت کے ساتھ تمام کام ہوجائیں اور میری رخصتی ہوجائے' اس کی بھی دُعا کرا دیں۔ میرے والدین بہت پریشان ہیں' معاشی مشکلات ویسے بھی بہت زیادہ تھیں لیکن اب معاملہ کچھ اور ہے۔

بس اللہ سے دُعا ہے کہ سفید پوشی کا بھرم رہ جائے اور ماں باپ کی عزت رہ جائے۔ بابا جی! میرے لیے دُعا کیجیے گا کہ شادی کے بعد کی زندگی بہت اچھی گزرے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دائمی خوشیوں اور اچھے نصیبوں کی دُعا کرتی رہتی ہوں۔ بابا جی! ہماری معاشی مشکلات بہت زیادہ ہیں' تنگ دستی بہت ہے۔ برکت نہیں ہے۔ بہت زیادہ پریشانی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی خوشی دی ہے لیکن ان مشکلات کی وجہ سے صحیح سے خوش بھی نہیں ہو سکتے۔ آپ سے التماس ہے کہ ہمارے لیے ضرور دُعا کیجیے گا۔ دُعاؤں میں یاد بھی رکھیے گا اور ہاں' میری دوسری بہن کا رشتہ بھی جلد از جلد ہو جائے۔

☆ بیٹی فرزانہ! ہر نماز کے بعد سورۃ المزمل پڑھو اور دُعا کرو۔ بہن سے کہو' وہ بھی یہی عمل کرے۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ شاہین۔ کینیڈا

○ محترم بابا جی! السلامُ علیکم! میں نے آپ کو اپنے شوہر کے بارے میں لکھا تھا۔ آپ نے جو وظیفہ پڑھنے کے لیے بتایا تھا' میں نے نماز کی پابندی کے ساتھ اکتالیس دن پڑھا لیکن کچھ اثر نہیں ہوا۔ آپ کوئی اور عمل وغیرہ بتائیں تاکہ میرے شوہر بری عادتوں' برے دوستوں اور گندی عورتوں سے بچیں۔ اپنے بچوں اور گھر کا خیال کریں۔ اپنے خدا کو پہچانیں۔ میں بہت پریشان ہوں' کبھی دل چاہتا ہے کہ خودکشی کرلوں۔ بابا جی! خدا آپ جیسے نیک لوگوں کی دُعائیں سنتا ہے۔ آپ ہمارے لیے بھی دُعا کریں۔

☆ بیٹی شاہین! وظیفہ اگر نماز کی پابندی اور پورے یقین کے ساتھ کیا جائے تو ضرور کرم ہوتا ہے۔ بہرحال نماز کی پابندی رکھو اور نمازِ عصر کے بعد سورۃ الصّٰفّٰت آیت ۲۳' ۱۰۱ بار پڑھو اور نام لے کر دُعا کرو۔ اس کے علاوہ گھر میں استعمال ہونے والی چینی پر کثرت سے یَاوَدُودُ پڑھ کر دَم کر دیا کرو۔ مجھے دو ماہ بعد مطلع کرو۔

□ نور بانو۔ پاراچنار

○ محترم بابا جی! السلامُ علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ آپ کی خدمت میں یہ میرا پہلا خط ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک لڑکے کو پسند کرتی ہوں مگر میرے ابو اس رشتے کے لیے راضی نہیں ہیں۔ مجھے ایسا وظیفہ دیں کہ میرے ابو اور سب گھر والے اس رشتے [illegible] راضی ہو جائیں۔ بابا جی! میں بہت پریشان رہتی ہوں [illegible] میری عمر بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ آپ مہربانی [illegible] میرے لیے دُعا کریں کہ میرا رشتہ جلدی طے ہو جائے اور کوئی بھی مشکل وغیرہ پیش نہ آئے۔ بابا جی! آپ مجھے استخارہ کر کے بتائیں کہ یہ رشتہ میرے لیے بہتر ہے کہ نہیں؟ بابا جی! آپ مجھے مہربانی کر کے اس ماہ جواب دیں۔ میں آپ کی بہت شکر گزار رہوں گی۔

☆ بیٹی نور! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ بیٹی! میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ والدین کی رضامندی سے شادی کرو' خوش رہو گی۔ یہ بابرکت ماہ اختتام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ خوب دُعائیں کرو اور اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کرو۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ طٰہٰ ضرور پڑھو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ زاہدہ۔ جہلم

○ محترم بابا جی! السلامُ علیکم! میں امید کرتی ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے اور دُعا کرتی ہوں کہ اللہ آپ کو ہمیشہ حفظ و اَمان میں رکھے۔ (آمین!) بابا جی! آج جو مسئلہ میں لے کر حاضر ہوئی ہوں' وہ میری بہن کے متعلق ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ بابا جی! میری بہن کی عمر 31 سال ہے اور کافی کوشش کے باوجود اس کی بات کہیں طے نہیں ہو پا رہی ہے۔ چونکہ میں خود بھی غیر شادی شدہ ہوں اور جن مسائل کا شکار ہوں' بابا جی! میں ان سے بہت خوفزدہ ہوں۔ میری عمر بھی 50 سال ہو گئی ہے لہٰذا میں آپ سے گزارش کروں گی کہ مجھے کوئی تعویذ ارسال کر دیجیے۔ تاکہ ہم اپنے اس فرض سے بخیر و خوبی سبکدوش ہو جائیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ آپ کے لیے دُعا گو۔ آپ کی بیٹی۔

☆ بیٹی زاہدہ! نماز کی پابندی کرو۔ کوشش کرو نماز قضا نہ ہو۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے آفس فون کر کے معلومات حاصل کرلو۔

□ فوزیہ۔ نارووال

○ بابا جی! السلامُ علیکم! میں نے آپ کو خط لکھا تھا مگر ایک ماہ ہو گیا' آپ نے میرے خط کا جواب نہیں

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے
کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع
سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ بر
اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد
آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہو
ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے
بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روز
رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ
ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک
کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا
موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے
مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے
ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرا
مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی
قدم..... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے

کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان
سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ
ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف
صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں
ان کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔
پیشہ بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا
کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے،
کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ
ال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ
کر دیے۔ مگر اب..... وقت چونکہ ریت
چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اچھی
لائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

آ
اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے.....

اور محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا
ٹھے گا۔

دیا ہے۔ میں دوبارہ مسئلہ بیان کررہی ہوں۔ میری تین جگہ رشتے کی بات پکی ہوئی پھرانہوں نے جواب دے دیا۔ پچھے سات ماہ سے بیمار ہوں۔ ٹانگوں اور کندھوں میں درد رہتا ہے اور نیند بالکل غائب ہے اس لیے آپ سے التماس ہے کہ کوئی ایسا تعویذ دیں کہ میں ٹھیک ہوجاؤں۔

☆ بیٹی فوزیہ! اللہ تمہیں صحتِ کُلی عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! تم سے تو براہِ راست خط و کتابت ہوتی ہے' جواب میں نے تمہیں ارسال کردیا تھا۔ ممکن ہے کہ تمہارا پتا درست نہ لکھا ہو اس لیے رسالے میں جواب دے رہا ہوں۔ نمازِ عشاء کے بعد یَسَارَ شیدُ کا کثرت سے وِرد کرو۔ وِرد آنکھیں بند کرکے کیا کرو اور حاجت بیان کرتی رہا کرو۔ مجھے ۲۱ روز کے بعد مطلع کرو۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے آفس فون کرکے معلومات حاصل کرلو۔

□ صبیحہ۔ پاکپتن

o محترم بابا جی! السلامُ علیکم کے بعد عرض ہے کہ آپ نے جو وظیفہ مجھے بھیجا تھا' وہ میں نے کیا۔ اللہ تعالیٰ کے کرم سے بیٹے کی شادی طے ہوگئی ہے۔ والد تو ویسے ابھی بھی راضی نہیں ہیں مگر میں نے زبردستی شادی طے کردی ہے مگر خاوند ناراض بھی نہیں ہیں' جو تعویذ آپ سے منگوایا تھا' کیا تعویذ ابھی پاس ہی رکھوں؟ اب ایک اور مسئلہ ہے کہ جس بیٹے کی شادی ہورہی ہے' وہ پہلے تو کام پر جاتا تھا۔ اب وہ جاتا ہی نہیں ہے۔ سارا دن گھر میں بیٹھا رہتا ہے اور غصے میں رہتا ہے۔ کوئی اور چھوٹا سا وظیفہ بھیج دیں کہ بیٹا کام دل لگا کر کرے۔

☆ بیٹی صبیحہ! جب ہم اللہ سے مدد مانگتے ہیں تو وہ ہمیں ہمت عطا کرتا ہے اور یہ ہمت ہی ہے جو راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کرتی ہے۔ تم وظیفہ جاری رکھو اور وظیفے کے بعد بیٹے کا نام لے کر دُعا کیا کرو۔ سورۃ فلق بھی کثرت سے پڑھ کر بیٹے پر دَم کرتی رہا کرو۔ وظیفہ شادی ہونے تک جاری رکھو۔

□ ضمن۔ کراچی۔

☆ بیٹی شازیہ! تعویذ کا مشورہ میں اُسی وقت دیتا ہوں جب حالات ناگزیر ہوچکے ہوتے ہیں۔ تمہارا خط مجھ تک پہنچتا تو ضرور جواب دیتا۔ بہرحال میں تمہارے لیے دُعا گو ہوں۔ تم نمازِ فجر کے بعد سورۃ فتح آیت ۱ تا ۳' کثرت سے پڑھو اور دُعا کرو۔ وظیفہ حاجت قبول ہونے تک جاری رکھو۔

□ رابعہ۔ پتوکی

o محترم بابا جی! السلامُ علیکم! میرا نام رابعہ ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ میرے شوہر کا اپنا کام تھا جو تقریباً 8 سال پہلے ختم ہوگیا اور میرا شوہر ہاتھ کا بہت کھلا ہے جس کی وجہ سے وہ بہت قرضدار ہوگئے ہیں۔ انھوں نے پہلے بھی آپ سے وظائف منگوائے جو آج تک پورا نہیں کرسکے لہٰذا مہربانی کرکے اس کے حق میں اللہ کریم سے دُعا کریں اور مجھے کوئی تعویذ عنایت فرمائیں تاکہ میرے شوہر کا اپنا کام شروع ہوجائے یا وہ ملک سے باہر چلے جائیں۔ بہت مہربانی ہوگی۔ اپنی خصوصی دُعاؤں میں انہیں شامل کرکے اُن پر مہربانی کریں۔ اللہ کا واسطہ تعویذ جلد عنایت کریں تاکہ ذہنی ٹینشن سے نجات مل جائے۔ چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے۔

☆ بیٹی رابعہ! اللہ تمہارا رِزق وافر کرے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ ہر نماز کے بعد 3 تسبیح پڑھو۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے آفس فون کرکے معلومات حاصل کرلو۔

□ ستارہ۔ حیدرآباد

o محترم بابا جی! السلامُ علیکم! میرا نام ستارہ ہے اور میری والدہ کا نام زینت ہے۔ میں نے گریجویشن کیا ہے۔ محترم بابا جی! میں اپنے دو مسئلے لے کر حاضر ہوں برائے مہربانی خدا کے لیے' میری مدد کریں۔ میں ساری زندگی آپ کو دُعائیں دوں گی۔ بابا جی! میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ہم 3 بہنیں ہیں۔ سب جوان ہیں' سب اللہ کے کرم سے شکل و صورت میں اچھی ہیں۔ اس تمام عرصے میں بہت رشتے آئے لیکن یقین کریں' جو کوئی بھی آتا ہے' اس کے بعد پلٹ کر جواب نہیں دیتا۔ میرے گھر والے میری وجہ سے ہر وقت پریشان رہتے ہیں۔ لوگ بے انتہا باتیں بنانے لگے ہیں۔ سب کی پریشانی دیکھ کر دل چاہتا ہے' خود کو ختم کرلوں تاکہ ماں باپ کی پریشانی دور ہوجائے۔ ڈر سے سب سے ملنا اور دوستوں کے گھر جانا بند کردیا ہے۔

☆ بیٹی ستارہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔

نماز کی پابندی کرو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد تین تین بار سورۃ یٰسین پڑھو اور بیٹی میں تمھیں تعویذ کے لیے کہوں گا۔ تم فوراً سچی کہانیاں کے آفس فون کر کے معلومات حاصل کرلو۔

□ فاریہ۔ سکھر

○ السلام علیکم! بابا جی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا ایک ہی گھر ہے جس میں ہم رہتے ہیں۔ میری والدہ بہت بیمار رہتی ہیں۔ سب اسی فکر میں ہیں کہ میری والدہ کی آنکھ بند ہوتے ہی گھر کو بیچ دیں۔ بابا جی! میں بہت پریشان ہوں' میں کدھر جاؤں گی؟ بھائی ساتھ رکھنے پر خوش نہیں ہیں۔ مجھے کسی نے بتایا ہے' میرے اوپر کالا علم کیا گیا ہے۔ آپ اللہ کے نیک بندے ہیں۔ آپ استخارہ کر کے بتائیں کہ اللہ کی طرف سے ہی دیر ہے یا کسی نے کوئی بندش وغیرہ کروا رکھی ہے؟

☆ بیٹی فاریہ! اللہ تمہاری مشکلات حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ ظہر اور عشاء کے بعد 33 بار سورۃ الفاتحہ پڑھو اول و آخر دُرود شریف پڑھو اور حاجت پوری ہونے کی دُعا کرو۔ مدت 2 ماہ ہے۔

□ ثمر۔ کوئٹہ

☆ بیٹی ثمر.....! غصے پر قابو نہ رکھنے والے دراصل شیطان کے غلام ہوتے ہیں۔ تمہیں اپنی اس کمی پر خود قابو پانا ہوگا اور بیٹی! شادی ہر مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔ اگر تمہارا یہی انداز رہا تو شادی کا برقرار رہنا ممکن نہ ہوگا۔ اپنے اندر صبر و تحمل پیدا کرو اور وہ ایسے ہوگا کہ نماز کی پابندی رکھو۔ ہر وقت باوضو رہو اور بعد نمازِ عصر قرآن ترجمے کے ساتھ پڑھو۔ مجھے ایک ماہ بعد اپنے حالات سے آگاہ کرو۔

□ ارم خان۔ ملتان

☆ بیٹی ارم! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ مجھے تمہارے حالات جان کر بہت دکھ ہوا تھا اور بعض اوقات دکھ اتنا شدید ہوتا ہے کہ انسان کے پاس الفاظ ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ بہرحال بیٹی! اللہ پر بھروسہ رکھو۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف کو اپنی عادت میں شامل کرلو۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین ضرور پڑھو۔ انشاء اللہ' معاملات بہتر ہوں گے۔

علاج اور مکمل شفاء

میرے عزیزو!

اللہ تعالیٰ! سب کو اپنی امان میں رکھے۔

☆ اگر آپ اپنے جسم کے اندرونی اور بیرونی زخموں کا مکمل علاج چاہتے ہیں۔

☆ اگر آپ بالوں کی بیماریوں، سکری اور بال خورے سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

☆ اگر آپ دانتوں کی گوناگوں تکالیف میں مبتلا ہیں۔

☆ اگر آپ موٹاپے جیسی موذی بیماری کا شکار ہیں۔

آپ سب کے لیے خوش خبری ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ان تمام عوارض کا مکمل علاج اور دوائیں موجود ہیں۔ ان شاء اللہ شفا ہوگی۔ علاج معالجے اور دواؤں کی طلب کے لیے جوابی لفافے کے ساتھ اپنا مسئلہ تحریر کریں۔

II 88-C۔ فرسٹ فلور، خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

ہائیڈ پارک

ڈی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

حضور اکرمؐ نے فرمایا

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

''بخیل اور خرچ کرنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے دو آدمی ہیں۔ ان کے بدن پر سینے سے ہنسلی تک لوہے کی زرہیں ہیں۔ پس خرچ کرنے والا خرچ کرتا ہے تو یہ ذرہ اس کے بدن پر دراز اور لمبی ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے پاؤں کی انگلیوں کے پوروں کو چھپا لیتی ہے اور اس کے نشان قدم کو ظاہر نہیں ہونے دیتی اور بخیل چونکہ کچھ بھی خرچ کرنا نہیں چاہتا اس لیے ذرہ کا ہر حلقہ اپنی جگہ پر چمٹ جاتا ہے پس وہ اسے ڈھیلا کرتا ہے لیکن وہ ڈھیلا نہیں ہوگا۔'' (بخاری مسلم)

اچھی بات

رشتے اور موسم دونوں ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کبھی حد سے زیادہ اچھے اور کبھی برداشت سے باہر۔ فرق صرف اتنا ہے کہ موسم جسم کو تکلیف دیتا ہے اور رشتے روح کو۔ (حضرت علیؓ)

شازیہ گل۔ بھیرکھنڈ

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ جس طرح چاند کے بغیر رات ادھوری ہے اسی طرح علم کے بغیر ذہن۔ (سر سید احمد خان)

☆ وہی صحیح معنوں میں آزاد ہیں جو خواہشوں کے غلام نہیں ہیں۔

☆ کامیابی کا دارومدار آپ کی محنت اور کوشش پیہم پر ہے۔ (شیکسپیئر)

☆ لگن کے بغیر کسی میں بھی عظیم ذہانت پیدا نہیں ہو سکتی۔ (ارسطو)

☆ انسان ہو کر ایسے کام نہ کرو جس سے انسانیت داغدار ہو۔ (وکٹر ہوگو)

☆ مسائل جہالت کے ذریعے طے نہیں ہو سکتے۔ (بنجمن ڈسٹرائیلی)

☆ یہاں صرف جہالت ہی خوش رکھ سکتی ہو وہاں عقل مند ہونا بے وقوفی ہے۔ (تھامس گرے)

☆ فتنہ انگیز سچائی سے مصلحت آمیز جھوٹ بہتر ہے۔ (شیخ سعدی)

☆ مسکراتا چہرہ معمولی کھانے کو بھی دعوت بنا دیتا ہے۔ (جارج ہرلوٹ)

☆ ترتیب، کائنات کا پہلا اصول ہے۔ (پوپ)

☆ اپنے آپ پر اعتماد رکھنے والے ہی فتح حاصل کرتے ہیں۔ (ول کاکس)

مرسلہ: محبّ خان۔ دبئی

نمک

نمک چار ہزار سال قبل مصر میں استعمال میں لایا گیا۔ اس کے بعد اس کا استعمال یونان اور روم میں ہوا۔ کرنسی کے استعمال سے قبل روم میں نمک لین دین کے معاملات میں کام آتا تھا۔ نمک، سفید، ہلکے گلابی اور ہلکے سرمئی رنگ کا ہوتا ہے۔ نمک کو سوڈیم کلورائیڈ بھی کہتے

ہیں۔نمک کو کھانوں میں ذائقے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔نمک ذائقے میں پانچ طرح کا ہوتا ہے۔نمکین، میٹھا، ترش، کڑوا اور خوشبودار۔

حسنِ انتخاب: زیدانتظار خان۔کراچی

غزل

میں عجیب ہوں تو محبتیں بھی عجیب ہیں
سبھی نفرتیں سبھی چاہتیں بھی عجیب ہیں
تیرے وصل سے مجھے بڑھ کے ہجر عزیز ہے
مری خواہشیں، میری حسرتیں بھی عجیب ہیں
مجھے پھول ہی نہیں، خار سے بھی لگاؤ ہے
مرے دکھ عجیب ہیں، راحتیں بھی عجیب ہیں
کبھی تجھ سے دور، کبھی ہوں تیرے قریب تر
مرے روز و شب مرے ساعتیں بھی عجیب ہیں
مجھے موت بھی کبھی آئے گی تو عجیب تر
ترے روبرو یہ وضاحتیں بھی عجیب ہیں
تجھے خانم آج بھی مانگتی ہے یقین سے
یہ دعائیں اور عبادتیں بھی عجیب ہیں

شاعرہ: فریدہ خانم۔لاہور

تاج محل، آگرہ بھارت

بھارت میں مغل فن تعمیر کا بہترین شاہکار تاج محل آگرہ کو قرار دیا جاتا ہے۔یہ عظیم محل نما مقبرہ شاہ جہاں نے اپنی بیوی ایرانی شہزادی ارجمند بانو المعروف ممتاز محل کی یاد میں بنوایا تھا۔ممتاز محل، شاہ جہاں کی زندگی کی اہم ترین ہستی تھی مگر 39 سال کی عمر میں 1631ء میں وفات پا گئی۔اس کی آخری خواہش تھی کہ اس کی یاد میں ایسا مقبرہ بنایا جائے جو اس سے پہلے دنیا میں کہیں نہ بنا ہو۔کہا جاتا ہے کہ اس کا نام ممتاز محل کے نام پر رکھا گیا۔ یہ 1631ء سے 1648ء کے درمیان تعمیر ہوا۔جب سورج کی کرنیں تاج محل پر پڑتی ہیں تو سفید سنگ مرمر اپنا رنگ تبدیل کرتا رہتا ہے اور مختلف رنگ منعکس کرتا ہے۔ عیسیٰ شیرازی نامی ایک ایرانی انجینئر نے اس کا نقشہ تیار کیا تھا لیکن بادشاہ نامے میں لکھا ہے کہ خود شاہ جہاں نے اس کا خاکہ تیار کیا۔اس کی تعمیر میں ساڑھے چار کروڑ روپے صرف ہوئے اور بیس ہزار معماروں اور مزدوروں نے اس کی تکمیل میں حصہ لیا۔اس کی لمبائی اور چوڑائی 130 فٹ اور بلندی 200 فٹ ہے۔مقبرے کے اندر اور باہر پچی کاری کی صورت میں قرآن شریف کی آیات بھی نقش ہیں۔اس کی پشت پر دریائے جمنا بہتا ہے۔مقبرے کے اندر ملکہ ممتاز محل اور شاہجہاں کی قبریں ہیں۔ہر سال اس تاریخی یادگار کو 30 لاکھ افراد دیکھنے آتے ہیں۔

حسن انتخاب: اعجاز اکبر کنگ۔دبئی

سوا سیر

چھ نوجوان دوست کالج سے واپس آرہے تھے۔ان کے آگے تین لڑکیاں جارہی تھیں۔وہ لڑکے ان کے پیچھے چلنے لگے۔اچانک ایک لڑکے نے بلند آواز میں کہا: ''یار! ہم تو چھ ہیں اور لڑکیاں تین، فیصلہ کیسے ہوگا؟''

ان میں سے ایک لڑکی جو کچھ زیادہ تیز تھی پلٹ کر بولی: ''فکر مت کرو ہم تین ہیں تو کیا ہوا لیکن سینڈلوں کی تعداد چھ ہی ہے۔فیصلہ ٹھیک ٹھاک اور انصاف سے ہوگا۔''

مرسلہ: حنا طارق۔کراچی

دائمی نشان

ایک پھل دار درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخ سے رس آنسوؤں کی طرح ٹپک رہا تھا۔کسی نے لاپروائی سے گزرتے ہوئے بے خیالی میں شاخ توڑ دی تھی اور اب وہ بے قصور ٹہنی اس دکھ کو سینے سے لگائے ہوئے تھی۔یہی حال انسان کے دل کا ہے بعض اوقات کوئی دکھ اُسے توڑ دیتا ہے بعد میں زخم مندمل تو ہو جاتا ہے لیکن نئی جلد زخم کے اس نشان کو کبھی نہیں چھپا سکتی یہ نشان دائمی ہوتا ہے۔

مرسلہ: ریاض حسین تبسم چوہان۔فیصل آباد

محبت مغرب کی نظر میں

☆ محبت ایسی پیاری چیز ہے جو انسان کو مشکل ترین کاموں کے لیے مجبور کر دیتی ہے۔اگر یہ نہ ہوتی و دنیا میں بالعموم قربانی کی راہ مسدود ہو جاتی۔

☆ اگر دنیا میں ایک بھی محبت کرنے والا دل باقی نہ رہے تو آفتاب حرارت کھو بیٹھے۔(تھیلو)

☆ محبت انسان کو شاعر بناتی ہے خواہ پہلے اس نے شاعری کا نام بھی نہ سنا ہو۔(پوری پیٹرز)

☆ محبت کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ شاید اس لیے کیوپڈ کو تصویر میں اندھا دکھایا گیا ہے۔ (شیکسپیئر)

☆ محبت اور شک ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ (خلیل جبران)

☆ اس کے ٹوٹ جانے پر افسوس ہے جو محبت کرتا ہے وہ دل کتنا عظیم ہے۔ جو یہ لا حاصل امید کرتا ہے۔ (گلبرٹ)

☆ جس نے بھی محبت کی اس نے پہلی نظر میں نہیں کی۔ (کرسٹوفر مارلو)

مرسلہ: اسامہ بلال اعوان۔ لاہور

خیالوں کا سورج

خیالوں کا سورج
تمازت سے اپنی ہی جل بجھ گیا ہے
میرے ذہن و دل پر کوئی بوجھ سا ہے
حقیقت کو پا کر
اچانک میری سوچ کی کہکشاں ٹوٹتی ہے
میری سادہ لوحی حقیقت سے کیوں آشنا ہے
میں کیوں سوچتی ہوں
یہ اچھا ہے اور یہ برا ہے
ہزاروں برس سے یہی ہو رہا ہے
تماشا نیا اِک تماشا
تماشا تو ہم آپ سب دیکھتے ہیں
مگر کس کو فرصت ہے یہ سوچنے کی
کہ کیا ہو رہا ہے
مگر کس میں جرأت ہے یہ بولنے کی
جو کہ ہو رہا ہے غلط ہو رہا ہے
مگر مجھ کو عادت سی ہے سوچنے کی
میرے سوچنے کی یہ عادت بری ہے

شاعرہ: نسیم سکینہ صدف۔ سیالکوٹ

دودھ کا جلا

بیٹے نے باپ سے کہا۔ ''ابا جان! آج آپ باکسنگ دیکھنے ضرور جائیں۔ صرف سو روپے لگیں گے اور ایک گھنٹے کی لڑائی آپ کا دل خوش کر دے گی۔''

باپ نے کہا۔ ''نا بیٹا نا! نکاح خواں نے بھی مجھ سے سو روپے لیے تھے۔ آج چالیس سال ہو گئے مگر لڑائی ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔''

حسنِ انتخاب: واصف نبی خان۔ کراچی

پھوپو اور خالہ

کراچی والوں کے لیے بارش اور سردی کا ایک ساتھ آ جانا ایسا ہی ہے جیسے گھر میں پھوپو اور خالہ ایک ساتھ آ جائیں، بندہ کنفیوژ ہو جاتا ہے کہ اب کس کو ٹائم دوں۔

پاگل

ایک پاگل دوسرے پاگل سے۔ ''اس بار کچھ زیادہ سردی نہیں ہے؟''

دوسرا پاگل: ''سائنسدان کہتے ہیں دنیا گھومتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ ہم گھوم کر مری میں آ گئے ہوں؟''

مرسلہ: مور شاہد۔ شہداد کوٹ

ابتلا

درویش دنیا داروں میں پسندیدہ نہیں ہوتا اور دنیا دار درویشوں میں ناپسندیدہ نہیں ہوتا اور دنیا دار درویشوں میں ناپسندیدہ رہتا ہے۔ سورج کی روشنی کو چمگادڑ، الو، چور اور ڈاکو ناپسند کرتے ہیں۔ بہر حال شہرت ایک مستقل ابتلا ہے۔ جہاں انسانوں کی خوبیاں مشہور ہوتی ہیں وہاں ان کی خامیاں بھی مشہور ہونے لگتی ہیں۔ ایک معمولی انسان کا گناہ بھی معمولی ہوتا ہے لیکن ایک مشہور کا گناہ ایک مشہور گناہ ہوتا ہے۔''

واصف علی واصف کی کتاب ''دل دریا سمندر'' سے نزابت افشال۔ مہورہ فتح جنگ کا اقتباس

راگ

میوزک بڑے کمال کی چیز ہے اگر یہ نہ ہوتی تو ہمارے جدید و شدید گلوکار مائیک پکڑ کر جو کچھ کرتے ہیں۔ انہیں اس پر پاگل خانے کی ہوا کھانی پڑتی۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ لوگ ان کے گانے سننا پسند بھی کرنے لگتے ہیں۔ اب ہر ہے بندہ اچھے گانے سن سن کر کبھی اکتا بھی جاتا ہے۔ یہ نوجوان گلوکار گاتے گاتے کہیں کھو بھی

جاتے ہیں، پھر کہیں سے ڈھونڈ کر انہیں لانا پڑتا ہے۔ کچھ نوجوان گروپ کی صورت میں مل کر اس لیے گانے گاتے ہیں کہ تاکہ پتا نہ چل سکے کہ سب سے بے سرا کون گا رہا ہے۔ یہ بھاگتے ہوئے بھی گاتے ہیں۔ واقعی ایسا گانا سنانے والے کو بھاگنا ہی چاہیے۔

ڈاکٹر یونس بٹ کی ''قلابازیاں'' سے اقتباس

آصف مرزا۔ ٹنڈوالہ یار

وہ بھی نہیں، میں بھی نہیں

دل سے دور وہ بھی نہیں میں بھی نہیں
دونوں انسان ہیں خدا وہ بھی نہیں میں بھی نہیں
وہ مجھے اور میں اسے الزام دیتا ہوں
مگر غلط اپنی جگہ وہ بھی نہیں میں بھی نہیں
محبت تو ہم دونوں کرتے ہیں دل سے
محبت کا گناہ گار وہ بھی نہیں میں بھی نہیں
عمر بھر ساتھ اگر ہم جی لیں تو کیا ہوگا
پر ہاتھوں کی لکیروں میں وہ بھی نہیں میں بھی نہیں
اس کے علاوہ میں کیا مانگوں اس خدا سے
اور کسی چیز کا طلب گار وہ بھی نہیں میں بھی نہیں

شاعر: خضرت حیات۔ روڈہ تھل

حادثہ

ہوائی جہاز کے ایک حادثے میں کوئی شخص زندہ نہ بچا۔ ماہرین جائے حادثہ پر پہنچے تو ہر چیز یوں تباہ ہو چکی تھی کہ حادثے کی وجوہات کا پتا چلانا ممکن نہیں تھا۔ تباہ شدہ جہاز کے قریب کسی درخت پر ایک بندر بیٹھا تھا، جس کے گلے میں ایئر لائن کا ٹیگ لٹک رہا تھا۔ پتا چلا کہ یہ بندر بھی تباہ ہونے والے جہاز کا مسافر تھا۔ اسے پکڑ لیا گیا۔ اشاروں کی زبان کے ایک ماہر کی خدمات حاصل کی گئیں تاکہ وہ بندر سے بات چیت کر کے کچھ معلوم کر سکے۔ تفتیشی بورڈ نے ماہر کے ذریعے بندر سے سوال کیا۔ ''حادثہ کتنے بجے ہوا تھا؟'' اشاروں کی زبان والے ماہر نے سوال بندر کو سمجھایا۔ بندر نے سوال سن کر اپنی کلائی کی طرف اشارہ کیا پھر دونوں ہاتھوں کی دس انگلیاں کھڑی کیں۔ اس کے بعد اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنے گال پر رکھے اور سر کو ٹیڑھا کر لیا۔ ماہرین نے اشارہ سمجھ کر بتایا۔ ''بندر کہہ رہا ہے حادثہ دس بجے ہوا۔'' تفتیشی بورڈ نے اگلا سوال کیا۔ ''اس وقت مسافر کیا کر رہے تھے؟'' بندر نے پھر دونوں ہاتھ اپنے گال کے ساتھ رکھ کر سر کو ٹیڑھا کیا۔ ماہرین نے بتایا۔ ''بندر کہہ رہا ہے مسافر سو رہے تھے۔'' پوچھا گیا۔ ''ایئر ہوسٹس کیا کر رہی تھی؟'' بندر نے کہا۔ ''سو رہی تھیں۔'' تفتیشی افسر نے پوچھا۔ ''پائلٹ کیا کر رہا تھا؟'' بندر نے پھر وہی جواب دیا۔ ''سو رہا تھا؟'' تفتیشی ٹیم میں سے ایک نے بندر سے پوچھا۔ ''جب سب لوگ سو رہے تھے تو تم کیا کر رہے تھے؟'' بندر نے دونوں ہاتھوں کو ٹھاتے ہوئے اشارے سے بتایا۔ ''جہاز چلا رہا تھا۔''

مرسلہ: ڈاکٹر شہباز احمد۔ حیدر آباد

زندگی

☆ بظاہر تو بہار کی طرح شاداب ہے مگر حقیقت میں بڑھاپے کی طرح اداس ہے۔

☆ ہوا کے سرد جھونکے کی مانند ہے، جو انسان کو خنکی محسوس کروا کے چلی جاتی ہے۔

☆ پانی کے اس بلبلے کی طرح ہے جو تھوڑی دیر کے لیے سطح آب پر نمودار ہوتا ہے اور پھر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔

☆ ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی طرح ہے جو ہوا کے جھونکے سے بھی بجھ سکتی ہے۔

مرسلہ: شمائلہ اختر۔ لاہور

نقل

ایک بس کنڈیکٹر ہکلاتا تھا، بس میں ایک اور ہکلا مسافر سفر کر رہا تھا۔ کنڈیکٹر نے اس سے کرایہ مانگا۔

''کک..... کک..... کرایہ؟''

ہکلے مسافر نے کہا۔ ''پہلے ٹک..... ٹک..... ٹکٹ تو دو۔''

اسی بس میں ایک تھانیدار بیٹھا تھا وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دونوں کی پٹائی کرنے لگا۔ ایک آدمی نے پوچھا۔ ''بھائی انہیں کیوں مار رہے ہو؟''

تھانیدار نے جواب دیا۔ ''یہ دو..... دو..... دونوں میری نقل اتار رہے ہیں۔''

مرسلہ: فلک ناز۔ پشاور

خوشی

دو عورتوں کی ملاقات ہوئی تو ایک نے دوسری کو بتایا۔ ''بہن تم نے کچھ سنا، نازیہ کے میاں کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔''

''ارے..... وہ کیسے؟'' دوسری عورت نے پوچھا۔

''وہ اس طرح کہ دونوں میاں بیوی میں لڑائی ہو رہی تھی۔ اس دوران نازیہ نے اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔''

''اچھا تو وہ صدمے سے مر گیا۔''

''ارے نہیں وہ اچانک اتنی خوشی برداشت نہ کر سکا۔''

مرسلہ: طارق پٹھان۔ لاڑکانہ

کلونجی

کلونجی ایک قسم کا گھاس کا پودا ہے۔ اس کا پودا سونف سے مشابہ، خودرو اور چالیس سینٹی میٹر تک بلند ہوتا ہے۔ اس کا پھول زردی مائل، بیجوں کا رنگ سیاہ اور شکل پیاز کے بیج سے ملتی ہے۔ کلونجی کے بیجوں کی بو تیز اور شفائی تاثیر سات سال تک قائم رہتی ہے۔ صحیح کلونجی کی پہچان یہ ہے کہ اگر اسے سفید کاغذ میں لپیٹ کر رکھا جائے تو اس پر چکنائی کے دھبے لگ جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے کتب سیرت میں آیا ہے کہ آپ کبھی کبھی شہد کے شربت کے ساتھ کلونجی استعمال فرمایا کرتے تھے۔ جو ماہرین طب وسائنس کلونجی پر تحقیقی کام کر رہے ہیں انہوں نے اسے مختلف امراض میں مفید پایا ہے اور ایک طویل عرصے سے اس پر تحقیقی کام جاری ہے۔

مرسلہ: ارسلان اسلم۔ راولپنڈی

نجات

ایک بے حد موٹی عورت کے گھر میں چور گھس آیا۔ جب وہ چوری کر کے واپس جانے لگا تو عورت اسے دیکھ کر اس کے پیچھے لپکی۔ پھر گھبراہٹ کے مارے گر پڑا۔ موٹی عورت چور کی کمر پر کھڑی ہو گئی اور شوہر کو تھانے کی طرف دوڑنے کو کہا۔

شوہر کافی دیر چپل تلاش کرنے کے بعد بولا۔

''بیگم! میرے چپل نہیں مل رہے۔''

''اللہ کے بندے میرے چپل پہن کر جلدی جاؤ۔'' چور بلبلاتے ہوئے بولا۔

مرسلہ: ام حبیبہ۔ سیالکوٹ

چیچن اتزا، میکسیکو

مایا زبان میں چیچن اتزاء سمراد لوگوں کے کنویں کے دہانے پر ہے۔ مندوں کا یہ شہر مایا تہذیب کا سیاسی و معاشی مرکز تھا۔ کوکلکن کا اہرام ان میں سے آخری اور سب سے عظیم مندر سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ یوکاٹن جزیرہ نما میں کوئی دریا نہیں، تو تین قدرتی پانی کے کنویں اسے شہر کے لیے اچھا انتخاب بناتے تھے، جن میں سے دو اب بھی موجود ہیں سی نوٹ آف سیکری فائز نامی مقدس کنویں میں مایا کے بارش کے خدا چاق کے لیے نذرانے، برتن، کافور اور بعض اوقات انسان، خصوصاً خوبصورت عورتیں بھی قربانی کے طور پر لائی جاتی تھیں۔ 987 عیسوی میں ایک ٹولٹیک بادشاہ مرکزی میکسیکو سے آیا اور چیچن اتزا کو دارالخلافہ بنایا۔ اس زمانے کا فن اور ثقافت اور ٹولٹیک انداز کا بہترین امتزاج تھی۔ اس شہر کے درمیان میں کوکلکن کی عبادت گاہ ایل کیسٹی لو (بمعنی قلعہ) موجود ہے۔ یہ محراب کی صورت میں ہے جس میں چاروں طرف چوڑے صحن اور سیڑھیاں ہیں۔ شمالی سیڑھیوں پر اژدھوں کے مجسمے ہیں اور اندر زائرین کے لیے ایک اونچے کمرے میں بادشاہ کا قیمتی سہرا اور سرخ رنگ میں آراستہ پتھر کے شیر کی شکل کا تخت بھی موجود ہے۔

حسنِ انتخاب: عبدالرافع بیگ۔ ملتان

سائنسی معلومات

☆ انسان کے مرنے کے بعد اس کا دماغ دو سے چار گھنٹے تک کام کرتا ہے۔

☆ انسانی دل کے چار خانے ہیں۔

☆ انسان کا دل ایک منٹ میں 72 مرتبہ دھڑکتا ہے۔

☆ انسان کے خون میں 90 فیصد پانی ہے۔

☆ نارمل انسان کے جسم کا درجہ حرارت 98.4 فارن ہائیٹ ہوتا ہے۔

حسنِ انتخاب: محمد سمیر عباس۔ مکہ المکرمہ

قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمایئے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں

نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

غلام مرتضیٰ علوی.....گوجرہ

حسن و فطرت کو ڈھونڈنے والے
کیا تو نے کبھی صبح دیکھی ہے

خضر حیات.....روڈہ تھل

کدھر سے دیکھیے، دکھلایئے کدھر سے بھلا
ہے آئینے میں وجود آئینہ وجود میں گم
مگر میں کون ہوں اور کیا ہیں یہ زمان و مکاں
میں ان میں قید ہوں یا یہ مری حدود میں گم

شہروز شریف.....کراچی

لے جاؤ اپنے نشتر و مرہم تم اپنے ساتھ
اب درد چاہتا نہ دوا چاہتا ہوں میں

سلمان شبیر.....اکوال۔ تلہ گنگ

دور افق سے ساحل تک ہر منظر چپ ہے
کس کو ڈبو کے جاتے آج سمندر چپ ہے

عاتکہ گل.....کوہاٹ

میں اُس کو سوچتا رہوں، ہر لمحہ ہر گھڑی
یہ روگ میرے ذہن میں پالا اسی نے تھا

محمد انور طالب.....اسلام آباد

کلیوں سے لب پہ پھول کھلاتی ہے گفتگو
قدرت نے اس کے لہجے میں گلزار رکھ دیا
دیکھیں تماشا شوق سے اہلِ جنوں کا وہ
ہم نے جنوں کو اب سرِ بازار رکھ دیا

اسامہ بلال اعوان.....لاہور

نسلوں کو آنے والی وراثت کے طور پر
جاتے ہیں لوگ اپنے خیالات سونپ کر

علی فضل.....کشمور

بہت چاہا یونہی کھیلیں سدا ہم
مگر بچپن ہمارے بس میں کب تھا
دل بسمل پہ ہم مرہم لگاتے
مگر یہ فن ہمارے بس میں کب تھا

قاصد احمد.....لاہور

کھلتا ہوا گلاب ہوں میں خار تو نہیں
زلفوں میں پیار سے وہ سجایا کرے مجھے
سمجھا دو اس کو قابلِ نفرت نہیں ہوں میں
نغمہ وفا کا جان کے گایا کرے مجھے

شاعر عتیق.....کراچی

روتا ہے منہ چھپا کے وہ ہاتھوں میں بار بار
جو چل رہا تھا غیر کے ہونے کے واسطے

اعجاز اکبر کنگ.....دبئی

محبتوں کی شروعات کرنے والا ہوں
میں اپنے آپ کو خیرات کرنے والا ہوں
خدا کرے کہ مجھے آئینے نہ پہچانیں
میں آج خود سے ملاقات کرنے والا ہوں

زاہد کولاچی.....گھوٹکی

پھرتا ہے میری ڈاک لیے سارے شہر میں
پہچانتا نہیں ہے ابھی ڈاکیا مجھے

سفیر احمد.....کوٹ ادو

یوں تو اس دنیا میں لاکھوں ہی حسیں ہیں لیکن
مجھ کو بس ایک وہی شکل لبھائی ہوئی ہے

جانتا ہوں کہ نہیں لوٹ کے آئے گا وہ شخص
اس کے آنے کی مگر آس لگائی ہوئی ہے

رافعہ.....میرپورمیرس

صرف اہلِ عشق ہی میں نہیں ہے یہ خاص بات
ہر شخص اپنی ذات میں شدت پسند ہے

منشی عزیز مئے.....وہاڑی

پہاڑی بستیوں کا ایک اپنا حسن ہے ساحر
پہاڑی بستیوں کی آبشاریں گیت گاتی ہیں

نعیم یاد.....خوشاب

پیاسا پلٹ گیا ہے ترے در سے ایک شخص
تُو نے خدا کو کتنی سہولت سے کھو دیا

علینہ.....ڈھرکی

عجب نہیں کبھی اپنی دعا قبول ہو یارو!
ہم ایک عمر سے دستِ دعا اٹھائے ہوئے ہیں

شازیہ رضوی.....کراچی

ہم جسے خود سے بھی چھپاتے رہے
راز وہ سب کو ہو گیا معلوم
اس نے وعدہ تو کرلیا لیکن
دل کی نیت کسی کو کیا معلوم

حسن نقوی.....کراچی

نہ جانے کون سی تم میں اضافی خوبی ہے
دکھائی دیتے ہو تم بزم میں سبھی سے الگ

شاہدہ سعید.....پسرور

میں نے پوچھا تھا فقط کیا حال ہے؟
اور وہ آنسو بہانے لگ گئی

انس انور.....چک شہزاد

مدت سے کئی راز ہیں سینے میں مرے
کوئی بھی نہیں جس کو میں ہم راز بنا لوں
آخر کو بشر ہے تُو خدا تھوڑی ہے
کیوں تیرے لیے سب کو میں ناراض کروں

راشد شفیع.....بحرین

اس لیے زہر اگلتے ہیں مرے بارے میں
دوستوں سے مری شہرت نہیں دیکھی جاتی

وقاص الطاف.....کراچی

اِک رات ہے کہ کٹتی نہیں ہے کسی طرح
مدت سے انتظارِ سحر کررہا ہوں میں

ہارون الطاف.....سندگلی

اِک بار کبھی دھوکا دیا تھا مجھے اس نے
پھر میں نے کسی شخص سے یاری ہی نہیں کی

کشف پری.....کراچی

اس لیے بھی نہیں مل سکتے ہم اِک دوسرے سے
درمیاں دونوں کے دیوارِ اَنا آتی ہے

روشان.....کراچی

سب کو فن کار کے شہ پارے سے دلچسپی رہی
کب کوئی جان سکا ہے کسی فن کار کا دُکھ

رضوانہ کوثر.....لاہور

یہ محبت کا شجر بوڑھا نہیں ہوتا کبھی
اِک نہ اِک شاخ سدا اس کی ہری رہتی ہے

عامر بشیر.....سعودی عرب

ممکن ہے جسم مردہ میں پڑ جائے پھر سے جان
ہے شرط یہ تُو پیار سے اِک بار چھو مجھے

میرا یہ پسندیدہ شعر ''سچی کہانیاں'' کی نذر ہے

نام:

پتا:

کوپن برائے

ترنیم کش

مئی 2017ء

Pakistanipoint.com
Waqar Azeem